الكوثر

في تفسير القرآن

١

الکوثر فی تفسیر القرآن

جلد ہشتم

سورۂ فصلت ۴۱ تا سورۃ الرحمٰن ۵۵

محسن علی نجفی

مصباح القرآن ٹرسٹ۔ لاہور

تفسیر القرآن

فصلت ۴۱۔ شعراء ۴۲۔ زخرف ۴۳۔ دخان ۴۴۔ جاثیة ۴۵۔
احقاف ۴۶۔ محمد ۴۷۔ فتح ۴۸۔ حجرات ۴۹۔ قٓ ۵۰۔
ذاریات ۵۱۔ طور ۵۲۔ نجم ۵۳۔ قمر ۵۴۔ رحمٰن ۵۵

نام کتاب: الکوثر فی تفسیر القرآن (جلد ہشتم)
مفسر: محسن علی نجفی
کمپوزنگ و فارمٹنگ: خادم حسین
انتظامی امور: علی حیدری
تعداد: ایک ہزار
باراول: محرم الحرام ۱۴۳۶ھ/نومبر ۲۰۱۴ء
باردوم: ربیع الاول ۱۴۳۷ھ/جنوری ۲۰۱۶ء
مطبع: عاشق شاہ زیب پریس۔ لاہور
پیشکش: جامعة الکوثر۔ اسلام آباد
ناشر: مصباح القرآن ٹرسٹ۔ لاہور
فون: 0321 448 1214
ای میل: info@misbahulqurantrust.com
ویب: www.misbahulaqurantrust.com

اس کتاب میں نقل شدہ اکثر روایات کے متن اور حوالوں کی اصلاح وتطبیق، کتب احادیث پر مبنی سافٹ ویئر ”جامع الاحادیث“ تیار کردہ کمپیوٹر ریسرچ سینٹر آف اسلامک سائنسز اور المحدث سے کی گئی ہے۔
نہج البلاغة کے اکثر اقتباسات کا ترجمہ نہج البلاغةترجمہ مفتی جعفر حسینؒ مطبوعہ امامیہ کتب خانہ لاہور سے نقل کیا گیا ہے۔
تشریح کلمات مفردات القرآن راغب اصفہانی، ترجمہ مولانا محمد عبدہ فیروزپوری سے ماخوذ ہے۔

ملنے کا پتہ: محمد علی بک ایجنسی۔ کراچی کمپنی۔ اسلام آباد
معراج کمپنی۔ غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

قارئین کرام!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ! مصباح القرآن ٹرسٹ عہد حاضر کی بعض عظیم ترین تفاسیر و تالیفات کی نشر واشاعت کے سلسلے میں ایک عظیم اور پُر وقار مرکز کی حیثیت سے امت مسلمہ کے لیے اپنی عاجزانہ خدمات انجام دے رہا ہے۔ ادارہ ہذا کی یہ شہرت اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور آپ حضرات کی تائید واعانت کا ثمرہ ہے۔

خالقِ کائنات نے ''انسان'' کو روح و بدن سے مرکب، عقلِ سلیم اور قوتِ گویائی کی نعمات سے مالا مال فرما کر موجوداتِ عالم میں منفرد و ممتاز مقام عطا فرمایا ہے۔ جس طرح بدن کو اپنے ہی اعضا کی تقویت وارتقا کے لیے خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح روح کی بلندی اور تازگی کے لیے زہد و تقویٰ سے ملبوس ہو کر علمی تفکر کے میدان میں اترنا پڑتا ہے۔ روحانی تسکین اور معرفت کی بلندیوں سے فیض یاب ہونے کے لیے آیاتِ قرآن پر غور وفکر کرنا، اس کے رموز وحقائق کو سمجھنا اور فرمودات الٰہی پر عمل پیرا ہو کر اپنی زندگی گزارنا آخرت کی کامیابی کا باعث ہے۔

بلاشبہ قرآنِ مجید دین اسلام کا حقیقی آئین و دستور ہے۔ دنیا کے ہر طبقہ اور ہر نسل کو اپنی استعداد کے مطابق اس سے استفادہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ حضرت امام رضا علیہ السلام سے منقول روایت میں حضرت امام صادق علیہ السلام سے سوال کیا گیا: کیا وجہ ہے کہ قرآن مجید کو جس قدر بیان اور نشر کیا جاتا ہے اسی قدر اس میں مزید تازگی آ جاتی ہے؟ جواب میں امام علیہ السلام نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو نہ ایک زمانے کے ساتھ مخصوص فرمایا، نہ کچھ لوگوں کے ساتھ بلکہ یہ ہر دور میں جدت اور ہر قوم کے لیے قیامت تک تازگی رکھتا ہے۔''

کامیاب زندگی گزارنے کے لیے دنیا کے ہر شخص کے لیے قرآنی آیات کے مفہوم اور تفاسیر کا سمجھنا ضروری ہے۔ اس ضرورت کے پیش نظر علمائے اسلام نے عربی، فارسی، انگریزی اور دیگر کئی زبانوں میں قرآن مجید کی بہت سی تفاسیر اور تراجم مرتب فرمائے ہیں۔ اس سلسلے میں برصغیر پاک و ہند کے اہل تشیع و اہل

سنت علماء نے بھی اردوزبان میں قرآن کریم کے متعدد تراجم و تفاسیر پیش کیے ہیں۔ پاکستان میں اردو زبان میں طبع شدہ اکثر تراجم و تفاسیر لکھنؤ (انڈیا) کے مترجمین و مفسرین کی محنت کا نتیجہ ہیں۔ لکھنؤ کی اُردو پاکستان کی موجودہ اردو سے ذرا مختلف ہے۔

دنیا کا ہر شخص دوسری زبانوں کے علاوہ اپنی قومی زبان بلکہ اپنے خطے کی زبان سے زیادہ مانوس ہوتا ہے لہٰذا خطے کی موجودہ اردو زبان کے پیش نظر اور قرآنی تصریحات کے بارے میں نئی نسل کی طرف سے اٹھنے والے سوالات کے جوابات اور جدید معاندانہ تحریروں اور الزام تراشیوں کے مقابلے میں مکتب اہل بیت علیہم السلام کا موقف بیان کرنے کے لیے ۱۰ جلدوں پر مشتمل زیر نظر تفسیر قرآن " الکوثر فی تفسیر القرآن " کی جلد ہشتم قارئین کرام کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ یہ تفسیری مجموعہ حجۃ الاسلام والمسلمین الشیخ محسن علی نجفی مدظلہ العالی کی غیر معمولی مساعی اور شبانہ روز محنت کا ثمر ہے۔ خداوندعالم اُن کا سایہ ہمارے سروں پر قائم و دائم رکھے اور انہیں طاقت وصحت کی نعمت سے سرفراز فرمائے۔

اراکین مصباح القرآن ٹرسٹ قبلہ موصوف کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے ادارہ ہذا کو یہ تفسیری مجموعہ پرنٹ کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

مزید برآں آپ ہماری کتب مصباح القرآن ٹرسٹ کی ویب سائٹ:

www.misbahulqurantrust.com

کے ذریعے گھر بیٹھے بھی پڑھ سکتے ہیں۔

ہمیں اُمید ہے کہ صاحبانِ علم وتحقیق حسبِ سابق مصباح القرآن ٹرسٹ کی اس کوشش کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے۔ اس گوہر نایاب سے بھرپور علمی و عملی استفادہ فرمائیں گے اور ادارے کو اپنی قیمتی تجاویز و آراء سے ضرور مستفید فرمائیں گے۔

والسلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاهور۔

پاکستان

سُوْرَةُ فُصِّلَتْ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس سورۃ مبارکہ کا نام حٰمٓ سجدۃ ہے چونکہ شروع میں حٰمٓ ہے اور اس میں ایک آیت سجدہ ہے جس پرسجدہ واجب ہے اس لیے اس سورۃ کو حٰمٓ سجدۃ کہا گیا۔ اس سورۃ مبارکہ کو فصلت اور مصابیح کا بھی نام دیا گیا ہے لیکن ائمہ علیہم السلام کی روایات میں اس سورۃ کو حٰمٓ سجدہ کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

یہ سورۃ مکی ہے۔ بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورۃ مکی زندگی میں نہایت مشکل حالات میں نازل ہوئی ہے کہ مشرکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف ہر حربہ استعمال کر رہے تھے۔

فضیلت: ابی بن کعب راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ قَرَأَ حٰمٓ السَّجْدَةُ اَعْطِیَ بِعَدَدِ کُلِّ حَرْفٍ مِنْهَا عَشْرَ حَسِنَاتٍ۔[1]

جو حم سجدہ کی تلاوت کرتا ہے اس کو ہر حرف کا دس نیکیوں کا ثواب دیا جائے گا۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

من قرأ سورۃ حٰمٓ السجدۃ کانت له نوراً یوم القیامة مد بصره و سروراً و عاش فی هذه الدنیا مغبوطاً محموداً۔[2]

جو سورہ حٰمٓ سجدہ کی تلاوت کرتا ہے اسے قیامت کے دن تا حدّ نگاہ روشنی اور خوشی ملے گی اور دنیا میں قابل رشک، قابل ستائش زندگی نصیب ہوگی۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بنام خدائے رحمٰن رحیم

حٰمٓ ۚ﴿۱﴾

۱۔ حا، میم۔

تَنۡزِیۡلٌ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۚ﴿۲﴾

۲۔ خدائے رحمٰن رحیم کی نازل کردہ (کتاب) ہے۔

---

[1] مجمع البیان۔ مستدرک الوسائل ۴: ۳۴۷

[2] مجمع البیان۔ بحار ۸۹: ۸۹۲

تفسیر آیات

یہ کتاب اس ذات کی نازل کردہ ہے جو رحمٰن اور رحیم ہے۔ اس کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ فاتحہ۔

اس آیت سے یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ قرآن مجید کا نزول اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ایک مظہر ہے اور انسانیت کے لیے اپنے اندر دنیا و آخرت دونوں سے متعلق بے پایاں رحمتوں کا ایک سمندر لیے نازل ہوا ہے۔

كِتٰبٌ فُصِّلَتۡ اٰیٰتُهٗ قُرۡاٰنًا عَرَبِیًّا لِّقَوۡمٍ یَّعۡلَمُوۡنَ ۝

۳۔ ایسی کتاب جس کی آیات کھول کر بیان کی گئی ہیں، ایک عربی (زبان کا) قرآن علم رکھنے والوں کے لیے۔

تفسیر آیات

۱۔ كِتٰبٌ فُصِّلَتۡ اٰیٰتُهٗ: قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیات اور مضامین میں کسی قسم کی پیچیدگی اور ابہام نہیں ہے۔ دلائل واضح، براہین غیر مبہم ہیں۔ کسی آیت کا دوسری آیت سے اختلاط نہیں ہے، نہ ایک مضمون دوسرے مضمون سے متصادم ہے کہ اسے اپنا دستور حیات بنانے کے لیے کوئی مشکل پیش آئے۔

قرآنی اسلوب بیان میں وضاحت کو بنیاد بنایا گیا ہے تاکہ اس میں غور کرنے والے اس سے روشنی حاصل کر سکیں اور فہم سلیم رکھنے والے اس کے ملکوتی مفاہیم سے فیض لے سکیں۔

۲۔ قُرۡاٰنًا عَرَبِیًّا: اس قرآن کو عربی زبان میں نازل کر کے جس قوم کو اس مشن کا ہراول دستہ قرار دیا گیا اس کے لیے کوئی عذر نہیں چھوڑا۔ چنانچہ عربوں کے سادہ فہم لوگ بھی اس کلام کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔

چنانچہ اصمعی نے آیۂ وَ السَّارِقُ وَ السَّارِقَۃُ فَاقۡطَعُوۡۤا اَیۡدِیَهُمَا ...[1] کے ذیل میں جو واقعہ لکھا ہے وہ بہترین مثال ہے۔ لکھتے ہیں:

> میں نے اس آیت کی تلاوت کرتے ہوئے آیت کے آخر میں غفور رحیم پڑھا تو ایک عرب بدو نے کہا: یہ کس کا کلام ہے؟ میں نے کہا: اللہ کا کلام ہے۔ بولا: پھر پڑھو۔ میں نے پھر غفور رحیم پڑھا۔ پھر میں متوجہ ہوا کہ غلط پڑھ رہا ہوں۔ جب میں نے پڑھا و اللّٰہ عزیز حکیم تو بدو نے کہا: اب درست پڑھا ہے۔ میں نے پوچھا: تم نے کیسے سمجھا؟ کہا: اللہ عزیز و حکیم ہے تو ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ اگر غفور رحیم کا ذکر

---

[1] ۵ مائدہ: ۳۸

آتا تو ہاتھ کاٹنے کا حکم نہ دیتا۔

ایک بدو بھی اپنے ذوق سلیم سے اس عربی سلیم سے اچھی طرح مطالب سمجھ لیتا ہے۔

۳۔ لِّقَوۡمٍ یَّعۡلَمُوۡنَ: یہ قرآن ایسی قوم کے لیے ہے جو اس کے معانی کا علم رکھتی ہے خواہ عرب ہو یا غیر عرب چونکہ قرآن کے معانی کا علم حاصل کرنے کے لیے عرب ہونا ضروری نہیں ہے۔ یہ اس صورت میں ہے اگر ہم یَّعۡلَمُوۡنَ کے بعد معانیہ کو مفعول تصور کرتے ہیں۔ اگر ہم یَّعۡلَمُوۡنَ کو متروك المفعول تصور کرتے ہیں تو آیت کا یہ مطلب بنتا ہے: یہ قرآن ان لوگوں کے لیے ہے جو علم رکھتے ہیں۔ یعنی قرآن سے استفادہ وہی لوگ کرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔ قرآن کی توقعات علم والوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔

بَشِیۡرًا وَّ نَذِیۡرًا ۚ فَاَعۡرَضَ اَکۡثَرُہُمۡ فَہُمۡ لَا یَسۡمَعُوۡنَ ﴿۴﴾

۴۔ بشارت دیتا ہے اور تنبیہ بھی کرتا ہے لیکن ان میں سے اکثر نے منہ پھیر لیا ہے پس وہ سنتے نہیں ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اس عربی قرآن میں بشارت ہے ان لوگوں کے لیے جو اس سے اپنی ابدی سعادت حاصل کرتے ہیں اور تنبیہ ہے ان لوگوں کے لیے جو اس قرآن سے ہدایت نہیں لیتے۔ درحقیقت تنبیہ، بشارت سے کم اہمیت نہیں رکھتی چونکہ بشارت حاصل کرنے والوں نے تنبیہ سے فائدہ اٹھایا ہے۔ تنبیہ بشارت کے لیے زینہ ہے۔

۲۔ فَاَعۡرَضَ اَکۡثَرُہُمۡ: لیکن ان میں سے اکثر کے پاس قبول حق کا ارادہ نہیں تھا چونکہ ان کی عقلوں پر اندھی تقلید کا تالا لگا ہوا تھا۔

۱۱

وَ قَالُوۡا قُلُوۡبُنَا فِیۡۤ اَکِنَّۃٍ مِّمَّا تَدۡعُوۡنَاۤ اِلَیۡہِ وَ فِیۡۤ اٰذَانِنَا وَقۡرٌ وَّ مِنۡۢ بَیۡنِنَا وَ بَیۡنِکَ حِجَابٌ فَاعۡمَلۡ اِنَّنَا عٰمِلُوۡنَ ﴿۵﴾ الثلثۃ

۵۔ اور وہ کہتے ہیں: جس چیز کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے اس کے لیے ہمارے دل غلاف میں ہیں اور ہمارے کانوں میں بھاری پن (بہرا پن) ہے اور ہمارے درمیان اور تمہارے درمیان پردہ حائل ہے، پس تم اپنا کام کرو، ہم اپنا کام کرتے ہیں۔

تشریح کلمات

اَکِنَّۃٍ: (ك ن ن) الکنان۔ پردہ غلاف وغیرہ جس میں کوئی چیز چھپائی جائے۔ اس کی جمع اکنۃ ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَقَالُوۡا قُلُوۡبُنَا فِیۡۤ اَکِنَّۃٍ: وہ کہتے ہیں جو بات آپ کرتے ہیں وہ ہمارے دلوں میں نہیں اترتی۔ ہمارے دل غلاف کے اندر محفوظ ہیں۔ اس میں ہمارے اپنے عقائد کے خلاف کوئی بات نہیں جا سکتی۔ لہٰذا ہمارے دلوں میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

۲۔ وَفِیۡۤ اٰذَانِنَا وَقۡرٌ: اور ہمارے کانوں میں بہرا پن ہے جس کی وجہ سے ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز نہیں سن سکتے۔

۳۔ وَّمِنۡۢ بَیۡنِنَا وَبَیۡنِکَ حِجَابٌ: ہمارے اور آپ کے درمیان پردہ حائل ہے۔ مفادات، آبائی تقلید اور مصلحتوں کا پردہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس دنیا میں ہیں اس سے ہم بہت دور ہیں۔

۴۔ فَاعۡمَلۡ اِنَّنَا عٰمِلُوۡنَ: آپ اپنی وادی میں یہ کام کریں ہم اپنی وادی میں کام کرتے ہیں۔ فَاعۡمَلۡ آپ اپنی توحیدی تحریک چلائیں۔ ہم آپ کے خلاف اپنی مشرکانہ طاقت صرف کریں گے۔

قُلۡ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ یُوۡحٰۤی اِلَیَّ اَنَّمَاۤ اِلٰـہُکُمۡ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ فَاسۡتَقِیۡمُوۡۤا اِلَیۡہِ وَاسۡتَغۡفِرُوۡہُ ؕ وَوَیۡلٌ لِّلۡمُشۡرِکِیۡنَ ۙ﴿۶﴾

۶۔ کہدیجیے: میں بھی تم جیسا آدمی ہوں، میری طرف وحی ہوتی ہے کہ ایک اللہ ہی تمہارا معبود ہے لہٰذا تم اس کی طرف سیدھے رہو اور اسی سے مغفرت مانگو اور تباہی ہے ان مشرکین کے لیے.

تفسیر آیات

اس آیت کی تشریح کے لیے سورہ کہف آیت ۱۱۰ ملاحظہ فرمائیں۔

فَاسۡتَقِیۡمُوۡۤا اِلَیۡہِ: اس واحد معبود کی طرف سیدھے رہو۔ دائیں بائیں طرف انحراف نہ کرو۔ تمہاری منزل ایک ہی رب کی بندگی ہے۔ اس سے انحراف کرنے والے ہلاکت میں ہیں۔

الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡتُوۡنَ الزَّکٰوۃَ وَہُمۡ بِالۡاٰخِرَۃِ ہُمۡ کٰفِرُوۡنَ ﴿۷﴾

۷۔ جو زکوۃ نہیں دیتے اور جو آخرت کا انکار کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

ہلاکت ہے ان مشرکین کے لیے جو زکوۃ ادا نہیں کرتے۔ یہ سورۃ مکہ میں بعثت کے ابتدائی سالوں

میں نازل ہوئی ہے جب زکوۃ ابھی واجب نہ تھی۔ زکوۃ کا حکم مدینہ میں نافذ ہوا ہے۔ لہٰذا یہاں زکوۃ سے مراد اصطلاحی زکوۃ نہیں ہے بلکہ مطلق صدقہ ہے کہ مشرکین ایام حج میں مسلمانوں پر کچھ خرچ کرنے سے پرہیز کرتے تھے یا یہ کہ مشرکین مال کی محبت زیادہ رکھتے تھے اور غریب پروری کی حس ان میں نہیں تھی جو بہت بری صفت ہے۔

واضح رہے زکوۃ کے واجب ہونے کا حکم مدینہ میں نافذ ہوا لیکن یہ لفظ واجب زکوۃ کے علاوہ ہر قسم کے مالی انفاق کے لیے متعدد مکی سورتوں میں استعمال ہوا ہے۔

ملاحظہ ہو اعراف آیت۱۵۶، نمل آیت۳، لقمان آیت۴، مزمل آیت۲۰۔

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن میں زکوۃ کا لفظ ہر اس مال کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو راہ خدا میں خرچ کیا جائے۔ خواہ واجب ہو یا مستحب ہو۔ واجب زکوۃ میں زکوۃ، عشر، خمس، فطرہ، کفارات وغیرہ سب شامل ہیں۔ بعد میں فقہاء نے فقہی ابواب مترتب کرتے ہوئے واجب زکوۃ کے لیے یہی لفظ زکوۃ مختص کیا اور دیگر واجبات کے لیے دیگر الفاظ جیسے خمس، فطرہ وغیرہ مختص کیا۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	۸۔ لیکن جو لوگ ایمان لائے اور اعمال صالح بجا
لَہُمۡ اَجۡرٌ غَیۡرُ مَمۡنُوۡنٍ ؑ﴿۸﴾ ع ۱۵	لائے یقیناً ان کے لیے نہ ختم ہونے والا ثواب ہے۔

تفسیر آیات

ایمان اور صالح اعمال بجا لانے والوں کو جو اجر و ثواب ملے گا اس کا یہ وصف ہوگا کہ وہ ممنون نہ ہوگا۔ ممنون کے دو معنی مشہور ہیں: ایک یہ غیر مقطوع، دائمی ثواب ہوگا۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ یہ ثواب ایسا ہوگا جس کا احسان جتایا نہیں جائے گا۔ احسان کرنے کے بعد احسان جتلانا ایک معیوب عمل ہے۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

اَحْیُوا الْمَعْرُوفَ بِاَمَاتَتِہِ، فَاِنَّ الْمِنَّۃَ تَہْدِمُ الصَّنِیعَۃَ۔[1]	نیکی (صفحۂ ذہن سے) مٹا کر زندہ رکھو کیونکہ احسان جتلانا احسان کو برباد کرنے کے مترادف ہے۔

لہٰذا جنت میں جو نعمتیں میسر ہوں گی انہیں جتلایا نہیں جائے گا کیونکہ جتانے سے ذہن پر ناقابل تلافی بوجھ آ جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

قَوۡلٌ مَّعۡرُوۡفٌ وَّ مَغۡفِرَۃٌ خَیۡرٌ مِّنۡ صَدَقَۃٍ یَّتۡبَعُہَاۤ اَذًی ...۔[2]	نرم کلامی اور درگزر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے بعد (خیرات لینے والے کو) ایذا دی جائے۔

---

[1] مستدرک الوسائل ۱۲: ۴۳۹ [2] بقرۃ: ۲۶۳

قُلۡ اَئِنَّکُمۡ لَتَکۡفُرُوۡنَ بِالَّذِیۡ خَلَقَ الۡاَرۡضَ فِیۡ یَوۡمَیۡنِ وَ تَجۡعَلُوۡنَ لَہٗۤ اَنۡدَادًا ؕ ذٰلِکَ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۚ﴿۹﴾

۹۔ کہدیجیے: کیا تم اس ذات کا انکار کرتے ہو اور اس کے لیے مدمقابل قرار دیتے ہو جس نے زمین کو دو دن میں پیدا کیا؟ وہی تو عالمین کا پروردگار ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ اَئِنَّکُمۡ لَتَکۡفُرُوۡنَ: کہدیجیے تمہارا رب اور تمہاری زندگی چلانے والا وہ ہے جس نے زمین کو دو یوم میں خلق کیا۔ یوم سے مراد اس کائنات کے وجود میں آنے کے بعد کا دن نہیں ہو سکتا چونکہ یہ ان دنوں کے وجود میں آنے سے پہلے کا ذکر ہے۔ لہٰذا یوم سے مراد یہاں مرحلہ لینا پڑے گا۔ دو مرحلوں سے مراد ممکن ہے وہ دو مرحلے ہوں جن سے زمین موجودہ شکل اختیار کرنے کے لیے گزری ہے۔

پہلے مرحلے میں زمین سیال مادے کی صورت میں تھی۔ اس وقت زمین کا اندرونی حصہ سیال اور آتشیں تھا لہٰذا کسی زمانے میں پورا کرۂ ارض سیال تھا۔ دوسرے مرحلے میں اس کے اوپر کی سطح سرد ہونا شروع ہوئی۔ ارضیاتی ماہرین کا تخمینہ ہے کہ زمین کے اوپر کے حصے کو سرد ہونے میں دو ہزار ملین سال لگے ہیں۔

۲۔ وَ تَجۡعَلُوۡنَ لَہٗۤ اَنۡدَادًا: پھر بھی تم اللہ کے لیے مدمقابل قرار دیتے ہو۔ کیا اس مدمقابل کا اس زمین کی تخلیق میں، اس زمین کو دو مرحلوں میں موجودہ شکل میں لانے میں کوئی حصہ ہے؟

۳۔ ذٰلِکَ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ: عالمین کا رَبّ وہ ہے جس نے اس زمین کو تمہارے لیے آمادہ کیا ہے۔

وَ جَعَلَ فِیۡہَا رَوَاسِیَ مِنۡ فَوۡقِہَا وَ بٰرَکَ فِیۡہَا وَ قَدَّرَ فِیۡہَاۤ اَقۡوَاتَہَا فِیۡۤ اَرۡبَعَۃِ اَیَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیۡنَ ﴿۱۰﴾

۱۰۔ اور اسی نے زمین میں اس کے اوپر پہاڑ بنائے اور اس میں برکات رکھ دیں اور اس میں چار دنوں میں حاجتمندوں کی ضروریات کے برابر سامان خوراک مقرر کیا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ جَعَلَ فِیۡہَا رَوَاسِیَ مِنۡ فَوۡقِہَا: اللہ تعالیٰ نے زمین کے اوپر پہاڑ بنا دیے۔ جس سے اس زمین میں ٹھہراؤ آ گیا۔ اس کا اندرونی حصہ مائع اور سیال صورت میں ہے اور زمین کی سطح جامد صورت میں ہے۔ اگر پہاڑ نہ ہوتے تو حرکت زمین کی وجہ سے اس کی بیرونی سطح ڈول جاتی۔ اس طرح پہاڑوں نے زمین کو ڈولنے سے محفوظ رکھا ہے۔

۲۔ بٰرَكَ فِيۡهَا: اور اس میں برکتیں رکھ دیں۔ ایک مہربان ماں کی مانند، آرام دہ گہوارے کی طرح بنا دیا جس میں نہ صرف انسانی زندگی برقرار رکھنے کے لیے ضرورت کی چیزیں فراہم ہیں بلکہ انسانی مختلف اذواق کی تسکین کا سامان بھی ہے۔ ایک فیاض خاک خلق فرمائی۔ اس کے ساتھ لطیف ہوا اور سیال پانی خلق فرما کر ان پر سورج کی حرارت ڈال دی جس نے پانی کو ہوا میں اٹھایا۔ بارشیں بنائیں، نہریں، چشمے جاری کیے۔ اسی حرارت نے پانی اور ہوا کے ساتھ مل کر زمین کو نمو کی طاقت بخشی۔ ان سب نے مل کر کرۂ ارض کو پُر برکت بنا دیا۔

۳۔ وَ قَدَّرَ فِيۡهَاۤ اَقۡوَاتَهَا: اس کرۂ ارض کے باشندوں کے لیے روزی کی تقدیر سازی کی۔ اہل زمین کی معیشت کے لیے ضروری چیزوں کی حدود و قیود کا تعین فرمایا۔ ان چیزوں کی خاصیت اور فعالیت مقرر فرمائی۔ یہ تکوین و تخلیق کے مراحل کی بات ہے۔

۴۔ فِيۡۤ اَرۡبَعَةِ اَيَّامٍ: پہاڑوں کی تشکیل، زمین بابرکت بنانے اور اہل ارض کے لیے روزی اور معیشت فراہم کرنے میں چار دن لگے۔ بعض بزرگ مفسرین کے نزدیک ان چار دنوں سے مراد سال کے چار موسم ہیں جو زمین کی موجودہ شکل میں آنے کے بعد وجود میں آئے ہیں۔ اس نظریے کے تحت ان آیات میں کائنات کی تخلیق کے بارے میں چار دنوں کا ذکر ہے۔ باقی دو دنوں کا ذکر نہیں ہے اور ما بینھما کا بھی ذکر نہیں ہے۔

ایک نظریہ یہ ہے کہ زمین کی تخلیق پر دو دن لگ گئے اور زمین کو قابل سکونت بنانے پر بھی دو ہی دن لگے ہیں۔ مجموعاً چار دن ہو گئے۔ اس نظریے کے مطابق ان دونوں آیتوں کا مفہوم اس طرح بنتا ہے:

> تم اس اللہ کے منکر ہو جس نے دو دن میں زمین بنائی۔ اس کے اوپر پہاڑ بنائے۔ اس میں برکتیں رکھ دیں اور سامان معیشت فراہم فرمایا چار دنوں میں۔

ان چار دنوں میں وہ دو دن بھی شامل ہیں جس کا ذکر زمین بنانے کے بارے میں ہوا ہے۔

۵۔ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيۡنَ: زمین کے باشندوں کو ان کی ضرورت کے مطابق روزی فراہم فرمائی۔ قرآنی تعبیر کا لفظی ترجمہ ہے: سوال کرنے والوں کے مطابق۔ سوال سے مراد ان کی احتیاج کی زبان حال ہے نیز سوال میں صرف ضروری اور لازمی چیزیں ہی نہیں ہیں۔ یہ انسان مَن و سلوی کے باوجود مسور اور پیاز اور اپنے ذوق کی تسکین کے لیے مختلف لذتوں کی چیزوں کا سوال کرتا ہے۔ یہ سب اللہ نے فراہم فرمائی ہیں۔

ثُمَّ اسۡتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ وَ هِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَ لِلۡاَرۡضِ ائۡتِيَا طَوۡعًا اَوۡ كَرۡهًا ؕ قَالَتَاۤ اَتَيۡنَا	۱۱۔ پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جو اس وقت دھواں تھا پھر آسمان اور زمین سے کہا: دونوں آ جاؤ خواہ خوشی سے یا کراہت سے، ان دونوں

طَآئِعِیۡنَ ﴿۱۱﴾ نے کہا: ہم بخوشی آ گئے۔

تفسیر آیات

۱۔ ثُمَّ اسۡتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ: لفظ اسۡتَوٰۤی کے بعد علی مذکور ہے تو اس صورت میں اسۡتَوٰی کا مطلب استقرار ہوتا ہے۔ جیسے ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ اور اگر اسۡتَوٰۤی کے بعد اِلَی مذکور ہے تو اس صورت میں اسۡتَوٰۤی متوجہ ہونے کے معنوں میں ہوتا ہے۔ اس آیت میں السَّمَآءِ بنانے کے قصد و ارادہ کے لیے یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ لفظ ثُمَّ سے تاخیر زمان مراد لینا ضروری نہیں ہے۔ یہ لفظ ترتیب بیانی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جیسے ترتیب زمان کے لیے ہوتا ہے۔ آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں تقدیم و تاخیر پر بحث غیر ضروری ہے چونکہ ارادۂ الٰہی زمانی نہیں ہے۔ خود زمانہ مخلوق خدا ہے۔

۲۔ وَهِيَ دُخَانٌ: جب یہ آسمان ابھی دھویں کی حالت میں تھا اس وقت اسے خلق کرنے کا ارادہ فرمایا۔ دھویں سے مراد وہ منتشر مادہ ہو سکتا ہے جو کائنات کی تخلیق سے پہلے فضا میں ایک غبار کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ ممکن ہے یہ مادہ وہی ہو جسے آج کل کے سائنسدان سحابیہ (Nebula) کہتے ہیں۔ تاہم ان سائنسی نظریات پر، جو تھیوری کے مراحل میں ہوتے ہیں، قرآنی حقائق کا انطباق کرنا درست نہیں ہے۔

۳۔ فَقَالَ لَهَا وَلِلۡاَرۡضِ ائۡتِیَا: پھر اللہ نے آسمان اور زمین کو بلایا کہ عدم سے منصۂ وجود میں آ جاؤ۔ نیستی سے صفحۂ ہستی پر نمودار ہو جاؤ۔ یہ ارادۂ الٰہی کے لفظ کُنۡ کی طرح ایک لفظی تعبیر ہے۔

۴۔ طَوۡعًا اَوۡ کَرۡهًا: خوشی یا کراہت سے۔ ارض و سما کے لیے خوشی اور کراہت کا موجود ہونا شعور کی دلیل ہے جیسا کہ سورۃ الزلزال میں فرمایا:

یَوۡمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخۡبَارَهَا ۙ﴿۴﴾ بِاَنَّ رَبَّکَ اَوۡحٰی لَهَا ؕ﴿۵﴾ [1]	اس دن وہ اپنے حالات بیان کرے گی۔ کیونکہ آپ کے رب نے اسے ایسا کرنے کا حکم دیا تھا۔

زمین اپنی پشت پر رونما ہونے والے اعمال عباد کی گواہی دے گی۔ لہٰذا زمین کا گواہی دینا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو حکم ملنا شعور کی دلیل ہے۔

نیز اس حکم میں خوشی اور کراہت میں سے ایک کے انتخاب کا بھی اشارہ ملتا ہے اور انتخاب دلیل شعور ہے۔

۵۔ قَالَتَاۤ اَتَیۡنَا طَآئِعِیۡنَ: اللہ کے حکم تکوینی کی اطاعت کا اظہار ہے کہ ہم خوشی یعنی فطرت سے مانوس ہو کر حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ اگرچہ تخلیق الٰہی عین فطرت ہے اور طوعاً کے علاوہ دوسری صورت واقع نہیں ہو سکتی تاہم عام فہم لفظوں میں حکم الٰہی کے نفاذ کے لیے یہ تعبیر اختیار فرمائی۔ اس کے علاوہ اور جو کچھ

---

[1] ۹۹ زالزال: ۴۔ ۵

اس سلسلے میں کہا جاتا ہے وہ ظن و تخمین اور مفروضے کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

فَقَضٰىهُنَّ سَبۡعَ سَمٰوَاتٍ فِیۡ یَوۡمَیۡنِ وَ اَوۡحٰی فِیۡ کُلِّ سَمَآءٍ اَمۡرَهَا ؕ وَ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡیَا بِمَصَابِیۡحَ ٭ۖ وَ حِفۡظًا ؕ ذٰلِکَ تَقۡدِیۡرُ الۡعَزِیۡزِ الۡعَلِیۡمِ ﴿۱۲﴾

۱۲۔ پھر انہیں دو دنوں میں سات آسمان بنا دیے اور ہر آسمان میں اس کا حکم پہنچا دیا اور ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں سے آراستہ کیا اور محفوظ بھی بنایا، یہ سب بڑے غالب آنے والے، دانا کی تقدیر سازی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَقَضٰىهُنَّ سَبۡعَ سَمٰوَاتٍ فِیۡ یَوۡمَیۡنِ: یہ دخان دو دن یا دو مرحلوں میں سات آسمان کی صورت میں آ گیا۔ ان مرحلوں کے بارے میں بشر کو کسی قسم کا کوئی علم نہیں ہے اور جو کچھ اس سلسلے میں کہا جاتا ہے وہ ظن و تخمین اور مفروضے کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

۲۔ وَ اَوۡحٰی فِیۡ کُلِّ سَمَآءٍ اَمۡرَهَا: اور ان سات آسمانوں میں سے ہر ایک آسمان کو اس سے متعلق حکم بتا دیا۔ ہر ایک آسمان کو اپنا اپنا نظام دے دیا۔ اس سے بظاہر اشارہ ملتا ہے کہ ہر آسمان کا نظام، تصور، زمان و مکاں و دیگر فیزیکلی خصوصیات، اقدار اور پیمانے مختلف ہیں۔ جس طرح زمین کی کشش سے نکلنے کے بعد اوپر اور نیچے کا تصور بدلتا ہے ممکن ہے دوسرے آسمانوں میں تمام یا بیشتر پیمانے بدل جاتے ہوں۔

چنانچہ جنت کی زندگی کے بارے میں معلوم ہے: لَهُمۡ مَّا یَشَآءُوۡنَ فِیۡهَا ...[1] وہاں انسان جو چاہے گا مل جائے گا۔ یعنی جنت میں انسان کا ارادہ نافذ ہے۔ دنیا میں ہم اپنے ارادوں کو علل و اسباب کے مراحل سے گزارنے کے بعد نافذ کر سکتے ہیں۔ دنیا میں ہم اپنے ارادوں کو اللہ کے دیے ہوئے نظام میں انجام دے سکتے ہیں:

اَبَی اللّٰهُ اَنۡ یُجۡرِیَ الۡاَشۡیَاءَ اِلَّا بِاَسۡبَابٍ۔[2]

اللہ اس بات سے انکاری ہے کہ چیزیں سبب کے بغیر نافذ ہوں۔

مگر جنت میں صرف ارادہ کافی ہوگا۔

۳۔ وَ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡیَا بِمَصَابِیۡحَ: ہم نے قریب ترین آسمان کو چراغوں سے آراستہ کیا، سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن ستاروں، کہکشاؤں کا وجود ہمارے لیے محسوس یا قابل محسوس ہے وہ سب آسمان اول

---

[1] ۵۰ ق: ۳۵ [2] الکافی ۱: ۱۸۳

سے مربوط ہیں۔ دیگر آسمانوں کے بارے میں انسان کو کچھ علم نہیں ہے۔

۴۔ وَحِفۡظًا: ان ستاروں سے قریب ترین آسمان کو آراستہ کیا اور تحفظ کا بھی ذریعہ بنایا ہے۔ یعنی شیاطین سے بچانے کا ذریعہ۔ اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیاطین کا آسمان اول میں ہی داخلہ ممنوع ہے۔ آیت کے اس جملے کی تشریح سورہ صافات آیت ۶۔۷ میں بھی ہو چکی ہے۔

۵۔ ذٰلِكَ تَقۡدِيۡرُ الۡعَزِيۡزِ الۡعَلِيۡمِ: یہ ہر طاقت پر غالب آنے والے دانا کی تقدیر سازی ہے۔ اپنی قہاریت اور دانائی کے تحت ترتیب، تنظیم اور قدرتی تقنین ہے جس میں اپنی صناعیت اور قادریت کے ساتھ حکیمانہ تدبیری رموز ودیعت فرمائے۔ انہی تقدیری رموز کے ستون پر کائنات قائم ہے۔

فَاِنۡ اَعۡرَضُوۡا فَقُلۡ اَنۡذَرۡتُكُمۡ صٰعِقَةً مِّثۡلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوۡدَ ﴿۱۳﴾

۱۳۔ اگر یہ منہ پھیر لیں تو کہدیجیے: میں نے تمہیں ایسی بجلی سے ڈرایا ہے جیسی بجلی قوم عاد وثمود پر آئی تھی۔

اِذۡ جَآءَتۡهُمُ الرُّسُلُ مِنۡۢ بَيۡنِ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمِنۡ خَلۡفِهِمۡ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ قَالُوۡا لَوۡ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنۡزَلَ مَلٰٓئِكَةً فَاِنَّا بِمَاۤ اُرۡسِلۡتُمۡ بِهٖ كٰفِرُوۡنَ ﴿۱۴﴾

۱۴۔ جب ان کے پاس پیغمبر آ گئے تھے ان کے سامنے اور پیچھے سے کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو تو وہ کہنے لگے: اگر ہمارا پروردگار چاہتا تو فرشتے نازل کرتا پس جس پیغام کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو ہم اسے نہیں مانتے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَاِنۡ اَعۡرَضُوۡا: اگر یہ لوگ ان تعلیمات سے منہ پھیر لیتے ہیں جو قرآن پیش کرتا ہے۔ یعنی خدائے واحد کی بندگی سے، شرک ترک کرنے سے۔ حیات آخرت قبول کرنے سے منہ پھیر لیا تو اس قسم کے عذاب کے لیے تیار رہو جو قوم عاد وثمود پر نازل ہوا ہے۔

قوم عاد وثمود کا ذکر اس لیے فرمایا کہ عربوں کو ان دونوں قوموں کے تباہ شدہ آثار کا علم تھا۔

۲۔ اِذۡ جَآءَتۡهُمُ الرُّسُلُ: جب ان کے پاس رسولوں کا ایک سلسلہ جاری رہا۔

مِنۡۢ بَيۡنِ اَيۡدِيۡهِمۡ: ان کے ہم عصر رسول تھے۔ وَمِنۡ خَلۡفِهِمۡ: ان سے پہلے بھی رسول آئے تھے یا ممکن ہے مراد یہ ہو کہ رسولوں نے انہیں ہر طرف سے اللہ کا پیغام پہنچایا، کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ جس طرح شیطان ان لوگوں کو گمراہی کے لیے ہر طرف سے گھیر لیتا ہے۔

ثُمَّ لَاٰتِیَنَّھُمۡ مِّنۡۢ بَیۡنِ اَیۡدِیۡھِمۡ وَ مِنۡ خَلۡفِھِمۡ ....[1] پھر ان کے آگے، پیچھے، دائیں اور بائیں (ہر طرف) سے انہیں ضرور گھیر لوں گا۔

۳۔ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰہَ: ان سب رسولوں کا پیغام یہ تھا کہ صرف ایک ہی معبود، اللہ کی عبادت کرو۔

۴۔ ان لوگوں نے اس دعوت کو یہ کہہ کر رد کیا کہ بشر اللہ کی نمائندگی نہیں کر سکتا۔ اللہ کو اگر زمین پر اپنا نمائندہ بھیجنا منظور ہوتا تو کسی فرشتے کو بھیجتا۔

اصل میں مشرکین رسالت و نبوت کے منکر تھے۔ اس انکار کے لیے یہ ان کا ایک بہانہ ہوا کرتا تھا۔

فَاَمَّا عَادٌ فَاسۡتَکۡبَرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ وَ قَالُوۡا مَنۡ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّۃً ؕ اَوَ لَمۡ یَرَوۡا اَنَّ اللّٰہَ الَّذِیۡ خَلَقَھُمۡ ھُوَ اَشَدُّ مِنۡھُمۡ قُوَّۃً ؕ وَ کَانُوۡا بِاٰیٰتِنَا یَجۡحَدُوۡنَ ﴿۱۵﴾

۱۵۔ مگر عاد نے زمین میں ناحق تکبر کیا اور کہا: ہم سے بڑھ کر طاقتور کون ہے؟ کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ جس اللہ نے انہیں پیدا کیا ہے وہ ان سے زیادہ طاقتور ہے؟ (اس طرح) وہ ہماری آیات کا انکار کرتے تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ قوم عاد اپنے تکبرانہ موقف کی بنا پر اس غلط فہمی میں مبتلا تھی کہ ہم جیسا طاقتور کون ہو سکتا ہے؟ قوم عاد اس زمانے کی طاقتور تمدن یافتہ قوم تھی اور ان کے تمدن کے آثار عربوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا کرتا تھا۔

وہ اس بات سے بالکل غافل تھے کہ اللہ ہر طاقت سے زیادہ طاقت کا مالک ہے۔

فَاَرۡسَلۡنَا عَلَیۡھِمۡ رِیۡحًا صَرۡصَرًا فِیۡۤ اَیَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِیۡقَھُمۡ عَذَابَ الۡخِزۡیِ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ؕ وَ لَعَذَابُ الۡاٰخِرَۃِ اَخۡزٰی وَ ھُمۡ لَا یُنۡصَرُوۡنَ ﴿۱۶﴾

۱۶۔ تو ہم نے منحوس ایام میں ان پر طوفانی ہوا چلا دی تاکہ ہم دنیاوی زندگی ہی میں انہیں رسوائی کا عذاب چکھا دیں اور آخرت کا عذاب تو زیادہ رسوا کن ہے اور ان کی مدد بھی نہیں کی جائے گی۔

تشریح کلمات

صَرۡصَر: (ص ر ص ر) شدید سردی۔ بعض نے کہا شدید تیز آندھی۔

---

[1] ۷ اعراف: ۱۷

تفسیر آیات

۱۔ فَاَرۡسَلۡنَا عَلَیۡہِمۡ رِیۡحًا: صاعقہ کی توضیح ہے کہ وہ صاعقہ اس صورت میں تھا کہ ایک شدید طوفانی آندھی ان پر آئی جو کئی دن چلتی رہی جس نے اس قوم کو تباہ کر دیا۔

۲۔ فِیۡۤ اَیَّامٍ نَّحِسَاتٍ: یہ سزا چند منحوس دنوں میں انہیں دی گئی۔ جن دنوں ان پر عذاب آیا وہ قوم عاد کے لیے منحوس ایام تھے۔ اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ یہ ایام ہمیشہ ہر شخص کے لیے منحوس ہوتے ہیں۔

۳۔ لِّنُذِیۡقَہُمۡ عَذَابَ الۡخِزۡیِ: یہ عذاب، دنیا میں ان کے لیے رسوائی کا سامان لے آیا اور ان کی یہ رسوائی صفحہ تاریخ پر ہمیشہ کے لیے ثبت ہے۔

وَ اَمَّا ثَمُوۡدُ فَہَدَیۡنٰہُمۡ فَاسۡتَحَبُّوا الۡعَمٰی عَلَی الۡہُدٰی فَاَخَذَتۡہُمۡ صٰعِقَۃُ الۡعَذَابِ الۡہُوۡنِ بِمَا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ ﴿۱۷﴾	۱۷۔ اور (ادھر) ثمود کو تو ہم نے راہ راست دکھا دی تھی مگر انہوں نے ہدایت کی جگہ اندھا رہنے کو پسند کیا تو انہیں ان کے اعمال کے سبب ذلت آمیز عذاب کی بجلی نے گرفت میں لے لیا۔

تفسیر آیات

اس آیت کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو اعراف آیت ۷۳ اور سورہ ھود ۶۱، عنکبوت ۳۸۔

وَ نَجَّیۡنَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ کَانُوۡا یَتَّقُوۡنَ ﴿۱۸﴾	۱۸۔ اور ہم نے انہیں بچا لیا جو ایمان لے آتے تھے اور تقویٰ اختیار کرتے تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ اس آیت سے اشارہ ملتا ہے کہ قوم ثمود میں سے چند لوگ حضرت صالح علیہ السلام پر ایمان لے آئے تھے۔

۲۔ وَ کَانُوۡا یَتَّقُوۡنَ: ایمان والوں کو ان کے تقویٰ کی وجہ سے نجات مل گئی۔ وہ ایمان لانے کے بعد عمل کے ذریعے اپنا بچاؤ کرتے تھے۔ تقویٰ یعنی بچاؤ۔ اس وجہ سے وہ عذاب سے بچ گئے۔

وَ یَوۡمَ یُحۡشَرُ اَعۡدَآءُ اللّٰہِ اِلَی	۱۹۔ اور جس دن اللہ کے دشمن جہنم کی طرف چلائے

النَّارِ فَهُمۡ يُوۡزَعُوۡنَ ۝۱۹

حَتّٰۤى اِذَا مَا جَآءُوۡهَا شَهِدَ عَلَيۡهِمۡ سَمۡعُهُمۡ وَاَبۡصَارُهُمۡ وَجُلُوۡدُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ۝۲۰

جائیں گے تو انہیں روک لیا جائے گا۔

۲۰۔ یہاں تک کہ جب سب وہاں پہنچ جائیں گے تو ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کی کھالیں ان کے خلاف گواہی دیں گی کہ وہ کیا کچھ کرتے رہے ہیں۔

تفسیر آیات

قرآن مجید میں انسان کے تقریباً تمام اعضاء کی گواہی کا ذکر ملتا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں i کان، ii آنکھ، iii کھال کا ذکر ہے۔ سورہ یٰسٓ آیت ۶۵:

وَتُكَلِّمُنَاۤ اَيۡدِيۡهِمۡ وَتَشۡهَدُ اَرۡجُلُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ ۝

اور ان کے ہاتھ ہم سے بولیں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے اس کے بارے میں جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں۔

میں iv ہاتھ، v پاؤں کا ذکر ہے۔ سورہ نور آیت ۲۴:

يَّوۡمَ تَشۡهَدُ عَلَيۡهِمۡ اَلۡسِنَتُهُمۡ وَاَيۡدِيۡهِمۡ وَاَرۡجُلُهُمۡ ....

اس دن ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان سب اعمال کی گواہی دیں گے....

میں vi زبان، vii پاؤں کا ذکر ہے۔

کان اور آنکھوں کی گواہی کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں ان لوگوں نے جس عضو سے کسی جرم کا ارتکاب کیا ہے وہ عضو اس بات کی گواہی دے گا: اس آنکھ نے وحدانیت پر دلالت کرنے والے واضح اور روشن معجزات کو دیکھا تھا، پھر مسترد کر دیا۔ اس کے کان نے آیات الٰہی کو سنا لیکن اس پر غور کرنے کی جگہ مسترد کر دیا یا اس نے مومن کی غیبت سنی، حرام غنا سنا۔ اس کی کھال ان گناہوں کی گواہی دے گی جو اس کے ذریعے یا اس کے سامنے انجام دیے۔ کھال ایک ایسی چیز ہے جس سے کوئی جرم چھپایا نہیں جا سکتا چونکہ کھال جسم کے تمام حصوں پر محیط ہے۔

واضح رہے اگر جرم سرزد ہوتے وقت ان اعضاء میں شعور و ادراک نہ ہوتا تو وہ شہادت اور گواہی دینے کے اہل نہ ہوتے۔ اگر اگر دنیا میں ان اعضا میں شعور و ادراک نہ ہوتا، آخرت میں اللہ نے ان میں شعور پیدا کیا تو یہ گواہی نہیں کہلائے گا۔ گواہی یہ ہے کہ جو کام اس کے سامنے سرزد ہوا اور اس کے شعور و ادراک میں آیا ہو اسے عند الطلب بیان کرے۔

اس آیت اور دیگر آیات سے یہ بات سامنے آتی ہے: انسان نے جس جسم کے ساتھ دنیا میں جرم

کیا ہے اسی جسم کے ساتھ اُٹھایا جائے گا۔ وہی سیل (Cell) اکٹھے کر دیے جائیں گے جن سے دنیا میں اس کا جسم مرکب تھا۔ اگرچہ دنیا میں جسم بدلتا رہتا ہے تاہم اللہ کے لیے یہ کام دشوار نہیں ہے کہ جس جسم کے ساتھ جرم سرزد ہوا ہے۔ وہی جسم حاضر کیا جائے۔ کوئی جرم جوانی میں سرزد ہوا ہے تو اس جسم سے، بڑھاپے سرزد ہوا ہے تو اس جسم سے گواہی لی جائے گی چونکہ اس کی ہر حرکت، جسم کے ہر سیل (Cell) کے کوڈ میں ملفوف ہے۔

ہمارے ذہن میں یہ بات بھی رہنی چاہیے کہ قیامت کے عالم میں جو نظام اور قانون طبیعت حاکم ہو گا یہ آیات اس نظام کے تحت بات کر رہی ہیں اور ہم اپنی دنیا میں حاکم نظام طبیعت کی روشنی میں سمجھ رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے واقع میں ایسا نہ ہو بلکہ ان اعضاء کی گواہی کی صورت اس سے بھی زیادہ واضح اور یقینی ہو جو ہم سمجھ رہے ہیں۔

وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ؕ قَالُوْۤا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْۤ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۱﴾

۲۱۔ تو وہ اپنی کھالوں سے کہیں گے: تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی؟ وہ جواب دیں گی: اسی اللہ نے ہمیں گویائی دی ہے جس نے ہر چیز کو گویائی دی اور اسی نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا اور تم اسی کی طرف پلٹائے جاؤ گے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ: انسان کو اپنی کھالوں پر اعتراض ہے۔ انسان اور انسان کی کھال، عقل و شعور میں دو مستقل وجود، سوال و جواب اور گفتگو کے دو فریق ہیں۔ اس گفتگو میں انسان خود اپنی کھال کے مقابلے میں بے بس نظر آتا ہے کہ انسان کھال پر اعتراض اپنی طرف سے کرتا ہے اور کھال اپنے عمل کو اللہ کی طرف نسبت دیتی ہے: اَنْطَقَنَا اللّٰهُ اللہ نے گویائی دی۔

یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ گواہی تمام اعضاء نے دی تھی۔ اعتراض صرف کھال پر کیوں؟

جواب: ممکن ہے چونکہ کھال پورے جسم پر محیط ہے لہٰذا اس کی گواہی تمام جرائم پر محیط ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ دیگر اعضاء نے جرم سرزد ہوتے ہوئے دیکھا، سنا ہے اور کھال ایسی ہے کہ اسی کے ذریعے جرم سرزد ہوا ہے۔

۲۔ قَالُوْۤا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْۤ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ: اس آیت میں جملہ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ ہر چیز کو گویائی دی، سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن ہر چیز، جس سے انسانی عمل کا ربط ہو، بول اٹھے گی نیز یہ بات

بھی معلوم ہوئی کہ ہر چیز اپنی جگہ شعور رکھتی ہے۔ چنانچہ زمین کے بارے میں ارشاد ہوا:

یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۙ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰی لَهَا ۝[1] — اس دن وہ اپنے حالات بیان کرے گی۔ کیونکہ آپ کے رب نے اسے ایسا کرنے کا حکم دیا تھا۔

کھال اپنے صاحب کو درس دے رہی ہے جیسے کہ صاحب کو معلوم نہیں ہے اور کھال بہتر جانتی ہے کہ آج ہر چیز میں گویائی آئی ہوئی ہے۔ تجھے میری گویائی پر تعجب ہے۔

۳۔ وَّ هُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ: کھال اپنے صاحب کو یاد دلاتی ہے اللہ وہی ہے جس نے تمہیں خلق کیا۔ تمہیں گویائی کی قوت دی اور آج اسی کی بارگاہ میں تم حاضر ہو جس نے گویائی کی قوت دی ہے۔

وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَاۤ اَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُوْدُكُمْ وَلٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝۲۲

۲۲۔ اور تم (گناہ کے وقت) اپنے کان کی گواہی سے اپنے آپ کو چھپا نہیں سکتے تھے اور نہ اپنی آنکھوں اور نہ اپنی کھالوں کی (گواہی سے) بلکہ تمہارا گمان یہ تھا کہ اللہ کو تمہارے بہت سے اعمال کی خبر نہیں ہے۔

تفسیر آیات

ا۔ یہ غافل انسان اس بات کی طرف متوجہ نہیں کہ اس کی ہر حرکت ہر سو، ہر جانب سے زیر نظر ہے۔ اول تو خود اللہ تعالیٰ براہ راست اس کی شہ رگ سے زیادہ قریب ہے، اس کے ہر عمل کی نگرانی کر رہا ہے۔ پھر زمین کی نظر بھی اس کی ہر حرکت پر جمی ہوئی ہے اور خود اس کے وجود کے ساتھ سیّار گواہ (کان، آنکھ، ہاتھ، پاؤں، کھال) اس کے تعاقب میں ہیں اور دیگر گواہان بھی ہیں:

وَ اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۙ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۙ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝[2] — جب کہ تم پر نگران مقرر ہیں، ایسے معزز لکھنے والے، جو تمہارے اعمال کو جانتے ہیں۔

وَذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۲۳

۲۳۔ اور یہ تمہارا گمان تھا، جو گمان تم اپنے پروردگار کے بارے میں رکھتے تھے اسی نے تمہیں ہلاک کر دیا اور تم خسارہ اٹھانے والوں میں ہو گئے۔

---

[1] ۹۹ زلزال: ۴۔۵ [2] ۸۲ انفطار: ۱۰۔۱۲

تشریح کلمات

اردی: (ر د ی) اھلک ہلاکت میں ڈال دینا کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ تمہارے اس گمان نے تمہیں آج کی ہلاکت سے دوچار کیا کہ اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر ہے۔ اگر اس بات پر تمہارا عقیدہ ہوتا کہ اللہ ہمارے ہر عمل سے آگاہ ہے اور موت کے بعد کی ایک زندگی ہے، وہاں ان اعمال کا حساب دینا ہے تو تم اس ہلاکت سے دوچار نہ ہوتے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

مومن کو چاہیے کہ اس طرح اللہ کا خوف رکھے جیسے وہ آتش کے دھانے پر ہے اور اس طرح امید رکھے کہ گویا وہ اہل جنت میں سے ہے پھر اس آیت کی تلاوت فرمائی اور فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ عَزَّ وَ جَلَّ عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِہِ اِنْ خَیْراً فَخَیْراً وَ اِنْ شَرّاً فَشَرّاً۔[1]

اللہ اپنے بندے کے گمان کے مطابق ہے اچھا گمان ہو تو اچھا برتاؤ ہو گا اور برا گمان ہو تو برا برتاؤ ہو گا۔

فَاِنۡ یَّصۡبِرُوۡا فَالنَّارُ مَثۡوًی لَّہُمۡ ۚ وَ اِنۡ یَّسۡتَعۡتِبُوۡا فَمَا ہُمۡ مِّنَ الۡمُعۡتَبِیۡنَ ﴿۲۴﴾

۲۴۔ پس اگر وہ صبر کریں تو بھی ان کا ٹھکانا آتش ہے اور اگر وہ معذرت کریں تو ان کا عذر قبول نہیں کیا جائے گا۔

تفسیر آیات

مجرمین قیامت کے دن مسلوب الاختیار ہوں گے۔ اپنی خود مختاری کے دنوں میں سرکشی کے بعد قیامت کے دن وہ صبر کرتے ہیں تو جہنم ان کا ٹھکانا ہے اور معذرت کرتے ہیں تو بھی ان کی معذرت قبول نہ ہو گی:

اِصۡلَوۡہَا فَاصۡبِرُوۡۤا اَوۡ لَا تَصۡبِرُوۡا ۚ سَوَآءٌ عَلَیۡکُمۡ ...۔[2]

اب اس میں جھلس جاؤ پھر صبر کرو یا صبر نہ کرو تمہارے لیے یکساں ہے۔

وَ قَیَّضۡنَا لَہُمۡ قُرَنَآءَ فَزَیَّنُوۡا

۲۵۔ اور ہم نے ان کے ساتھ ایسے ہم نشین لگا

---

[1] الکافی ۸: ۳۰۲　[2] ۵۲ طور: ۱۶

لَهُمۡ مَّا بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ وَحَقَّ عَلَيۡهِمُ الۡقَوۡلُ فِىۡۤ اُمَمٍ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ مِّنَ الۡجِنِّ وَالۡاِنۡسِ‌ ۚ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا خٰسِرِيۡنَ ﴿۲۵﴾ ع ۱۷

دیے تھے جو انہیں ان کے اگلے اور پچھلے اعمال کو خوشنما بنا کر دکھاتے تھے اور ان پر بھی وہی فیصلہ حتمی ہو گیا جو ان سے پہلے جنوں اور انسانوں کی امتوں پر لازم ہو چکا تھا، وہ یقیناً خسارے میں تھے۔

تفسیر آیات

وَقَيَّضۡنَا لَهُمۡ قُرَنَآءَ: اللہ نے انسان کی ہدایت کے لیے پاکیزہ ہم نشینوں کو اس کے ساتھ کر دیا ہے۔ اسی سورہ کی آیت ۳۱ میں ہے: ملائکہ اللہ کی ربوبیت پر ایمان پر استقامت دکھانے والوں سے کہیں: نَحۡنُ اَوۡلِيٰٓـؤُكُمۡ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا.... ہم دنیا میں بھی تمہارے رفیق تھے لیکن کافروں نے ایسے رفیقوں کی ہم نشینی کو قبول نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسے ہم نشینوں کے ساتھ مبتلا کر دیا جن کے ساتھ رہ کر حسن و قبح کے پیمانے بدل جاتے ہیں:

وَمَنۡ يَّعۡشُ عَنۡ ذِكۡرِ الرَّحۡمٰنِ نُقَيِّضۡ لَهٗ شَيۡطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيۡنٌ ﴿﴾ [1]

اور جو بھی رحمٰن کے ذکر سے پہلوتہی کرتا ہے ہم اس پر ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں تو وہی اس کا ساتھی ہو جاتا ہے۔

۲۔ فَزَيَّنُوۡا لَهُمۡ: ان برے ہم نشینوں نے ان سے ان کا ضمیر چھین لیا اور احساس گناہ ختم کر دیا۔ اب انہیں گناہ اور جرم میں حسن و خوبی نظر آنا شروع ہو گئی۔ یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ اچھے لوگوں سے نفرت کرنے والے لوگ برے لوگوں کی صحبت میں جا پھنستے ہیں۔ پھر حسن و قبح کے پیمانے بدل جاتے ہیں۔

۳۔ وَحَقَّ عَلَيۡهِمُ الۡقَوۡلُ: آخر میں ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا اٹل فیصلہ آ جاتا ہے جیسے گزشتہ امتوں کے بارے میں اسی قسم کے اٹل فیصلے ہوئے تھے جنہیں کوئی ٹال نہیں سکتا۔ ایسے لوگ زندگی کا سودا ہار جاتے ہیں۔

وَقَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لَا تَسۡمَعُوۡا لِهٰذَا الۡقُرۡاٰنِ وَالۡغَوۡا فِيۡهِ لَعَلَّكُمۡ تَغۡلِبُوۡنَ ﴿۲۶﴾

۲۶۔ اور جو لوگ کافر ہو گئے ہیں وہ کہتے ہیں: اس قرآن کو نہ سنا کرو اور اس میں شور مچا دیا کرو تا کہ تم غالب آ جاؤ۔

---

[1] ۴۳ زخرف: ۳۶

تفسیر آیات

۱۔ وَقَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَا تَسۡمَعُوۡا: قرآن سننے سے لوگوں کو دور رکھنے کا کفار کا یہ حربہ خود اپنی جگہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن ایک معجزہ ہے۔ اس معجزۂ الٰہی کو سننے کے بعد اثر نہ لینا بہت کم لوگوں میں دیکھنے میں آیا ہے۔ کفار قریش ہمیشہ قرآن کی اس معجزانہ تاثیر سے خائف رہتے اور مکہ میں باہر سے آنے والوں کو ہمیشہ خبردار کرتے تھے کہ قرآن مت سنا کرو۔

ان لوگوں نے دوسرا یہ حل ڈھونڈا کہ تلاوت قرآن کے موقع پر شور مچایا کرو تاکہ لوگ قرآن سے متاثر نہ ہوں۔

جب کسی کے پاس دلیل و منطق نہیں ہوتی تو وہ دوسرے کا کلام اور اس کی دلیل سننا گوارا نہیں کرتا۔ کفار مکہ کے پاس قرآن کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی منطقی دلیل نہ تھی اس لیے وہ کوشش کرتے تھے کہ قرآن کو سنا ہی نہ جائے۔

فَلَنُذِیۡقَنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا عَذَابًا شَدِیۡدًا ۙ وَّ لَنَجۡزِیَنَّہُمۡ اَسۡوَاَ الَّذِیۡ کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲۷﴾

۲۷۔ پس ہم کفار کو ضرور بالضرور سخت عذاب چکھائیں گے اور انہیں ان کے برے اعمال کی بدترین سزا ضرور دیں گے۔

ذٰلِکَ جَزَآءُ اَعۡدَآءِ اللّٰہِ النَّارُ ۚ لَہُمۡ فِیۡہَا دَارُ الۡخُلۡدِ ؕ جَزَآءًۢ بِمَا کَانُوۡا بِاٰیٰتِنَا یَجۡحَدُوۡنَ ﴿۲۸﴾

۲۸۔ یہی آتش دشمنان خدا کی سزا ہے اس میں ان کے لیے ہمیشہ کا گھر ہے، یہ اس بات کی سزا ہے کہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتے تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ ایسے کافروں کے لیے عذاب خدا شدید ہوگا۔ ممکن ہے عَذَابًا شَدِیۡدًا دنیوی عذاب کی طرف اشارہ ہو کہ یہ لوگ قتل یا اسیر ہوں گے۔ وہ دن آئے گا اسی صاحب قرآن کی پناہ اپنے لیے غنیمت شمار کریں گے۔

۲۔ وَّ لَنَجۡزِیَنَّہُمۡ اَسۡوَاَ الَّذِیۡ: قیامت کے دن ان کے بدترین اعمال کی سزا دی جائے گی۔ معمولی جرائم کے عذاب کی نوبت نہیں آئے گی کیونکہ اپنے بہت بڑے اور بدترین جرائم کے عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

۳۔ ذٰلِکَ جَزَآءُ اَعۡدَآءِ اللّٰہِ النَّارُ: اللہ تعالیٰ کے ساتھ محاذ آرائی کرنے والے دشمنانِ خدا کی سزا دائمی جہنم کے علاوہ اور کیا ہوسکتی ہے۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ ﴿۲۹﴾

۲۹۔اور کفار کہیں گے: اے ہمارے پروردگار! جنوں اور انسانوں میں سے جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا دونوں کو ہمیں دکھا دے تاکہ ہم انہیں پاؤں تلے روند ڈالیں تاکہ وہ خوار ہوں۔

تفسیر آیات

دنیا میں جن فریب کار شیاطین انس و جن کے دھوکے میں یہ رہے ہیں قیامت کے دن پتہ چلے گا کہ ان راہنماؤں نے انہیں کہاں پہنچایا ہے۔

ہمارے بعض معاصر لوگ (۲۰۰۹ء) اپنے سادہ لوح معتقدین کو خودکش حملوں کے ذریعے بے گناہ مسلمانوں کے ناحق خون میں اپنے ہاتھ رنگین کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ حتیٰ حرمت کے مہینوں کے احترام کے بھی یہ لوگ قائل نہیں ہیں جن کی حرمت کا لحاظ مشرکین بھی کرتے تھے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۰﴾

۳۰۔جو کہتے ہیں: ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر ثابت قدم رہتے ہیں ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں (اور ان سے کہتے ہیں) نہ خوف کرو، نہ غم کرو اور اس جنت کی خوشی مناؤ جس کا تم سے وعدہ کیا تھا۔

تفسیر آیات

۱۔جن لوگوں نے اللہ کو اپنا رب تسلیم کر لینے کے بعد اس پر استقامت دکھائی، ثابت قدم رہے، ان میں انحراف نہیں آیا، ان کے لیے چند ایک خصوصیات حاصل ہوں گی۔

استقامت کیا ہے؟ اس سلسلے میں چند روایات موجود ہیں۔ مروی ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے ایک خطبے میں فرمایا:

وَ قَدْ قُلْتُمْ رَبُّنَا اللّٰهُ فَاسْتَقِيمُوا عَلَى كِتَابِهِ وَ عَلَى مِنْهَاجِ اَمْرِهِ وَ عَلَى الطَّرِيقَةِ الصَّالِحَةِ مِنْ عِبَادَتِهِ ثُمَّ لَا

اب تمہارا قول تو یہ ہے کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے، تو اب اس کی کتاب اور اس کی شریعت کی راہ اور اس کی عبادت کے نیک طریقے پر جمے رہو اور پھر اس

تَمْرُقُوا مِنْهَا وَ لَا تَبْتَدِعُوا فِيهَا وَ لَا تُخَالِفُوا عَنْهَا ...[۱] — سے نکل نہ بھاگو اور نہ اس میں بدعتیں پیدا کرو اور نہ اس کے خلاف چلو۔

دراصل اس آیت میں تادم مرگ ایمان پر قائم رہنے والوں کا ذکر ہے۔

رسول ﷺ کی ایک حدیث میں آیا ہے:

فقد قالها اناس ثم کفر اکثرهم۔ فمن قالها حتی یموت فهو ممن استقام علیها۔[۲] — ربنا اللّٰہ بہت سے لوگوں نے کہا ہے۔ پھر اکثر کافر ہو گئے۔ جو ربنا اللّٰہ تا دم مرگ کہتا رہے گا وہ اس پر استقامت رکھنے والا ہے۔

اللّٰہ کی ربوبیت کا مطلب نفی شرک ہے۔ نفی شرک کا مطلب تکوینی و تشریع میں اللّٰہ کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرنا ہے۔

استقامت کی شرط سے مرتد، بدعتی اور منافق خارج ہو جاتے ہیں اور ساتھ وہ لوگ بھی نکل گئے جنہیں حدیث ما احد ثوا بعدك کے مطابق رسول ﷺ کے بعد انحراف اور تبدیلی لانے والے کہا ہے۔

۲۔ تَتَنَزَّلُ عَلَیۡهِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ: ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ روایات میں آیا ہے کہ یہ فرشتے ایسے لوگوں پر حالت نزع میں نازل ہوں گے اور جنت کی بشارت دیں گے۔ جیسے سورہ نحل آیت ۳۲ میں ہے:

الَّذِیۡنَ تَتَوَفّٰىہُمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ طَیِّبِیۡنَ ۙ یَقُوۡلُوۡنَ سَلٰمٌ عَلَیۡکُمُ ۙ ادۡخُلُوا الۡجَنَّۃَ بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ○ — جن کی روحیں فرشتے پاکیزہ حالت میں قبض کرتے ہیں (اور انہیں) کہتے ہیں: تم پر سلام ہو! اپنے (نیک) اعمال کی جزا میں جنت میں داخل ہو جاؤ۔

چنانچہ مروی ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے حارث ہمدانی سے فرمایا:

یا حار همدان من یمت یرنی من مؤمن او منافق قبلا۔[۳] — اے حارث ہمدانی! جو بھی مرنے والا ہے وہ مجھے دیکھتا ہے، خواہ وہ مؤمن رہ چکا ہو یا کافر۔

نَحۡنُ اَوۡلِیٰٓؤُکُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ فِی الۡاٰخِرَۃِ ۚ وَ لَکُمۡ فِیۡہَا مَا تَشۡتَہِیۡۤ اَنۡفُسُکُمۡ وَ لَکُمۡ فِیۡہَا مَا تَدَّعُوۡنَ ﴿ؕ۳۱﴾

۳۱۔ ہم دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق تھے اور آخرت میں بھی (تمہارے ساتھی ہیں) اور یہاں تمہارے لیے تمہاری من پسند چیزیں موجود ہیں اور جو چیز تم طلب کرو گے وہ تمہارے لیے اس میں موجود ہو گی۔

---

[۱] نہج البلاغۃ خ ۱۷۶ [۲] تفسیر نور الثقلین ۴: ۵۴۷ [۳] بحار ۶: ۱۸۱

تفسیر آیات

۱۔ نَحۡنُ اَوۡلِیٰٓؤُکُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا: فرشتے ان مومنین سے کہیں گے: ہم دنیا میں بھی تمہارے اولیاء تھے۔ اولیاء کا لفظ قرناء کے مقابلے میں استعمال ہوا ہے۔ جن کا کافروں پر تسلط قائم تھا انہیں قرناء ہم نشین کہا ہے۔ انہوں نے کافروں پر اپنا تسلط جما لیا تھا۔

فَزَیَّنُوۡا لَہُمۡ ان شیاطین نے ان کی سوچ میں تبدیلی پیدا کر کے ان میں اچھے برے کے پیمانے بدل دیے اور برے جرائم انہیں اچھے لگنے لگے تھے۔

جب کہ فرشتے اولیاء بن کر اہل ایمان کو راہ راست پر رہنے میں مدد دے رہے تھے اور ہر قسم کے انحراف سے بچا رہے تھے۔ جس طرح کافروں پر قرناء اپنا تسلط جما کر اپنا کام کر رہے تھے اسی طرح اولیاء اپنی ولایت قائم کر کے مومنین کو حق پر قائم رہنے میں مدد دے رہے تھے۔ جیسے فرمایا:

لَہٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنۡۢ بَیۡنِ یَدَیۡہِ وَ مِنۡ خَلۡفِہٖ یَحۡفَظُوۡنَہٗ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰہِ ...[1] ہر شخص کے آگے اور پیچھے یکے بعد دیگرے آنے والے پہرے دار (فرشتے) مقرر ہیں جو بحکم خدا اس کی حفاظت کرتے ہیں۔

۲۔ وَ فِی الۡاٰخِرَۃِ: جن فرشتوں نے دنیا میں اپنی ولایت قائم رکھی تھی وہ آخرت میں ان کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ آخرت کی مشکلات کو آسان بنانے کے لیے ان کی مدد کر رہے ہوں گے اور جنت میں داخل ہونے تک ان کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔

۳۔ وَ لَکُمۡ فِیۡہَا مَا تَشۡتَہِیۡۤ اَنۡفُسُکُمۡ: یہ فرشتے مومنین کو یہ بشارت دے رہے ہوں گے کہ تمہارے لیے جنت میں ہر وہ چیز میسر ہوگی جس کی تم خواہش کرو گے۔

۴۔ وَ لَکُمۡ فِیۡہَا مَا تَدَّعُوۡنَ: جس چیز کو طلب کرو اسے اس جنت میں موجود پاؤ گے۔ یعنی جنت میں تمہارے ارادے نافذ ہوں گے۔ واضح رہے مَا تَشۡتَہِیۡۤ سے مَا تَدَّعُوۡنَ کا دائرہ وسیع ہو گا چونکہ تَشۡتَہِیۡۤ "خواہش" میں وہ چیزیں آتی ہیں جو محسوسات کے دائرے میں ہیں جب کہ مَا تَدَّعُوۡنَ "جو طلب کرو" میں وہ چیزیں بھی آ جاتی ہیں جنہیں ذہن و خیال نے تصور کیا ہے۔

اس جملے کی مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ یٰسٓ آیت ۵۷۔

ع ۱۸ نُزُلًا مِّنۡ غَفُوۡرٍ رَّحِیۡمٍ ﴿۳۲﴾ ۳۲۔ اس ذات کی طرف سے ضیافت کے طور پر جو بڑا بخشنے والا رحیم ہے۔

---

[1] ۱۳ رعد: ۱۱

تفسیر آیات

ان تمام نعمتوں سے بالاتر نعمت، یہ تاثر ہے کہ رب غفور و رحیم کے جوار سے ضیافت مل رہی ہے۔ یہ اللہ کی مہمانی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعزاز و اکرام ہے۔ وَرِضۡوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکۡبَرُ ....[1] اللہ کی خوشنودی ہر نعمت سے بڑی ہے۔ اس اکرام و اعزاز سے جو کیف و سرور ملے گا وہ انسانی تصور و خیال سے بالا ہے۔

وَمَنۡ اَحۡسَنُ قَوۡلًا مِّمَّنۡ دَعَاۤ اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ﴿۳۳﴾

۳۳۔ اور اس شخص کی بات سے زیادہ کس کی بات اچھی ہو سکتی ہے جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا: میں مسلمانوں میں سے ہوں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمَنۡ اَحۡسَنُ قَوۡلًا: اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو گویائی کی قوت عنایت فرمائی ہے اس کا سب سے بہترین مصرف دعوت الی اللّٰہ میں صرف ہونے والا قول ہے۔ اس آیت و دیگر احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ افضل ترین عبادت دعوت الی اللّٰہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ جب حضرت علی علیہ السلام کو کی طرف تبلیغ کے لیے روانہ کر رہے تھے اس موقع پر فرمایا:

وَ ایۡمُ اللّٰہِ لَاَنۡ یَھۡدِیَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ عَلَی یَدَیۡکَ رَجُلًا خَیۡرٌ لَکَ مِمَّا طَلَعَتۡ عَلَیۡہِ الشَّمۡسُ ....[2]

قسم بخدا! یہ بات کہ اللہ تیرے ہاتھ ایک آدمی کو بھی ہدایت دے دے، ہر اس چیز سے بہتر ہے جس پر سورج طلوع کرتا ہے۔

دعوت الی اللّٰہ کے بھی مدارج ہیں۔ حضرت ختم المرسل ﷺ سب سے اعلیٰ و ارفع درجے پر فائز ہیں۔ پورے کرۂ ارض پر آپ ہی کی دعوت ابھی تک تیزی سے پھیل رہی ہے۔ آپؐ کے بعد آپؐ کے جانشین ائمہ ہدیٰ علیہم السلام ان کے بعد وہ علماء جو امر بمعروف اور نہی از منکر کرتے ہیں۔ اس آخری درجے کا کیا درجہ ہے؟ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

وَ مَا اَعۡمَالُ الۡبِرِّ کُلُّھَا وَ الۡجِھَادُ فِی

امر بمعروف اور نہی از منکر کے مقابلے میں تمام نیک

---

[1] ۹ توبۃ: ۷۲ [2] الکافی ۵: ۲۸

سَبِیْلِ اللّٰہِ عِنْدَ الْاَمْرِ بِالْمَعْرُوفِ وَ النَّھْیِ عَنِ الْمُنْکَرِ اِلَّا کَنَفْثَۃٍ فِی بَحْرٍ لُجِّیٍ۔۔۔۔[1]

اعمال اور جہاد فی سبیل اللہ کی حیثیت ٹھاٹھیں مارتے سمندر کے مقابلے میں ایک چھوٹے قطرے کی سی ہے۔

۲۔ دَعَاۤ اِلَی اللّٰہِ: اللہ کی عبادت کی طرف بلانے والا یہ داعی خود عابد بھی ہو۔ دعوت بلا عمل خود ایک انحراف ہے:

کَبُرَ مَقۡتًا عِنۡدَ اللّٰہِ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا مَا لَا تَفۡعَلُوۡنَ ۝ [2]

اللہ کے نزدیک یہ بات سخت ناپسندیدہ ہے کہ تم وہ بات کہو جو کرتے نہیں ہو۔

لہٰذا اللہ کی طرف دعوت دینے والے کو قولاً و عملاً داعی ہونا چاہیے ورنہ صرف زبان ہلانے سے داعی نہیں بنتا۔ اس کے ایمان پر عمل کے علاوہ کوئی شاہد نہیں۔

۳۔ وَّ قَالَ اِنَّنِیۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ: اپنے کو تسلیم و رضا کی منزل پر فائز کرے یا مسلمانوں کی جماعت میں شمولیت کا اعلان کرے، ورنہ خود تسلیم و رضا کی منزل پر نہ ہو تو اس کی دعوت اپنے عمل سے متصادم ہو گی نیز انسان ایمان کی منزل پر ہو تو اس کے عمل کی قیمت بن جاتی ہے اور عمل سے اس کے ایمان کو ثبوت مل جاتا ہے۔ ان دونوں عناصر کی ترکیب کے بغیر انسان مؤمن نہیں بنتا۔

وَ لَا تَسۡتَوِی الۡحَسَنَۃُ وَ لَا السَّیِّئَۃُ ؕ اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ فَاِذَا الَّذِیۡ بَیۡنَکَ وَ بَیۡنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیۡمٌ ﴿۳۴﴾

۳۴۔ اور نیکی اور بدی برابر نہیں ہو سکتے، آپ (بدی کو) بہترین نیکی سے دفع کریں تو آپ دیکھ لیں گے کہ آپ کے ساتھ جس کی عداوت تھی وہ گویا نہایت قریبی دوست بن گیا ہے۔

تفسیر آیات

سابقہ آیت میں دعوت الی اللہ کو بہترین گفتار قرار دینے کے بعد اس دعوت کو مؤثر بنانے کے لیے بہترین ذریعے کی نشاندہی فرمائی اور وہ یہ ہے: برائی کو نیکی سے دفع کرنا۔ جہالت کو علم اور بردباری، بد اخلاقی کو حسن اخلاق، گستاخی کو عفو درگزر سے، غرض بدسلوکی کو احسان سے دفع کرنا چاہیے۔

ہر انسان اپنی فطرت سے یہ سمجھ سکتا ہے کہ نیکی اور بدی یکساں نہیں، ان کے اثرات بھی یکساں نہیں ہوتے۔ نیکی کا اولین اثر یہ ہو گا کہ تمہارا جانی دشمن جگری دوست بن جائے گا کیونکہ اخلاق کی مار نہایت کارگر ثابت ہوتی ہے۔ آپ کا دشمن اگر ابتدا میں آپ کے موقف کے ساتھ عناد رکھتا ہے تاہم وہ بھی انسان

---

[1] وسائل الشیعۃ ۱۶: ۱۳۴ [2] ۶۱ صف: ۳

ہے اس کا ضمیر اگر مردہ ہے تو آپ کا اخلاق اس میں روح پھونک سکتا ہے۔ اس نے اگر آپ کے مذہب کے بارے میں غلیظ الفاظ استعمال کیے ہیں تو آپ کا مہذب اور احترام آدمیت پر مبنی ردعمل اس غلاظت میں پھول اُگا سکتا ہے۔

چنانچہ رسول ﷺ اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی سیرت میں اس بات کے بہت سے شواہد ملتے ہیں۔ البتہ بعض انسان نما درندہ صفت لوگ بھی ہوتے ہیں جن کے دل کسی بھی اخلاق حسنہ سے اثر پذیر نہیں ہوتے۔ چنانچہ فتح مکہ کے موقع پر عمر بھر اسلام سے لڑنے والوں پر رسول کریم ﷺ کا خلق عظیم کارگر ثابت نہیں ہوا حالانکہ انہیں توقع سے بہت زیادہ مراعات دی گئیں۔

وَ مَا یُلَقّٰهَاۤ اِلَّا الَّذِیۡنَ صَبَرُوۡا ۚ وَ مَا یُلَقّٰهَاۤ اِلَّا ذُوۡ حَظٍّ عَظِیۡمٍ ﴿۳۵﴾

۳۵۔ اور یہ (خصلت) صرف صبر کرنے والوں کو ملتی ہے اور یہ صفت صرف انہیں ملتی ہے جو بڑے نصیب والے ہیں۔

تفسیر آیات

برائی کے مقابلے میں احسان کرنا ہر شخص کے بس کا روگ نہیں ہے۔ یہ کام وہ شخص کر سکتا ہے جسے اپنے نفس پر پورا کنٹرول ہو اور جو صبر و حوصلے کے اعلیٰ مقام پر فائز ہو۔ کمال انسانی میں بڑے نصیب والے ہی ایسا کر سکتے ہیں۔

وَ اِمَّا یَنۡزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۳۶﴾

۳۶۔ اور اگر آپ شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ محسوس کریں تو اللہ کی پناہ مانگیں وہ یقیناً خوب سننے والا، جاننے والا ہے۔

تشریح کلمات

نزغ: (ن ز غ) بغرض فساد مداخلت کرنا۔

تفسیر آیات

کوئی کمینگی کا مظاہرہ کرے تو اس صورت میں مدمقابل کو اُکسانے کا شیطان کو ایک سنہرا موقع ملتا ہے۔ چنانچہ شیطان کہتا ہے: اس کمینے کو سبق سکھانا چاہیے اور اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہیے وغیرہ۔ یہاں اگر ایسا جذباتی ہیجان آ جائے تو اللہ کی پناہ ڈھونڈنی چاہیے۔ وہی انسان کو شیطان کی اشتعال انگیزی

سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

اس آیت میں اگرچہ خطاب رسول اللہ ﷺ سے ہے لیکن سمجھانا دوسروں کو مقصود ہے جیسا کہ ائمہ علیہم السلام کی احادیث میں آیا ہے کہ قرآنی خطابات ایاك اعنی فاسمعی یا جارہ: سر دلبراں در حدیث دیگراں کی طرز پر ہوتے ہیں۔

وَ مِنْ اٰیٰتِہِ الَّیْلُ وَ النَّہَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ؕ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَہُنَّ اِنْ کُنْتُمْ اِیَّاہُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۳۷﴾ السجدۃ الواجبۃ

۳۷۔ اور رات اور دن اور سورج اور چاند اس کی نشانیوں میں سے ہیں، تم نہ تو سورج کو سجدہ کرو اور نہ ہی چاند کو بلکہ اللہ کو سجدہ کرو جس نے ان سب کو پیدا کیا ہے، اگر تم صرف اللہ کی بندگی کرتے ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمِنْ اٰیٰتِہِ الَّیْلُ وَ النَّہَارُ: اللہ تعالیٰ کے رب، مدبر اور لائق عبادت ہونے کی آیات میں سے رات اور دن ہیں۔ ان دونوں کی گردش سے روئے زمین حیات کے لیے آمادہ ہوئی:

یُکَوِّرُ الَّیۡلَ عَلَی النَّہَارِ وَ یُکَوِّرُ النَّہَارَ عَلَی الَّیۡلِ ...[1]

اور وہی رات کو دن پر لپیٹتا ہے اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے۔

بلکہ صرف دن یا صرف رات ہوتی تو اس کرۂ ارض پر زندگی کا نام ونشان نہ ہوتا۔

۲۔ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ: سورج بھی اللہ تعالیٰ کے واحد معبود ہونے کی آیت ہے چونکہ سورج سرچشمۂ حیات ہے۔ دوسری آیات میں فرمایا کہ اللہ نے سورج کو تمہارے لیے مسخر کیا ہے یعنی تمہارے مفاد میں کر دیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے اللہ ہی کے ہاتھ میں تدبیر کائنات ہے لہٰذا اللہ ہی رب ہے پس اللہ ہی کی بندگی ہونی چاہیے۔

۳۔ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ: اگرچہ عربوں میں ستارہ پرستی نہیں تھی تاہم عربوں کے قرب و جوار میں شرک کی ایک صورت ستارہ پرستی بھی تھی۔ لہٰذا اذہان کو ہر قسم کے شرک سے دور رکھنے کے لیے فرمایا: سورج چاند کے لیے سجدہ نہ کرو بلکہ سجدہ اس ذات کے لیے کرو جو لائق سجدہ ہے۔

۴۔ وَاسْجُدُوْا لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَہُنَّ: سجدہ خالق کے لیے ہوتا ہے۔ لہٰذا تم صرف شمس و قمر کے

---

[1] ۳۹ زمر: ۵

خالق کے لیے سجدہ کرو۔

قرآن مجید کی متعدد آیات سے استدلال کرتے ہوئے ہم نے عبادت کی یہ تعریف اختیار کی ہے:

عبادت یہ ہے کہ کسی ذات کو خالق اور رب سمجھ کر اس کی تعظیم کی جائے۔

۵۔ اِنۡ کُنۡتُمۡ اِیَّاہُ تَعۡبُدُوۡنَ: کہتے ہیں ستارہ پرستوں کا دعویٰ یہ تھا کہ سورج کی پوجا کرنے کا مقصد اللہ کی عبادت کرنا ہے۔ سورج صرف واسطہ ہے۔ اس عقیدے کو باطل قرار دیتے ہوئے فرمایا:

> اگر تم واقعی اللہ ہی عبادت کرتے ہو تو سورج کے واسطہ کے بغیر براہ راست اللہ کی عبادت کرو۔ کسی غیر اللہ کی شرکت کے ساتھ اللہ کی عبادت نہیں ہوتی۔

واضح رہے اس آیت کا آخری جملہ اِنۡ کُنۡتُمۡ اِیَّاہُ تَعۡبُدُوۡنَ واجب سجدے کی جگہ ہے۔ ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی روایات کے مطابق یہی سجدے کی جگہ ہے جب کہ فقہ حنفی کے مطابق اگلی آیت وَ ہُمۡ لَا یَسۡـَٔمُوۡنَ سجدے کی جگہ ہے۔

فَاِنِ اسۡتَکۡبَرُوۡا فَالَّذِیۡنَ عِنۡدَ رَبِّکَ یُسَبِّحُوۡنَ لَہٗ بِالَّیۡلِ وَ النَّہَارِ وَ ہُمۡ لَا یَسۡـَٔمُوۡنَ ﴿۳۸﴾	۳۸۔ پس اگر یہ لوگ تکبر کرتے ہیں تو جو (فرشتے) آپ کے پروردگار کے پاس ہیں وہ رات اور دن اسی کی تسبیح کرتے ہیں اور تھکتے نہیں ہیں۔

تفسیر آیات

اگر یہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات ماننے اور اطاعت کرنے سے اپنے آپ کو بالاتر سمجھتے ہیں اور اللہ کی عبادت نہیں کرتے تو اللہ کو ان کی عبادت کی ضرورت نہیں ہے۔ عبادت گزاروں کو عبادت کی ضرورت ہے۔ اسی لیے جو فرشتے اللہ کے ہاں ہیں وہ ہمیشہ عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔

۲۔ وَ ہُمۡ لَا یَسۡـَٔمُوۡنَ: وہ عبادت سے تھکتے نہیں ہیں چونکہ عبادت کی حقیقی لذت چکھنے والوں کے لیے اس میں وقفہ دینا تھکن کا باعث ہوتا ہے۔ عبادت میں سکون اور زندگی کی لذت لیتے ہیں۔

وَ مِنۡ اٰیٰتِہٖۤ اَنَّکَ تَرَی الۡاَرۡضَ خَاشِعَۃً فَاِذَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡہَا الۡمَآءَ اہۡتَزَّتۡ وَ رَبَتۡ ؕ اِنَّ الَّذِیۡۤ اَحۡیَاہَا لَمُحۡیِ الۡمَوۡتٰی ؕ اِنَّہٗ عَلٰی	۳۹۔ اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ آپ زمین کو جمود کی حالت میں دیکھتے ہیں اور جب ہم اس پر پانی برسائیں تو وہ یکایک جنبش میں آتی ہے اور پھلنے پھولنے لگتی ہے، تو جس

كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۳۹﴾ — نے زمین کو زندہ کیا وہی یقیناً مردوں کو زندہ کرنے والا ہے، وہ یقیناً ہر چیز پر قادر ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ: اللہ تعالیٰ ہی کے رب اور مدبر و معبود ہونے پر دلالت کرنے والی آیات اور دلائل میں ایک دلیل، پانی کے ذریعے زمین کی زرخیزی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مٹی اور پانی کی تخلیق میں ایسی تدبیر ودیعت فرمائی کہ پانی جب مٹی پر پڑتا ہے تو نہ صرف ان دونوں میں کوئی تنافر، تنافی اور تضاد نہیں ہے بلکہ پانی پڑنے پر مٹی خوشی کا رقص کرتی ہے اهْتَزَّتْ اور اپنی فیاضی شروع کر دیتی ہے۔

۲۔ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً: آپ زمین کو خشوع و سکون اور آرام کی حالت میں دیکھتے ہیں۔ اس میں بذات خود کوئی جنبش، حرکت اور فعالیت و فیاضی نہیں ہے۔

۳۔ فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ: جب مٹی پر پانی پڑتا ہے تو اس کا سکوت و جمود ٹوٹ جاتا اور یہ جنبش میں آ جاتی ہے۔ یہ جنبش زندگی کی علامت ہے۔ اس خاک کا از خود نہیں، پانی کے ساتھ مل کر زندگی کے آثار ظاہر کرنا، اس ذات کی قدرت کی نشانی ہے جس نے ان دونوں کو جوڑا، نباتی حیات پیدا کی وَرَبَتْ اور نمو پیدا ہوا۔ لہلہاتے کھیت، رنگ برنگ کے پھول اور درخت بڑھنے لگے۔ قدرت کا ایک حسین کرشمہ یہ ہے کہ پھل دینے والے درخت عموماً پہلے پھول، پھر پھل دیتے ہیں۔ پھول دے کر جمالیاتی بھوک کو دور کرتا، انسان میں مسرت و سرور لاتا اور مکدر طبیعتوں کو بہلاتا ہے۔ پھر دسترخوان بچھتا ہے اور مختلف لذتوں کے پھل دیتے ہیں۔

۴۔ اِنَّ الَّذِيْٓ اَحْيَاهَا لَمُحْيِ الْمَوْتٰى: جس نے اس خاموش زمین میں پانی کے ذریعے جنبش پیدا کی اور اس مردہ زمین کو زندہ کیا وہ مردہ انسانوں کو بھی زندہ کر سکتا ہے۔ مردوں کو زندہ کرنے کے عمل کا انسان روز مشاہدہ کرتا ہے لیکن اسے روز کا معمول سمجھ کر اس پر توجہ نہیں دیتا، نہ اس میں غور و فکر کرتا ہے ورنہ یہ ایک عجیب معجزہ ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا ۭ اَفَمَنْ يُّلْقٰى فِي النَّارِ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ يَّاْتِيْٓ اٰمِنًا يَّوْمَ

۴۰۔ جو لوگ ہماری آیات میں ہیرا پھیری کرتے ہیں وہ ہم سے پوشیدہ نہیں ہیں کیا وہ شخص جو جہنم میں ڈالا جائے بہتر ہے یا وہ جو قیامت کے دن امن کے ساتھ حاضر ہوگا؟ تم جو چاہو

الْقِيٰمَةِ ۭ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۙ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۴۰ | کرتے رہو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے یقیناً خوب دیکھنے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی ان آیات کا انکار کرتے ہیں جو روز ان کے مشاہدے میں آتی ہیں، وہ آیات قرآنی کے بھی منکر ہوتے ہیں جو انہیں سنائی جاتی ہیں۔ پھر وہ آیات تکوینی کے منکر ہونے کے ساتھ آیات قرآنی کو رسول اللہ ﷺ کی خود ساختہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے یہ جرائم اللہ سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

۲۔ اَفَمَنْ يُّلْقٰى فِي النَّارِ: پھر سوالیہ انداز میں ان دو گروہوں کا انجام بتایا۔ ایک گروہ، جو آیات الٰہی کا انکار کرتا ہے اسے آتش جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔

۳۔ اَمْ مَّنْ يَّاْتِيْٓ اٰمِنًا: اور دوسرا گروہ امن و سلامتی میں ہو گا۔ اس سے اشارہ ملتا ہے اہل ایمان، خاص کر استقامت دکھانے والے قیامت کے دن امن و سلامتی میں ہوں گے۔

۴۔ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ: تم جو چاہو کرو۔ یہ اس صورت کا بیان ہے جس میں اللہ تعالیٰ بندے کو اس کے حال پر چھوڑ دیتا ہے اور جسے اللہ اس کے حال پر چھوڑ دے اس سے زیادہ بدنصیب کوئی نہیں ہے۔

۵۔ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ: یہ انتہائی صورت کی بے نصیبی کی خبر ہے۔ یہ کہنا تم جو چاہو کرو، تمہارے جرائم ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔

فضیلت: ابن عباس راوی ہیں۔ اس آیت میں اَفَمَنْ يُّلْقٰى فِي النَّارِ سے ولید بن مغیرہ مراد لیا گیا ہے اور اَمْ مَّنْ يَّاْتِيْٓ اٰمِنًا يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ سے علی بن ابی طالب علیہم السلام مراد ہیں۔[1]

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَاۗءَهُمْ ۚ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۝۴۱ | ۴۱۔ جو لوگ اس ذکر کا انکار کرتے ہیں جب وہ ان کے پاس آجائے، حالانکہ یہ معزز کتاب ہے۔

لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ۝۴۲ | ۴۲۔ باطل نہ اس کے سامنے سے آ سکتا ہے اور نہ پیچھے سے، یہ حکمت والے اور لائق ستائش کی نازل کردہ ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قرآن مجید ایک دو موضوعات پر مشتمل کتاب نہیں ہے، بلکہ یہ حقائق کا بحر بیکراں ہے۔ اس میں

[1] شواھد التنزیل ذیل آیت

اخلاق، عقائد، احکام، قانون، تہذیب و تمدن، معاشرت، معیشت اور سیاست سے متعلق حقائق کا بیان ہے، کسی باطل قوت کے لیے ممکن نہیں کہ وہ ان حقائق میں سے کسی ایک حقیقت کو غلط ثابت کرے، خواہ قرآن پر اس کا یہ حملہ براہ راست ہو یا کسی سازش یا مکر و حیلہ کے ذریعے سے۔

۲۔ لَّا یَاۡتِیۡہِ الۡبَاطِلُ: یہ قرآن انسانیت کے لیے ایک دستور حیات اور اسلام کی حقانیت کا ایک معجزہ ہے۔ ممکن نہیں اس معجزے کو کوئی باطل قوت بے اثر بنا دے اور اس کے معجزاتی حیثیت کو ختم کر دے۔ تاریخ انبیاء علیہم السلام میں کسی معجزے کو کوئی طاقت گزند نہیں پہنچا سکی خواہ وہ فرعون و نمرود جیسے بڑے طاغوت کیوں نہ ہوں۔

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کے سردار خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عظیم معجزہ قرآن ہر قسم کی تحریف سے یقیناً محفوظ رہا ہے اور رہے گا۔ جب دیگر انبیاء علیہم السلام کے وقتی معجزے محفوظ اور غالب رہے ہیں تو ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ابدی معجزہ کسی تحریف کنندہ کی زد میں کیسے آ سکتا ہے؟

۳۔ مِنۡۢ بَیۡنِ یَدَیۡہِ وَ لَا مِنۡ خَلۡفِہٖ: باطل، قرآن کا توڑ نہ پچھلی کتابوں سے پیش کر سکتا ہے، نہ آئندہ کوئی ایسی کتاب پیش کر سکتا ہے جو اس قرآن کا توڑ ہو۔ روایت میں آیا ہے:

لیس فی اخبارہ عما مضی باطل و لا فی اخبارہ فیما یکون فی المستقبل باطل بل اخبارہ کلھا موافقۃ لمخبراتھا...[1]	قرآن نے ماضی کے بارے میں جو خبریں دی ہیں نہ وہ باطل ہیں، نہ آئندہ مستقبل کے بارے میں جو خبریں دی ہیں وہ باطل ہیں بلکہ اس کی تمام خبریں واقع کے مطابق ہیں۔

مَا یُقَالُ لَکَ اِلَّا مَا قَدۡ قِیۡلَ لِلرُّسُلِ مِنۡ قَبۡلِکَ ؕ اِنَّ رَبَّکَ لَذُوۡ مَغۡفِرَۃٍ وَّ ذُوۡ عِقَابٍ اَلِیۡمٍ ﴿۴۳﴾	۴۳۔ آپ سے وہی کچھ کہا جا رہا ہے جو آپ سے پہلے رسولوں سے کہا گیا ہے، آپ کا رب یقیناً مغفرت والا اور دردناک عذاب دینے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ یہ کفار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں جو گستاخیاں کر رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مجنون، شاعر، جادوگر اور کاہن کہہ رہے ہیں، یہ عیناً وہی الزامات ہیں جو آپؐ سے پہلے مرسلین علیہم السلام پر لگائے گئے ہیں۔ چونکہ شرک کی سوچ ایک ہے اور انبیاء علیہم السلام کا پیغام بھی ایک ہے۔ لہٰذا انبیاء علیہم السلام کے خلاف بہتان کی نوعیت بھی ایک ہے۔

یہاں ایک حدیث میں منقول ہے:

---

[1] مجمع البیان

ما اوذی نبی مثل ما اوذیت۔[1]　کسی نبی کو اتنی اذیت نہیں دی گئی جتنی مجھے دی گئی ہے۔

۲۔ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوۡ مَغۡفِرَۃٍ: آپ کے پروردگار کا حلم ہے کہ انہیں مہلت دی ہے۔ البتہ قیامت کے دن اللہ اپنی قہاریت سے بھی کام لینے والا ہے۔

وَ لَوۡ جَعَلۡنٰہُ قُرۡاٰنًا اَعۡجَمِیًّا لَّقَالُوۡا لَوۡ لَا فُصِّلَتۡ اٰیٰتُہٗ ؕ ءَ اَعۡجَمِیٌّ وَّ عَرَبِیٌّ ؕ قُلۡ ہُوَ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ہُدًی وَّ شِفَآءٌ ؕ وَ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ فِیۡۤ اٰذَانِہِمۡ وَقۡرٌ وَّ ہُوَ عَلَیۡہِمۡ عَمًی ؕ اُولٰٓئِکَ یُنَادَوۡنَ مِنۡ مَّکَانٍۭ بَعِیۡدٍ ﴿۴۴﴾

فی حفص بتسهیل الهمزة الثانیة ۱۲

۴۴۔ اور اگر ہم اس قرآن کو عجمی زبان میں قرار دیتے تو یہ لوگ کہتے کہ اس کی آیات کو کھول کر بیان کیوں نہیں کیا گیا؟ (کتاب) عجمی اور (نبی) عربی؟ کہد یجیے: یہ کتاب ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور شفا ہے اور جو ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں بھاری پن (بہرا پن) ہے اور وہ ان کے لیے اندھا پن ہے، وہ ایسے ہیں جیسے انہیں دور سے پکارا جاتا ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ کبھی مشرکین کی طرف سے یہ سوال بھی آیا تھا کہ اس قرآن کو کسی اور زبان میں کیوں نہیں اتارا گیا؟ صرف عربی میں نازل کرنے کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا:

> اگر یہ قرآن غیر عربی زبان میں اتارتا تو تم نے ضرور کہنا تھا کہ مرسل الیہ عربی اور اس نبی کی قوم بھی عربی ہے، اسے پیغام کسی عجمی زبان میں کیوں مل رہا ہے؟ ایک غیر مفہوم زبان میں ہم سے بات کرنے کا کیا مقصد ہے؟
>
> قرآن نے دیگر مقامات پر فرمایا ہے:

فَاِنَّمَا یَسَّرۡنٰہُ بِلِسَانِکَ ....[2]　(اے رسول!) پس ہم نے یہ قرآن آپ کی زبان میں یقیناً آسان کیا ہے۔

وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِہٖ ....[3]　ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی قوم کی زبان میں۔

تا کہ وہ انہیں وضاحت سے بات سمجھا سکے۔

۲۔ قُلۡ ہُوَ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا: یہ قرآن اہل ایمان کے لیے مینار ہدایت اور ان میں موجود کفر و شرک اور ہر قسم کی قلبی بیماری کے لیے شفا ہے۔

---

[1] بحار الانوار ۳۹/۵۵　[2] ۱۹ مریم: ۹۷　[3] ۱۴ ابراھیم: ۴

۳۔ وَ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ: اور ایمان کی روشنی سے محروم لوگوں کے لیے یہ قرآن موثر نہیں ہے تو اس کی وجہ ان میں اہلیت نہ ہونا ہے۔ نہ ان میں کچھ سننے کی صلاحیت ہے، نہ کچھ دیکھنے کی۔

۴۔ اُولٰٓئِکَ یُنَادَوۡنَ مِنۡ مَّکَانٍۭ بَعِیۡدٍ: قرآن ان کے لیے دور سے آنے والی آواز کی طرح ہے۔ جہاں آواز آ رہی ہوتی ہے مگر سمجھ میں نہیں آتی۔

وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ فَاخۡتُلِفَ فِیۡہِ ؕ وَ لَوۡ لَا کَلِمَۃٌ سَبَقَتۡ مِنۡ رَّبِّکَ لَقُضِیَ بَیۡنَہُمۡ ؕ وَ اِنَّہُمۡ لَفِیۡ شَکٍّ مِّنۡہُ مُرِیۡبٍ ﴿۴۵﴾

۴۵۔ اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تو اس میں بھی اختلاف کیا گیا اور اگر آپ کے رب کی بات پہلے طے نہ ہوئی ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ ہو چکا ہوتا اور وہ اس (قرآن) کے بارے میں شبہ پیدا کرنے والے شک میں پڑے ہوئے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ: رسول کریم ﷺ کے لیے ایک تسلی کے طور پر فرمایا: جو کتاب آپ کی طرف نازل کی گئی ہے صرف اس میں نہیں، موسیٰ کی طرف جو کتاب نازل کی گئی اس میں بھی لوگوں نے اختلاف کیا۔ کچھ لوگوں نے اسے مان لیا، کچھ لوگوں نے تکذیب کی۔

۲۔ وَ لَوۡ لَا کَلِمَۃٌ سَبَقَتۡ مِنۡ رَّبِّکَ: اگر تکذیبی عناصر اور مجرمین کو مہلت دینے کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اٹل فیصلہ نہ ہوتا تو آپ کی قوم کے بارے میں بھی آخری فیصلہ یعنی ہلاکت کا فیصلہ صادر ہو چکا ہوتا لیکن ہم نے موسیٰ کی تکذیب کرنے والوں کو بھی مہلت دی ہے۔ آپ کی قوم کو بھی مہلت مل جائے گی لیکن تباہی سے بچنے والے نہیں ہیں۔

۳۔ وَ اِنَّہُمۡ لَفِیۡ شَکٍّ مِّنۡہُ مُرِیۡبٍ: آپ کی قوم قرآن کے بارے میں ایسے شک میں مبتلا ہے جو شبہ پیدا کرنے والا ہے۔

واضح رہے شک اس صورت میں پیدا ہوتا جب مثبت اور منفی دونوں اطراف برابر ہوں۔ ریب اسے کہتے ہیں جس میں منفی کی طرف رجحان زیادہ ہوتا ہے۔

مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفۡسِہٖ وَ مَنۡ اَسَآءَ فَعَلَیۡہَا ؕ وَ مَا رَبُّکَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِیۡدِ ﴿۴۶﴾

۴۶۔ جو نیک عمل کرتا ہے وہ اپنے لیے ہی کرتا ہے اور جو برا کام کرتا ہے خود اپنے ہی خلاف کرتا ہے اور آپ کا پروردگار تو بندوں پر قطعاً ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفۡسِہٖ: عمل صالح کی دعوت دینے والا، انسانوں کی نجات کے لیے دعوت دے رہا ہے۔ داعی کو اس بات سے غرض ہے کہ یہ انسان ہلاکت میں نہ جائے۔ اس سے کوئی مفاد وابستہ نہیں ہے۔ جو مفاد ہے، خود اس عمل صالح بجا لانے کے لیے ہے۔

۲۔ وَ مَنۡ اَسَآءَ فَعَلَیۡہَا: جو برے کاموں کا ارتکاب کرتا ہے اس کا اثر اس برے کام کے ترک کرنے کی دعوت دینے والے پر نہیں پڑتا۔ خود ہلاکت ابدی سے دوچار ہو جاتا ہے۔

۳۔ وَ مَا رَبُّکَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِیۡدِ: آپ کا رب اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ لہٰذا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کسی مومن کو اس کے اچھے عمل کا ثواب نہ دے اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ کسی نے جرم کا ارتکاب نہیں کیا ہے، اسے عذاب دے۔

یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ کسی نے جرم کا ارتکاب از خود نہیں کیا، کسی نے مجبور کیا ہے، اسے بھی عذاب دے:

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَہَا ...۔[1]		اللہ کسی شخص پر اس کی طاقت سے زیادہ ذمے داری نہیں ڈالتا۔

جسے کسی اور نے جرم کے ارتکاب پر مجبور کیا ہو اسے اللہ عذاب نہیں دیتا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ خود جرم کے ارتکاب پر مجبور کرے۔

واضح رہے ظلام مبالغے کے لیے نہیں ہے کہ کہا جائے کہ اللہ بہت زیادہ ظلم کرنے والا نہیں، تھوڑا ظلم ہو سکتا ہے بلکہ یہ نسبت کے لیے ہے یعنی اللہ کی طرف ظلم کی نسبت نہیں ہو سکتی۔

الجزء ۲۵ اِلَیۡہِ یُرَدُّ عِلۡمُ السَّاعَۃِ ؕ وَ مَا تَخۡرُجُ مِنۡ ثَمَرٰتٍ مِّنۡ اَکۡمَامِہَا وَ مَا تَحۡمِلُ مِنۡ اُنۡثٰی وَ لَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلۡمِہٖ ؕ وَ یَوۡمَ یُنَادِیۡہِمۡ اَیۡنَ شُرَکَآءِیۡ ۙ قَالُوۡۤا اٰذَنّٰکَ ۙ مَا مِنَّا مِنۡ شَہِیۡدٍ ﴿۴۷﴾

۴۷۔ قیامت کا علم اللہ کی طرف پلٹا دیا جاتا ہے، اس کے علم کے بغیر نہ کوئی پھل اپنے شگوفوں سے نکلتا ہے اور نہ کوئی مادہ حاملہ ہوتی ہے اور نہ جنتی ہے اور جس دن وہ انہیں پکارے گا: کہاں ہیں میرے شریک؟ تو وہ کہیں گے: ہم آپ سے اظہار کر چکے ہیں کہ ہم میں سے کوئی بھی گواہی دینے والا نہیں ہے۔

---

[1] ۲ بقرہ:۲۸۶

تشریح کلمات

اکمام: (ک م م) الکم بکسر کاف خوشوں کے غلاف کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع اکمام ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِلَیۡہِ یُرَدُّ عِلۡمُ السَّاعَۃِ: قیامت کب برپا ہو گی؟ اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ کسی نبی، مرسل کو علم ہے اور نہ کسی مقرب فرشتے کو۔

۲۔ وَ مَا تَخۡرُجُ مِنۡ ثَمَرٰتٍ: مشرکین کا یہ عقیدہ تھا کہ ان کے معبود ان کو رزق اور اولاد دیتے ہیں۔ ان کی رد میں فرمایا: کائنات کی چھوٹی بڑی چیز پر اللہ تعالیٰ کا احاطۂ علمی ہے اور حاکمیت بھی۔ پھل کو شگوفے سے نکلنے کا شعور اسی نے دیا ہے اور اسی کے حکم پر نکلتا ہے۔

۳۔ وَمَا تَحۡمِلُ مِنۡ اُنۡثٰی: کوئی بھی مادہ بارداری قبول کرتی ہے تو اس شعور کے تحت جو اس کے خالق نے اس کی فطرت میں ودیعت فرمایا ہے۔ اسی نے ہوا کو حکم دیا کہ وہ اپنا دوش پر نباتات کی بارداری کا سبب بننے والے بیجوں کو منتقل کرے اور اسی نے جرثومۂ پدر کو سمجھایا کہ تخم مادر تیری منزل ہے۔

۴۔ وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلۡمِہٖ: بچہ عالم جنین سے اسی لحہ بیرونی دنیا میں آ سکتا ہے جب اللہ سے رحم مادر کو اس کا حکم مل جاتا ہے۔

جب کائنات کی کوئی چیز اس کے علم اور حکم کے بغیر جنبش نہیں کر سکتی تو غیر اللہ کس چیز کے مدبر ہیں؟

۵۔ وَیَوۡمَ یُنَادِیۡہِمۡ اَیۡنَ شُرَکَآءِیۡ: جب قیامت کے دن ان مشرکین سے کہا جائے گا: کہاں ہیں تمہارے وہ معبود جنہیں میرا شریک ٹھہراتے تھے؟

۶۔ قَالُوۡۤا اٰذَنّٰکَ: مشرکین کہیں گے: ہم اس سے پہلے بھی اظہار کر چکے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بھی ان سے یہی سوال ہوا تھا۔ ممکن ہے اس جہاں سے آنکھیں بند ہوتے ہی ان مشرکین کی آنکھیں کھل گئی ہوں اور حقائق سامنے آنے یا نکیرین کی طرف سے سوال کرنے پر اظہار ہو چکا ہو۔

۷۔ مَا مِنَّا مِنۡ شَہِیۡدٍ: حقائق کھل کر سامنے آنے اور ان شریکوں کا ایک واہمہ ہونے کا انکشاف ہونے پر اب ان شریکوں کے بارے میں گواہی دینے والا کوئی نہیں۔

وَ ضَلَّ عَنۡہُمۡ مَّا کَانُوۡا یَدۡعُوۡنَ مِنۡ قَبۡلُ وَ ظَنُّوۡا مَا لَہُمۡ مِّنۡ مَّحِیۡصٍ ﴿۴۸﴾

۴۸۔ اور جنہیں وہ پہلے پکارتے تھے وہ ان سے ناپید ہو جائیں گے اور وہ سمجھ جائیں گے کہ ان کے لیے کوئی خلاصی نہیں ہے۔

۴۱

تفسیر آیات

ظاہر ہے ان کے معبود ایک واہمہ سے زیادہ کچھ نہ تھے۔ قیامت کے دن ان معبودوں کا کوئی اثر، علامت نظر نہیں آئے گی۔ اب ندامت، توبہ، ایمان، استغفار جیسے خلاصی کے ذرائع جو دنیا میں تھے، قیامت میں نہیں ہیں۔

لَا يَسْـَٔمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَيْرِ ۫ وَاِنْ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَـُٔوْسٌ قَنُوْطٌ ﴿۴۹﴾

۴۹۔ انسان آسودگی مانگ مانگ کر تو تھکتا نہیں لیکن جب کوئی آفت آ جاتی ہے تو مایوس ہوتا ہے اور آس توڑ بیٹھتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ لَا يَسْـَٔمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَيْرِ: اپنی خواہش کی چیزیں مانگ کر انسان نہیں تھکتا، نہ ہی وہ دنیا کی بھلائی سے سیر ہوتا ہے بلکہ یہاں مال و دولت ملنے پر اس کی تشنگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ قابل توجہ یہ ہے کہ روح انسان مال و دولت کی فراوانی سے تڑپ جاتی، اس کا سکون چھن جاتا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کو اللہ نے اس دنیا کے مال و دولت اور آسائشوں کے لیے نہیں بنایا۔ اگر اس دنیا کے لیے بنایا ہوتا تو اس دنیا کے ملنے پر سکون حاصل ہوتا جس طرح مچھلی کو پانی میں سکون ملتا ہے چونکہ مچھلی کو قدرت نے پانی میں زندگی گزارنے کے لیے خلق کیا ہے۔

۲۔ وَاِنْ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَـُٔوْسٌ قَنُوْطٌ: اگر کوئی آفت سے دوچار ہوتا ہے، جلد مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ اس لیے ہوتا ہے کہ اس نے راز زندگی کو سمجھا نہیں تھا بلکہ وہ زندگی کے بارے میں ایک غلط نظریہ رکھتا ہے۔ وہ یہ نظریہ رکھتا ہے کہ اس دنیا میں عیش و آرام کے لیے آیا ہے۔ اسی وجہ سے اس دنیا سے عیش و آرام کی توقع رکھتا ہے اور اس توقع سے جہاں وہ سیراب نہیں ہوتا وہاں اس کی توقع کے خلاف کسی آفت کے لیے اس نے آپ کو تیار نہیں کیا ہوتا۔ اس لیے اس کے لیے یہ صورت حال ناگہانی ہوتی ہے اور یاس و ناامیدی کا شکار ہو جاتا ہے۔

وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِيْ ۙ وَمَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّجِعْتُ

۵۰۔ اور اگر تکلیف پہنچنے کے بعد ہم اسے اپنی رحمت کی لذت چکھائیں تو ضرور کہتا ہے: یہ تو میرا حق تھا اور میں گمان نہیں کرتا کہ قیامت آنے والی ہے اور

اِلٰى رَبِّىْٓ اِنَّ لِىْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى ۚ فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِمَا عَمِلُوْا ۡ وَ لَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿۵۰﴾

اگر میں اپنے رب کی طرف پلٹایا بھی گیا تو میرے لیے اللہ کے ہاں یقیناً بھلائی ہے، (حالانکہ) کفار کو ان کے اعمال کے بارے میں ہم ضرور بتائیں گے وہ کیا کچھ کرتے رہے ہیں اور انہیں بدترین عذاب چکھائیں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا: جب آفت کا وقت گزر جاتا ہے اور نعمتیں پھر سے لوٹ آتی ہیں تو وہ اپنے آپ کو اس کا حقدار سمجھتا ہے۔ یہ نعمت میری اپنی مہارت اور تجربے کی وجہ سے لوٹ آئی ہے، میرا ہی حق تھا اور ان مراعات کا میں مستحق ہوں۔ وہ اس نعمت کو اللہ کی عنایت نہیں، اپنی مہارت کا نتیجہ خیال کرتا ہے۔

۲۔ وَمَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً: میرے مطابق قیامت آنے والی نہیں ہے اور مٹ کر خاک ہونے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا ممکن نہیں۔

۳۔ اور اگر بالفرض قیامت قائم ہو جاتی ہے تو مجھے وہاں بھی یہی مراعات مل جائیں گی۔ مراعات یافتہ دنیا دار کا ذہن اس طرح کا ہو چکا ہوتا ہے کہ وہ مراعات کو اپنا حق سمجھتا ہے جو ہر صورت میں اسے ملنی چاہئیں۔ اگر مراعات مل گئیں تو وہ تصور کرتا ہے کہ ہر صورت میں یہ میری ذاتی چیز تھی جو مجھے مل گئی۔ کسی کا اس میں کیا احسان ہے اور کسی کا کیا شکریہ ادا کرنا ہے۔

۴۔ فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: ان کافروں کو قیامت کے دن ان اپنے اعمال کی اصلی صورت دکھائیں گے، جرم منوائیں گے، پھر عذاب دیں گے۔

وَ اِذَاۤ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ ﴿۵۱﴾

۵۱۔ اور جب ہم انسان کو نعمت سے نوازتے ہیں تو وہ منہ پھیرتا اور اکڑ جاتا ہے اور جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو وہ لمبی دعائیں کرنے لگتا ہے۔

تشریح کلمات

نَاٰ بِجَانِبِهٖ: (ن و ء) نأبجانبه کے معنی پہلو پھیر لینے کے ہیں۔ نَأی بروزن نَعیٰ اعراض کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

انسان کے لیے جب نعمتوں کی فراوانی ہو جاتی ہے تو اس کی سوچ اور حسن و قبح کے پیمانے بدل جاتے ہیں۔

اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَیَطۡغٰۤی ۙ﴿۶﴾ اَنۡ رَّاٰہُ اسۡتَغۡنٰی ﴿۷﴾[1] — انسان تو یقیناً سرکشی کرتا ہے۔ اس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز خیال کرتا ہے۔

اِنَّ الۡاِنۡسَانَ خُلِقَ ہَلُوۡعًا ﴿ۙ۱۹﴾ اِذَا مَسَّہُ الشَّرُّ جَزُوۡعًا ﴿ۙ۲۰﴾ وَّ اِذَا مَسَّہُ الۡخَیۡرُ مَنُوۡعًا ﴿ۙ۲۱﴾ اِلَّا الۡمُصَلِّیۡنَ ﴿۲۲﴾[2] — انسان یقیناً کم حوصلہ خلق ہوا ہے۔ جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے اور جب اسے آسائش حاصل ہو جاتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے، سوائے نماز گزاروں کے۔

مختلف حالات میں چلنے والی ہوا کے ساتھ ادھر سے ادھر ہو جاتا ہے۔ اپنا موقف نہیں رکھتا بلکہ ہر بدلتے حالات کے ساتھ بدل جاتا ہے۔ اِلَّا الۡمُصَلِّیۡنَ البتہ نمازی مضبوط چٹان کی طرح اپنا ایک موقف رکھتا ہے۔ وہ ہر حالت میں ایک موقف رکھتا ہے۔

۲۔ وَ اِذَا مَسَّہُ الشَّرُّ فَذُوۡ دُعَآءٍ عَرِیۡضٍ: اور جب وہ کسی تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس سے تکبر و غرور کے اسباب، نعمتوں کی فراوانی ختم ہو جاتی ہے اور دولت کے پردے ہٹ جاتے ہیں تو اس وقت اسے اپنی حقیقت، مجبوری اور بے بسی نظر آتی ہے۔ اب اس کی اکڑ ختم، غرور و تکبر نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔ نہایت عاجزی سے طویل و عریض دعائیں کرنے لگ جاتا ہے۔

قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ کَانَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ ثُمَّ کَفَرۡتُمۡ بِہٖ مَنۡ اَضَلُّ مِمَّنۡ ہُوَ فِیۡ شِقَاقٍۭ بَعِیۡدٍ ﴿۵۲﴾

۵۲۔ کہدیجیے: یہ تو بتاؤ کہ اگر (یہ قرآن) اللہ کی طرف سے ہو، پھر تم اس سے انکار کرو تو اس شخص سے بڑھ کر گمراہ اور کون ہو گا جو اس (کی مخالفت) میں دور تک نکل گیا ہو؟

تشریح کلمات

اَرَءَیۡتُمۡ: (ر ء ی) یہ ترکیب اخبرونی کے معنوں میں آتی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ: کہدیجیے: یہ تو بتاؤ! اس وقت تم قرآن کے اللہ کی طرف سے ہونے کے منکر ہو۔

---

[1] ۹۶ علق: ۶۔۷ [2] ۷۰ معارج: ۱۹ تا ۲۲

بالفرض اگر یہ اللہ کی طرف سے ہو پھر تم انکار کر رہے ہو تو تم سے زیادہ گمراہ کون ہو سکتا ہے؟

سَنُرِيۡهِمۡ اٰيٰتِنَا فِى الۡاٰفَاقِ وَفِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمۡ اَنَّهُ الۡحَقُّ ؕ اَوَلَمۡ يَكۡفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ شَهِيۡدٌ ﴿۵۳﴾

۵۳۔ہم عنقریب انہیں اپنی نشانیاں آفاق عالم میں بھی دکھائیں گے اور خود ان کی ذات میں بھی یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے کہ یقیناً وہی (اللہ) حق ہے، کیا آپ کے پروردگار کا یہ وصف کافی نہیں ہے کہ وہ ہر چیز پر خوب شاہد ہے؟

تفسیر آیات

ا۔ سَنُرِيۡهِمۡ اٰيٰتِنَا فِى الۡاٰفَاقِ: مکہ میں نہایت نامساعد حالات میں نازل ہونے والی اس آیت میں ایک عظیم اور تابناک مستقبل کی نوید ہے کہ ایک وقت ایسا آنے والا ہے جس میں کائنات آفاق اور کائنات انفس میں ہماری صناعیت، وحدانیت اور قرآن کی صداقت، دین اسلام کی حقانیت کی نشانیاں اس حد تک وضاحت کے ساتھ دکھائی جائیں گی کہ حق کھل کر سامنے آجائے:

الف۔ کائنات آفاق: اس کائنات کے بارے میں عصر نزول قرآن اور اس سے پہلے بطلیموسی نظریہ افلاک کے مطابق اس کائنات، خاص کر اپنے منظومہ شمسی کے بارے میں نظریات سو فیصد اشتباہات پر مبنی تھے۔ اس نظام شمسی کی مرکزی حیثیت کے حامل سورج کو زمین کے تابع ایک سیارہ شمار کیا جاتا تھا۔ چنانچہ انسان پر آفاق کے دروازے کھل رہے ہیں اور کائنات کے اسرار پر آگاہی حاصل ہو رہی ہے۔

اپنے کرۂ ارض کے بارے میں بہت کچھ جاننے لگا ہے: وَفِى الۡاَرۡضِ اٰيٰتٌ لِّلۡمُوۡقِنِيۡنَ ۔[1] کے تحت زمین میں پوشیدہ اسرار قدرت سے پردہ ہٹنا شروع ہوا ہے۔ چار عناصر کی حدود پھلانگ کر بیسیوں عناصر کا کھوج لگایا ہے۔ ان عناصر کی ترتیب و تجزیہ کے رموز سے واقف ہونا شروع ہو گیا ہے۔ حتیٰ نامرئی ذرہ (ایٹم) کے شکم میں جھانک کر دیکھ لیا ہے۔ آفاق بعید ستاروں، کہکشاؤں اور کائنات میں موجود مختلف نظاموں کے بارے میں بہت جاننا شروع ہو گیا ہے تاہم ابھی نظام کائنات کے اصل راز تک رسائی بہت دور ہے۔ ابھی تک اس کائنات پر حاکم مطلوبہ کشش کی توجیہ نہ ہو سکی چونکہ موجودہ کشش اجرام سماوی کو بکھرنے سے محفوظ رکھنے کے لیے ناکافی ہے۔ اس کے لیے ایک بلیک ہول (blackhole) کا نظریہ قائم کیا ہوا ہے جو زیر تحقیق ہے اور خیال

[1] ۵۱ ذاریات: ۲۰ (ترجمہ) اور زمین میں اہل یقین کے لیے نشانیاں ہیں۔

ہے کہ اجرام سماوی کو بکھرنے سے محفوظ رکھنے کے لیے لازم کشش میں سے بیس فیصد کشش اس بلیک ہول سے ملنی چاہیے۔خود بلیک ہول کیا چیز ہے؟ یہ ایک تھیوری ہے۔ اس کی حقیقت کا علم نہیں۔صرف آثار (کشش) سے اس کے موجود ہونے کا اندازہ لگایا جا رہا ہے۔

قرآن کا وعدہ ہے وہ وقت آئے گا جس میں آفاق میں موجود آیات الٰہی اس حد تک منکشف ہو جائیں گی کہ قرآنی تعلیمات کی حقانیت واضح ہو جائے۔

ب۔ کائنات انفس: انسان کی ساخت و بافت خود اپنی جگہ، بقول الکسس کاریل **(Alexis Carrel)** ایک نامعلوم کائنات ہے۔

انسانی تخلیق میں استعمال ہونے والی بنیادی اینٹ سیل **(Cell)** کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ اس کائنات کا سب سے زیادہ محیر العقول عجوبہ ہے۔ انسانی تخلیق میں سیلز کی حیرت انگیز فعالیت کے بارے میں تشریح کے لیے ملاحظہ فرمائیں سورہ نساء آیت ۱۱۹۔

کائنات انفس میں اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نشانی حیات ہے جو ایک سربستہ راز اور پراسرار حقیقت ہے۔ انسان نے اس سلسلے میں ایک چھوٹا سا قدم آگے بڑھایا ہے۔

چنانچہ ۲۶، جون ۲۰۰۰ء کو انکشاف کی تاریخ کا ایک اہم ترین دن قرار دیا گیا اور دعویٰ کیا گیا کہ اس روز سینۂ کائنات میں پوشیدہ ایک راز ''راز حیات'' سے پردہ اٹھ گیا اور انسانی **D.N.A** میں تین ارب سالموں کی منظم ترتیب کے ذریعے جینیاتی کوڈ کا معمہ حل ہو گیا۔ کہتے ہیں حیات کا راز ان تین ارب سالموں میں پوشیدہ ہے۔ تشریح کے ملاحظہ ہو سورہ بقرہ آیت ۲۸۔

سائنسدان فرانسس کولنز **(Francis Collins)** کہتے ہیں:

سائنسداں اس بات کے اہل نہیں ہیں کہ وہ ''حیات'' کو سمجھ سکیں۔ (روزنامہ جنگ تحریر لی سلور، ترجمہ این ایچ تمکین)

۲۔ اَوَلَمۡ یَکۡفِ بِرَبِّکَ اَنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَہِیۡدٌ: یہ وعدہ اس علم و شہود کی بنیاد پر ہے کہ کائنات کی ہر چیز کسی زمانے کی قید کے بغیر اس کے سامنے ہے۔

مفسرین کا یہ نظریہ کہ آفاق و انفس میں اللہ کی نشانیوں سے مراد فتوحات اسلامیہ ہیں، دو اعتبار سے ظہور قرآن کے خلاف ہے:

اول یہ کہ فتوحات کے لیے'' اللہ کی نشانیاں'' کی تعبیر قرآن میں استعمال نہیں ہوئی۔ فتوحات کے لیے فتح و نصرت اور تائید کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

دوم یہ کہ اَنۡفُسِہِمۡ سے مراد قریبی علاقے لیتے ہیں جو خلاف ظاہر بلکہ خلاف نص ہے۔ چونکہ وَفِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ میں انفس سے مراد قریبی علاقے لیا جائے، بعید از فہم ہے۔

واضح رہے انسان کی علمی پیشرفت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے وجود کے انکار میں وہ زور نہیں رہا جو سائنسی دور کی ابتدا میں تھا۔ حتیٰ قیامت اور حیات بعدالموت کا مسئلہ بھی سائنس کی روشنی میں حل ہو رہا ہے۔

اَلَاۤ اِنَّهُمۡ فِیۡ مِرۡیَۃٍ مِّنۡ لِّقَآءِ رَبِّهِمۡ ؕ اَلَاۤ اِنَّهٗ بِکُلِّ شَیۡءٍ مُّحِیۡطٌ ﴿۵۴﴾ ع

۵۴۔ آگاہ رہو! بے شک یہ لوگ اپنے رب کی ملاقات کے بارے میں شک میں ہیں، آگاہ رہو! یقیناً وہ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

تفسیر آیات

مشرکین حیات بعدالموت کو ناممکن سمجھتے ہیں اور کہتے تھے کہ یہ ہڈی بوسیدہ ہونے کے بعد دوبارہ کیسے زندہ ہو سکتی ہے۔ جواب میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ہر چیز پر جہاں احاطہ علمی ہے، احاطۂ قدرت بھی ہے۔ ابتدائے حیات ہو یا اعادۂ حیات، اللہ کے لیے یکساں ہے۔

سُورَۃُ الشُّوریٰ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اس سورۂ مبارکہ کا نام آیۂ وَاَمۡرُہُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَہُمۡ سے ماخوذ ہے۔ بعض روایات کے مطابق اس سورہ کا نام حمعسق ذکر ہوا ہے۔ کوفی قرائت کے مطابق آیات کی تعداد ۵۳ ہے جب کہ دوسروں کے نزدیک ۵۰ ہے۔ اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ کوفی قرائت کے مطابق حٰمٓ، عٓسٓقٓ دو آیتیں ہیں اور وَمِنۡ اٰیٰتِہِ الۡجَوَارِ فِی الۡبَحۡرِ کَالۡاَعۡلَامِ ایک آیت ہے۔ (مجمع البیان)

یہ سورہ مکی ہے مگر بعض کے نزدیک آیات ۳۸ و ۳۹ مدینہ میں نازل ہوئیں اور قُلۡ لَّاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّۃَ فِی الۡقُرۡبٰی ۔ مدنی ہے۔

ابن عباس کی روایت کے مطابق جب یہ آیت نازل ہوئی تو ایک شخص نے کہا: قسم بخدا یہ آیت اللہ نے نازل نہیں کی ہے۔ اس شخص کی رد میں یہ آیت نازل ہوئی: اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا تو وہ شخص نادم ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی وَ ہُوَ الَّذِیۡ یَقۡبَلُ التَّوۡبَۃَ ۔ (مجمع البیان)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	بنام خدائے رحمن رحیم
حٰمٓ ۝١	۱۔ حا، میم۔
عٓسٓقٓ ۝٢	۲۔ عین، سین، قاف۔
کَذٰلِکَ یُوۡحِیۡۤ اِلَیۡکَ وَ اِلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکَ ۙ اللّٰہُ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ۝٣	۳۔ اسی طرح آپ کی طرف اور آپ سے پہلوں کی طرف بڑا غالب آنے والا، حکمت والا اللہ وحی بھیجتا رہا ہے۔
لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ وَ ہُوَ الۡعَلِیُّ الۡعَظِیۡمُ ۝٤	۴۔ جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے سب اسی کی ملکیت ہے اور وہ عالی مرتبہ، عظیم ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ کَذٰلِکَ یُوۡحِیۡۤ: اس سورہ کے نزول کے وقت مکہ کی فضا میں وحی پر چہ میگوئیاں ہوتی تھیں کہ عبد اللہ کا بیٹا یہ باتیں کہاں سے لاتا ہے؟ وحی کیا چیز ہے؟ اور کس طرح کوئی کلام کسی پر نازل ہوتا ہے؟ اس پر فرمایا: کَذٰلِکَ یُوۡحِیۡۤ۔ وحی کا طریقہ ہمیشہ اسی طرح رہا ہے۔ تمام انبیاء پر یکساں وحی نازل ہوتی ہے۔ فرزند عبد اللہ پر وحی آنا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ تمام انبیاء کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ کا ایک حصہ ہے۔

۲۔ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ: اللہ اپنی بات وحی کے ذریعے کسی عبد کے سینے میں اتارنے پر قدرت رکھتا ہے اور کس عبد کے سینے پر، کس زمانے میں اور کس قوم کی طرف یہ وحی ہونی چاہیے اس حکمت سے بھی اچھی طرح واقف ہے۔

۳۔ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ: آسمانوں اور زمین کی موجودات اللہ کے قبضۂ ملکیت میں ہیں۔ اپنی ملکیت میں کسی قسم کا تصرف اس کے لیے مسئلہ نہیں ہے۔ وَ ہُوَ الۡعَلِیُّ الۡعَظِیۡمُ وہ بلندی اور عظمت کے اس مقام پر ہے کہ یہ سوال نہیں آتا کہ وہ کوئی کام کس طرح کرتا ہے۔

تَکَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرۡنَ مِنۡ فَوۡقِہِنَّ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ یُسَبِّحُوۡنَ بِحَمۡدِ رَبِّہِمۡ وَ یَسۡتَغۡفِرُوۡنَ لِمَنۡ فِی الۡاَرۡضِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ اللّٰہَ ہُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ ﴿۵﴾	۵۔ قریب ہے کہ آسمان ان کے اوپر سے پھٹ پڑیں اور فرشتے اپنے پروردگار کی ثناء کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور اہل زمین کے لیے استغفار کرتے ہیں، آگاہ رہو! اللہ ہی بڑا بخشنے والا، مہربان ہے۔
وَ الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اَوۡلِیَآءَ اللّٰہُ حَفِیۡظٌ عَلَیۡہِمۡ ۫ۖ وَ مَاۤ اَنۡتَ عَلَیۡہِمۡ بِوَکِیۡلٍ ﴿۶﴾	۶۔ اور جنہوں نے اللہ کے سوا دوسروں کو سرپرست بنایا ہے اللہ ہی ان (کے اعمال) پر نگہبان ہے اور آپ ان کے ذمہ دار نہیں ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ تَکَادُ السَّمٰوٰتُ: اس آیت کی دو تفسیریں ہیں:

پہلی تفسیر یہ ہے کہ وحی کو ہمارے رسول ﷺ کا قلب تحمل کر سکتا ہے، ضمیر عالم اس کا متحمل نہیں

ہے۔ اگر آسمانوں پر یہ وحی نازل ہوتو وہ پھٹ پڑیں۔ جیسے فرمایا:

لَوۡ اَنۡزَلۡنَا هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیۡتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنۡ خَشۡیَةِ اللّٰهِ ...[1] اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو آپ اسے اللہ کے خوف سے جھک کر پاش پاش ہوتا ضرور دیکھتے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ شرک کا عقیدہ اللہ تعالیٰ کی شان میں انتہائی گستاخی ہے۔ اس قدر سنگین گستاخی ہے کہ کائنات کا ضمیر اسے برداشت نہیں کرسکتا۔ جیسے سورہ مریم ۹۰۔۹۱ میں فرمایا:

تَکَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرۡنَ مِنۡهُ وَ تَنۡشَقُّ الۡاَرۡضُ وَ تَخِرُّ الۡجِبَالُ هَدًّا ۙ اَنۡ دَعَوۡا لِلرَّحۡمٰنِ وَلَدًا ۚ قریب ہے کہ اس سے آسمان پھٹ جائیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر گر جائیں۔ اس بات پر کہ انہوں نے رحمٰن کے لیے فرزند (کی موجودگی) کا الزام لگایا ہے۔

سیاق آیت کے اعتبار سے پہلی تفسیر قرین واقع معلوم ہوتی ہے۔ البتہ کسی دلیل کے موجود ہونے کی صورت میں سیاق کا اعتبار نہیں کیا جاتا چونکہ قرآن کا طرز کلام یہی ہے کہ کبھی ایک آیت میں متعدد موضوعات سمو دیے جاتے ہیں۔

۲۔ مِنۡ فَوۡقِهِنَّ: یعنی من فوق السماوات۔ ممکن ہے آسمان ان کے اوپر سے پھٹ جائیں۔ معاملہ اس قدر سنگین ہے کہ آسمان پھٹ سکتے ہیں۔ مزید سنگینی یہ ہے کہ آسمانوں کی بالائی دنیا میں شکست و ریخت آ سکتی ہے۔ ممکن ہے مسئلہ کی سنگینی بیان کرنے کے لیے یہ تعبیر اختیار فرمائی ہو کہ زمین پھٹنے سے آسمانوں کا پھٹنا زیادہ سنگین اور آسمانوں، بالائی ملکوت میں اس کے اثرات پیدا ہونا مزید سنگین ہے۔ والعلم عند اللّٰہ۔

۳۔ وَ الۡمَلٰٓئِکَةُ یُسَبِّحُوۡنَ بِحَمۡدِ رَبِّهِمۡ: فرشتے اللہ تعالیٰ کی تنزیہ کرتے اور اسی ایک معبود کو لائق حمد و ثنا کہتے ہیں۔

۴۔ وَ یَسۡتَغۡفِرُوۡنَ لِمَنۡ فِی الۡاَرۡضِ: اور اہل ارض کے لیے استغفار کرتے ہیں۔ بعض مفسرین نے لِمَنۡ فِی الۡاَرۡضِ میں الۡاَرۡضِ کے لفظی اطلاق کو سامنے رکھ کر فرمایا: تمام اہل ارض خواہ مسلم ہوں یا مشرک، سب کے لیے مغفرت طلب کرتے۔

صاحب المیزان مغفرت سے سبب مغفرت یعنی ایمان مراد لیتے ہیں لیکن اگرچہ یہاں لِمَنۡ فِی الۡاَرۡضِ مطلق ہے لیکن سورہ مومن: ۷ میں بھی فرشتوں کی طرف سے مغفرت کا ذکر ہے۔ اس میں مومنین کی قید ہے وَ یَسۡتَغۡفِرُوۡنَ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا اور قاعدۂ مطلق، مقید پر محمول ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حاملین عرش اور دیگر فرشتوں کے استغفار میں فرق ہے۔

---

[1] ۵۹ حشر: ۲۱

۵۔ اَلَاۤ اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ: اللہ توبہ کرنے اور دائرۂ ایمان میں داخل ہونے والوں کے گزشتہ تمام شرک وغیرہ کے گناہوں کو معاف فرماتا ہے۔

۶۔ وَ الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ: جو لوگ غیر اللہ کو اپنا کارساز بناتے ہیں ان کے اس عقیدہ وعمل کو اللہ محفوظ اور ثبت کرتا ہے جس کا انہیں قیامت کے دن سامنا کرنا ہوگا۔

۷۔ وَ مَاۤ اَنۡتَ عَلَیۡہِمۡ بِوَکِیۡلٍ: آپ کو ان کے عدم ایمان کا ذمے دار نہیں ٹھہرایا گیا ہے۔ آپ کی تکلیف ان تک پیغام پہنچانا ہے۔ ان کے ایمان لانے کی ذمہ داری آپ پر عائد نہیں ہوتی۔

وَ کَذٰلِکَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ قُرۡاٰنًا عَرَبِیًّا لِّتُنۡذِرَ اُمَّ الۡقُرٰی وَ مَنۡ حَوۡلَہَا وَ تُنۡذِرَ یَوۡمَ الۡجَمۡعِ لَا رَیۡبَ فِیۡہِ ؕ فَرِیۡقٌ فِی الۡجَنَّۃِ وَ فَرِیۡقٌ فِی السَّعِیۡرِ ﴿۷﴾

۷۔ اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف عربی قرآن بھیجا ہے تاکہ آپ مکہ اور اس کے گرد و پیش میں رہنے والوں کو تنبیہ کریں اور اجتماع (قیامت) کے دن بارے میں بھی (تنبیہ کریں) جس میں کوئی شبہ نہیں ہے، (اس روز) ایک گروہ کو جنت جانا ہے اور دوسرے گروہ کو جہنم جانا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اُمَّ الۡقُرٰی: بستیوں کا مرکز۔ اس سے مراد مکہ ہے۔ رسول کریم ﷺ کو تبلیغ و ارشاد کا کام بہ تدریج کرنے کا حکم ملتا ہے۔ احکام کے بیان میں تدریجی حکمت عملی اختیار کرنے کا حکم ملتا ہے۔ اسی طرح لوگوں اور علاقوں میں اس پیغام کو تدریجاً پہنچانے کا حکم ملتا ہے۔

چنانچہ حکم ملتا ہے کہ ابتدا اپنے قریبی رشتہ داروں سے کرو:

وَ اَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ ۙ﴿﴾ [۱]　　اور اپنے قریب ترین رشتے داروں کو تنبیہ کیجیے۔

پھر عرب مشرکین کو یہ پیغام پہنچانے کا حکم ملتا ہے:

لِتُنۡذِرَ قَوۡمًا مَّاۤ اُنۡذِرَ اٰبَآؤُہُمۡ فَہُمۡ غٰفِلُوۡنَ ﴿﴾ [۲]　　تاکہ آپ ایک ایسی قوم کو تنبیہ کریں جس کے باپ دادا کو تنبیہ نہیں کی گئی تھی لہٰذا وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

اس آیت کا تعلق بھی اسی مرحلے سے ہے۔

اس کے بعد اپنی تبلیغ کا پورا حلقہ بیان فرمایا کہ پوری انسانیت اس حلقۂ تبلیغ میں شامل ہے:

---

[۱] ۲۶ شعراء: ۲۱۴　　[۲] ۳۶ یس: ۶

وَاُوۡحِیَ اِلَیَّ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنُ لِاُنۡذِرَکُمۡ بِہٖ وَمَنۡۢ بَلَغَ ...[1] | اور یہ قرآن میری طرف بذریعہ وحی نازل کیا گیا ہے تاکہ میں تمہیں اور جس تک یہ پیغام پہنچے سب کو تنبیہ کروں۔

مستشرقین نے اس آیت سے بھی اسلام پر حملہ کرنے کی راہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے: شروع میں محمد صرف مکہ اور گرد و پیش کے علاقوں تک اپنی دعوت کو محدود رکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

اس کا جواب ہم پہلے بھی دے چکے ہیں کہ اول تو اسلامی دعوت تدریجاً عمل میں آتی رہی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے پہلے اپنے قریبی رشتہ داروں، پھر ام القری (مکہ) والوں، پھر گرد و پیش والوں، پھر سارے جہاں کے رہنے والوں کو دعوت دی۔ چنانچہ مکہ میں نازل ہونے والے سورہ فرقان آیت ۱ میں فرمایا:

تَبٰرَکَ الَّذِیۡ نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ عَلٰی عَبۡدِہٖ لِیَکُوۡنَ لِلۡعٰلَمِیۡنَ نَذِیۡرَا ۙ﴿۱﴾ | بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر قرآن اتارا تاکہ وہ سارے جہاں کے لیے تنبیہ ہو۔

اور مکی سورہ ص آیت ۸۷ میں فرمایا اِنۡ ہُوَ اِلَّا ذِکۡرٌ لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ۔ مکی سورہ قلم آیت ۵۲ وَمَا ہُوَ اِلَّا ذِکۡرٌ لِّلۡعٰلَمِیۡنَ نیز مکی سورہ تکویر آیت ۲۷ میں فرمایا: اِنۡ ہُوَ اِلَّا ذِکۡرٌ لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ۔

۲۔ وَتُنۡذِرَ یَوۡمَ الۡجَمۡعِ : اور روز قیامت کے بارے میں تنبیہ کرو جس میں تمام انسانوں کو جمع کیا جائے گا۔ قیامت کی ہولناکیوں میں ایک مسئلہ یہی ہے کہ انسان کو سب کے سامنے اللہ کی بارگاہ میں حساب دینا ہے۔ دعاؤں میں آیا ہے:

الھی لا تظھر خطیئتی و لا تفضحنی علی رؤس الاشھاد من العالمین۔[2] | میرے معبود! میری خطاؤں کو فاش اور پورے عالم میں مجھے سر عام رسوا نہ فرما۔

۳۔ فَرِیۡقٌ فِی الۡجَنَّۃِ وَفَرِیۡقٌ فِی السَّعِیۡرِ : اس میدان میں سب کو جمع کرنے کے بعد ایک گروہ کو سب کے سامنے بڑے احترام وعزت، فخر و مباہات کے ساتھ جنت میں لے جایا جائے گا اور دوسرا گروہ بڑی رسوائی اور ذلت وخواری کے ساتھ جہنم کی طرف ہانک دیا جائے گا۔

وَلَوۡ شَآءَ اللّٰہُ لَجَعَلَہُمۡ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّلٰکِنۡ یُّدۡخِلُ مَنۡ یَّشَآءُ فِیۡ رَحۡمَتِہٖ ؕ وَالظّٰلِمُوۡنَ مَا لَہُمۡ | ۸۔ اور اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ایک ہی امت بنا دیتا لیکن وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے اور ظالموں کے لیے نہ کوئی سرپرست

---

[1] ٦ انعام: ۱۹
[2] بحار ۹۴: ۲۲۸

مِنۡ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیۡرٍ ﴿۸﴾ ہے اور نہ مددگار۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰہُ: اگر اللہ چاہتا تو کسی نبی کو مبعوث نہ کرتا۔ اس صورت میں سب لوگ کافر رہتے اور ایک ہی امت ہوتی لیکن اللہ نے ایسا نہ چاہا۔ پیغمبروں کو مبعوث فرمایا۔ نتیجتاً لوگ کفر و ایمان میں بٹ گئے۔

دوسری تفسیر یہ ہے: اگر اللہ چاہتا تو سب ایمان لے آتے:

وَلَوۡ شَآءَ لَهَدٰىكُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ۝ [1] اور اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت کرتا۔

اور لوگ ایمان پر امت واحدہ بن جاتے مگر اللہ نے ایسا نہ چاہا کیونکہ سب کو ایمان پر متحد کرنے کے لیے جبر استعمال کرنا پڑتا تھا۔ اللہ نے یہ چاہا کہ لوگوں کو اختیار و انتخاب میں آزادی دی جائے۔ ہدایت کا راستہ دکھایا جائے۔ اس پر چلنے نہ چلنے کا فیصلہ خود انسان، خودمختارانہ طریقے سے کرے۔ اگر جبر سے کام لینا تھا تو انبیاء علیہم السلام کو مبعوث کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس کے لیے اللہ کا ایک ارادہ تکوینی کافی تھا جس سے سب انسان قہراً مؤمن بن جاتے۔ قہراً مومن بنانے کے لیے اختیار و ارادہ سلب کرنا پڑتا۔ اس صورت میں انسان، انسان نہ رہتا، جمادات بن جاتا۔

۲۔ وَّلٰکِنۡ یُّدۡخِلُ مَنۡ یَّشَآءُ: جو ہدایت قبول کرتے ہیں انہیں اپنی رحمت میں داخل کیا جاتا ہے اور جن لوگوں نے اپنے نفس کے ساتھ انصاف نہیں کیا انہیں رحمت خدا نہ ملنے کی وجہ سے کسی دوسرے حوالے سے مددگار نہیں ملے گا۔

صدر اور ذیل آیت، آیت کی ابتدا اور انتہا میں ربط کے اعتبار سے دوسری تفسیر زیادہ قرین سیاق ہے تاہم پہلی تفسیر کو قطعی طور پر رد نہیں کیا جا سکتا۔

اَمِ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اَوۡلِیَآءَ ۚ فَاللّٰہُ ہُوَ الۡوَلِیُّ وَ ہُوَ یُحۡیِ الۡمَوۡتٰی ۫ وَ ہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ٪﴿۹﴾

۹۔ کیا انہوں نے اللہ کے علاوہ سرپرست بنا لیے ہیں؟ پس سرپرست تو صرف اللہ ہے اور وہی مردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہی ہر چیز پر قادر ہے۔

ع

وَ مَا اخۡتَلَفۡتُمۡ فِیۡہِ مِنۡ شَیۡءٍ فَحُکۡمُہٗۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبِّیۡ عَلَیۡہِ تَوَکَّلۡتُ ٭ۖ وَ اِلَیۡہِ

۱۰۔ اور تم جس بات میں اختلاف کرتے ہو اس کا فیصلہ اللہ کی طرف سے ہو گا وہی میرا پروردگار ہے، اسی پر میں نے بھروسا کیا اور اسی کی طرف

---

[1] ۱۶ نحل: ۹

اُنِیۡبُ ﴿۱۰﴾ رجوع کرتا ہوں۔

تفسیر آیات

۱۔ اَمِ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اَوۡلِیَآءَ: انکار اور تعجب کے طور پر فرمایا: کیا ان لوگوں نے غیر اللہ کی ولایت کو قبول کر رکھا ہے۔ ان کی زندگی پر کسی غیر اللہ کا تصرف ہے کہ وہ غیر اللہ ان کی قسمت اور نصیب بناتا ہے۔

۲۔ فَاللّٰہُ ہُوَ الۡوَلِیُّ: سارے جہاں کی ولایت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ ہی کل کائنات کا حقیقی مالک ہے۔ وَ ہُوَ یُحۡیِ الۡمَوۡتٰی: ولایت اس ذات کے ہاتھ میں ہے جو موت و حیات کی مالک ہے۔ وَ ہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ۔ جو ذات ہر چیز پر قدرت رکھتی ہے وہ تمہاری قسمت بنا سکتی ہے۔

۳۔ وَ مَا اخۡتَلَفۡتُمۡ فِیۡہِ مِنۡ شَیۡءٍ: اختلاف کی صورت میں حق و باطل کی تمیز اور فیصلے کا حق صرف اللہ کو حاصل ہے۔ فیصلہ قانون کے تحت ہوتا ہے۔ قانون سازی کا حق بھی صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے:

اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ ؕ عَلَیۡہِ تَوَکَّلۡتُ ... [۱] حکم صرف اللہ ہی کا چلتا ہے اسی پر میں نے بھروسہ کیا۔

اگر فیصلہ تکوینی ہے تو بھی خود مشرکین کے نزدیک بھی تکوینی و تخلیقی فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر آخرت کا فیصلہ ہے تو بھی آخرت میں فیصلے کی بالادستی صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

۴۔ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبِّیۡ: میرا رب وہی ذات ہے جس کے ہاتھ میں میری قسمت، حیات اور قدرت ہے اور جس کو ہی فیصلے کا حق حاصل ہے۔

۵۔ تَوَکَّلۡتُ ٭ۖ وَ اِلَیۡہِ اُنِیۡبُ: اس ذات کی ربوبیت کی دعوت کے سلسلے میں پیش آنے والی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے میں اسی رب پر توکل کرتا ہوں اور مدد کے لیے اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

۵۷

فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ جَعَلَ لَکُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِکُمۡ اَزۡوَاجًا وَّ مِنَ الۡاَنۡعَامِ اَزۡوَاجًا ۚ یَذۡرَؤُکُمۡ فِیۡہِ ؕ لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ ۚ وَ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ﴿۱۱﴾

۱۱۔ (وہی) آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، اسی نے خود تمہاری جنس سے تمہارے لیے ازواج بنائے اور چوپایوں کے بھی جوڑے بنائے، اس طرح سے وہ تمہاری افزائش کرتا ہے، اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے اور وہ خوب سننے والا، دیکھنے والا ہے۔

تشریح کلمات

یذرء: (ذ ر ء) الذرء کے معنی ہیں اللہ نے جس چیز کا ارادہ کیا اسے ظاہر کر دیا ہے۔

---

[۱] ۱۲ یوسف: ۶۷

تفسیر آیات

۱۔ فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ: اللہ کی ربوبیت اور مدبریت پر ایک بار پھر استدلال ہے کہ تمہارا رب وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ مشرکین بھی اللہ کے خالق و موجد ہونے کا اعتراف کرتے تھے۔ خالقیت سے ربوبیت اور مدبریت پر استدلال ہے چونکہ خالقیت اور مدبریت ناقابل تفریق ہیں۔

۲۔ جَعَلَ لَکُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِکُمۡ اَزۡوَاجًا: تمہارے لیے خود تمہاری جنس بشر سے زوج پیدا کرنے سے تو زندگی کا قافلہ رواں دواں ہے۔ یہ تدبیری تخلیق کس کا کارنامہ ہے؟

۳۔ وَّ مِنَ الۡاَنۡعَامِ اَزۡوَاجًا: چوپاؤں میں جوڑے بنا کر تمہارے لیے مسخر حیوانات کی نسلی افزائش کی تدبیری تخلیق کس کا عمل ہے؟

۴۔ یَذۡرَؤُکُمۡ فِیۡہِ: اس تزویج میں تمہاری افزائش کرنے والا ہی تمہارا رب ہے۔ فِیۡہِ کی ضمیر تزویج کی طرف ہے جو اَزۡوَاجًا کی تعبیر میں ضمناً مذکور ہے۔

۵۔ لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ: اللہ کی کوئی مثل نہیں ہے۔ اللہ اپنی مخلوقات میں سے کسی چیز کے ساتھ مماثلت نہیں رکھتا۔ نہ اس کا وجود باقی موجودات کے وجود کی طرح ہے، نہ اس کی حیات باقی زندہ موجودات کی حیات کی طرح ہے، نہ اس کی قدرت باقی قدرت کی طرح ہے:

قُلِ اللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیۡءٍ ...[1] کہد یجیے: ہر چیز کا خالق صرف اللہ ہے۔

لہٰذا وہ اپنی مخلوق کی مثل نہیں ہو سکتا۔

علی بن مھزیار کہتے ہیں:

میں نے حضرت امام رضا علیہ السلام کو لکھا: میں ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھتا ہوں جو اللہ کے جسم ہونے کا قائل ہے تو جواب میں لکھا:

لَا تُصَلُّوا خَلۡفَھُمۡ وَلَا تُعۡطُوھُمۡ مِنَ الزَّکَاۃِ وَ ابۡرَأُوا مِنۡھُمۡ بَرِیٔ اللّٰہُ مِنۡھُمۡ۔[2] ان کے پیچھے نماز نہ پڑھو، انہیں زکوۃ نہ دو، ان سے بیزاری اختیار کرو، اللہ ان سے بیزار ہے۔

جمال الدین قاسمی اپنی تفسیر محاسن التاویل میں لکھتے ہیں:

ذھبی نے کہا ہے کہ متکلمین میں سے متاخرین نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نہ آسمانوں میں ہے، نہ زمین میں، نہ عرش پر، نہ داخل عالم، نہ خارج عالم، نہ اپنی مخلوق سے جدا ہے، نہ متصل کیونکہ یہ سب جسم کے اوصاف ہیں۔ اللہ تعالیٰ جسم سے منزہ ہے۔

قاسمی کہتے ہیں: ان کے جواب میں اھل السنۃ والاثر (اہل حدیث) یہ کہتے ہیں:

---

[1] ۱۳ رعد: ۱۶ [2] وسائل الشیعۃ ۸: ۳۱۲۔ بحار الانوار ۳: ۲۹۲

ہم اس بات میں نہیں پڑتے۔ ہم وہی بات کرتے ہیں جو نصوص میں ہے۔ آپ لوگوں کی باتیں ایک معدوم کے اوصاف ہو سکتے ہیں۔

اس مکتب فکر کا عقیدہ ہے کہ جو صفات قرآن و سنت میں وارد ہوئی ہیں ہم انہیں حقیقی معنی میں لیتے ہیں جیسے اللہ کے لیے ہاتھ، چہرہ ہے لیکن کیفیت کی نفی کرتے اور کہتے ہیں: اللہ کا ہاتھ ہے، کیفیت معلوم نہیں ہے کہ وہ کس قسم کا ہاتھ ہے۔ اللہ کا چہرہ ہے۔ کیفیت معلوم نہیں ہے۔ اللہ عرش پر ہے۔ کیفیت معلوم نہیں ہے۔ وہ صفات سلبیہ کو معدوم کے اوصاف قرار دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان میں سے بعض نے یہ تشبیہ بھی دی ہے کہ اگر کوئی کہے: ہمارے گھر میں کھجور کا درخت ہے۔ کہا: کیا اس کی ٹہنی ہے؟ کہا نہیں ہے۔ کیا اس پر پھل ہے؟ کہا نہیں ہے؟ کیا اس کا تنا ہے؟ کہا نہیں ہے۔ پھر کہو تمہارے گھر میں کھجور کا کوئی درخت نہیں ہے۔ اس طرح ہے کہ وہ لوگ جو کہتے ہیں: نہ اللہ کسی زمان میں، نہ کسی مکان میں ہے... وغیرہ۔ پھر معطلہ کا بھی ذکر آتا ہے جو اللہ کے سمیع و بصیر ہونے کے بھی منکر ہیں۔ جب کہ یہ لوگ بھی کیفیت کی نفی کرتے ہیں۔ جو بات اس نفی کے لیے لازم آتی ہے وہی دوسرے نظریات پر لازم آتی ہے۔

یہی سوال اس مکتب کے نظریے پر بھی آتا ہے کہ آپ کہتے ہیں اللہ کا چہرہ ہے۔ کیفیت معلوم نہیں ہے۔ کہا جائے کیا اس چہرے کی ناک ہے؟ کہا معلوم نہیں ہے۔ کیا اس چہرے پر دو آنکھیں ہیں؟ کہا معلوم نہیں ہے۔ کیا اس چہرے پر گوشت، کھال، رگیں، اعصاب ہیں؟ کہا معلوم نہیں۔ پھر کہو اس چہرے کے وجود کا علم نہیں ہے۔

وہ کہتے ہیں: تم اس چہرے کو انسانی چہرہ جیسا سمجھ لیتے ہو پھر اس کی نفی کرتے ہو جب کہ ہم انسانی چہرہ نہیں بلکہ کہتے ہیں چہرہ ہے لیکن دوسرے چہروں کی طرح نہیں ہے۔

امامیہ اپنا عقیدہ اپنے امام مولائے متقیان علی علیہ السلام اخذ کرتے ہیں جو ایک روایت میں فرماتے ہیں:

كَائِنٌ لَا عَنْ حَدَثٍ مَوْجُودٌ لَا عَنْ عَدَمٍ مَعَ كُلِّ شَيْءٍ لَا بِمُقَارَنَةٍ وَ غَيْرُ كُلِّ شَيْءٍ لَا بِمُزَايَلَةٍ.... [1]	وہ ہے، ہوا نہیں۔ موجود ہے مگر عدم سے وجود میں نہیں آیا۔ وہ ہر شے کے ساتھ ہے، نہ جسمانی اتصال کی طرح۔ وہ ہر چیز سے علیحدہ ہے، نہ جسمانی دوری کے طور پر۔

دوسری جگہ فرمایا:

وَ مَنْ قَالَ عَلَامَ فَقَدْ اَخْلَى مِنْهُ وَ مَنْ قَالَ فِيمَ فَقَدْ ضَمَّنَهُ.... [2]	جس نے یہ کہا وہ کس چیز پر ہے، اس نے اور جگہیں اس سے خالی سمجھ لیں۔ جس نے یہ کہا وہ کس چیز میں ہے اس نے اسے کسی شے کے ضمن میں فرض کر لیا۔

---

[1] نہج البلاغة خ ۱ [2] حوالہ سابق

لَهٗ مَقَالِيۡدُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ يَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ يَّشَآءُ وَيَقۡدِرُ ؕ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ﴿۱۲﴾

۱۲۔ آسمانوں اور زمین کی کنجیاں اس کی ملکیت ہیں وہ جس کے لیے چاہتا ہے رزق میں کشادگی اور تنگی دیتا ہے، وہ یقیناً ہر چیز کا خوب علم رکھنے والا ہے۔

تفسیر آیات

مشرکین اپنے معبودوں کو رازق سمجھتے تھے۔ ان کی رد میں فرمایا:

۱۔ لَهٗ مَقَالِيۡدُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ: آسمانوں اور زمین میں موجود خزانوں کی کنجیاں اللہ کے پاس ہیں۔ ان خزانوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے تو ان پر اللہ تعالیٰ کی گرفت ہے۔ کسی غیر اللہ کے لیے ان خزانوں تک رسائی حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔

۲۔ يَبۡسُطُ الرِّزۡقَ: ان خزانہ ہائے آسمان و زمین سے اللہ ہی رزق فراہم کرتا ہے آسمان سے پانی برسا کر، زمین کو روئیدگی عنایت کر کے۔ جسے فروانی کے ساتھ رزق دینا اللہ کی مشیت میں ہو تو اس کے لیے اسباب و وسائل فراہم کر دیتا ہے۔

جسے رزق کے اعتبار سے تنگی میں رکھنا ہو تو اس سے اسباب و وسائل سلب کرتا ہے۔ مثلاً اس میں چابک دستی نہیں ہوتی۔ سست و کاہل ہوتا ہے۔

۳۔ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ: اللہ اپنے علم کے مطابق رزق میں فراوانی یا تنگی کرتا ہے کہ کون سا بندہ کس اہلیت کا مالک ہے۔ رزق کی فراوانی کبھی برائے امتحان و آزمائش اور کبھی از باب عذاب و عقاب اور کبھی از باب رحمت ہوتی ہے۔ اسی طرح تنگی بھی۔

شَرَعَ لَكُمۡ مِّنَ الدِّيۡنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوۡحًا وَّالَّذِىۡۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ وَمَا وَصَّيۡنَا بِهٖۤ اِبۡرٰهِيۡمَ وَمُوۡسٰى وَعِيۡسٰۤى اَنۡ اَقِيۡمُوا الدِّيۡنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوۡا فِيۡهِ ؕ كَبُرَ عَلَى الۡمُشۡرِكِيۡنَ مَا تَدۡعُوۡهُمۡ اِلَيۡهِ ؕ اَللّٰهُ يَجۡتَبِىۡۤ اِلَيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ وَ

۱۳۔ اس نے تمہارے لیے دین کا وہی دستور معین کیا جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا اور جس کی ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی ہے اور جس کا ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا کہ اس دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا، مشرکین کو وہ بات ناگوار گزری ہے جس کی طرف آپ انہیں دعوت دیتے ہیں، اللہ جسے چاہتا ہے اپنا برگزیدہ بنا لیتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے

يَهۡدِيۡۤ اِلَيۡهِ مَنۡ يُّنِيۡبُ ۝۱۳ اسی کو اپنی طرف راستہ دکھاتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ شَرَعَ لَكُمۡ مِّنَ الدِّيۡنِ: دین پر عمل کرنے کے طریقے کو شریعت کہا جاتا ہے۔ ہر دور کی شریعت مختلف ہونے کے باوجود شریعت، دین سے مختلف چیز نہیں ہے۔ جیسا کہ دین اور شریعت میں فرق سمجھنے میں کچھ لوگوں کو دشواری پیش آئی ہے۔

اللہ کے دین واحد پر عمل کرنے کے لیے ہر دور میں اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق مختلف طریقے نافذ رہے ہیں۔ اولین طریقہ فطری تقاضے ہیں کہ ابتدائی انسان ابھی ملکیت سے آشنا نہیں تھا، اس لیے مفادات کا ٹکراؤ اور مصلحتوں کا تصادم بھی وجود میں نہیں آیا۔ نہایت سادہ زندگی اور رہن سہن کے طریقے ایسے تھے جو فطرت سے متصادم نہیں تھے۔

جب انسان ملکیت سے آشنا ہوئے، اجتماعی زندگی میں مفادات کا تصادم شروع ہوا۔ اس تصادم کی وجہ سے خواہشات کا مغلوب یہ انسان فطرت کے تقاضوں سے دور ہونا شروع ہو گیا۔ جب انسان فطری تقاضوں سے دور ہونے لگا اور ان میں قانون و شریعت لینے کی اہلیت بھی آ گئی تو اس انسان کو واپس اس کے فطری تقاضوں کی طرف لانے کے لیے شریعت کا آغاز ہو گیا۔

شَرَعَ لَكُمۡ: تمہارے لیے واضح راستہ بنایا۔ شَرَعَ (شریعت) کے لغوی معنی واضح راستہ کے ہیں۔ اصطلاح میں ضابطہ اور قانون و دستور کے معنوں میں بولا جاتا ہے۔ قانون و شریعت بنانے والے کو شارع اور اس پر عمل پیرا ہونے والے کو متشرع کہتے ہیں۔

شارع: اسلامی مسلمہ عقیدے کے مطابق صرف اللہ ہے۔ شریعت اور قانون بنانا اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ ہے۔ کسی غیر اللہ کو اس میں مداخلت کا حق حاصل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب شیعہ اثنا عشری کے مطابق کسی قانون اور حکم شرعی کے اثبات کے لیے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، دلیل کی ضرورت ہے۔ دلیل کے بغیر کسی حکم کا اللہ کی طرف نسبت دینا جائز نہیں ہے۔

یہ بھی اس مذہب کے مسلمات میں سے ہے کہ دلیل کے دلیل ہونے کے لیے ''یقین'' شرط ہے۔ دوسرے لفظوں دلیل صرف ''یقین'' ہے۔ جب تک اس کے دلیل ہونے پر یقین نہ ہو وہ دلیل نہیں بنتی۔ لہٰذا پہلے مرحلے میں ''یقین'' دلیل ہے۔ دوسرے مرحلے میں وہ چیز بھی دلیل بن جائے گی جس کے دلیل ہونے پر یقین ہو۔

لہٰذا صریح قرآن اور متواتر احادیث سے یقین حاصل ہوتا ہے اور یقین بذات خود دلیل ہے اور عادل اور ثقہ کی روایت بھی دلیل ہے چونکہ اس کے دلیل ہونے پر یقین حاصل ہے اور یقین کا مصدر صریح

قرآن اور سنت متواترہ ہے۔

اس حکم عقلی سے بھی یقین حاصل ہوتا ہے جس پر تمام عقلاء کا اتفاق ہو۔ جیسے عدل کی اچھائی اور ظلم کی برائی پر تمام عقلاء کا اتفاق ہے۔

اس اصول کے تناظر میں مذہب اہل بیت قیاس کو دلیل نہیں سمجھتا چونکہ اس کے دلیل ہونے پر یقین حاصل نہیں ہے بلکہ روایات متواترہ اہل بیت علیہم السلام سے اس کے دلیل ہونے کی نفی ثابت ہے۔

چونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی حاکیت اعلیٰ کا مسئلہ ہے اور تشریع و قانون سازی میں مداخلت شرک ہے اس لیے مذہب اہل بیت علیہم السلام کے مضبوط توحیدی موقف کا یہ لازمہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حاکیت اعلیٰ میں مداخلت لازم آنے والی ہر چیز سے احتراز کیا جائے۔

مِّنَ الدِّیۡنِ: اس شریعت کا سرچشمہ دین ہے۔ شریعت، دین پر عمل کرنے کا طریقہ، شرعة و منهاج ہے۔ دوسرے لفظوں میں دین کو اصول اور شریعت کو فروع کا درجہ حاصل ہے کہ شریعت کے بغیر دین پر عمل نہیں ہو سکتا اور دین کے بغیر شریعت کا کوئی مفہوم نہیں بنتا۔ چنانچہ دین کے معنی اطاعت کے ہیں اور اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ ...[1] کے تحت اسلام کے معنی تسلیم و انقیاد کے ہیں۔ اس طرح دین اطاعت کے معنوں میں اور اسلام، تسلیم و انقیاد کے معنوں میں ہے۔ شریعت نے آ کر بتانا ہے کہ اطاعت، تسلیم و انقیاد کس طریقے سے ہو سکتی ہے۔

یہاں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام ایک دین، یعنی اطاعت و تسلیم کی طرف بلاتے تھے جب کہ اس اطاعت و تسلیم کا طریقہ (شریعت) ہر دور کے تقاضوں کے مطابق تھا۔ لہٰذا دین اور شریعت ناقابل تفریق ہیں، لہٰذا بےعمل عقیدے کو دین نہیں کہتے۔ اسی طرح بے عقیدہ عمل کو شریعت نہیں کہتے۔ اسلام مسیحیت کی طرح دین بلا شریعت نہیں ہے، نہ کمیونزم کی طرح قانون بلا دین ہے۔

دین و شریعت میں تفریق نہ ہونے کی وجہ سے کبھی شریعت کو دین کہا گیا۔ جیسے لَاۤ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ ...[2] چنانچہ اِکۡرَاہَ کا تعلق عمل سے ہے جو شریعت سے متعلق ہے۔

۲۔ مَا وَصّٰی بِہٖ: فطرت کی راہ سے بھٹکنے والے اس انسان کو پہلی بار حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں شریعت دی گئی۔ حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے شریعت نہیں دی گئی چونکہ دین پر عمل پیرا لوگ اپنے فطری تقاضوں کے مطابق دین پر عمل کرتے تھے اور حضرت نوح علیہ السلام موجودہ انسانی نسل کے دوسرے ابوالبشر ہیں۔

۳۔ وَّ الَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ: اللہ نے تمہارے لیے دین کا وہی دستور معین کیا جس کا اس نے نوح علیہ السلام کو حکم دیا تھا اور جس کی آپؐ کی طرف وحی بھیجی ہے۔ شریعت کی ابتدا اور تکمیل کا ذکر ہے کہ اللہ نے انسانوں

---

[1] ۳ آل عمران: ۱۹　[2] ۲ بقرہ: ۲۵۶

کے لیے دستور حیات دنیا نوح علیہ السلام کے زمانے سے شروع کیا اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں اسے تکمیل تک پہنچایا۔

حضرت نوح علیہ السلام کو جو شریعت عنایت ہوئی اس کے لیے وَصّٰی عہد کیا، حکم دیا کے ساتھ تعبیر فرمایا۔ ممکن ہے یہ شریعت نہایت سادہ عہد اور حکم پر مشتمل تھی جب کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت کے لیے اوحینا کی تعبیر اختیار فرمائی جو ایک جامع نظام حیات کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے۔

۴۔ وَمَا وَصَّيۡنَا بِهٖۤ اِبۡرٰهِيۡمَ وَ مُوۡسٰى وَعِيۡسٰۤى : صاحبان شریعت اولوالعزم انبیاء علیہم السلام کا ذکر ہے:

i۔ پہلے صاحب شریعت حضرت نوح علیہ السلام ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام تک حضرت نوح علیہ السلام کی شریعت پر عمل ہوتا رہا۔

ii۔ دوسرے صاحب شریعت حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام تک آپؑ کی شریعت پر عمل ہوتا رہا۔

ii۔ تیسرے صاحب شریعت حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک آپؑ کی شریعت پر عمل ہوتا رہا۔

iv۔ چوتھے صاحب شریعت حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت کے نفاذ تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر عمل ہوتا رہا۔

v۔ پانچویں صاحب شریعت حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت خاتم الشرائع ہے اور ایک جامع نظام حیات ہونے کے اعتبار سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عظیم معجزہ ہے۔ جس میں عصر تشریع سے لے کر قیامت تک کے ثابت و متغیر تقاضوں کے عین مطابق نظام حیات ہے اور کسی گوشے کو تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔

ہم نے سورہ احزاب آیت ۴۰ کے ذیل میں ان قوانین کا ذکر کیا ہے جو ایک جامع ضابطے کے تحت بدلتے ہوئے حالات کے مطابق ہو جاتے ہیں۔

یہاں حضرت آیت اللہ محسنی دام ظلہ کا وہ مکالمہ قابل ذکر ہے جو فرانس کے سفیر کے ساتھ ہوا تھا۔ فرماتے ہیں:

> فرانس کے سفیر ایک دن میرے پاس آئے اور کہا ہم مسیحی کبھی یہ مطالبہ نہیں کرتے کہ مسیحی حکومت قائم ہونی چاہیے۔ آپ لوگ اسلامی حکومت کا مطالبہ کیوں کرتے ہیں؟
>
> آیۃ اللہ نے فرمایا:
>
> آپ لوگوں کا مسیحی حکومت کا مطالبہ نہ کرنا صحیح ہے چونکہ آپ کے ہاں کوئی نظام حیات نہیں ہے جب کہ ہم اس ترقی یافتہ ترین گنجان ٹریفک کے سارے قوانین تک اپنے شرعی مصادر

سے بیان کر سکتے ہیں۔

۵۔ اَنۡ اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ: اَنۡ تفسیری ہے۔ دین کا جو دستور اور شریعت حضرت نوح علیہ السلام شروع ہوئی اور نبی خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ختم ہوئی ان شریعتوں کے ذریعے دین قائم اور نافذ کر دیا جائے چونکہ دین کا نفاذ شریعت کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے۔

۶۔ وَلَا تَتَفَرَّقُوۡا فِیۡہِ: اقامۂ دین میں تفرقہ نہ ڈالنا۔ اقامۂ دین اور اس کا نفاذ، شریعت اور قانون پر عمل کرنے کی صورت ہو سکتا ہے تو اس قانون کے نفاذ اور اس پر عمل کی جب نوبت آتی ہے اس وقت اس میں اختلاف نہ کرو۔ سب مل کر اس کا نفاذ کریں۔ تفرقہ کی دوسری تفسیر یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دین کے نفاذ کی جب نوبت آتی ہے تو احکام کے نفاذ میں تفریق نہ کرو کہ کچھ کو نافذ کیا جائے اور کچھ نافذ نہ کیا جائے۔ جس طرح یہود و نصاریٰ نے کیا کہ اپنے مفادات سے متصادم احکام شریعت کو معطل کر دیا۔

۷۔ کَبُرَ عَلَی الۡمُشۡرِکِیۡنَ مَا تَدۡعُوۡہُمۡ اِلَیۡہِ: تمہارا توحید اور صرف ایک معبود کی عبادت کرنے کی دعوت دینا اور اور دیگر معبودوں کو مسترد کر دینا ان مشرکین کو ناگوار گزرا ہے۔ جن معبودوں کی وہ پشت در پشت پوجا کرتے آئے ہیں، آج انہیں باطل قرار دینے کی دعوت ان مشرکین کو نہایت گراں گزری ہے۔

۸۔ اَللّٰہُ یَجۡتَبِیۡۤ اِلَیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ: اللہ ان لوگوں کو اپنی طرف جلب اور برگزیدہ کرتا ہے جو اس کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ان پر توحید نہ صرف شاق نہیں گزرے گی بلکہ وہ اس اللہ واحد کے عشق و محبت میں کیف و سرور کے عالم میں ہوتے ہیں۔

وَ مَا تَفَرَّقُوۡۤا اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَہُمُ الۡعِلۡمُ بَغۡیًۢا بَیۡنَہُمۡ ؕ وَ لَوۡ لَا کَلِمَۃٌ سَبَقَتۡ مِنۡ رَّبِّکَ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی لَّقُضِیَ بَیۡنَہُمۡ ؕ وَ اِنَّ الَّذِیۡنَ اُوۡرِثُوا الۡکِتٰبَ مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ لَفِیۡ شَکٍّ مِّنۡہُ مُرِیۡبٍ ﴿۱۴﴾

۱۴۔ اور یہ لوگ اپنے پاس علم آنے کے بعد صرف آپس کی سرکشی کی وجہ سے تفرقے کا شکار ہوئے اور اگر آپ کے پروردگار کی طرف سے ایک مقررہ وقت تک کے لیے بات طے نہ ہو چکی ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ ہو چکا ہوتا اور جو لوگ ان کے بعد کتاب کے وارث ہوئے وہ اس کے بارے میں شبہ انگیز شک میں ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمَا تَفَرَّقُوۡۤا: جو شریعت اور دستور حیات ان گزشتہ امتوں کو دیا گیا تھا ان میں اگر ان لوگوں نے تفرقہ یعنی اختلاف کیا یا تفریق فی العمل بالدین کیا تو یہ تفرقہ یا یہ تفریق اس لیے نہیں تھی کہ انہیں علم

نہیں تھا بلکہ یہ سب کچھ علم کے باوجود کیا۔ ان لوگوں نے کچھ کتاب کو مانا اور کچھ کو نہ مانا۔

۲۔ بَغۡیًۢا بَیۡنَہُمۡ: اس تفرقہ یا تفریق کی وجہ احکام شریعت سے سرکشی ہے۔ یہ سرکشی جاہ طلبی اور مفادات کی وجہ سے تھی چونکہ بغی طلب کے معنوں میں ہے۔

۳۔ لَوۡلَا کَلِمَۃٌ سَبَقَتۡ: اللہ تعالیٰ کا یہ اٹل فیصلہ نہ ہوتا کہ ظالم اور سرکش کو مہلت دینی ہے اور سرکشی کا مرتکب ہوتے ہی تباہ اور نابود نہیں کرنا تو لَّقُضِیَ بَیۡنَہُمۡ ان لوگوں کو بھی تباہ اور نابود کر دیا جاتا۔

۴۔ وَ اِنَّ الَّذِیۡنَ اُوۡرِثُوا الۡکِتٰبَ: لیکن عصر رسول ﷺ کے اہل کتاب کو اس بات پر ابھی یقین نہیں آیا کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے ہے۔ وہ اہل کتاب ہوتے ہوئے دینی کتاب پر کماحقہ ایمان نہیں رکھتے یا یہ کہ اصل کتاب ان تک پہنچی ہی نہیں۔ ایک مسخ شدہ، تحریف زدہ مکتوب ان کے پاس ہے۔

فَلِذٰلِکَ فَادۡعُ ۚ وَ اسۡتَقِمۡ کَمَاۤ اُمِرۡتَ ۚ وَ لَا تَتَّبِعۡ اَہۡوَآءَہُمۡ ۚ وَ قُلۡ اٰمَنۡتُ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنۡ کِتٰبٍ ۚ وَ اُمِرۡتُ لِاَعۡدِلَ بَیۡنَکُمۡ ؕ اَللّٰہُ رَبُّنَا وَ رَبُّکُمۡ ؕ لَنَاۤ اَعۡمَالُنَا وَ لَکُمۡ اَعۡمَالُکُمۡ ؕ لَا حُجَّۃَ بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَکُمۡ ؕ اَللّٰہُ یَجۡمَعُ بَیۡنَنَا ۚ وَ اِلَیۡہِ الۡمَصِیۡرُ ﴿۱۵﴾

۱۵۔ لہٰذا آپ اس کے لیے دعوت دیں اور جیسے آپ کو حکم ملا ہے ثابت قدم رہیں اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں اور کہد یجیے: اللہ نے جو کتاب نازل کی ہے میں اس پر ایمان لایا اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں، اللہ ہمارا رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے، ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے ہیں، ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی بحث نہیں، اللہ ہی ہمیں (ایک جگہ) جمع کرے گا اور بازگشت بھی اسی کی طرف ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَلِذٰلِکَ فَادۡعُ ۚ وَ اسۡتَقِمۡ: فَلِذٰلِکَ جب حالت یہ ہے کہ تمام لوگوں کو شریعت اور دستور حیات دیا گیا مگر لوگوں نے اس میں تفرقہ ڈالا اور علم آنے کے باوجود خواہش پرستی اور جاہ طلبی میں یہ لوگ سرکش ہوتے رہے اور انبیاء کے بعد آنے والی نسلوں تک یہ شریعت مسخ ہو کر رہ گئی، ان حالات میں

۲۔ فَادۡعُ ۚ وَ اسۡتَقِمۡ: آپ اپنی دعوت جاری رکھیں اور لوگوں کو اللہ کی وحدت اور ربوبیت کی طرف بلائیں۔ اسلامی قیادت کے لیے پہلی لازمی چیز استقامت ہے اور منزل پر یقین ہونے کی صورت میں استقامت آجاتی ہے۔

۳۔ وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ: اس خواہش میں کہ لوگ اسلامی دعوت کی طرف جذب ہو جائیں کسی قسم کی سودا بازی نہ کریں۔ اسلامی قانون اور شریعت کی طرف دعوت دینے کی راہ میں اس شریعت کی کسی ایک شق سے ہاتھ اٹھانا درست نہ ہوگا۔ اسی مصلحت پرستی میں آ کر یہود اور نصاریٰ نے اپنی شریعت کو مسخ کر دیا ہے۔ تمام مصلحتیں اللہ کی دی ہوئی شریعت میں ہیں۔

۴۔ وَقُلۡ اٰمَنۡتُ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ: آپ یہ اعلان کریں: میں کسی تفریق کے بغیر اللہ کی طرف سے آنے والی ہر کتاب اور ان میں موجود ہر شریعت کے برحق ہونے پر ایمان رکھتا ہوں۔

۵۔ وَاُمِرۡتُ لِاَعۡدِلَ بَيۡنَكُمۡ: یہ بھی اعلان کیجیے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان عدل قائم کروں جو اس شریعت کا ستون ہے۔

۶۔ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمۡ: اللہ ہمارا رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔ ایک ہی رب کے عباد ہونے میں ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی امتیاز نہیں ہے۔ ہم تمہارے نعرۂ نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ... [۱] (ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں) کو قبول نہیں کرتے۔

۷۔ لَنَاۤ اَعۡمَالُنَا وَلَكُمۡ اَعۡمَالُكُمۡ: اس طرح عمل پر مترتب ہونے والے نتائج میں بھی ہم کسی قسم کی تفریق کے قائل نہیں ہیں۔ گناہ کا ارتکاب کرنے والے یہود، مسیحی اور مسلمان یکساں ہیں۔ تمہارا یہ نعرہ قبول نہیں کہ یہود گناہ کرے تو عذاب نہ ہوگا، مسیحی گناہ کرے تو مسیحی نے اس کا کفارہ دینا ہے بلکہ ہر ایک کو اپنے عمل کا جواب دینا ہے۔

۸۔ لَا حُجَّةَ بَيۡنَنَا وَبَيۡنَكُمۡ: نفی جواز ہے، نہ نفی وجود کہ جب اہل کتاب اور اہل اسلام کا رب ایک ہے اور جزائے عمل میں ہر ایک اپنے اپنے عمل کا جوابدہ ہے تو اہل کتاب اور اہل اسلام میں سے کون کس سے بہتر اور برتر ہے کی بحث کا کوئی جواز نہیں ہے چونکہ اگر کوئی برتری آنا تھی تو دو حوالوں سے ممکن تھی: اللہ کے ساتھ نسبت اور اعمال کے آثار و نتائج۔ جب اللہ کے ساتھ نسبت ایک ہے اور اعمال کے نتائج بھی ایک جیسے ہیں تو یہاں برتری کی کوئی بحث باقی نہیں رہتی۔

۹۔ اَللّٰهُ يَجۡمَعُ بَيۡنَنَا: اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ہمیں ایک جگہ جمع کرے گا اور وہاں ہمارے درمیان فیصلہ ہوگا۔ اس جملے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ قیامت کے دن اہل حق اور اہل باطل کا آمنا سامنا ہوگا۔ اللہ کی عدالت میں دونوں جمع ہوں گے جہاں حق اور ناحق کا فیصلہ سنا دیا جائے گا۔

وَ الَّذِيۡنَ يُحَآجُّوۡنَ فِى اللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا اسۡتُجِيۡبَ لَهٗ حُجَّتُهُمۡ دَاحِضَةٌ

۱۶۔ اور جو لوگ اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں بعد اس کے کہ اسے مان لیا گیا ہے، ان کے پروردگار

---

[۱] ۵ مائدہ: ۱۸

عِنۡدَ رَبِّہِمۡ وَ عَلَیۡہِمۡ غَضَبٌ وَّ لَہُمۡ عَذَابٌ شَدِیۡدٌ ﴿۱۶﴾

کے نزدیک ان کی دلیل باطل ہے اور ان پر غضب ہے اور ان کے لیے سخت ترین عذاب ہے۔

تشریح کلمات

دَاحِضَۃٌ: (د ح ض) الدحض باطل اور زائل ہونے والی دلیل۔

تفسیر آیات

۱۔ وَالَّذِیۡنَ یُحَآجُّوۡنَ فِی اللّٰہِ: جو لوگ اللہ کی وحدانیت اور ربوبیت کے بارے میں کج بحثی کرتے ہیں انہیں ایسا کرنے کا حق شاید اس وقت مل جائے کہ اس دعوت میں کوئی معقولیت نہ ہو اور اسے عاقل لوگوں میں کوئی پذیرائی بھی نہ ملی ہو۔ نہ اس دعوت کو فطرتی تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگی حاصل ہو، نہ اس کے برحق ہونے پر کوئی حجت پوری ہوئی ہو۔

۲۔ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا اسۡتُجِیۡبَ لَہٗ: لیکن اس دعوت کو اہل عقل و خرد میں پذیرائی مل چکی ہو، فطرت سلیمہ نے اسے قبول کیا ہو، اس کے بعد منکرین کی دلیل ناقابل اعتنا اور مردود ہے۔

۳۔ وَعَلَیۡہِمۡ غَضَبٌ: ان کی دلیل مردود، ناقابل قبول ہونے کے ساتھ وہ اللہ کے غضب اور عذاب شدید کے بھی سزاوار ہیں۔

اَللّٰہُ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ وَ الۡمِیۡزَانَ ؕ وَ مَا یُدۡرِیۡکَ لَعَلَّ السَّاعَۃَ قَرِیۡبٌ ﴿۱۷﴾

۱۷۔ اللہ وہی ہے جس نے برحق کتاب اور میزان نازل کیا اور آپ کو کیا معلوم کہ شاید قیامت نزدیک آ گئی ہو۔

یَسۡتَعۡجِلُ بِہَا الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِہَا ۚ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مُشۡفِقُوۡنَ مِنۡہَا ۙ وَ یَعۡلَمُوۡنَ اَنَّہَا الۡحَقُّ ؕ اَلَاۤ اِنَّ الَّذِیۡنَ یُمَارُوۡنَ فِی السَّاعَۃِ لَفِیۡ ضَلٰلٍۭ بَعِیۡدٍ ﴿۱۸﴾

۱۸۔ جو لوگ اس (قیامت) پر ایمان نہیں رکھتے وہ اس کے بارے میں جلدی مچا رہے ہیں اور جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ اس سے ڈرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ قیامت یقیناً برحق ہے، آگاہ رہو! جو قیامت کے بارے میں جھگڑتے ہیں، وہ یقیناً گمراہی میں دور نکل گئے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اَللّٰہُ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ: اللہ کی ذات وہ ہے جس نے حقائق کے بحر بیکراں پر مشتمل کتاب (قرآن) نازل فرمائی:

وَ الۡمِیۡزَانَ: ساتھ ایسا پیمانہ بھی نازل کیا جس سے حق، ناحق میں امتیاز آجاتا، انصاف اور ناانصافی کی شناخت ہو جاتی اور ظلم و زیادتی کا علم ہو جاتا ہے۔ ایسے جامع نظام حیات پر مشتمل شریعت نازل فرمائی جس کے ذریعے حقدار کو اس کا حق مل جاتا ہے۔ ایسا پیمانہ نازل فرمایا جس سے ہر قسم کے انحراف کی شناخت ہو سکتی ہے۔

۲۔ وَ مَا یُدۡرِیۡکَ لَعَلَّ السَّاعَۃَ قَرِیۡبٌ: آپ کو کیا معلوم شاید قیامت نزدیک ہو۔ قیامت کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے اور اس کے قریب ہونے کا مطلب بھی یہی ہے کہ کسی بھی گھڑی قیامت برپا ہو سکتی ہے۔ قَرِیۡبٌ وصف ہے۔ مذکر مونث دونوں کے لیے یکساں ہے۔

۳۔ یَسۡتَعۡجِلُ بِہَا: جو لوگ قیامت کے منکر ہیں وہ قیامت کے بارے میں جلدی مچاتے ہیں اور تمسخر کے طور پر کہتے ہیں: مَتٰی ہٰذَا الۡوَعۡدُ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ۔[1] اگر تم سچے ہو تو یہ وعدہ کب پورا ہوگا؟

۴۔ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مُشۡفِقُوۡنَ مِنۡہَا: جو قیامت پر ایمان لے آئے ہیں وہ اس روز سے خوف زدہ ہیں۔ اس روز کے لیے تیاری کرتے ہیں چونکہ اس روز انہیں اپنے اعمال کا سامنا کرنا ہے۔

۵۔ اَلَاۤ اِنَّ الَّذِیۡنَ یُمَارُوۡنَ فِی السَّاعَۃِ: قیامت میں شک کرنے والے جب قیامت کے دن سے دوچار ہوں گے تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ گمراہی میں اس قدر دور نکل گئے ہیں کہ پلٹ کر آنے کے لیے راستہ نہیں چھوڑا۔

اَللّٰہُ لَطِیۡفٌۢ بِعِبَادِہٖ یَرۡزُقُ مَنۡ یَّشَآءُ ۚ وَ ہُوَ الۡقَوِیُّ الۡعَزِیۡزُ ﴿۱۹﴾ ع

۱۹۔ اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے، وہ جسے چاہتا ہے رزق دیتا ہے اور وہی بڑا طاقت والا، بڑا غالب آنے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَللّٰہُ لَطِیۡفٌۢ بِعِبَادِہٖ: اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔ بندوں سے مراد صرف اہل ایمان نہیں، سب شامل ہیں۔ لَطِیۡفٌ میں جہاں مہربانی کے معنی پائے جاتے ہیں وہاں نرمی اور باریک بینی کے معنی بھی ملحوظ ہوتے ہیں کہ اس کی مہربانی میں باریک اور معمولی بات بھی شامل ہے۔ یعنی انسان کی نہایت معمولی

[1] ۱۰ یونس: ۴۸

ترجیحات کو بھی نظر میں رکھا جاتا ہے۔ مثلاً حیض کے ابتدائی دنوں میں مجامعت کا کفارہ زیادہ اور آخری دنوں کا کفارہ کم ہے کہ چونکہ دن بڑھنے سے انسان کی جنسی خواہش میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسے لحاظ میں رکھ کر کفارہ کم رکھا ہے اور ساتھ یہ مہربانی نرمی اور رقت کے ساتھ ہے۔

۲۔ یَرۡزُقُ مَنۡ یَّشَآءُ: اسی لطافت و نرمی اور ہر قسم کی چھوٹی بڑی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر رزق عنایت فرماتا ہے۔ رزق میں ہر قسم کی عنایت شامل ہے چونکہ رزق دائمی عطا کو کہتے ہیں۔

۳۔ وَهُوَ الۡقَوِیُّ الۡعَزِیۡزُ: وہ جہاں مہربان ہے وہاں وہ طاقتور اور غالب آنے والا ہے۔ اس کی مہربانی ہر چیز تک پہنچنے میں کوئی حائل نہیں ہوسکتا۔

مَنۡ کَانَ یُرِیۡدُ حَرۡثَ الۡاٰخِرَۃِ نَزِدۡ لَهٗ فِیۡ حَرۡثِهٖ ۚ وَ مَنۡ کَانَ یُرِیۡدُ حَرۡثَ الدُّنۡیَا نُؤۡتِهٖ مِنۡهَا وَ مَا لَهٗ فِی الۡاٰخِرَۃِ مِنۡ نَّصِیۡبٍ ﴿۲۰﴾

۲۰۔ جو شخص آخرت کی کھیتی کا خواہاں ہو ہم اس کی کھیتی میں اضافہ کرتے ہیں اور جو دنیا کی کھیتی کا خواہاں ہو ہم اسے دنیا میں سے (کچھ) دے دیتے ہیں اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہ ہوگا۔

تفسیر آیات

۱۔ مَنۡ کَانَ یُرِیۡدُ حَرۡثَ الۡاٰخِرَۃِ: اس آیت میں قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے طالب دنیا سے کہا ہے کہ اسے آخرت میں کچھ نہیں ملے گا لیکن طالب آخرت سے نہیں کہا کہ اسے دنیا میں سے کچھ نہیں ملے گا۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

اِنَّ الْمَالَ وَ الْبَنِیْنَ حَرْثُ الدُّنْیَا وَ الْعَمَلَ الصَّالِحَ حَرْثُ الْآخِرَۃِ وَ قَدْ یَجْمَعُھُمَا اللّٰہُ تَعَالَی لِاَقْوَامٍ ....[1]

بے شک مال اور اولاد دنیا کی کھیتی اور عمل صالح آخرت کی کشت زار ہے اور بعض لوگوں کے لیے اللہ ان دونوں چیزوں کو یکجا کر دیتا ہے۔

اَمۡ لَهُمۡ شُرَکٰٓؤُا شَرَعُوۡا لَهُمۡ مِّنَ الدِّیۡنِ مَا لَمۡ یَاۡذَنۡۢ بِهِ اللّٰهُ ؕ وَ لَوۡ لَا کَلِمَۃُ الۡفَصۡلِ لَقُضِیَ بَیۡنَهُمۡ ؕ وَ اِنَّ الظّٰلِمِیۡنَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۲۱﴾

۲۱۔ کیا ان کے پاس ایسے شریک ہیں جنہوں نے ان کے دین کا ایسا دستور فراہم کیا ہے جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی؟ اور اگر فیصلہ کن وعدہ نہ ہوتا تو ان کے درمیان فیصلہ ہو چکا ہوتا اور ظالموں کے لیے یقیناً دردناک عذاب ہے۔

---

[1] الکافی ۵: ۵۷۔ نہج البلاغۃ خ ۲۳

تفسیر آیات

۱۔ اَمۡ لَہُمۡ شُرَکٰٓؤُا شَرَعُوۡا لَہُمۡ : کیا ان کے ہاں ایسے شریک ہیں جو اللہ سے ہٹ کر از خود دستور حیات اور نظام شریعت دے دیں؟ مشرکین اپنے خداؤں کو دنیاوی زندگی کی آسودگی کے لیے پوجتے ہیں تو ان شریکوں نے ان کی دنیاوی زندگی کو آسودہ بنانے کے لیے کون سی شریعت کون سا دستور حیات دیا ہے؟

ظاہر ہے مشرکین رسالت و نبوت کے قائل نہیں ہیں۔ ان کا اپنے معبودوں سے کوئی ایسا رابطہ نہیں ہے کہ ان سے شریعت لے لیں چونکہ ان کے معبود یا بے جان جامد ہیں یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ملائکہ کی طرح اللہ کے بندے ہیں تو ظاہر ہے کہ اللہ کی طرف سے ان کے پاس کوئی شریعت نہیں آ سکتی، ان کے شریک بھی دستور زندگی نہیں دے سکتے تو یہ معبود ان کی کون سی زندگی آسودہ کریں گے؟

۲۔ وَ لَوۡ لَا کَلِمَۃُ الۡفَصۡلِ لَقُضِیَ بَیۡنَہُمۡ : اگر اللہ ان مشرکین کو مہلت دینے کا حتمی اور اٹل فیصلہ نہ کر چکا ہوتا تو ان ظالموں کو اپنے دردناک انجام تک پہنچا چکا ہوتا۔

تَرَی الظّٰلِمِیۡنَ مُشۡفِقِیۡنَ مِمَّا کَسَبُوۡا وَ ہُوَ وَاقِعٌۢ بِہِمۡ ؕ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِیۡ رَوۡضٰتِ الۡجَنّٰتِ ۚ لَہُمۡ مَّا یَشَآءُوۡنَ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ؕ ذٰلِکَ ہُوَ الۡفَضۡلُ الۡکَبِیۡرُ ﴿۲۲﴾	۲۲۔ آپ ظالموں کو اپنے اعمال کے سبب ڈرتے ہوئے دیکھیں گے اور وہ ان پر واقع ہونے والا ہے اور جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور نیک اعمال بجا لائے ہیں وہ جنت کے گلستانوں میں ہوں گے، ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس جو وہ چاہیں گے موجود ہو گا، یہی بڑا فضل ہے۔

تشریح کلمات

رَوۡضٰتِ: (ر و ض) الروض اصل میں اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں پانی جمع ہو اور سرسبز بھی ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ تَرَی الظّٰلِمِیۡنَ مُشۡفِقِیۡنَ : جن لوگوں نے اللہ کی وحدانیت کا انکار کر کے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ ان ظالموں کو اپنے جرائم سے خوفزدہ ہوتے دیکھیں گے۔ انہیں خود اپنی کرتوتوں سے خوف لاحق ہو گا۔ اس سے اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ انسان کا عمل خود انسان کے لیے عذاب بن جاتا ہے۔

۲۔ وَ ہُوَ وَاقِعٌۢ بِہِمۡ : اور وہ کرتوت ان پر آ کر رہے گا۔ ان مشرکین کو ان کے اپنے جرائم سے

دوچار ہونا پڑے گا۔

۳۔ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا: جب کہ اہل ایمان کا واسطہ ان کے اپنے اعمال سے پڑے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ جنت کے گلستانوں میں ہوں گے۔

واضح رہے رَوۡضٰتِ الۡجَنّٰتِ جنت کا اعلیٰ ترین درجہ ہے جس پر اللہ کے خاص قرب والے بندے فائز ہوں گے۔

۴۔ لَہُمۡ مَّا یَشَآءُوۡنَ: اس روضۃ میں ہر وہ چیز موجود ہو گی جو وہ چاہیں گے۔ صرف چاہنے اور ارادہ کرنے کی دیر ہو گی۔ اس بات کی ہم نے پہلے بھی وضاحت کی ہے کہ دنیا میں انسان کو اپنے ارادوں کے نفاذ کے لیے اسباب و سائل عبور کرنا پڑتے ہیں لیکن جنت میں اہل جنت کے ارادے براہ راست نافذ ہوں گے۔

۵۔ ذٰلِکَ ہُوَ الۡفَضۡلُ الۡکَبِیۡرُ: اس قسم کی زندگی سے زیادہ فضل کبیر کا انسان تصور نہیں کر سکتا۔ روضات الجنات کی اہمیت کا اندازہ اس حدیث سے ہوتا ہے جسے زِرّ بن حُبیش نے روایت کیا ہے۔ کہتے ہیں:

> میں نے مسجد کوفہ میں حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی خدمت میں قرآن مجید کی اول سے لے کر آخر تک تلاوت کی۔ جب میں سورہ حٰمٓ عٓسٓقٓ کی اس آیت تک پہنچ گیا۔ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِیۡ رَوۡضٰتِ الۡجَنّٰتِ ... الی آخر۔ تو امیر المومنین علیہ السلام نے گریہ فرمایا یہاں تک آپ کی آواز بلند ہو گئی۔[1]

ذٰلِکَ الَّذِیۡ یُبَشِّرُ اللّٰہُ عِبَادَہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ قُلۡ لَّاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّۃَ فِی الۡقُرۡبٰی ؕ وَمَنۡ یَّقۡتَرِفۡ حَسَنَۃً نَّزِدۡ لَہٗ فِیۡہَا حُسۡنًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ شَکُوۡرٌ ﴿۲۳﴾

۲۳۔ یہ وہ بات ہے جس کی اللہ اپنے ان بندوں کو خوشخبری دیتا ہے جو ایمان لاتے ہیں اور اعمال صالح بجا لاتے ہیں، کہد یجیے: میں اس (تبلیغ رسالت) پر تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا سوائے قریب ترین رشتہ داروں کی محبت کے اور جو کوئی نیکی کمائے ہم اس کے لیے اس نیکی میں اچھا اضافہ کرتے ہیں، اللہ یقیناً بڑا بخشنے والا، قدردان ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ ذٰلِکَ الَّذِیۡ یُبَشِّرُ اللّٰہُ: یہ وہ فضل کبیر ہے جس کی اللہ تعالیٰ نیک بندوں کو بشارت دیتا

---

[1] مستدرک الوسائل ۴: ۲۷۷

ہے تاکہ یہ بشارت مومنین کے دلوں پر ایسا اثر چھوڑے جس کی وجہ سے رضائے رب کی راہ میں پیش آنے والی ہر مصیبت آسان ہو جائے۔

۲۔ قُلۡ لَّاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّةَ فِى الۡقُرۡبٰى: فضل کبیر تک رسائی کی راہنمائی ایک عظیم احسان ہے۔ خالق کے احسان کے بعد اس سے بالاتر احسان قابل تصور نہیں ہے۔

اس مہربان رسول کی مہربانی کی خود اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے:

لَقَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ عَزِيۡزٌ عَلَيۡهِ مَا عَنِتُّمۡ حَرِيۡصٌ عَلَيۡكُمۡ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ ○ [1]	تحقیق تمہارے پاس خود تم ہی میں سے ایک رسول آیا ہے تمہیں تکلیف میں دیکھنا ان پر شاق گزرتا ہے، وہ تمہاری بھلائی کا نہایت خواہاں ہے اور مومنین کے لیے نہایت شفیق، مہربان ہے۔

لوگوں کے ایمان و نجات کی طرف نہ آنے پر آپ ﷺ کی مہربانی کی وجہ سے آپ ﷺ کو کس حد تک افسوس ہوتا تھا اس کا اندازہ اس آیت سے ہوتا ہے:

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفۡسَكَ اَلَّا يَكُوۡنُوۡا مُؤۡمِنِيۡنَ ○ [2]	شاید اس رنج سے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے آپ اپنی جان کھو دیں گے۔

قُلۡ لَّاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّةَ فِى الۡقُرۡبٰى: اس آیت میں لفظ الۡقُرۡبٰى کی تین تفسیریں ہیں:

پہلی تفسیر یہ کی گئی ہے: الۡقُرۡبٰى سے مراد رسول اللہ ﷺ کی قریش کے ساتھ رشتہ داری ہے۔ اس تفسیر کے مطابق آیت کا مطلب یہ بیان کیا ہے: میں تم سے اس کام پر (یعنی تبلیغ رسالت پر) کوئی اجر نہیں چاہتا سوائے اس کے کہ اس رشتہ داری کا لحاظ کرو جو میری تمہارے ساتھ ہے۔ اس تفسیر کو زیادہ پذیرائی ملی ہے۔ اس کی تائید میں کئی ایک روایات بخاری، مسلم، ترمذی اور بیہقی وغیرہ نے نقل کی ہیں چونکہ یہ ان راویوں اور ناقلوں کی ترجیحات کے مطابق ہے۔

دوسری تفسیر میں الۡقُرۡبٰى سے تقریب مراد لیا گیا، اس تفسیر کے مطابق آیت کا یہ مطلب بنتا ہے: میں تم سے تبلیغ رسالت پر کوئی اجر نہیں مانگتا ہوں سوائے اس کے کہ تم اللہ کا قرب حاصل کرو۔

تیسری تفسیر یہ ہے: میں تبلیغ رسالت پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا ہوں سوائے اپنے قریبی رشتے داروں کی محبت کے۔

ہم ان تفاسیر میں سے کسی ایک تفسیر کو اختیار کرنے سے پہلے آیت کے کلمات کا مفہوم واضح کرتے ہیں۔ اس کے بعد آیت کا مطلب از خود واضح ہو جائے گا۔

---

[1] ۹ توبہ: ۱۲۸ [2] ۲۶ شعراء: ۳

۱۔ عَلَیۡہِ: اس پر۔ آیت میں فرمایا: لَاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ اَجۡرًا۔ اس میں عَلَیۡہِ کا مطلب کیا ہے؟ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کس چیز پر اجر نہیں مانگتے تھے۔ سب نے اتفاق کیا ہے عَلَیۡہِ کا مطلب تبلیغ رسالت اور حق کا راستہ دکھانا ہے۔ ذیل میں عَلَیۡہِ کے بارے میں مفسرین کی تشریحات اس طرح ہیں:

عَلَیۡہِ: ان علی ما اتعاطاہ لکم من التبلیغ و البشارۃ وغیرھا۔ ملاحظہ ہو روح المعانی بیضاوی، تفسیر مظھری۔

عَلَیۡہِ: ای قل یا محمد لا اسئلکم علی تبلیغ الرسالۃ جعلاً۔ تفسیر قرطبی ذیل آیت

عَلَیۡہِ: علی تبلیغ الرسالۃ۔ تفسیر جلالین ذیل آیت

عَلَیۡہِ: وضمیر علیہ عائد الی القرآن المفھوم من المقام۔ التحریر و التنویر ذیل آیت

۲۔ اَجۡرًا: اجر کے معنی کے بارے میں راغب لکھتے ہیں:

الاجر مایعود من ثواب العمل دنیویا او اخرویا. نحو قولہ اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ...[1] وَ اٰتَیۡنٰہُ اَجۡرَہٗ فِی الدُّنۡیَا ۚ وَ اِنَّہٗ فِی الۡاٰخِرَۃِ لَمِنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿﴾[2] وَ لَاَجۡرُ الۡاٰخِرَۃِ خَیۡرٌ لِّلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا...[3]

آگے لکھتے ہیں:

ولا یقال الا فی النفع دون الضر... والجزاء یقال فی النافع والضار

جیسے فرمایا: اِنَّا لَا نُضِیۡعُ اَجۡرَ مَنۡ اَحۡسَنَ عَمَلًا ﴿ۚ﴾[4]

خلاصہ یہ کہ اجر اس بہتر معاوضے کو کہتے ہیں جو اچھے کام پر دیا جاتا ہے۔ اجر یعنی صلہ اور ثواب اور جزا۔ نفع اور ضرر دونوں کے لیے بولا جاتا ہے۔

۳۔ قربیٰ: قرآنی استعمالات میں یہ لفظ قریبی ترین رشتہ دار کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

مَا کَانَ لِلنَّبِیِّ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ یَّسۡتَغۡفِرُوۡا لِلۡمُشۡرِکِیۡنَ وَ لَوۡ کَانُوۡۤا اُولِیۡ قُرۡبٰی...[5]	نبی اور ایمان والوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مشرکوں کے لیے مغفرت طلب کریں خواہ وہ ان کے قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔
وَّ لَوۡ کَانَ ذَا قُرۡبٰی...[6]	خواہ وہ قربتدار ہی کیوں نہ ہو۔
وَ اِذَا حَضَرَ الۡقِسۡمَۃَ اُولُوا الۡقُرۡبٰی...[7]	اور جب (میراث کی) تقسیم کے وقت قریب ترین رشتہ دار ...

اگر غیر رشتہ دار قریبی کے لیے یہ لفظ استعمال ہو جائے تو قرینہ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ جیسے:

---

[1] ۱۰ یونس: ۷۲ [2] ۲۹ عنکبوت: ۲۷ [3] ۱۲ یوسف: ۵۷ [4] ۱۸ کہف: ۳۰ [5] ۹ توبہ: ۱۱۳
[6] ۳۵ فاطر: ۱۸ [7] ۴ نساء: ۸

وَ الۡجَارِ ذِی الۡقُرۡبٰی ...[1] قریب ترین رشتہ دار پڑوسی...

یہاں جار (ہمسایہ) قرینہ ہے کہ مراد ہمسایہ ہے۔ ورنہ مطلق ذکر ہونے کی صورت میں اس سے قریبی رشتہ دار مراد ہوا کرتا ہے۔

پہلی تفسیر کے مطابق آیت کا مطلب یہ بنتا ہے کہ کہدیجیے عَلَیۡهِ اس تبلیغ رسالت پر یعنی تمہارے معبودوں کو باطل ثابت کرنے پر میں تم سے کوئی صلہ انعام نہیں مانگتا۔

رسول اللہ ﷺ جو کچھ لے کر آئے ہیں وہ قریش کی نظر میں بڑا جرم ہے اور جرم کا صلہ اور اجر نہیں مانگا جاتا۔ اِلَّا الۡمَوَدَّۃَ۔ استثنیٰ خواہ متصل ہو یا منفصل، دونوں صورتوں میں صرف یہ تعبیر کہ میں تم مشرکین سے تمہارے معبودوں کو باطل قرار دینے پر صلہ انعام، اجر و ثواب نہیں مانگتا، نہایت غیر مربوط ترکیب ہے:

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ اَمۡ عَلٰی قُلُوۡبٍ اَقۡفَالُهَا ○ [2] کیا لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے یا (ان کے) دلوں پر تالے لگ گئے ہیں؟

یہ بات اہل ایمان سے کی جاسکتی ہے جن پر رسول اللہ ﷺ کا احسان ہے۔

دوسری تفسیر چنداں قابل بحث نہیں ہے چونکہ المودۃ فی القربی کی ترکیب سے قرب الٰہی مراد لینا نہایت نا مربوط ہے۔

تیسری تفسیر یہ ہے کہ اس آیت کے مخاطب اہل ایمان ہیں اور یہ آیت رسول اللہ ﷺ کے قریبی ترین رشتہ داروں کی محبت کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو لوگوں نے پوچھا: یا رسول اللہ ﷺ آپ کے قریبی ترین رشتہ دار کون لوگ ہیں جن کی محبت ہم پر واجب ہے فرمایا:

علی و فاطمۃ و ابناھما۔ علی، فاطمہ اور ان کے دونوں بیٹے ہیں۔

اس روایت کو طبرانی، ابن ابی حاتم اور حاکم نے مناقب شافعی، زمخشری نے کشاف میں ابن عباس سے نقل کیا ہے نیز حضرت امام حسن علیہ السلام اور حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے بھی منقول ہے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

اس حدیث کے راوی حسب ذیل ہیں۔

i۔ حضرت ابن عباس: ان کی روایت کا ذکر اوپر ہو گیا۔

ii۔ جابر بن عبد اللہ راوی ہیں:

ایک اعرابی نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا میرے لیے اسلام پیش کیجیے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تشھد ان لا الہ الا اللہ و ان محمد عبدہ و رسولہ ” تو اس بات کی گواہی دے کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور محمد اس کے عبد اور رسول ہیں۔“ اس اعرابی نے کہا: کیا اس پر آپ کوئی اجر (صلہ) مانگتے

---

[1] ۴ نساء: ۳۶ [2] ۴۷ محمد۔ ۲۴

ہیں؟ فرمایا: لا۔ الا المودة فی القربی۔ نہیں۔ صرف قریبی ترین رشتہ داروں کی محبت کے سوا کوئی اجر نہیں مانگتا۔ اس نے کہا: میرے قریبی یا آپ کے قریبی؟ فرمایا: قرابتی، میرے قریبی۔ اس نے کہا: آیئے میں آپ کی بیعت کرتا ہوں اور جو آپ اور آپ کے رشتہ داروں سے محبت نہ کرے اس پر لعنت ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آمین۔

ملاحظہ ہو حلیة الاولیا ذکر حالات امام جعفر صادق علیہ السلام جلد ۳ صفحہ ۲۰۱۔ کفایة الطالب باب ۱۱۔

iii۔ ابو اماما باھلی کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ان اللّٰہ خلق الانبیاء من اشجار شتی و خلقت اناو علی من شجرة واحدة، فانا اصلھاو علی فرعھاو الحسن و الحسین ثمارھا و اشیاعنا اوراقھا، فمن تعلق بغصن من اغصانھانجا و من زاغ ھوی، ولو ان عبداًعبد اللّٰہ بین الصفا و المروة الف عام حتی یصیر کالشن البالی ثم لم یدرک محبتنا اکبہ اللّٰہ علی منخریہ فی النار۔ ثم تلا: قُلۡ لَّاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّۃَ فِی الۡقُرۡبٰی۔

اللہ نے انبیاء کو مختلف اشجار سے خلق فرمایا اور مجھے اور علی کو ایک ہی شجر سے خلق کیا گیا۔ پس میں اس درخت کی جڑ ہوں۔ علی (علیہ السلام) اس کی شاخ ہیں اور حسن و حسین (علیہما السلام) اس کے ثمر ہیں اور ہمارے شیعہ اس کے اوراق ہیں۔ پس جو اس شجر کی ٹہنیوں میں سے کسی ٹہنی کے ساتھ متمسک ہو جائے تو اسے نجات مل گئی اور جو منحرف ہو جائے تو وہ ہلاک ہو گیا۔ اگر کوئی بندہ صفا اور مروہ کے درمیان ایک ہزار سال اللہ کی عبادت کرے کہ وہ بوسیدہ مشکیزہ کی طرح ہو جائے پھر اسے ہماری محبت حاصل نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اسے اس کی ناک کے بل آتش میں گرا دے گا پھر اس آیت کی تلاوت فرمائی۔

ملاحظہ ہو الحسکانی شواھد التنزیل ذیل آیت۔ ابن عساکر تاریخ دمشق ۱: ۱۴۸ طبع سوم۔ ابن عساکر نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: اس روایت کو علی بن الحسن الصوفی نے دوسری بار ایک اور اسناد سے نقل کیا ہے۔

iv۔ علی بن ابی طالب: حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

فینافی ال حم ایة انه لا یحفظ مودتنا الا مؤمن ثم قرأ: قُلۡ لَّاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّۃَ فِی الۡقُرۡبٰی۔

(سورة) حم میں ہماری شان میں ایک آیت ہے (جس کے تحت) ہماری محبت کی حفاظت صرف مؤمن کرے گا۔ پھر آیہ مودت کی تلاوت فرمائی۔

ملاحظہ ہو حسکانی، شواھد التنزیل ذیل آیت۔ ابن مردویہ نے اس حدیث کا ذکر کیا ہے جسے سیوطی نے جمع الجوامع جلد دوم صفحہ ۱۹۴ پر حدیث نمبر ۲۴۶۵ کے تحت ذکر کیا ہے۔

اس قسم کی روایت کو ابو نعیم نے تاریخ اصفہانی ۲: ۱۵۵ میں نقل کیا ہے۔ صواعق محرقہ صفحہ ۱۷۰، طبع مصر ۱۳۸۵ھ اور کنز العمال میں اس حدیث کا ذکر ہے۔

v۔ حضرت امام حسن علیہ السلام: امیر المومنین علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد حضرت امام حسن علیہ السلام نے ایک خطبے میں ارشاد فرمایا:

وانا من اھل البیت الذین افترض اللّٰہ عزوجل مودتھم وولایتھم فقال فیما انزل علی محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم قُلۡ لَّاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّۃَ فِی الۡقُرۡبٰی۔

میں اس اہل بیت کا فرد ہوں جن کی محبت اور ولایت کو اللہ عزوجل واجب قرار دیا ہے۔ جیسا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ پر نازل ہونے والی کتاب میں فرمایا: قُلۡ لَّاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّۃَ فِی الۡقُرۡبٰی۔

ملاحظہ ہو مستدرك حاکم، جلد ۳، صفحہ ۱۷۲۔ مجمع الزوائد، صفحہ ۱۴۶ میں ھیثمی نے اس روایت کو بیان کرنے کے بعد لکھا ہے: واسناد احمد و بعض طرق البزار و الطبرانی فی الکبیر حسان۔ صواعق محرقہ صفحہ ۱۷۰۔

vi۔ امام علی بن الحسین زین العابدین علیہ السلام: جب حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کو اسیر بنا کر شام لایا گیا تو ایک شامی شخص نے کہا:

الحمد اللّٰہ قتلکم واستا صلکم و قطع قرن الفتنۃ۔ حمد ہو اس ذات کے لیے جس نے تمہیں قتل کیا اور تباہ کر دیا اور فتنہ کا سلسلہ کاٹ دیا۔ اس پر حضرت امام زین العابدین علیہ السلام نے اس سے پوچھا: کیا تم نے قرآن پڑھا ہے؟ اس نے کہا: ہاں! فرمایا: کیا تم ال حم پڑھا ہے؟ کہا: میں نے قرآن پڑھا ہے ال حم نہیں پڑھی۔ فرمایا: کیا تم نے یہ آیت نہیں پڑھی: قُلۡ لَّاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّۃَ فِی الۡقُرۡبٰی؟ اس شامی نے کہا: کیا آپ لوگ وہی ہیں (جن کی محبت فرض ہے)؟ فرمایا: ہاں۔

ملاحظہ ہو تفسیر طبری، ذیل آیت۔ الصواعق المحرقہ صفحہ ۱۷۰۔ تفسیر ابن کثیر ذیل آیت۔

تابعین میں سے درج ذیل راویوں نے اس حدیث کو نقل کیا ہے:

i۔ عمرو بن شعیب سے آیت مودت کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: قربی النبیؐ، نبیؐ کے قریبی رشتہ دار مراد ہیں۔ حسکانی، شواھد التنزیل، ذیل آیت۔ تفسیر ابن کثیر ذیل آیت۔

ii۔ سعید بن جبیر: ان کا موقف سب کے لیے عیاں ہے کہ الۡقُرۡبٰی سے مراد نبی کے قرابت دار ہیں۔ ملاحظہ ہو احیاء المیت سیوطی۔ شواھد التنزیل۔

iii۔ مجاھد: جلال الدین سیوطی نے الدرالمنثور میں اس آیت کے ذیل میں مجاھد کا اس بارے میں موقف بیان کیا ہے۔

حافظین حدیث و مفسرین قرآن میں درج ذیل شخصیتوں نے حدیث مودت کو اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔ صاحب الغدیر نے جلد سوم صفحہ ۱۷۲ میں ان کا ذکر کیا ہے:

امام احمد	ابن المنذر	الطبری	الطبرانی
ابن مردديه	ابو عبد الله الملا	ابو الشيخ	النسائی
الواحدی	البغوی	البزار	ابن المغازلی
الحسكانی	الزمخشری	ابن عساكر	ابو الفرج
الحموينی	ابن طلحة	الرازی	ابوالسعود
ابوحيان	البيضاوی	النسفی	الهيثمی
ابن الصباغ	المناوی	القسطلانی	الزرندی
الحازن	ابن حجر	السهودی	السيوطی
الصفوری	الشبلنجی	ابو حيان اندلسی	النبهانی
الحضرمی			

امام شافعی کے یہ اشعار مشہور ہے:

یا اهل بیت رسول الله حبكم فرض من الله فی القرآن انزله
كفاكم من عظيم القدر انكم من لم يصل عليكم لاصلوة له

اے رسول اللہؐ کے اہل بیت تمہاری محبت اللہ کی طرف سے فرض ہے جسے قرآن میں نازل کیا ہے
تمہاری عظیم القدری کے لیے اتنا کافی ہے کہ جو تم پر درود نہیں بھیجتا اس کی نماز نہیں ہوتی۔

ابن کثیر کی خیانت: ابن ابی حیان نے اپنی تفسیر جلد دہم صفحہ ۳۲۷۶ اس آیت کے ذیل میں یہ حدیث اس طرح ثبت فرمائی:

عن ابن عباس قال: لما نزلت هذه الآية قُلۡ لَّاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَیۡهِ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّةَ فِی الۡقُرۡبٰی قالوا يا رسول اللهؐ من قرابتك هؤلاء الذين وجبت مودتهم؟ قال علی و فاطمة وولداها۔

ابن عباس کہتے ہیں: جب یہ آیت قُلۡ لَّاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَیۡهِ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّةَ فِی الۡقُرۡبٰی نازل ہوئی تو لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ! آپ کے یہ قریبی رشتہ دار کون ہیں جن کی محبت واجب ہوگئی ہے؟ فرمایا: علی، فاطمہ اور ان کے دو بیٹے۔

ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اس روایت کو تفسیر ابی حیان سے نقل کرتے ہوئے اس حدیث

میں اس طرح تحریف کی:

من قرابتك هؤلاء الذين وجبت مودتهم؟ قال: فاطمه و ولداها رضى الله عنهما۔

اس نے حضرت علی علیہ السلام کا نام حذف کر دیا۔ ہم نے دوسرے مقامات پر بھی ان کی طرف سے اس قسم کی بہت سی تحریفات دیکھی ہیں۔ کبھی نام حذف کرتے ہیں اور کبھی نام کی جگہ کذا و کذا رکھ لیتے ہیں۔

اعتراضات

اس آیت سے اہل بیت علیہم السلام کی مودت واجب ہونا جنہیں گراں گزرتا ہے انہوں نے اپنی ذاتی تشفی کے لیے چند ایک اعتراضات اٹھائے ہیں:

پہلا اعتراض: پہلا اعتراض یہ ہے کہ سورہ شوریٰ مکی ہے۔ یہ سورہ اس وقت نازل ہوئی کہ ابھی حضرت علی علیہ السلام اور حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی تو کیسے ممکن ہے یہ آیت حسنین کی شان میں نازل ہو۔

جواب: قرآن مجید میں ایسی مثالیں بہت ہیں کہ ایک سورہ مکی ہے لیکن اس کی بعض آیات مدینہ میں نازل ہوئیں۔ اسی طرح بعض سورتیں مدنی ہیں مگر ان کی بعض آیات مکہ میں نازل ہوئیں۔

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: الاتقان فی علوم القرآن، جلد اول، صفحہ ۸۔ لغات الحدیث علامہ وحید الزمان مادہ ضرّ، و ما یضرك، صفحہ ۲۹، طبع کراچی۔

کوئی ذمہ دار شخص اس بات کا قائل نہیں ہے کہ آیت مودت مکی ہے بلکہ سورہ شوریٰ کے بارے میں کہتے ہیں یہ مکی سورہ ہے۔ یہ بات سب کے لیے واضح ہے کہ سورہ کے مکی ہونے سے آیت کا مکی ہونا ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس آیت کے مدنی ہونے کی صراحت موجود ہے۔ چنانچہ قرطبی نے اپنی تفسیر ۱۶: ۱ میں، نیشاپوری نے اپنی تفسیر میں، خازن نے اپنی تفسیر ۴: ۴۹ میں، شوکانی نے فتح القدیر ۴: ۵۱۰ میں وغیرھم نے ابن عباس اور قتادہ سے روایت کی ہے کہ سورہ شوریٰ مکی ہے۔ سوائے چار آیات کے جو قُلۡ لَّاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّۃَ فِی الۡقُرۡبٰی سے شروع ہوتی ہیں۔ یہ چار آیات مدنی ہیں۔ ملاحظہ ہو الغدیر، جلد سوم، صفحہ ۱۷۲۔

دوسرا اعتراض: یہ اعتراض تفہیم القرآن کے مؤلف کو زیادہ پسند ہے اور اس اعتراض کو وہ سب سے زیادہ اہم قرار دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ان کے اپنے الفاظ میں۔ تفہیم القرآن کی جلد ۴ صفحہ ۵۰۱ پر رقمطراز ہیں:

وہ یہ ہے کہ ایک نبی جس بلند مقام پر کھڑا ہو کر دعوت الی اللہ کی پکار بلند کرتا ہے۔
اس مقام سے اس کار عظیم پر یہ اجر مانگنا کہ تم میرے رشتہ داروں سے محبت کرو، اتنی
گری ہوئی بات ہے کہ کوئی صاحب ذوق سلیم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اللہ نے
اپنے نبی کو یہ بات سکھائی ہوگی اور نبی نے قریش میں کھڑے ہو کر یہ بات کہی ہوگی۔

جواب: ہم نے ثابت کیا ہے کہ آیت مدنی ہے اور مخاطب مومنین ہیں۔ بنی قریش نہیں ہیں۔ تفہیم القرآن کے مؤلف کا یہ جملہ:

"اس کار عظیم پر یہ اجر مانگنا کہ تم میرے رشتہ داروں سے محبت کرو اتنی گری ہوئی بات ہے کہ کوئی صاحب ذوق سلیم اس کا تصور نہیں کر سکتا"

انتہائی گستاخی اور جسارت ہے نبی اور اولاد نبی کی شان میں کہ کسی نبی کا اپنی اولاد کے بارے میں اس قسم کا موقف اختیار کرنا "اتنی گری ہوئی بات ہے کہ کوئی صاحب ذوق سلیم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔" ہم ذیل میں اس کا تصور اور ذوق سلیم بیان کریں گے جو انبیاء علیہم السلام میں موجود تھا:

i۔ **حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذوق سلیم:** حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ سے درخواست کرتے ہیں کہ لوگوں کے دلوں کو میری اولاد کا مشتاق بنا۔ جب اللہ سے مانگتے ہیں تو اس کا لازمہ یہ ہے کہ لوگوں سے بھی توقع رکھ رہے ہیں کہ وہ ان کی اولاد سے محبت کریں۔ ملاحظہ ہو سورہ ابراہیم کی آیت ۳۷:

رَبَّنَآ اِنِّيۡۤ اَسۡكَنۡتُ مِنۡ ذُرِّيَّتِيۡ بِوَادٍ غَيۡرِ ذِيۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَيۡتِكَ الۡمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ فَاجۡعَلۡ اَفۡـئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهۡوِىۡۤ اِلَيۡهِمۡ وَارۡزُقۡهُمۡ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمۡ يَشۡكُرُوۡنَ ○	اے پروردگار! میں نے اپنی اولاد میں سے بعض کو تیرے محترم گھر کے نزدیک ایک بنجر وادی میں بسایا، ہمارے پروردگار! تاکہ یہ نماز قائم کریں لہٰذا تو کچھ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اور انہیں پھلوں کا رزق عطا فرما تاکہ یہ شکر گزار بنیں۔

من فمك ادينك کے طور پر ہم اس آیت کا تفہیم القرآن کا ترجمہ پیش کرتے ہیں:

پروردگار میں نے ایک بے آب و گیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے۔ پروردگار یہ میں نے اس لیے کیا ہے کہ یہ لوگ یہاں نماز قائم کریں۔ لہٰذا تو لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا اور انہیں کھانے کے پھل دے شاید یہ شکر گزار بنیں۔

فَاجۡعَلۡ میں فَا تفریعی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس عمل کے صلے میں اپنی اولاد کے لیے لوگوں کی محبت مانگ رہے ہیں۔ تَهۡوِىۡۤ اِلَيۡهِمۡ میں اِلَيۡهِمۡ کی ضمیر ذُرِّيَّتِيۡ کی طرف راجع ہے۔

ii۔رسول اللہ ﷺ کا ذوق سلیم:

الف۔ حدیث ثقلین جو تواتر سے ثابت ہے۔ اس میں کتاب خدا اور اپنی عترت سے متمسک رہنے کا حکم دیا۔ یہ آپ کو گری ہوئی بات لگتی ہوگی کہ اپنی اولاد سے متمسک رہنے کا حکم دیں۔

ب: درود ابراہیمی میں آل درود بھیجنے کی تعلیم دی ہے۔ یہ بھی آپ کے لیے قابل تصور نہ ہوگا کہ اپنے ساتھ اپنی اولاد پر درود بھیجنے کا حکم دیں۔ اسی وجہ سے آپ آل سے مراد پیروکار لیتے ہیں اور اس پر آل فرعون سے استدلال کرتے ہیں کہ فرعون کے ماننے والوں کو آل فرعون کہا ہے۔ نہ معلوم انہیں آل فرعون کیوں یاد آتے ہیں جب کہ اس درود میں آل ابراهیم کا ذکر ہے تو دیکھنا یہ چاہیے تھا کہ آل ابراهیم کون ہیں؟ قرآن نے اس بات کو واضح کر دیا کہ آل ابراهیم کون ہیں: فَقَدۡ اٰتَیۡنَاۤ اٰلَ اِبۡرٰهِیۡمَ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ ....[1] ہم نے آل ابراہیم کو کتاب و حکمت عطا کی۔

ج: آیۂ تطہیر کے نزول کے موقع پر حضور ﷺ کی دعا بھی آپ کو غیر مناسب لگے گی۔ جو روایت آپ نے خود تفہیم القرآن ۴: ۹۳ پر آیت تطہیر کے ذیل میں حضرت عائشہ سے نقل کی ہے کہ حضورؐ نے حضرت علی اور فاطمہ اور حسن و حسین رضی اللہ عنہم کو بلایا اور ان پر ایک کپڑا ڈال دیا اور دعا کی: **اللّٰهم هؤلاء اهل بيتى و اذهب عنهم الرجس و طهرهم تطهيراً۔** پھر آپ اہل بیت علیہم السلام میں ان کے علاوہ ان لوگوں کو بھی شامل کرنا چاہتے ہیں جو اس چادر میں نہیں تھے۔ اگر ایسا ہے تو حضور ﷺ نے گھر کی چاردیواری کے احاطے میں کپڑے کا احاطہ کیوں بنایا؟

د: تواتر معنوی سے ثابت ہے کہ رسول ﷺ نے اپنی اولاد کے ساتھ محبت کو جزو ایمان قرار دیا ہے اور اس مطلب کو مختلف مواقع پر مختلف لفظوں میں بیان فرمایا: حضرت علی، حضرت فاطمہ اور حضرات حسنین علیہم السلام کے بارے میں صحاح میں موجود احادیث آپ کی نظر سے گزری ہیں۔ ان تمام احادیث میں امت کو ان سے محبت کرنے کی تاکید کی گئی ہے جو آپ کو گری ہوئی بات لگتی ہے حالانکہ آپ منکرین حدیث کا شد و مد سے مقابلہ کرتے رہے ہیں۔

تفہیم القرآن اپنے اعتراض کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> پھر یہ بات اور بھی زیادہ بے موقع نظر آتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس تقریر کے مخاطب اہل ایمان نہیں بلکہ کفار ہیں۔ اوپر سے ساری تقریر انہی سے خطاب کرتے ہوئے چلی آ رہی ہے اور آگے بھی روئے سخن انہی کی طرف ہے۔ اس سلسلۂ کلام میں مخالفین سے کسی نوعیت کا اجر طلب کرنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ اجر تو ان

---

[1] ۴ نساء: ۵۴

لوگوں سے مانگا جاتا ہے جن کی نگاہ میں اس کام کی کوئی قدر ہو۔[1] جو کسی شخص نے اس کے لیے انجام دیا ہو۔ کفار حضورؐ کے اس کام کی کون سی قدر کر رہے تھے کہ آپ ان سے یہ بات فرماتے کہ یہ خدمت جو میں نے تمہاری انجام دی اس پر تم میرے رشتہ داروں سے محبت کرنا۔ وہ تو الٹا اسے جرم سمجھ رہے تھے اور اس بنا پر آپ کی جان کے درپے تھے۔

جواب: عجب اتفاق ہے کہ آپ کا یہ اعتراض خود آپ کی اختیار کردہ پہلی تفسیر پر وارد ہوتا ہے۔ جس میں آپ نے آیت کا مخاطب کفار قریش کو قرار دیا ہے۔ اسے اب آپ نے خود مسترد کر دیا۔ رہا آپ کا یہ کہنا کہ اوپر سے ساری تقریر انہی یعنی کفار سے خطاب کرتے ہوئے چلی آ رہی ہے، نہایت غیر ذمہ دارانہ بات ہے جب کہ سلسلہ کلام وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِیۡ رَوۡضٰتِ الۡجَنّٰتِ سے لے کر وَمَنۡ یَّقۡتَرِفۡ حَسَنَۃً نَّزِدۡ لَہٗ فِیۡہَا حُسۡنًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ شَکُوۡرٌ تک اہل ایمان کے بارے میں ہے اور آیہ مودت اہل ایمان سے خطاب کے سلسلہ کلام کے درمیان ہے۔

دنیا کی ستم ظریفی یہ ہے کہ اولاد خاتم النبیین ﷺ کو اس حد تک نظر انداز کیا گیا کہ ان لوگوں کے ذہن کے گوشے میں بھی نہیں آتا کہ یہ اولاد رسول ﷺ ہیں۔ ان کا دیگر لوگوں کی اولاد کے ساتھ موازنہ کرتے ہیں کہ اپنی اولاد، اپنے رشتہ داروں کے بارے میں اس قسم کی بات کرنا ذوق سلیم کے خلاف ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ ؕ ...[2]	میں تمہیں لوگوں کا امام بنانے والا ہوں، انہوں نے کہا: اور میری اولاد سے بھی؟

نیز فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰۤی اٰدَمَ وَنُوۡحًا وَّاٰلَ اِبۡرٰہِیۡمَ وَاٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿ۙ﴾ ذُرِّیَّۃًۢ بَعۡضُہَا مِنۡۢ بَعۡضٍ ...[3]	اللہ نے آدم اور نوح اور آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام دنیا والوں پر ترجیح دے کر منتخب کر دیا۔ یہ ایک سلسلے کے لوگ تھے جو ایک دوسرے کی نسل سے پیدا ہوئے...[4]

سورہ الانعام میں ابراھیم، اسحاق، نوح، داود، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ھارون، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، اسماعیل، الیسع، یونس اور لوط علیہم السلام کے ذکر کے بعد فرمایا:

وَمِنۡ اٰبَآئِہِمۡ وَذُرِّیّٰتِہِمۡ وَاِخۡوَانِہِمۡ ۚ	اور اسی طرح ان کے آبا اور ان کی اولاد اور ان کے

[1] یہ بھی آپ کی نظر میں اتنی گری ہوئی بات ہے کہ کوئی صاحب ذوق سلیم اس کا تصور نہیں کر سکتا۔ واضح رہے یہ آیت مدنی ہے اور اس کے مخاطب اہل ایمان ہیں۔

[2] بقرہ: ۱۲۴ [3] آل عمران: ۳۳۔۳۴ [4] ترجمہ تفہیم القرآن

وَ اجۡتَبَیۡنٰہُمۡ وَ ہَدَیۡنٰہُمۡ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ [۱]

بھائیوں کو بھی (ہدایت دی) اور ہم نے انہیں منتخب کر لیا اور ہم نے راہ راست کی طرف ان کی رہنمائی کی۔

قرآن کی دیگر آیات سے آیت مودت کی ہماری تفسیر و تشریح کی تائید ہوتی ہے۔

قُلۡ مَاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ مِنۡ اَجۡرٍ اِلَّا مَنۡ شَآءَ اَنۡ یَّتَّخِذَ اِلٰی رَبِّہٖ سَبِیۡلًا [۲]

کہدیجیے: اس کام پر میں تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا مگر یہ (چاہتا ہوں) کہ جو شخص چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کر لے۔

رب کا راستہ اختیار کرنا اجر رسالت ہے۔ سبیل رب کے اختیار سے رسول اللہ ﷺ کو مسرت حاصل ہوتی ہے چونکہ رب کا راستہ دکھانے کے لیے جو مشقتیں اٹھائی ہیں، وہ رائگاں نہیں جاتیں۔

قُلۡ مَا سَاَلۡتُکُمۡ مِّنۡ اَجۡرٍ فَہُوَ لَکُمۡ ... [۳]

کہدیجیے: جو اجر (رسالت) میں نے تم سے مانگا ہے وہ خود تمہارے ہی لیے ہے....

ایسا معلوم ہوتا ہے یہ دونوں آیتیں آیت مودت کے لیے تمہیدی آیات ہیں۔ اہل بیت کی مودت سے راہ رب اختیار کرنا عمل میں آتا ہے اور یہ خود مومنین کے مفاد میں ہے۔

تفسیر مظہری میں اس آیت کی بڑی صائب تفسیر کی گئی ہے۔ عبارت ملاحظہ ہو:

وقیل معناہ: مَاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ مِنۡ اَجۡرٍ **بقولی:** مَاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ مِنۡ اَجۡرٍ اِلَّا مَنۡ شَآءَ اَنۡ یَّتَّخِذَ اِلٰی رَبِّہٖ سَبِیۡلًا۔ **قولہ** قُلۡ لَّاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّۃَ فِی الۡقُرۡبٰی **فھو لکم، ای لفائدتکم لان اتخاذ السبیل الی اللہ ینفعکم و قربائی قرباکم قلت: بل قربی النبی صلی اللہ علیہ وسلم علماء الظاھر والباطن من اھل بیتہ و غیرھم، و مودتھم یورث التقرب الی اللہ سبحانہ۔**

بعض کہتے ہیں: آیت کے معنی یہ ہیں: جو میں نے (ان دو آیتوں میں) تم سے اجر مانگا ہے یہ کہہ کر: ”کہدیجیے: اس کام پر میں تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا مگر یہ (چاہتا ہوں) کہ جو شخص چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کر لے“ اور یہ کہکر: ”میں اس (تبلیغ رسالت) پر تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا سوائے قریب ترین رشتہ داروں کی محبت کے۔“ وہ اجر خود تمہارے لیے ہے یعنی تمہارے فائدے میں ہے چونکہ سبیل رب کا اختیار کرنا تمہارے لیے فائدہ مند ہے اور میرے قریبی تمہارے قریبی ہے۔ میں (مؤلف تفسیر مظہری) کہتا ہوں: بلکہ نبی ﷺ کے اہل بیت سے جو قریبی ہیں وہ ظاہر و باطن کے علماء ہیں ان کی محبت اللہ سبحانہ کی قربت کا وسیلہ ہے۔

[۱] ۶ انعام: ۸۷ [۲] ۲۵ فرقان: ۵۷ [۳] ۳۴ سباء: ۴۷

چنانچہ امت اگر اہل بیت علیہم السلام کی محبت اور ان کی اقتدا کرتی اور اسلامی دستور حیات کو سمجھنے کے لیے ان کی طرف رجوع کرتی تو اہل بیت علیہم السلام اس امت کی سبیل رب (راہ خدا) کی طرف راہنمائی کرتے۔ امت میں اختلاف تفرقہ کی صورت میں، مودت اہل بیت راہ حق اور سبیل رب کی طرف لے جاتی۔

تاریخ شاہد ہے کہ بعض فروعی مسائل میں مشکل پیش آنے پر اہل بیت علیہم السلام کی طرف رجوع کرنے سے وہ مشکل حل ہوگئی لیکن امت کی قیادت کے مسئلے میں اہل بیت علیہم السلام کو دور رکھنے کی وجہ سے رفتہ رفتہ یہ امت نہ ختم ہونے والے اختلافات سے دوچار ہے۔

گزشتہ مباحث سے واضح ہوگیا کہ مودت اہل بیت علیہم السلام اجر رسالت ہے اور یہ بھی واضح ہوگیا مودت اہل بیت کس طرح اجر رسالت قرار پائی؟ اور یہ بات سمجھنے میں آسانی ہوگئی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی اولاد کو نماز قائم کرنے کے لیے مکہ کی بے آب و گیاہ وادی میں آباد کرنے کے صلہ اور اجر کے طور پر اس بات کا مطالبہ کیسے فرمایا: اے اللہ تو لوگوں کے دلوں کو میری ذریت کا مشتاق بنا دے؟

قابل توجہ بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مومنین کے ساتھ نہایت مہربان مشفق ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

لَقَدۡ جَآءَکُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِکُمۡ عَزِیۡزٌ عَلَیۡہِ مَا عَنِتُّمۡ حَرِیۡصٌ عَلَیۡکُمۡ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ ۝[1]

تحقیق تمہارے پاس خود تم ہی میں سے ایک رسول آیا ہے تمہیں تکلیف میں دیکھنا ان پر شاق گزرتا ہے، وہ تمہاری بھلائی کا نہایت خواہاں ہے اور مومنین کے لیے نہایت شفیق، مہربان ہے۔

اس شفقت و مہربانی کی وجہ سے وہ اس امت کے لیے بھلائی چاہتے ہیں۔ وہ بھلائی، سبیل رب اختیار کرنا ہے۔ اس کا بہترین وسیلہ محبت و اتباع اہل بیت علیہم السلام ہے۔ اس سے رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے دل کو تسکین ہوتی ہے نیز لوگوں کے راہ راست پر نہ آنے سے آپ کو نہایت تکلیف ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

فَلَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفۡسَکَ عَلٰۤی اٰثَارِہِمۡ اِنۡ لَّمۡ یُؤۡمِنُوۡا بِہٰذَا الۡحَدِیۡثِ اَسَفًا ۝[2]

پس اگر یہ لوگ اس (قرآنی) مضمون پر ایمان نہ لائے تو ان کی وجہ سے شاید آپ اس رنج میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔

اہل بیت علیہم السلام کی محبت اور ان کی اتباع سے لوگ راہ رب پر آتے ہیں تو رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے رنج میں کمی آجاتی ہے لہٰذا رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی مومنین کے ساتھ شفقت اور لوگوں کی گمراہی پر ہونے والے رنج کا تقاضا یہ ہے کہ اگر رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو تبلیغ رسالت پر کوئی اجر اور صلہ دینا ہے تو وہ ان کی رسالت پر عمل ہے، اس عمل کی ضمانت مودت و اتباع اہل بیت علیہم السلام ہے اور ساتھ یہ اجر ہمارے اپنے فائدے میں ہے۔

وَ مَنۡ یَّقۡتَرِفۡ حَسَنَۃً نَّزِدۡ لَہٗ فِیۡہَا حُسۡنًا: اور جو کوئی نیکی کمائے ہم اس کے لیے اس نیکی میں اچھا

---

[1] ۹ توبۃ: ۱۲۸	[2] ۱۸ کہف: ۶

اضافہ کریں گے۔آیت کا یہ حصہ بھی بہترین دلیل ہے کہ خطاب مومنین سے ہے اور مودت قربیٰ ایسا حسنہ ہے جس پر حسنات کا بہتر اضافہ ہوگا۔

چنانچہ ابن عباس راوی ہیں:

وَمَنۡ یَّقۡتَرِفۡ حَسَنَۃً میں حَسَنَۃً سے مراد آل محمد ہیں۔

ملاحظہ ہو: تفسیر ثعلبی ذیل آیت وشواھد التنزیل۔ تفسیر الکشاف عن سدی تفسیر قرطبی۔

آلوسی روح المعانی میں اس جگہ لکھتے ہیں:

وحب آل الرسول علیہ الصلوۃ و السلام من اعظم الحسنات و تدخل فی الحسنۃ ھنا دخولا اولیا نَّزِدۡ لَہٗ فِیۡھَا نزد لہ فیھا ای فی الحسنۃ حسنا بمضاعفۃ الثواب علیھا یزداد بھا حسن الحسنۃ۔

آل رسول علیہ الصلوۃ والسلام کی محبت عظیم حسنات میں سے ہے اور یہ محبت حسنہ میں اولیٰ اور بنیادی طور پر داخل ہوگی پھر نَّزِدۡ لَہٗ فِیۡھَا اللہ اس حسنہ میں کئی گنا ثواب کا اضافہ فرمائے گا جس سے حسنہ کا حسن بڑھ جائے گا۔

ابن ابی حاتم کی روایت ہے:

ابن عباس نے کہا: وَمَنۡ یَّقۡتَرِفۡ حَسَنَۃً سے مراد ہے المودۃ لآل محمد۔[1]

زمخشری نے آیت کے اس جملے کے ذیل لکھا ہے:

وَمَنۡ یَّقۡتَرِفۡ حَسَنَۃً میں بظاہر سب حسنۃ اس میں شامل ہیں لیکن چونکہ ذی القربیٰ کی محبت کے ذکر کے بعد اس حسنۃ کا ذکر ہوا ہے تو ذوالقربیٰ کی محبت اس میں اولیٰ اور بنیادی طور پر شامل ہے اور باقی حسنات اس کے تابع اور ثانوی حیثیت میں ہیں۔

اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا ۚ فَاِنۡ یَّشَاِ اللّٰہُ یَخۡتِمۡ عَلٰی قَلۡبِکَ ؕ وَ یَمۡحُ اللّٰہُ الۡبَاطِلَ وَ یُحِقُّ الۡحَقَّ بِکَلِمٰتِہٖ ؕ اِنَّہٗ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ﴿۲۴﴾

۲۴۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں (رسول نے) اللہ پر جھوٹ بہتان باندھا ہے؟ پس اگر اللہ چاہے تو آپ کے دل پر مہر لگا دے اور اللہ باطل کو نابود کر دیتا ہے اور اپنے فرامین کے ذریعے حق کو پائیداری بخشتا ہے، وہ سینوں کی (پوشیدہ) باتوں سے یقیناً خوب واقف ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ: اگر ان چار آیتوں کو روایات کے مطابق مدنی تسلیم کیا جائے تو اس بات کا امکان

[1] الدرالمنثور ذیل آیت

نظر آتا ہے کہ ان آیات کا تعلق آیۂ قربی سے ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے اپنے قریبی ترین رشتہ داروں کی محبت کو اجر رسالت قرار دیا تو بیمار دل والوں اور منافقین کی طرف سے یہ الزام عائد ہو گیا ہو کہ محمد ﷺ نے اپنی طرف سے یہ بات بنا لی ہے کہ میرے قریبی ترین رشتہ داروں کی محبت اجر رسالت ہے۔ اس تفسیر کے مطابق فرمایا کہ کیا یہ لوگ اجر رسالت کو خودساختہ قرار دے رہے ہیں حالانکہ ایسا ممکن نہیں ہے کہ کوئی رسول اپنی طرف سے کسی بات کی اللہ کی طرف جھوٹی نسبت دے کیونکہ بالفرض اگر اللہ کی طرف سے مبعوث ہونے والا کوئی رسول ایسا کرے تو اس بارے میں سورہ حاقہ آیت ۴۴ تا ۴۶ میں فرمایا:

وَلَوۡ تَقَوَّلَ عَلَيۡنَا بَعۡضَ الۡاَقَاوِيۡلِ ۙ لَاَخَذۡنَا مِنۡهُ بِالۡيَمِيۡنِ ۙ ثُمَّ لَقَطَعۡنَا مِنۡهُ الۡوَتِيۡنَ ○	اور اگر اس (نبی) نے کوئی تھوڑی بات بھی گھڑ کر ہماری طرف منسوب کی ہوتی تو ہم اسے دائیں ہاتھ سے پکڑ لیتے پھر اس کی شہ رگ کاٹ دیتے۔

اور اس آیت میں فرمایا: فَاِنۡ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخۡتِمۡ عَلٰى قَلۡبِكَ ۔ واضح رہے اگر کوئی نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرے اور کوئی کلام اللہ کی طرف منسوب کرے تو اس صورت میں باقی مجرمین کی طرح اسے بھی مہلت ملتی ہے اور فوری عذاب نہیں آتا لیکن ایک سچا نبی بفرض محال کوئی جھوٹا کلام اللہ کی طرف منسوب کرے تو اسی وقت اس پر عذاب نازل ہو جاتا ہے۔

۲۔ وَيَمۡحُ اللّٰهُ الۡبَاطِلَ : اس باطل نسبت کو اسی وقت صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے۔ دشمن کی طرف سے جس باطل کو رواج دیا جاتا ہے اسے مہلت مل سکتی ہے لیکن بالفرض اگر اللہ کے برگزیدہ نبی نے کوئی باطل پیش کیا تو اسے اسی وقت مٹا دیا جائے گا۔

۳۔ وَيُحِقُّ الۡحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ : اس طرح اللہ اپنے کلمات وحی کے ذریعہ حق کو ثبات فراہم فرماتا ہے۔

۴۔ اِنَّهٗ عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ : کوئی شخص اس قسم کا جرم چھپا کر بھی انجام نہیں دے سکتا چونکہ اللہ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ یہاں تک کہ وہ چیز بھی اللہ سے پوشیدہ نہیں ہے جو ابھی سینوں کے اندر ہے۔

وَهُوَ الَّذِىۡ يَقۡبَلُ التَّوۡبَةَ عَنۡ عِبَادِهٖ وَيَعۡفُوۡا عَنِ السَّيِّاٰتِ وَ يَعۡلَمُ مَا تَفۡعَلُوۡنَ ﴿۲۵﴾	۲۵۔ اور وہ وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور گناہوں کو معاف کرتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اس کا علم رکھتا ہے۔

تفسیر آیات

مذکورہ بالا آیت کی جو تفسیر ہم نے اختیار کیا ہے اس کے تحت اس آیت کا مفہوم بھی آیت مودت کو جھٹلانے والوں سے متعلق ہے کہ جب ان میں سے بعض کو اس بات کا علم ہوا کہ مودت اہل بیت کا حکم اللہ

کی طرف سے ہے تو ان کو ندامت ہوئی۔ ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا:

۱۔ وَ هُوَ الَّذِیۡ یَقۡبَلُ التَّوۡبَۃَ: اگر جرم کا ارتکاب کرنے کے بعد انسان کے دل میں ندامت آ جائے اور آیندہ اس سے اجتناب کا پختہ ارادہ کر لیا جائے تو اللہ ایسی توبہ قبول فرماتا ہے۔ کوئی گناہ ایسا نہیں ہے جو توبہ کی صورت میں معاف نہ ہو، اگر وہ حقوق العباد سے متعلق نہیں ہے۔

۲۔ وَ یَعۡفُوۡا عَنِ السَّیِّاٰتِ: یہ گناہ اگر کبیرہ ہے تو اس صورت میں توبہ کی صورت میں معاف ہو جاتا ہے اور اگر صغیرہ ہے تو اللہ خود معاف فرماتا ہے:

اِنۡ تَجۡتَنِبُوۡا کَبَآئِرَ مَا تُنۡهَوۡنَ عَنۡهُ نُکَفِّرۡ عَنۡکُمۡ سَیِّاٰتِکُمۡ ...[1]

اگر تم ان بڑے بڑے گناہوں سے اجتناب کرو جن سے تمہیں منع کیا گیا ہے تو ہم تمہارے (چھوٹے چھوٹے) گناہ معاف کر دیں گے۔

وَ یَسۡتَجِیۡبُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ یَزِیۡدُهُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ ؕ وَ الۡکٰفِرُوۡنَ لَهُمۡ عَذَابٌ شَدِیۡدٌ ﴿۲۶﴾

۲۶۔ اور ایمان لانے والوں اور اعمال صالح بجا لانے والوں کی دعا قبول کرتا ہے اور اپنے فضل سے انہیں اور زیادہ دیتا ہے اور کفار کے لیے سخت ترین عذاب ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ یَسۡتَجِیۡبُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا: ایمان اور عمل صالح کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں جانے والوں کی بات سنی جائے گی۔ ان کی دعا قبول ہو گی ان کی ہر درخواست کو پذیرائی ملے گی۔ اپنی مغفرت اپنی نجات اپنی سعادت کے لیے جو دعا کریں گے اللہ قبول فرمائے گا۔

۲۔ وَ یَزِیۡدُهُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ: اس پر اللہ اپنے فضل و کرم سے مزید بھی عنایت فرمائے گا یعنی استجابت دعا سے آگے جو انسان کے تصور میں بھی نہیں آتا اسے بھی اللہ تعالیٰ از خود اپنے فضل سے عنایت فرمائے گا۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے آیت کے جملہ وَ یَزِیۡدُهُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ کی تفسیر میں فرمایا:

الشفاعة لمن وجبت له النار ممن احسن الیهم فی الدنیا۔[2]

مزید فضل کرے گا سے مراد اس شخص کی شفاعت ہے وہ شخص جس پر جہنم لازم ہو گئی ہو اور اس نے دنیا میں ان مومنین پر احسان کیا ہو۔

[1] ۴ نساء: ۳۱	[2] مجمع البیان۔ بحار ۶۴: ۴۹

یعنی اہل ایمان پر احسان کرنے والے شفاعت کے مستحق بنیں گے۔

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام مروی ایک طویل حدیث کے ایک حصے کا ترجمہ پیش کرتا ہوں:

کل قیامت کے دن ہمارے محبین سے کہا جائے گا: اے ولی خدا! اس میدان محشر میں دیکھو کہ کوئی ایسا آدمی ہے جس نے دنیا میں تم پر احسان کیا ہے یا تجھ سے کسی مصیبت کے ٹالنے میں مدد کی ہے یا تیرے کسی حادثے میں تیری فریاد کو پہنچا ہو یا تجھ سے کسی دشمن کو دور کیا ہو یا کسی معاملے میں تجھ پر احسان کیا ہو تو اس کا شفیع بنے گا۔ اگر وہ شخص مومنوں میں سے حق پر ہے تو اس کی شفاعت کر کے اس پر اللہ کی نعمتوں میں اضافہ کرے گا اگر وہ شخص بے معرفت ہے تو وہ مومن اس کمی کو شفاعت کے ذریعہ پورا کرے گا اگر وہ شخص کافر ہے تو اس کے عذاب میں تخفیف ہو گی۔ پھر فرمایا:

وَ كَاَنِّی بِشِيعَتِنَا هٰؤُلَاءِ يَطِيرُونَ فِی تِلْكَ الْعَرَصَاتِ كَالصُّقُورِ وَ الْبُزَاةِ فَيَنْقَضُّونَ عَلٰی مَنْ اَحْسَنَ فِی الدُّنْيَا اِلَيْهِمْ انْقِضَاضَ الْبُزَاةِ وَ الصُّقُورِ عَلَی اللُّحُومِ تَتَلَقَّفُهَا وَ تَحْفَظُهَا فَكَذٰلِكَ يَلْتَقِطُونَ مِنْ شَدَائِدِ الْعَرَصَاتِ مَنْ كَانَ اَحْسَنَ اِلَيْهِمْ فِی الدُّنْيَا فَيَرْفَعُونَهُمْ اِلٰی جَنَّاتِ النَّعِيمِ...[1]

گویا میں اپنے شیعوں کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ میدان حشر میں باز اور شاہین کی طرح پرواز کر رہے ہیں پھر ان لوگوں کو اٹھا رہے ہیں جنہوں نے دنیا میں ان پر احسان کیا ہے جس طرح باز اور شاہین گوشت اٹھاتے اور محفوظ کر لیتے ہیں اسی طرح ہمارے شیعہ ان لوگوں کو میدان حشر کے شدائد سے اٹھا کر جنت کی طرف لے جاتے ہیں جنہوں نے دنیا میں ان پر احسان کیا ہے۔

اسی قسم کی ایک اہم حدیث مستدرک الوسائل ۱۲: ۱۷۵ میں موجود ہے۔

وَ لَوۡ بَسَطَ اللّٰہُ الرِّزۡقَ لِعِبَادِہٖ لَبَغَوۡا فِی الۡاَرۡضِ وَ لٰکِنۡ یُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا یَشَآءُ ؕ اِنَّہٗ بِعِبَادِہٖ خَبِیۡرٌۢ بَصِیۡرٌ ﴿۲۷﴾

۲۷۔ اور اگر اللہ اپنے بندوں کے لیے رزق میں فراوانی کر دیتا تو وہ زمین میں سرکش ہو جاتے لیکن اللہ جو چاہتا ہے وہ ایک مقدار سے نازل کرتا ہے، وہ اپنے بندوں سے خوب باخبر، نگاہ رکھنے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ لَوۡ بَسَطَ اللّٰہُ الرِّزۡقَ لِعِبَادِہٖ: عام حالات میں رزق کی فراوانی کا نتیجہ سرکشی ہے اور اس کی

---

[1] مستدرک الوسائل ۱۰: ۳۹

وجہ یہ ہے کہ دولت کے وافر ہونے کی وجہ سے انسان کی خوابیدہ خواہشات بیدار ہو جاتی ہیں اور انسان میں موجود خواہشات درندہ صفت ہوتی ہیں۔ دولت کی فراوانی سے یہ درندہ بے لگام ہو جاتا ہے جیسا کہ فرمایا:

كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۙ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۙ[1]　　ہرگز نہیں انسان تو یقیناً سرکشی کرتا ہے۔ اس بات پر کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز خیال کرتا ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوسکتا ہے: بہت سے لوگوں کو ہم دیکھتے ہیں ان کے رزق میں فراوانی ہے اور سرکشی بھی ہے۔ جواب یہ ہے: آیت میں لِعِبَادِهٖ سے مراد خاص بندے ہیں جن کی مصلحت میں رزق کی فراوانی نہیں ہے۔ ان پر اللہ مہربانی فرماتا ہے۔ دولت کی فراوانی کے عذاب میں نہیں ڈالتا جب کہ بعض لوگوں کو اللہ دولت کی فروانی کے عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے تو اس سرکشی کی وجہ سے ان کی آخرت بھی خراب ہو جاتی ہے اور اسی دولت کی وجہ سے دنیا میں بے سکون ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے:

وان من عبادی من لا یصلحه الا الغنی فلو افقرته لأفسده ذلك و ان من عبادی من لا یصلحه الا الفقر فلو اغنیته لافسده ذلك۔[2]　　میرے بندوں میں سے بعض ایسے ہیں جن کی مصلحت دولتمندی میں ہے اگر انہیں فقیر بنا دوں تو غربت انہیں بگاڑ دے گی۔ میرے بندوں میں سے بعض ایسے ہیں کہ غربت ہی ان کی مصلحت میں ہے کہ اگر میں انہیں دولتمند بنادوں تو دولت انہیں خراب کر دے گی۔

۲۔ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ: مگر اپنی حکیمانہ مشیت اور بندوں کی مصلحت کے مطابق روزی عنایت فرماتا ہے لہٰذا بعض کے لیے دولت دینا نعمت ہے اور دیگر بعض کے لیے دولت دینا عذاب ہے اور بعض دیگر کے لیے دولت نہ دینا نعمت ہے۔

لوگوں میں موجود خصلتوں میں جو فرق ہے اس کے مطابق ان کے ساتھ معاملہ ہوتا ہے۔ حضرت جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

وَلَو عَلِمَ النَّاسُ اَنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَ جَلَّ خَلَقَ هٰذَا الْخَلْقَ عَلٰی هٰذَا لَمْ یَلُمْ اَحَدٌ اَحَداً۔[3]　　اگر لوگوں کو علم ہو جائے کہ اللہ نے مخلوق کو کس طرح خلق فرمایا ہے تو کوئی بھی کسی کی ملامت نہ کرتا۔

وَهُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ۭ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ ۝۲۸　　۲۸۔ اور وہ وہی ہے جو ان کے ناامید ہو جانے کے بعد مینہ برساتا ہے اور اپنی رحمت پھیلا دیتا ہے اور وہی کارساز، قابل ستائش ہے۔

---

[1] ۹۶ علق: ۶۔۷　　[2] مجمع البیان۔ عوالی اللئالی ۲: ۱۰۸　　[3] الکافی ۲: ۴۴

تشریح کلمات

الۡغَیۡثَ: (غ ی ث) مجمع البیان کے مطابق غیث فائدہ مند بارش کو کہتے ہیں جب کہ مطر فائدہ مند اور ضرر رساں دونوں کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اس آیت کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور وحدانیت سے ہے کہ طویل خشک سالی کی وجہ سے لوگوں میں جب مایوسی پھیل جاتی ہے، اس وقت تمہارے فائدے کی بارش نازل کرنے والا اللہ ہی ہے۔

۲۔ وَ یَنۡشُرُ رَحۡمَتَہٗ: اس بارش کے بعد زمین کی شادابی کے ذریعے اللہ کی رحمتوں کی فراوانی ہوتی ہے تو جس کے ہاتھ میں یہ بارش ہے وہی تمہارا رب ہے۔

وَ مِنۡ اٰیٰتِہٖ خَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ مَا بَثَّ فِیۡہِمَا مِنۡ دَآبَّۃٍ ؕ وَ ہُوَ عَلٰی جَمۡعِہِمۡ اِذَا یَشَآءُ قَدِیۡرٌ ﴿۲۹﴾

۲۹۔ اور آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور وہ جاندار جو اس نے ان دونوں میں پھیلا رکھے ہیں اس کی نشانیوں میں سے ہیں اور وہ جب چاہے انہیں جمع کرنے پر خوب قادر ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ مِنۡ اٰیٰتِہٖ: اللہ کی ربوبیت کی نشانیوں کا ذکر ہے کہ ربّ صرف اور صرف اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ ان آیات کا ذکر قرآن میں متعدد بار ہوا ہے۔

۲۔ وَ مَا بَثَّ فِیۡہِمَا مِنۡ دَآبَّۃٍ: اور آسمانوں اور زمین میں رینگنے والوں کا پھیلانا بھی اللہ کی ربوبیت اور وحدانیت کی نشانیوں میں سے ہے۔

واضح رہے دَآبَّۃٍ زمین پر رینگنے والے کو کہتے ہیں۔ لہٰذا فرشتوں کے لیے یہ لفظ استعمال نہیں ہوتا۔ چنانچہ قرآن میں لفظ دَآبَّۃٍ طائر کے مقابلے میں ذکر ہوا ہے:

وَ مَا مِنۡ دَآبَّۃٍ فِی الۡاَرۡضِ وَ لَا طٰٓئِرٍ یَّطِیۡرُ بِجَنَاحَیۡہِ اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمۡثَالُکُمۡ ... [1]

اور زمین پر چلنے والے تمام جانور اور ہوا میں اپنے دو پروں سے اُڑنے والے سارے پرندے بس تمہاری طرح کی امتیں ہیں۔

اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے آسمانوں میں بھی ایسی حیات موجود ہے جو رینگنے والی ہے جیسی زمین پر ہے۔

---

[1] ۶ انعام: ۳۸

اسے قرآن کی پیشگوئی قرار دینا چاہیے۔کل انسان پر جب آسمانوں میں موجود دَآبَّۃٍ کا انکشاف ہوگا تو یہ قرآن کا زندہ معجزہ ہوگا۔

۳۔ وَھُوَعَلٰی جَمۡعِھِمۡ اِذَا یَشَآءُ قَدِیۡرٌ : اس جملے کی تعبیر میں لفظ اِذَا سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ آسمانوں میں موجود دَآبَّۃٍ ، زمین پر موجود دَآبَّۃٍ سے ملنے والے بھی ہیں۔ قدیم مفسرین فرماتے ہیں۔ جمع سے مراد قیامت کے دن حشر میں جمع کرنا ہے لیکن ممکن ہے کہ یہ جمع دنیا میں واقع ہو جائے اور ممکن ہے انسان تسخیر فضا میں اس حد تک پہنچ جائے کہ دوسرے کرات میں زندہ موجودات سے مل بیٹھنے کا وقت آ جائے۔

روزنامہ جنگ راولپنڈی مورخہ ۶ نومبر ۲۰۱۳ء کی اشاعت میں یونیورسٹی آف کیلیفورنیا بارکیلی اور یونیورسٹی آف ہوائی کے ماہرین فلکیات کی تحقیقی ٹیم کی ایک نئی ریسرچ شائع ہوئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ کائنات میں زمین جیسے 8.8 ارب سیارے ہیں اور یہ سب سیارے حجم میں زمین کے برابر ہیں جنہیں سائنسدانوں نے گولڈی لاکس (Goldilocks) زون قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ سیارے نہ بہت زیادہ گرم ہیں اور نہ بہت زیادہ ٹھنڈے اور زندگی کے ارتقاء کے لیے ان کا حجم موزوں ہے۔ خلانوردوں کی ٹیم نے کیپلر خلائی دوربین کے ذریعے سورج کی طرح کے ستاروں کے مدار میں گردش کرنے والے زمین جیسے اربوں سیاروں کا پتہ چلایا ہے۔

آسمانوں میں زندگی کے بارے میں ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی متعدد احادیث بھی موجود ہیں۔

وَمَاۤ اَصَابَکُمۡ مِّنۡ مُّصِیۡبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتۡ اَیۡدِیۡکُمۡ وَ یَعۡفُوۡا عَنۡ کَثِیۡرٍ ﴿۳۰﴾

۳۰۔ اور تم پر جو مصیبت آتی ہے وہ خود تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے آتی ہے اور وہ بہت سی باتوں سے درگزر کرتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَبِمَا کَسَبَتۡ اَیۡدِیۡکُمۡ : سے مراد معصیت ہے اور خطاب ان لوگوں سے ہے جو معصیت کا ارتکاب کرتے ہیں خواہ مسلم ہوں یا کافر اور مصیبت سے مراد سزائے معصیت ہے۔

معصوم اور غیر مکلّف اطفال اس میں شامل نہیں ہیں۔ یہ آیت صرف گناہگاروں کے بارے میں ہے کیونکہ معصوم سے معصیت سرزد نہیں ہوتی اس لیے ان پر جو مصیبت آتی ہے وہ سزائے معصیت نہیں ہے۔

دوسرے لوگوں کے بارے میں فرمایا: جو آفت تم پر آتی ہے وہ خود تمہارے برے اعمال کا نتیجہ ہے۔ اس آیت و دیگر متعدد آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی اعمال و کردار اور کائنات پر حاکم نظام فطرت میں ایک گہرا ربط ہے:

وَلَوْ اَنَّ اَہْلَ الْقُرٰۤی اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَیْہِمْ بَرَکٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ۔[1] اور اگر ان بستیوں کے لوگ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔

۲۔ وَ یَعۡفُوۡا عَنۡ کَثِیۡرٍ: اور بہت سی معصیتوں کے اثرات کو اللہ مٹا دیتا ہے۔

وَ لَوۡ یُؤَاخِذُ اللّٰہُ النَّاسَ بِظُلۡمِہِمۡ مَّا تَرَکَ عَلَیۡہَا مِنۡ دَآبَّۃٍ ....[2] اور اگر لوگوں کے ظلم کی وجہ سے اللہ ان کا مواخذہ کرتا تو روئے زمین پر کسی چلنے پھرنے والے کو نہ چھوڑتا۔

حدیث نبوی ہے:

من عفی عنه فی الدنیا عفی عنه فی الاخرة و من عوقب فی الدنیا لم تثنی علیه العقوبة فی الآخرة۔[3] جو دنیا میں بخشا جاتا ہے وہ آخرت میں بھی بخشا جاتا ہے اور جسے دنیا میں سزا دی گئی اسے دوبارہ آخرت میں سزا نہیں ملتی۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے۔

هذه ارجی آية للمؤمنين فی القرآن۔[4] یہ آیت مؤمنوں کے لیے قرآن کی امید افزا ترین آیت ہے۔

وَ مَاۤ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِیۡنَ فِی الۡاَرۡضِ ۚۖ وَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیۡرٍ ﴿۳۱﴾ ۳۱۔ اور تم زمین میں (اللہ کو) عاجز تو نہیں کر سکتے، اللہ کے سوا تمہارا نہ کوئی کارساز ہے اور نہ مددگار۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ مَاۤ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِیۡنَ: تمہارے گناہوں کے اثرات مترتب ہونے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ صرف اللہ یہ کام کر سکتا ہے۔

۲۔ اللہ کے علاوہ تمہارا کوئی ایسا والی اور وارث نہیں کہ تمہارے گناہوں کے اثرات کو دور کر سکے۔

وَ مِنۡ اٰیٰتِہِ الۡجَوَارِ فِی الۡبَحۡرِ کَالۡاَعۡلَامِ ﴿ؕ۳۲﴾ ۳۲۔ اور سمندر میں پہاڑوں جیسے جہاز اس کی نشانیوں میں سے ہے۔

---

[1] اعراف: ۹۶ [2] ۱۶ نحل: ۶۱ [3] زبدة التفاسير [4] زبدة التفاسير ملا فتح اللہ کاشانی ۶: ۲۲۶

اِنۡ یَّشَاۡ یُسۡکِنِ الرِّیۡحَ فَیَظۡلَلۡنَ رَوَاکِدَ عَلٰی ظَہۡرِہٖ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوۡرٍ ﴿ۙ۳۳﴾

۳۳۔ اگر اللہ چاہے تو ہوا کو ساکن کر دے تو یہ سطح سمندر پر کھڑے رہ جائیں، ہر صبر کرنے والے شکرگزار کے لیے اس میں نشانیاں ہیں۔

اَوۡ یُوۡبِقۡہُنَّ بِمَا کَسَبُوۡا وَ یَعۡفُ عَنۡ کَثِیۡرٍ ﴿۳۴﴾

۳۴۔ یا انہیں ان کے اعمال کے سبب تباہ کر دے اور وہ بہت سے لوگوں سے درگزر کرتا ہے،

تفسیر آیات

۱۔ وَ مِنۡ اٰیٰتِہِ الۡجَوَارِ: سمندر کی پشت پر چلنے والی کشتیاں اللہ تعالیٰ کی مدبریت اور ربوبیت کی آیات اور نشانیوں میں سے ہیں کہ ان کشتیوں پر انسان کی معیشت کا انحصار ہے۔ خصوصاً آج کی متمدن دنیا کے تمدن کی بنا سمندری جہازوں کے ذریعے نقل و حمل کی مرہون ہے۔

لہٰذا تمہارا مدبر اور رب وہ ہے جس نے پانی پر کشتی کو اٹھایا۔ پانی میں یہ خاصیت ودیعت فرمائی کہ اپنے وزن سے کم وزن کی چیزیں اپنی پشت پر اٹھاتا ہے اور ہوا میں یہ خاصیت ودیعت فرمائی کہ درجہ حرارت کے اختلاف کی وجہ سے اس میں روانی آ جائے۔

۲۔ اِنۡ یَّشَاۡ یُسۡکِنِ الرِّیۡحَ: جس طرح اللہ کی مشیت کے تحت اور اس کی ودیعت شدہ خاصیت کے تحت ہوا چلتی ہے، کبھی اللہ کی مشیت کا تقاضا اس ہوا کے رک جانے میں ہوتا ہے تو ہوا رک جاتی ہے۔ جب مختلف علاقوں کا درجہ حرارت مختلف نہیں ہوتا۔

۳۔ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ: اس کشتی کے چلنے رکنے میں جذبۂ صبر و شکر سے سرشار مومنین کے لیے اللہ کی ربوبیت اور مدبریت کی نشانی ہے چونکہ کشتی چلنے رکنے جیسے مختلف حالات سے دوچار ہونے کی صورت میں مومن ہی صبر و شکر کرتا ہے اور ایمان کی نظر سے دیکھنے والوں کو یہ نشانیاں نظر آتی ہیں۔

۴۔ اَوۡ یُوۡبِقۡہُنَّ: یا اس ہوا کو تیز چلا کر ان کشتیوں کو غرق کر کے تباہ بھی کر دیا جاتا ہے۔ یہ تباہی بِمَا کَسَبُوۡا ان کشتیوں پر سوار لوگوں کے جرائم کا لازمہ ہو گی۔

۵۔ وَ یَعۡفُ عَنۡ کَثِیۡرٍ: لیکن ان کے تمام گناہوں کا مواخذہ نہ ہو گا۔ بہت سے گناہوں کے اثرات روک دیے جاتے ہیں۔

وَّ یَعۡلَمَ الَّذِیۡنَ یُجَادِلُوۡنَ فِیۡۤ اٰیٰتِنَا ؕ مَا لَہُمۡ مِّنۡ مَّحِیۡصٍ ﴿۳۵﴾

۳۵۔ تاکہ ہماری آیات میں جھگڑنے والوں کو علم ہو جائے کہ ان کے لیے جائے پناہ نہیں ہے۔

تفسیر آیات

اللہ بعض کو ہلاکت میں ڈال کر، بعض کو نجات دے کر اور بعض کی تنبیہ کر کے یہ بتانا چاہتا ہے کہ جو لوگ ہماری نشانیوں کو قبول کرنے کی جگہ ان ہی میں کج بحثیاں کرتے ہیں انہیں علم ہو کہ ان کے جرائم کے آثار جب مترتب ہونے لگیں گے تو ان کے لیے کوئی جائے پناہ نہ ہوگی۔

فَمَاۤ اُوۡتِیۡتُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ فَمَتَاعُ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚ وَ مَا عِنۡدَ اللّٰہِ خَیۡرٌ وَّ اَبۡقٰی لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَلٰی رَبِّہِمۡ یَتَوَکَّلُوۡنَ ﴿۳۶﴾

۳۶۔ پس جو کچھ تمہیں دیا گیا ہے وہ دنیاوی زندگی کا سامان ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہترین اور زیادہ پائیدار ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے اور اپنے پروردگار پر بھروسا کرتے ہیں،

تفسیر آیات

۱۔ متاع دنیا دو قسم کے ہیں: ایک وہ متاع ہے جو انسان کے زندہ رہنے اور اپنی عزت وقار کے تحفظ کے لیے ضروری ہے۔ اس حد تک متاع حیات کا حصول مذموم نہیں ہے۔ چنانچہ ضمیر انسان بھی اس کی گواہی دیتا ہے۔ وہ گواہی یہ ہے کہ اس حد تک کے متاع کے حصول سے انسان کو سکون ملتا ہے اور آسودگی کا احساس ہوتا ہے۔

دوسرا متاع دنیا ضرورت سے زائد مال و دولت ہے جو برائے دولت ہو۔ اس متاع کی مذمت ہے اور ضمیر بھی گواہی دیتا ہے کہ انسان اس متاع کے لیے نہیں ہے۔ وہ گواہی یہ ہے کہ مال و دولت کی فراوانی سے انسان بے سکون ہو جاتا ہے۔ اگرچہ یہ مال حلال ہی کیوں نہ ہو اس سے سکون نہیں ملتا۔

لہٰذا متاع دنیا کی یہ قسم مذموم ہے، دنیا میں بے سکون کر دیتا ہے۔ حلال ہے تو آخرت میں حساب دینا ہے، حرام ہے تو عذاب کا سامنا ہے۔ پھر یہ زوال پذیر بھی ہے:

مَا اَصِفُ مِنْ دَارٍ اَوَّلُهَا عَنَاءٌ وَ آخِرُهَا فَنَاءٌ. فِي حَلَالِهَا حِسَابٌ وَ فِي حَرَامِهَا عِقَابٌ ....[1]

میں اس دار دنیا کی حالت کیا بیان کروں کہ جس کی ابتداء رنج اور انتہا فنا ہو جس کے حلال میں حساب اور حرام میں سزا و عقاب ہو۔

۲۔ وَ مَا عِنۡدَ اللّٰہِ: اس کے مقابلے میں اللہ کے پاس جو اجر و ثواب ہے وہ دائمی ہونے کے علاوہ رضایت الٰہی کی علامت ہے: وَرِضۡوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکۡبَرُ ....[2] اللہ کی خوشنودی ناقابل وصف و بیان نعمت ہے۔

---

[1] نہج البلاغۃ خ ۸۰ [2] ۹ توبۃ: ۷۲

۳۔ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَلٰی رَبِّہِمۡ یَتَوَکَّلُوۡنَ: متاع دنیا اور متاع آخرت میں موازنہ ان کے لیے قابل فہم ہے جو ایمان اور اللہ کے وعدے پر بھروسہ رکھتے ہوں۔ اگر یہ دونوں کسی کے پاس نہیں ہیں ان کے لیے یہ موازنہ قابل فہم نہیں ہے۔ وہ دنیا ہی کو سمجھ سکتے اور اسی کو ترجیح دیتے ہیں۔

وَ الَّذِیۡنَ یَجۡتَنِبُوۡنَ کَبٰٓئِرَ الۡاِثۡمِ وَ الۡفَوَاحِشَ وَ اِذَا مَا غَضِبُوۡا ہُمۡ یَغۡفِرُوۡنَ ﴿۳۷﴾

۳۷۔ اور جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے پرہیز کرتے ہیں اور جب انہیں غصہ آئے تو معاف کر دیتے ہیں۔

وَ الَّذِیۡنَ اسۡتَجَابُوۡا لِرَبِّہِمۡ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ ۪ وَ اَمۡرُہُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَہُمۡ ۪ وَ مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ ﴿ۚ۳۸﴾

۳۸۔ اور جو اپنے پروردگار کو لبیک کہتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور اپنے معاملات باہمی مشاورت سے انجام دیتے ہیں اور ہم نے جو رزق انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

وَ الَّذِیۡنَ اِذَاۤ اَصَابَہُمُ الۡبَغۡیُ ہُمۡ یَنۡتَصِرُوۡنَ ﴿۳۹﴾

۳۹۔ اور جب ان پر زیادتی سے ظلم کیا جاتا ہے تو وہ اس کا بدلہ لیتے ہیں۔

تفسیر آیات

وَ مَا عِنۡدَ اللّٰہِ خَیۡرٌ وَّ اَبۡقٰی: جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر و دائمی ہے ان لوگوں کے لیے جن میں یہ اوصاف موجود ہوں:

i۔ ایمان، ii۔ توکل، iii۔ بڑے گناہوں اور بے حیائی سے اجتناب، iv۔ غصے کی صورت میں معاف، v۔ اپنے رب کی ہر دعوت پر لبیک، vi۔ اقامۂ نماز، vii۔ اپنے معاملات میں مشورہ، viii۔ انفاق، ix۔ ظلم سے انکاری۔

۱۔ وَ الَّذِیۡنَ یَجۡتَنِبُوۡنَ کَبٰٓئِرَ الۡاِثۡمِ: یہ دائمی ثواب ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان اور توکل بر خدا کے بعد گناہانِ کبیرہ سے اجتناب کرتے ہیں۔ گناہان کبیرہ کی تعریف کیا ہے؟ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورہ نساء آیت ۳۱۔

۲۔ وَ الۡفَوَاحِشَ: فحش گناہوں سے بچتے ہیں۔ الۡفَوَاحِشَ کے بارے میں ایک روایت میں حضرت علی علیہ السلام نے زنا، شراب نوشی اور رباخواری کو الۡفَوَاحِشَ میں شمار فرمایا ہے۔[1]

۱۔ مستدرک الوسائل ۴: ۹۴

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

اَلْفَوَاحِشُ الزِّنَا وَ السَّرِقَۃُ۔[1] زنا، چوری فواحش ہیں۔

قرآن کی دیگر آیات میں اَلۡفَوَاحِشَ کی تعریف ملتی ہے:

وَ لَا تَقۡرَبُوا الزِّنٰۤی اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً ؕ وَ سَآءَ سَبِیۡلًا﴿﴾[2] اور زنا کے قریب بھی نہ جاؤ، یقیناً یہ بڑی بے حیائی ہے اور بہت برا راستہ ہے۔

وَ لُوۡطًا اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِہٖۤ اَتَاۡتُوۡنَ الۡفَاحِشَۃَ وَ اَنۡتُمۡ تُبۡصِرُوۡنَ﴿﴾[3] اور لوط (کا وہ وقت یاد کرو) جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا: کیا تم بدکاری کا ارتکاب کرتے ہو؟ حالانکہ تم دیکھ رہے ہوتے ہو۔

ان آیات میں فواحش میں زنا لواط اور باپ کی منکوحہ سے نکاح کرنا شامل ہیں۔

۳۔ وَ اِذَا مَا غَضِبُوۡا: غصہ آئے تو معاف کر دیتے ہیں۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے:

مَنْ مَلَكَ نَفْسَهُ إِذَا رَغِبَ وَ إِذَا رَهِبَ وَ إِذَا اشْتَهَى وَ إِذَا غَضِبَ وَ إِذَا رَضِيَ حَرَّمَ اللّٰهُ جَسَدَهُ عَلَى النَّارِ۔[4] جو شخص رغبت، خواہشات، خوف، غصے اور خوشی کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھتا ہے اس کے جسم کو اللہ جہنم کی آگ پر حرام کر دیتا ہے۔

روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے پوچھا گیا لوگوں میں بہتر کون ہے؟ فرمایا:

الَّذِيْنَ إِذَا أَحْسَنُوا اسْتَبْشَرُوا وَإِذَا أَسَاءُوا اسْتَغْفَرُوا وَإِذَا أُعْطُوا شَكَرُوا وَ إِذَا ابْتُلُوا صَبَرُوا وَ إِذَا غَضِبُوا غَفَرُوا۔[5] وہ لوگ ہیں کہ جب احسان کریں تو خوش ہو جائیں جب کوئی برا کام صادر ہو جائے تو استغفار کریں جب کوئی چیز مل جائے تو شکر کریں جب کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائیں تو صبر کریں جب غصہ آئے تو معاف کریں۔

۴۔ وَ الَّذِیۡنَ اسۡتَجَابُوۡا لِرَبِّہِمۡ: اللہ کے پاس جو ثواب ہیں وہ ان لوگوں کے لیے ہیں جو اللہ کے ہر حکم پر لبیک کہتے ہیں۔ حکم الٰہی قبول اور اس پر عمل کرنے میں کسی قسم کے لیت و لعل سے کام نہیں لیتے۔ منجملہ نماز کا قائم کرنا ہے۔

۵۔ وَ اَمۡرُہُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَہُمۡ: اجتماعی امور میں دوسروں کے تجربات اور بہت سی عقلوں سے فائدہ اٹھانے کا نام مشورہ ہے۔ حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے:

لَا ظَهِيرَ كَالْمُشَاوَرَةِ۔[6] باہمی مشاورت جیسی کوئی پشت پناہ نہیں۔

---

[1] وسائل الشیعۃ ۱۵: ۳۲۳ [2] ۱۷ بنی اسرائیل: ۳۲
[3] ۲۷ نمل: ۵۴ [4] الفقیہ ۴: ۴۰۰ [5] الوسائل ۱: ۱۰۶ [6] الوسائل ۱۲: ۴۰

مشورہ ان امور میں لیا جاتا ہے جو بقول مولانا شبیر احمد عثمانی قرآن وسنت میں منصوص نہ ہوں۔ جو چیز منصوص ہو اس میں رائے ومشورہ کی گنجائش نہیں ہے اور غیر معقول ہوگا کہ خدا و رسول ﷺ کوئی حکم دیں اور لوگ مشورے سے اس کے خلاف فیصلہ دیں۔

اَمۡرُهُمۡ: ''اپنے معاملات'' سے معلوم ہوا کہ مشاورت ان اجتماعی امور سے متعلق ہے جو شریعت سے متصادم نہیں ہیں اور جو قرآن وسنت میں منصوص ہے وہ اَمۡرُهُمۡ نہیں ہوگا بلکہ امر من اللّٰہ ہوگا۔ چنانچہ سورہ احزاب آیت ۳۶ میں ارشاد فرمایا:

وَمَا كَانَ لِمُؤۡمِنٍ وَّلَا مُؤۡمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗۤ اَمۡرًا اَنۡ يَّكُوۡنَ لَهُمُ الۡخِيَرَةُ مِنۡ اَمۡرِهِمۡ ...	اور کسی مؤمن اور مومنہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ جب اللہ اور اس کے رسول کسی معاملے میں فیصلہ کریں تو انہیں اپنے معاملے کا اختیار حاصل رہے۔

۶۔ وَمِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ يُنۡفِقُوۡنَ: راہ خدا میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ مالی واجبات ادا کرتے ہیں۔

۷۔ وَالَّذِيۡنَ اِذَاۤ اَصَابَهُمُ الۡبَغۡىُ: مومن ظالم اور جابر کے مقابلے میں چٹان کی طرح مضبوط ہوتا ہے۔ وہ کسی جابر سے دبتا ہے نہ کسی ظالم کے سامنے ہتھیار ڈالتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے وہ غالب آنے پر مغلوب اور کمزور آدمی کی غلطیوں سے درگزر کرتا ہے اور ندامت کا اظہار کرنے والے کی معذرت قبول کرتا ہے لیکن اگر ظالم اور جابر قابل عفو نہیں ہے تو اس سے صرف انتقام لیتا ہے اور اس پر زیادتی نہیں کرتا۔ آنے والی چند آیتوں میں انتقام کے اصول وضوابط کا ذکر ہے:

اُذِنَ لِلَّذِيۡنَ يُقٰتَلُوۡنَ بِاَنَّهُمۡ ظُلِمُوۡا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصۡرِهِمۡ لَقَدِيۡرُ ۙ ۞ [1]	جن لوگوں پر جنگ مسلط کی جائے انہیں (جنگ کی) اجازت دی گئی ہے کیونکہ وہ مظلوم واقع ہوئے اور اللہ ان کی مدد کرنے پر یقیناً قدرت رکھتا ہے۔

چونکہ ظلم وزیادتی کا دفاع قابل ستائش عمل ہے۔ دفاع ممکن ہونے کے باوجود ظالم اور سرکش کو ظلم کرنے کی اجازت دینا مذموم ہے۔

وَ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثۡلُهَا ۚ فَمَنۡ عَفَا وَاَصۡلَحَ فَاَجۡرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيۡنَ ۞	۴۰۔ اور برائی کا بدلہ اسی طرح کی برائی سے لینا (جائز) ہے، پھر کوئی درگزر کرے اور اصلاح کرے تو اس کا اجر اللہ پر ہے، اللہ یقیناً ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

---

[1] ۲۲حج: ۳۹

تفسیر آیات

۱۔ وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثۡلُہَا: ظلم و زیادتی کا بدلہ لینے کے ضوابط میں بنیادی بات یہ ہے:

جتنی برائی ہوئی ہے اس کے بدلے میں اتنی ہی برائی کی جائے۔ اس سے زیادہ کا حق نہیں ہے۔

برائی کا بدلہ برائی نہیں ہے۔ اسے برائی اس لیے کہا ہے کہ جس سے بدلہ لیا جاتا ہے اس کے لیے برائی ہے۔ اس کے لیے بدلہ نہ لینا بھلائی ہے۔

یہ اسلام کے عادلانہ نظام کا ایک اہم ترین قانون ہے کہ ظلم کا بدلہ لینا جائز قرار دیا اس پابندی کے ساتھ کہ بدلہ میں زیادتی نہ ہو۔

۲۔ فَمَنۡ عَفَا وَ اَصۡلَحَ فَاَجۡرُہٗ عَلَی اللّٰہِ: اگر بدلہ کی جگہ عفو اور درگزر سے کام لیا جائے۔ وَ اَصۡلَحَ اور جس نے زیادتی کی ہے اس کے ساتھ اصلاح کی جائے،

دوسری تفسیر یہ ہے کہ اپنا معاملہ اللہ کے ساتھ درست رکھا جائے لیکن پہلی تفسیر قرین سیاق ہے،

فَاَجۡرُہٗ عَلَی اللّٰہِ: تو اس کا اجر اللہ کے پاس یا اللہ کے ذمے ہوگا۔ یہ ایک تفضّل ہے اللہ کی طرف سے اور اس سے اللہ کے مقام رحمت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے بندوں پر کس قدر شفیق اور مہربان ہے کہ اس درگزر کرنے کا اجر اپنے ذمے لیا ہے۔

روایت میں آیا ہے:

قیامت کے دن منادی ندا دے گا جس کا اجر اللہ کے ذمے ہو وہ جنت میں داخل ہو جائے تو کہا جائے گا کون ہے جس کا اجر اللہ کے ذمے ہے؟ جواب آئے گا:

العافون عن الناس یدخلون الجنۃ بغیر حساب۔[1] جو لوگوں کو عفو کرنے والے ہیں وہ جنت میں حساب کے بغیر داخل ہوں گے۔

وَ لَمَنِ انۡتَصَرَ بَعۡدَ ظُلۡمِہٖ فَاُولٰٓئِکَ مَا عَلَیۡہِمۡ مِّنۡ سَبِیۡلٍ ﴿۴۱﴾

۴۱۔ اور جو شخص مظلوم ہونے کے بعد بدلہ لے پس ایسے لوگوں پر ملامت کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

تفسیر آیات

ظلم کا بدلہ لینا خواہ قصاص کی شکل میں ہو یا دیت کی شکل میں، جائز عمل ہے۔ اس جائز عمل پر عمل ہونے کی صورت میں اس کا کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ اخلاقی طور پر قابل ملامت نہیں ہے۔ قانونی اعتبار سے

---

[1] تفسیر الآصفی ۲ ذیل آیہ۔ بحار ۶۴: ۲۶۶

اس کے بدلے پر کوئی احکام نافذ نہیں ہوتے، نہ قصاص نہ دیت۔

مَا عَلَیۡہِمۡ مِّنۡ سَبِیۡلٍ: اس آیت میں سبیل سے مراد بدلہ لینے والے کو کسی قسم کی گرفت میں لینے کی کوئی راہ نہیں ہے۔ یعنی قانونی جواز نہیں ہے چونکہ اس نے ایک جائز کام کیا ہے۔ اگرچہ بدلہ نہ لینا بہتر تھا تاہم بدلہ لینا جائز کام ہے۔

اِنَّمَا السَّبِیۡلُ عَلَی الَّذِیۡنَ یَظۡلِمُوۡنَ النَّاسَ وَ یَبۡغُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ ؕ اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۴۲﴾

۴۲۔ ملامت تو بس ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور ملک میں ناحق زیادتی کرتے ہیں ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّمَا السَّبِیۡلُ: قانونی گرفت کی راہ دو قسم کے لوگوں کے خلاف ہے:

الف: یَظۡلِمُوۡنَ النَّاسَ: جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں۔ ظلم خواہ ایک فرد پر ہو یا بہت سے لوگوں پر ہو ہر صورت میں مظلوم کی داد رسی ہو گی اور ظالم کو اس کے ظلم کی نوعیت کے مطابق قانونی گرفت میں لیا جائے گا۔

ب: وَ یَبۡغُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ: دوسرے وہ لوگ قانونی گرفت میں آ جائیں گے جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں، اپنی حد میں نہیں رہتے۔ امن عامہ متاثر کرتے ہیں۔ دوسروں کی حدود میں مداخلت کرتے ہیں۔ یَبۡغُوۡنَ کے ساتھ فِی الۡاَرۡضِ کی قید سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ یَبۡغُوۡنَ سے مراد وہ زیادتی ہے جس سے معاشرہ متاثر ہوتا ہے۔ یہ فساد فِی الۡاَرۡضِ ہے جس کا حکم سورہ مائدہ ۳۳ میں آیا ہے۔

۲۔ اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ: دنیا میں قانون کی گرفت میں آنے کے ساتھ آخرت میں دردناک عذاب میں بھی مبتلا ہوں گے۔

وَ لَمَنۡ صَبَرَ وَ غَفَرَ اِنَّ ذٰلِکَ لَمِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ ﴿۴۳﴾ ع ۴

۴۳۔ البتہ جس نے صبر کیا اور درگزر کیا تو یہ معاملات میں عزم راسخ (کی علامت) ہے۔

تفسیر آیات

ظالم کی طرف سے ظلم صادر ہونے اور اسے سہنے پر مجبور ہونے کے بعد اگر مظلوم کو ظالم پر بالادستی حاصل ہو جاتی اور اپنا جائز بدلہ لینے پر قادر ہو جاتا ہے تو جذبۂ انتقام کو دبانے پر صبر سے کام لیتے ہوئے اگر معاف کر دے تو یہ کام آساں نہیں ہو گا۔

اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ: جذبۂ انتقام پر قابو پا لینا ایک ہمت طلب کام ہے جو عام لوگوں کے بس میں نہیں ہوتا۔ اس لیے اس جذبے سے ہاتھ اٹھانے کے لیے ایک طاقتور عزم کی ضرورت ہے۔ حدیث میں آیا ہے:

مَرَارَةُ الْحِلْمِ اَعْذَبُ مِنْ مَرَارَةِ الْاِنْتِقَامِ.[1] بردباری کی تلخی، انتقام کی تلخی سے زیادہ شیریں ہے۔

وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ وَّلِيٍّ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَ تَرَى الظّٰلِمِيْنَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ يَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿۴۴﴾

۴۴۔ اور جسے اللہ گمراہ کر دے تو اس کے بعد اس کے لیے کوئی کارساز نہیں ہے اور آپ ظالموں کو دیکھیں گے کہ جب وہ عذاب کا مشاہدہ کریں گے تو کہیں گے: کیا واپس جانے کا کوئی راستہ ہے؟

تفسیر آیات

۱۔ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ: جب کوئی شخص حق پہچان لینے کے بعد باطل پر ڈٹ جاتا ہے یا قبول حق کی اس میں سرے سے آمادگی نہیں ہے، اس کی وجہ اس کے مفادات باطل کے ساتھ وابستہ ہونا ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں اللہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ جب سرچشمہ ہدایت اس سے ہاتھ اٹھا لے تو کوئی اور کارساز اس کی کارسازی نہیں کر سکتا۔

۲۔ وَ تَرَى الظّٰلِمِيْنَ: ظالم جب عذاب کا مشاہدہ کریں گے تو بچنے کی آرزو ضرور کریں گے اور اس کی صرف ایک صورت ان کے ذہن میں آتی ہے: واپس دنیا میں جانے کی صورت بنی تو وہ سارے اعمال صالحہ بجا لائیں گے جو یہاں کے لیے ضروری ہیں لیکن انہیں بعد میں علم ہو جائے گا کہ واپسی بھی ناممکن ہے۔

وَ تَرٰىهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ يَنْظُرُوْنَ مِنْ

۴۵۔ اور آپ دیکھیں گے کہ جب وہ جہنم کے سامنے لائے جائیں گے تو ذلت کی وجہ سے جھکے ہوئے

---

[1] مستدرک الوسائل ۱۱: ۲۹۰

طَرۡفٍ خَفِیٍّ ؕ وَ قَالَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ الۡخٰسِرِیۡنَ الَّذِیۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ وَ اَہۡلِیۡہِمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ الظّٰلِمِیۡنَ فِیۡ عَذَابٍ مُّقِیۡمٍ ﴿۴۵﴾	نظریں چرا کر دیکھ رہے ہوں گے اور (اس وقت) ایمان لانے والے کہیں گے: خسارہ اٹھانے والے یقیناً وہ ہیں جنہوں نے آج قیامت کے دن اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو خسارے میں ڈالا، آگاہ رہو! ظالم لوگ یقیناً دائمی عذاب میں رہیں گے۔

تشریح کلمات

طَرۡفٍ: (ط ر ف) الطرْف کے اصل معنی پلک جھپکنے کے ہیں اور پلک جھپکنے میں دیکھنا لازم ہے۔ اس لیے الطرْف کے معنی میں دیکھنا بھی آ جاتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ تَرٰىہُمۡ یُعۡرَضُوۡنَ عَلَیۡہَا: ان کافروں کو اس حالت میں آپ دیکھ لیں گے کہ انہیں آتش جہنم میں داخل کرنے سے پہلے اس کے سامنے پیش کیا جائے گا تاکہ وہ اس آتش جہنم کا مشاہدہ کریں جس میں انہیں داخل کرنا ہے۔

۲۔ خٰشِعِیۡنَ مِنَ الذُّلِّ: ذلت و خواری کی وجہ سے وہ جھکے ہوئے ہوں گے۔

۳۔ یَنۡظُرُوۡنَ مِنۡ طَرۡفٍ خَفِیٍّ: وہ اس آتش کو نظریں چرا کر آنکھ کے ایک گوشے سے دیکھ رہے ہوں گے اور پوری نگاہ سے دیکھنے کی جرأت نہیں کریں گے۔

۴۔ وَ قَالَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا: جب اہل جہنم کا یہ حال اہل ایمان کے بھی مشاہدے میں آئے گا تو وہ کہیں گے: خسارے میں ہیں وہ لوگ جنہوں نے قیامت کے دن اپنی ابدی و دائمی زندگی کا خسارہ اٹھایا ہے۔ وَ اَہۡلِیۡہِمۡ اور ساتھ اپنے اہل و عیال کو بھی خسارے میں ڈالا ہے چونکہ ان کے اہل و عیال ان کے تابع ہیں۔

وَ مَا کَانَ لَہُمۡ مِّنۡ اَوۡلِیَآءَ یَنۡصُرُوۡنَہُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ ؕ وَ مَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنۡ سَبِیۡلٍ ﴿ؕ۴۶﴾	۴۶۔ اور اللہ کے سوا ان کے ایسے سرپرست نہ ہوں گے جو ان کی مدد کریں اور جسے اللہ گمراہ کر دے پس اس کے لیے کوئی راہ نہیں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ مَا کَانَ لَہُمۡ مِّنۡ اَوۡلِیَآءَ: انہیں اس خسارے سے نکالنے کے لیے اللہ کے علاوہ ان کا

کوئی مددگار بھی نہ ہوگا۔ اللہ کی مدد تو ان لوگوں نے ہاتھ سے دے دی اور کفر پر ڈٹ جانے کی وجہ سے اللہ نے انہیں گمراہی میں ڈالے رکھا۔

۲۔ وَ مَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰہُ: اور یہ بھی اپنی جگہ واضح ہے جسے اللہ ہدایت نہ دے اسے کسی اور سے ہدایت نہیں مل سکتی۔

اِسۡتَجِیۡبُوۡا لِرَبِّکُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَ یَوۡمٌ لَّا مَرَدَّ لَہٗ مِنَ اللّٰہِ ؕ مَا لَکُمۡ مِّنۡ مَّلۡجَاٍ یَّوۡمَئِذٍ وَّ مَا لَکُمۡ مِّنۡ نَّکِیۡرٍ ﴿۴۷﴾

۴۷۔ اپنے پروردگار کو لبیک کہو اس سے پہلے کہ اللہ کی جانب سے وہ دن آ جائے جس کے ٹلنے کا کوئی امکان نہیں، اس دن تمہارے لیے نہ کوئی پناہ گاہ ہوگی اور نہ ہی انکار کی کوئی گنجائش ہوگی۔

تفسیر آیات

۱۔ اِسۡتَجِیۡبُوۡا لِرَبِّکُمۡ: اپنے مالک کے ہر حکم پر لبیک کہو۔ دنیا کی اس زندگی میں ابھی فرصت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اللہ کے حکم کی تعمیل کر کے اپنے آپ کو قیامت کے خطرات سے بچا سکتے ہو۔

۲۔ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَ یَوۡمٌ: جب قیامت کا دن آئے گا تو تم عذاب کو اپنے سے ٹال نہیں سکتے۔

۳۔ مَا لَکُمۡ مِّنۡ مَّلۡجَاٍ: نہ اس عذاب سے بچنے کے لیے کوئی پناہ گاہ میسر آئے گی چونکہ اس دن اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی جنبش تک نہیں کر سکتا۔

۴۔ وَّ مَا لَکُمۡ مِّنۡ نَّکِیۡرٍ: انکار کی بھی کوئی گنجائش نہ ہوگی۔ چونکہ خود عمل سامنے آئے گا اور خود اس کے اعضاء بھی گواہی دے رہے ہوں گے۔

فَاِنۡ اَعۡرَضُوۡا فَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ عَلَیۡہِمۡ حَفِیۡظًا ؕ اِنۡ عَلَیۡکَ اِلَّا الۡبَلٰغُ ؕ وَ اِنَّاۤ اِذَاۤ اَذَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنَّا رَحۡمَۃً فَرِحَ بِہَا ۚ وَ اِنۡ تُصِبۡہُمۡ سَیِّئَۃٌۢ بِمَا قَدَّمَتۡ اَیۡدِیۡہِمۡ فَاِنَّ الۡاِنۡسَانَ کَفُوۡرٌ ﴿۴۸﴾

۴۸۔ پھر اگر یہ منہ پھیر لیں تو ہم نے آپ کو ان پر نگہبان بنا کر تو نہیں بھیجا، آپ کے ذمے تو صرف پہنچا دینا ہے اور جب ہم انسان کو اپنی رحمت کا ذائقہ چکھاتے ہیں تو اس سے خوش ہو جاتا ہے اور اگر ان کے اپنے بھیجے ہوئے اعمال کی وجہ سے انہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اس وقت یہ انسان یقیناً ناشکرا ہو جاتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَاِنۡ اَعۡرَضُوۡا: اگر یہ لوگ قبول حق کے لیے آمادہ نہیں ہیں تو آپ اس کے ذمے دار نہیں ہیں۔ آپ پر واجب یہ ہے کہ حق کا پیغام بغیر کسی ابہام کے ان تک پہنچا دیں۔ ان پر حجت پوری ہونے میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ اِنۡ عَلَیۡکَ اِلَّا الۡبَلٰغُ۔ بات پوری وضاحت کے ساتھ ان تک پہنچ گئی۔ آپ کی ذمہ داری ختم ہو گئی کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی بات طاقت اور جبر کے ذریعے مسلط نہیں کی جاتی۔ اگر ایسا ہوتا تو انبیاء علیہم السلام کی ضرورت نہ رہتی۔ اس کے لیے اللہ کا ایک تکوینی اشارہ کُنۡ کافی تھا۔

انبیاء علیہم السلام کو دل اور ضمیر سے کام ہے۔ جس کا دل صحت مند اور ضمیر زندہ ہو وہ اس خدائی آواز کو پہچان لیتا ہے۔ مریض دل، مردہ ضمیر والوں پر حجت پوری ہونے کے بعد انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ محسوس پرست ہوتا ہے۔ اس کی خوشی و غمی کا مدار سامنے کی حالت پر ہوتا ہے۔ گزشتہ کی قدر نہ آیندہ کی فکر۔

۲۔ وَ اِنَّاۤ اِذَاۤ اَذَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ: ان کا ایمان نہ لانا اس وجہ سے نہ ہو گا کہ آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پیغام کے حق ہونے میں کوئی شائبہ یا آپؐ کی تبلیغ میں کوئی ابہام ہے بلکہ اس کی وجہ ان کی سرکشی اور نعمتوں میں بدمستی ہے۔ چنانچہ جب ہم اس انسان کو اپنی رحمتوں سے نوازتے ہیں تو یہ اتراتا ہے اور خوشی سے مدہوش ہو جاتا ہے۔

۳۔ وَ اِنۡ تُصِبۡہُمۡ سَیِّئَۃٌ: اگر کوئی حادثہ پیش آ جائے تو نعمتوں کو بھول جاتا ہے حالانکہ یہ حادثہ بِمَا قَدَّمَتۡ اَیۡدِیۡہِمۡ خود اس کی اپنی شامت اعمال ہے۔

قابل توجہ یہ ہے:

i۔ نعمت کو اللہ نے اَذَقۡنَا کہکر اپنی طرف نسبت دی اور برائی سَیِّئَۃٌ کو خود لوگوں کے اعمال کا نتیجہ قرار دیا۔

ii۔ فَرِحَ مفرد لفظ انسان کے اعتبار سے اور تُصِبۡہُمۡ جمع معنی انسان کے اعتبار سے ہے۔

iii۔ اِذَاۤ اَذَقۡنَا میں نعمت کے لیے اِذَاۤ اور اِنۡ تُصِبۡہُمۡ میں برائی کے لیے اِنۡ کے استعمال میں یہ راز ہے کہ نعمت یقینی اور حتمی ہے جب کہ برائی کا وقوع ضروری اور حتمی نہیں ہے۔ لوگوں کے شامت اعمال کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ چونکہ اِذَا (جب) یقینی کے لیے، اِنۡ (اگر) غیر حتمی کے لیے ہے۔

لِلّٰہِ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ یَخۡلُقُ مَا یَشَآءُ ؕ یَہَبُ لِمَنۡ یَّشَآءُ

۴۹۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی صرف اللہ کے لیے ہے، وہ جو چاہتا ہے خلق فرماتا ہے، جسے

اِنَاثًا وَّ یَهَبُ لِمَنۡ یَّشَآءُ الذُّکُوۡرَ ﴿۴۹﴾ چاہتا ہے بیٹیاں عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے نرینہ اولاد عطا کرتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ لِلّٰهِ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ: کائنات اللہ کے قبضۂ ملکیت میں ہے۔ اس کا وجود و عدم بھی اس کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

۲۔ یَخۡلُقُ مَا یَشَآءُ: وہ جب کسی چیز کو نیستی و عدم سے صفحہ وجود میں لانا چاہتا ہے تو اس کے لیے صرف اور صرف ایک ارادہ یَشَآءُ کافی ہوتا ہے۔

۳۔ یَهَبُ لِمَنۡ یَّشَآءُ اِنَاثًا: جسے چاہتا ہے بیٹیاں دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے نرینہ اولاد عطا کرتا ہے۔ اولاد، نرینہ ہو یا لڑکی، اس کا عطا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ اگر انسان کو خدا داد قوت و تجربے سے اس بات کی شناخت ہوگئی کہ وہ پدر کے Y کو ماں کے X کے ساتھ جفت کر کے لڑکا اور پدر کے X کو ماں کے X کے ساتھ جفت کر کے لڑکی کے پیدا ہونے کے لیے فضا سازگار بنا لیتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اولاد دینے والا ہے۔ اس انسان کو نطفۂ پدر اور تخم مادر میں سے کسی ایک کو بنانے کی قدرت حاصل نہیں ہے۔ صرف راز قدرت کے سمجھنے کی صورت میں اس سے استفادہ کی بات ہے۔ جیسے قدیم سے لوگوں نے تجربہ کیا ہے کہ بعض غذاؤں اور دواؤں کے استعمال کی وجہ سے لڑکی یا لڑکا کے پیدا ہونے میں مدد ملتی ہے۔ اس آیت میں بیٹیوں کا ذکر بیٹوں سے پہلے آیا ہے۔ ممکن ہے من حیث الاولاد بیٹی کو فضیلت حاصل ہو۔ چنانچہ حدیث نبوی ہے:

خَیۡرُ اَوۡلَادِکُمُ الۡبَنَاتُ۔[1] تمہاری اولاد میں بہتر بیٹیاں ہیں۔

اَوۡ یُزَوِّجُهُمۡ ذُکۡرَانًا وَّ اِنَاثًا ۚ وَ یَجۡعَلُ مَنۡ یَّشَآءُ عَقِیۡمًا ؕ اِنَّهٗ عَلِیۡمٌ قَدِیۡرٌ ﴿۵۰﴾ ۵۰۔ یا (جسے چاہے) بیٹے اور بیٹیاں دونوں دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بانجھ بنا دیتا ہے وہ یقیناً بڑا جاننے والا، قدرت والا ہے۔

تفسیر آیات

عربی محاورے میں زوج دو مختلف چیزوں کو ایک جگہ جمع کرنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

مجمع البیان میں فرمایا:

---

[1] مستدرک الوسائل ۱۵: ۱۱۶

تقول العرب زوجت ابلی ای جمعت بین صغارھا و کبارھا۔ عرب جب چھوٹے اور بڑے اونٹوں کو ایک جگہ جمع کرتے ہیں زوجت ابلی کہتے ہیں۔

اَوۡ یُزَوِّجُهُمۡ : اور اللہ جسے چاہتا ہے بیٹے اور بیٹیاں دونوں عنایت فرماتا ہے جیسے اللہ کی مشیت کا تقاضا ہو۔

۲۔ وَ یَجۡعَلُ مَنۡ یَّشَآءُ عَقِیۡمًا : اگر اللہ کی مشیت یہ ہو کہ کسی کو اولاد نہ دی جائے تو اس سے یہ نعمت چھن جاتی ہے۔ اِنَّهٗ عَلِیۡمٌ قَدِیۡرٌ اس علم الٰہی کے مطابق جو اس بندے کے بارے میں رکھتا ہے ورنہ اللہ اولاد دینے پر قادر ہے۔

وَ مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ یُّکَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحۡیًا اَوۡ مِنۡ وَّرَآیِٔ حِجَابٍ اَوۡ یُرۡسِلَ رَسُوۡلًا فَیُوۡحِیَ بِاِذۡنِهٖ مَا یَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِیٌّ حَکِیۡمٌ ﴿۵۱﴾

۵۱۔ اور کسی بشر میں یہ صلاحیت نہیں کہ اللہ اس سے بات کرے ماسوائے وحی کے یا پردے کے پیچھے سے یا یہ کہ کوئی پیام رساں بھیجے پس وہ اس کے حکم سے جو چاہے وحی کرے، بے شک وہ بلند مرتبہ، حکمت والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ کسی انسان سے اللہ تعالیٰ کے ہم کلام ہونے کی تین صورتوں کا بیان ہے۔ پہلی صورت وَحۡیًا ہے۔ اس پہلی صورت کو مطلق وحی کے ساتھ تعبیر فرمایا جب کہ باقی دو صورتیں بھی وحی کی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ وحی کی پہلی صورت ایک کامل اور اعلیٰ درجے کی وحی ہے چونکہ اس میں اللہ تعالیٰ اپنے رسول کے قلب پر اپنا کلام براہ راست نازل فرماتا ہے۔

زرارۃ کہتے ہیں: میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر وحی کے نزول کے وقت طاری ہونے والی غشی کے بارے میں پوچھا تو فرمایا:

ذلك اذا لم یکن بینه و بین اللّٰه احد ذاك اذا تحلی اللّٰه له قال: ثم قال: تلك النبوة یا ذرارة و اقبل یتخشع۔ [۱]

یہ غشی اس وقت طاری ہوتی تھی جب آپ کے اور اللہ کے درمیان کوئی نہیں ہوتا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ رسولؐ کے لیے تجلی فرماتا تھا۔ پھر فرمایا: اے زرارہ! یہی نبوت ہے۔ پھر امامؑ خشوع کی حالت میں آ گئے۔

دوسری صورت پس پردہ کلام کرنا ہے۔ یہاں پردے کا وحی میں کوئی دخل نہیں ہے۔ پس پردہ

---

۱ التوحید۔ بحار ۱۸: ۲۵۶

کلام کرنا بھی وحی ہے مگر وہ وحی بالحجاب ہے۔ مثلاً درخت کے ذریعے کلام کرنا یا خواب میں حکم الٰہی کا ملنا وحی بالحجاب میں شامل ہے۔

تیسری صورت میں اللہ تعالیٰ اپنے قاصد فرشتے کے ذریعے اپنے بندے سے ہم کلام ہوتا ہے۔ یہ بھی وحی ہے مگر اس میں قاصد کا وحی پہنچانے میں دخل ہے فَیُوۡحِیَ بِاِذۡنِہٖ یہ فرشتہ از خود نہیں اذن خدا سے وحی نازل کرتا ہے۔

وحی کے بارے میں تفصیل کے لیے مقدمہ تفسیر کی طرف رجوع فرمائیں۔

وَ کَذٰلِکَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ رُوۡحًا مِّنۡ اَمۡرِنَا ؕ مَا کُنۡتَ تَدۡرِیۡ مَا الۡکِتٰبُ وَ لَا الۡاِیۡمَانُ وَ لٰکِنۡ جَعَلۡنٰہُ نُوۡرًا نَّہۡدِیۡ بِہٖ مَنۡ نَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِنَا ؕ وَ اِنَّکَ لَتَہۡدِیۡۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿ۙ۵۲﴾

۵۲۔ اور اسی طرح ہم نے اپنے امر میں سے ایک روح آپ کی طرف وحی کی ہے، آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور نہ ہی ایمان کو (جانتے تھے) لیکن ہم نے اسے روشنی بنا دیا جس سے ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں اور آپ تو یقیناً سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں،

صِرَاطِ اللّٰہِ الَّذِیۡ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ اَلَاۤ اِلَی اللّٰہِ تَصِیۡرُ الۡاُمُوۡرُ ﴿۵۳﴾ ع

۵۳۔ اس اللہ کے راستے کی طرف جو آسمانوں اور زمین کی سب چیزوں کا مالک ہے، آگاہ رہو! تمام معاملات اللہ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ کَذٰلِکَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ رُوۡحًا: جس طرح دیگر انبیاء علیہم السلام پر وحی نازل کی گئی اسی طرح ہم نے آپؐ پر ایک روح کی وحی کی ہے یا جس طرح سابقہ آیت میں ذکر ہوا اسی طرح تینوں قسموں کے ساتھ آپؐ پر ایک روح کی وحی ہوئی ہے۔ اس آیت میں رُوۡحًا سے مراد اکثر کے نزدیک قرآن ہے۔ بعض کے نزدیک روح سے مراد وحی ہے۔ دونوں اقوال کا نتیجہ ایک ہے یعنی قرآن بھی وحی ہے۔ روح سے مراد وحی ہونے پر یہ آیت دلیل ہے:

یُنَزِّلُ الۡمَلٰٓئِکَۃَ بِالرُّوۡحِ مِنۡ اَمۡرِہٖ عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖۤ اَنۡ اَنۡذِرُوۡۤا اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰہَ

وہ اپنے حکم سے فرشتوں کو روح کے ساتھ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے نازل کرتا ہے (اس حکم کے

اِلَّاۤ اَنَا فَاتَّقُوۡنِ ○[۱] ساتھ) کہ تنبیہ کرو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں لہٰذا تم میری مخالفت سے بچو۔

اس آیت میں روح کی تفسیر اَنۡ اَنۡذِرُوۡۤا ہے لہٰذا روح وہی انذار ہے۔ البتہ اس انذار کی بنیاد کلمۂ توحید ہے۔

۲۔ مِّنۡ اَمۡرِنَا: اس وحی کا تعلق عالم امری سے ہے اور وحی کا نزول اسی عالم سے ہوتا ہے۔ امر خدا، ارادۂ خدا ہے۔کل کائنات کی ایجاد و بقاء ارادۂ الٰہی سے مربوط ہے جس کے نفاذ میں کوئی چیز حائل نہیں ہوسکتی:

اِنَّمَاۤ اَمۡرُہٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیۡئًا اَنۡ یَّقُوۡلَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ○[۲] جب وہ کسی چیز کا ارادہ کر لیتا ہے تو بس اس کا امر یہ ہوتا ہے: ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے۔

پس وحی اللہ تعالیٰ کے فیصلے سے نازل ہوتی ہے۔

۳۔ مَا کُنۡتَ تَدۡرِیۡ مَا الۡکِتٰبُ: اس کتاب کے مندرجات اور ایمان کی تفصیل آپؐ اللہ تعالیٰ سے قطع نظر بذات خود نہیں جانتے تھے۔ جو کچھ آپ جانتے ہیں وہ اللہ کی طرف سے وحی ہے۔

واضح رہے چالیس سال کے بعد اعلان رسالت سے بہت پہلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبوت پر فائز تھے اور وحی کا تعلق نبوت سے ہے: کنت نبیاً و آدم بین الماء و الطین[۳] کے تحت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی ابتدا بشر کو معلوم نہیں ہے۔

اعلان رسالت اور نبوت میں فرق بیان کیے بغیر یہ کہنا: حضورؐ نبوت سے پہلے کچھ نہیں جانتے تھے اور نبوت سے مراد اعلان رسالت و بعثت لینا، نہایت غیر ذمہ دارانہ بات ہے۔

۴۔ وَ لٰکِنۡ جَعَلۡنٰہُ نُوۡرًا: اس روح کو نور سے تعبیر فرمایا: یہ وحی جہاں حیات آفرین ہے وہاں منزل تک پہنچنے کے لیے نور بھی ہے۔

۵۔ وَ اِنَّکَ لَتَہۡدِیۡۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ: اس جملے میں اس بات کی بھی وضاحت فرمائی کہ اے نبی! آپ لوگوں کو منزل تک پہنچانے کے لیے رہنمائی فرماتے ہیں۔ اس سے نصاب پورا ہو جاتا ہے کہ وحی حیات آفرینی کے ساتھ منزل کی طرف جانے کے لیے روشنی فراہم کرتی ہے اور منزل کا تعین کرنے کے لیے ہدایت کا کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انجام دیتے ہیں۔

۶۔ صِرَاطِ اللّٰہِ الَّذِیۡ: اس صراط مستقیم کی وضاحت ہے جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رہنمائی فرماتے ہیں۔ وہ اس کا صراط ہے جس کے قبضۂ قدرت میں کل کائنات ہے۔ یہ وہ راستہ ہے جس کے علاوہ نجات کا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔

---

[۱] ۱۶ نحل: ۲ [۲] ۳۶ یس: ۸۲ [۳] المقنعة: للشیخ مفید علیه الرحمة باب الالهتیم و احکامه

۷۔ اَلَاۤ اِلَی اللّٰہِ تَصِیۡرُ الۡاُمُوۡرُ : یہ اللہ کے کل کائنات کا مالک ہونے کا لازمی نتیجہ ہے۔ جب کائنات کا مالک صرف اللہ ہے تو تمام مملوک کا انجام اس کے مالک کے ہاتھ میں ہے۔

سُورَةُ الزُّخرُفِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اس سورۃ مبارکہ کا نام آیت ۳۵ میں مذکور لفظ وَزُخۡرُفًا سے ماخوذ ہے۔

یہ سورۃ مکہ میں نازل ہوئی سوائے آیت ۴۵ کے جو بروایتے بیت المقدس میں نازل ہوئی۔ بعض دیگر روایات کے مطابق معراج کے موقع پر نازل ہوئی سورۃ زخرف، سور ہائے حوامیم کے سلسلے کی ایک سورۃ ہے جن کے مضامین تقریباً نزدیک ہیں۔ اس سے اس گمان کو تقویت ملتی ہے کہ حروف مقطعات کا تعلق سورۃ میں ذکر ہونے والے مضامین کی نوعیت سے ہے۔ والعلم عنداللّٰہ۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	بنام خدائے رحمٰن و رحیم
حٰمٓ ۚ﴿۱﴾	ا۔ حا، میم۔
وَ الۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ۙ﴿۲﴾	۲۔ اس روشن کتاب کی قسم۔
اِنَّا جَعَلۡنٰہُ قُرۡءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ۚ﴿۳﴾	۳۔ ہم نے اس (قرآن) کو عربی قرآن بنایا ہے تاکہ تم سمجھ لو۔

تفسیر آیات

ا۔ حٰمٓ: یہ سورہ سورہ ہائے حوامیم میں چوتھی سورہ ہے۔ اس سے پہلے سورہ مومن، سورہ حٰمٓ سجدہ، سورہ شوریٰ سورہ ہائے حوامیم ہیں۔

۲۔ وَ الۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ: قسم ہے اس قرآن کی جو انسان کے لیے سعادت و نجات کی راہوں کا بیان کرنے والا ہے۔

۳۔ اِنَّا جَعَلۡنٰہُ قُرۡءٰنًا عَرَبِیًّا: اس قرآن کو عربی زبان میں قرار دیا اور ممکن ہے عربی سے مراد

زبان نہ ہو بلکہ فصاحت مراد ہو۔ کہتے ہیں: اعرب الرجل افصح القول والکلام۔ اس صورت میں زبان عربی کو اس لیے اختیار کیا چونکہ اس زبان میں بیان مطالب کے لیے بہتر اور فصیح تر اسلوب فراہم ہے۔

چونکہ قرآن کریم کے مخاطبین اولین عرب لوگ ہیں۔ پہلے مرحلے میں انہیں سمجھانا مقصود ہے۔ مخاطبین اول پر واجب ہے کہ وہ قرآنی پیغام کو آنے والی قوموں تک پہنچا دیں۔ چنانچہ فرمایا:

وَاُوۡحِیَ اِلَیَّ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنُ لِاُنۡذِرَکُمۡ بِہٖ وَمَنۡۢ بَلَغَ ...[1] اور یہ قرآن میری طرف بذریعہ وحی نازل کیا گیا ہے تاکہ میں تمہیں اور جس تک یہ پیغام پہنچے سب کو تنبیہ کروں۔

لِاُنۡذِرَکُمۡ مخاطبین اول اور وَمَنۡۢ بَلَغَ آنے والی قومیں ہیں۔

۴۔ لَعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ: کلام جس قدر غیر مبہم اور واضح ہوگا انسانی عقل اس سے مطلب بہتر سمجھ سکتی ہے۔ چونکہ انسانی عقل کسی بھی مطلب کو حواس ہی کے ذریعے سمجھ سکتی ہے، براہ راست نہیں۔

اہم نکات

۱۔ غیر مبہم انداز میں بات کرنے سے عقل کو سمجھنے کا بہتر موقع فراہم ہوتا ہے۔

وَ اِنَّہٗ فِیۡۤ اُمِّ الۡکِتٰبِ لَدَیۡنَا لَعَلِیٌّ حَکِیۡمٌ ؕ﴿۴﴾ ۴۔ اور بلاشبہ یہ مرکزی کتاب (لوح محفوظ) میں ہمارے پاس برتر، پرحکمت ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اُمِّ الۡکِتٰبِ سے مراد اکثر مفسرین کے نزدیک لوح محفوظ ہے۔ چنانچہ سورہ بروج آیت ۲۱۔۲۲ میں فرمایا:

بَلۡ ہُوَ قُرۡاٰنٌ مَّجِیۡدٌ ﴿ۙ﴾ فِیۡ لَوۡحٍ مَّحۡفُوۡظٍ ﴿﴾ بلکہ یہ قرآن بلند پایہ ہے لوح محفوظ میں (ثبت) ہے۔

لوح محفوظ ہر قسم کے تغیر و تبدل سے محفوظ ہے۔ جس میں کل کائنات کا دستور ثبت ہے۔

۲۔ لَعَلِیٌّ حَکِیۡمٌ: یہ قرآن لوح محفوظ میں ہمارے پاس برتر، بلند مرتبہ ہے، یعنی لوح محفوظ میں جہاں دیگر کتابیں محفوظ ہیں ان میں قرآن کو ایک بالاتر حیثیت حاصل ہے اور حکمت آمیز بھی ہے۔

اس سے معلوم ہوا قرآن کو لوح کائنات میں ممتاز مقام حاصل ہے چونکہ یہ وہ کتاب ہے جو نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا معجزہ اور قیامت تک کے انسانوں کے لیے دستور حیات بھی ہے۔

---

[1] ۶ انعام: ۱۹

اہم نکات

۱۔ قرآن مجید کو لوح کائنات میں تمام آسمانی کتابوں میں بلند و برتر مقام ہے۔

اَفَنَضۡرِبُ عَنۡکُمُ الذِّکۡرَ صَفۡحًا اَنۡ کُنۡتُمۡ قَوۡمًا مُّسۡرِفِیۡنَ ۞۵

۵۔ کیا ہم اس ذکر (قرآن) کو محض اس لیے تم سے پھیر دیں کہ تم حد سے گزرے ہوئے لوگ ہو؟

تفسیر آیات

قوموں کی طرف سے پذیرائی نہ ملنے پر اللہ تعالیٰ ہدایت کا سلسلہ بند نہیں فرماتا۔ اس کی چند ایک وجوہ ہیں:

۱۔ ہدایت کے سلسلہ انبیاء علیہم السلام کو مبعوث کرنا اتمام حجت کے لیے ضروری ہے۔ حجت پوری کرنے سے پہلے صرف علم خدا کی بنیاد پر انہیں عذاب کا مستحق نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

۲۔ پوری قوم میں ایک شخص نے بھی ہدایت حاصل کرنی ہو تو بھی اللہ ہدایت کا سلسلہ بند نہیں فرماتا۔ چنانچہ قوم لوط کے بارے میں فرمایا:

فَمَا وَجَدۡنَا فِیۡہَا غَیۡرَ بَیۡتٍ مِّنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ۞ [1]

وہاں ہم نے ایک گھر کے علاوہ مسلمانوں کا کوئی گھر نہ پایا۔

۳۔ موجودہ نسل نے اگرچہ پذیرائی نہیں دی لیکن آنے والی نسلوں کے لیے پیغام ہدایت پہنچایا جاتا ہے۔ اس بات کی بہت سی مثالیں ہیں کہ بعض انبیاء علیہم السلام کے معاصر لوگ ایمان نہیں لائے مگر آنے والی نسلیں مسلمان ہو گئیں۔

۴۔ منکرین کو ملنے والی سزا سے آیندہ نسلوں کے لیے نشان عبرت وجود میں آتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ اکثر لوگوں کے منکر ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ ہدایت کا سلسلہ بند نہیں کرتا۔

وَکَمۡ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ نَّبِیٍّ فِی الۡاَوَّلِیۡنَ ۞۶

۶۔ اور پہلے لوگوں میں ہم نے بہت سے نبی بھیجے ہیں۔

---

[1] ۵۱ ذاریات: ۳۶

وَ مَا یَاۡتِیۡہِمۡ مِّنۡ نَّبِیٍّ اِلَّا کَانُوۡا بِہٖ یَسۡتَہۡزِءُوۡنَ ۞

۷۔ اور کوئی نبی ان کے پاس نہیں آتا تھا مگر یہ کہ یہ لوگ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔

فَاَہۡلَکۡنَاۤ اَشَدَّ مِنۡہُمۡ بَطۡشًا وَّ مَضٰی مَثَلُ الۡاَوَّلِیۡنَ ۞

۸۔ پس ہم نے ان سے زیادہ طاقتوروں کو ہلاک کر دیا اور پچھلی قوموں کی سنت نافذ ہو گئی۔

تفسیر آیات

عام لوگوں سے پذیرائی نہ ملنے کے باوجود ہم نے سابقہ امتوں میں انبیاء کو مبعوث کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ اگرچہ ان لوگوں نے انبیاء کا تمسخر اڑایا تاہم انبیاء کو آخر میں کامیابی حاصل ہوئی اور اے خاتم الرسل آپ کی قوم کی تو کوئی حیثیت نہیں اس قوم سے طاقتور قوموں کو ہم نے نابود کر دیا ہے۔

۲۔ مَضٰی مَثَلُ الۡاَوَّلِیۡنَ: آپ کی امت نے بھی وہی رویہ اختیار کر رکھا ہے جو سابقہ امتوں نے اختیار کیا ہے۔ لہٰذا ان کے بارے میں بھی پہلی قوموں کی سنت اور مثال نافذ ہو چکی ہے۔ اس جملے میں حتمی فیصلے کے نفاذ کی خبر دی جا رہی ہے۔ جیسے اس آیت میں ہے:

قُلۡ لِّلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِنۡ یَّنۡتَہُوۡا یُغۡفَرۡ لَہُمۡ مَّا قَدۡ سَلَفَ ۚ وَ اِنۡ یَّعُوۡدُوۡا فَقَدۡ مَضَتۡ سُنَّتُ الۡاَوَّلِیۡنَ ۞ [1]

کفار سے کہدیجیے کہ اگر وہ باز آ جائیں تو جو کچھ پہلے (ان سے سرزد) ہو چکا اسے معاف کر دیا جائے گا اور اگر انہوں نے (پچھلے جرائم کا) اعادہ کیا تو گزشتہ اقوام کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ (ان کے بارے میں بھی) نافذ ہو گا۔

لہٰذا قرآن میں لفظ مَضٰی حتمی فیصلے کے نفاذ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

تعجب ہے بعض بزرگ مفسرین نے مَضٰی کا معنی "سابقہ سورہ میں گزر گیا" کے معنوں میں لیا ہے۔

اہم نکات

۱۔ منکر قوموں کو مہلت تو مل جاتی ہے، بقا نہیں ملتی۔

وَ لَئِنۡ سَاَلۡتَہُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ لَیَقُوۡلُنَّ خَلَقَہُنَّ الۡعَزِیۡزُ الۡعَلِیۡمُ ۞

۹۔ اور اگر آپ ان سے پوچھیں: آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا؟ تو یہ ضرور کہیں گے: بڑے غالب آنے والے، علیم نے انہیں پیدا کیا ہے۔

---

[1] ۸ انفال: ۳۸

تفسیر آیات

اس آیت اور اس کے بعد آنے والی چند آیات کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، وحدانیت اور مدبریت پر استدلال سے ہے۔ قرآنی آیات کا متعدد مقامات پر اس بات پر زور ہے کہ خلق و تدبیر ناقابل تفریق ہے۔ اگر تخلیق میں تدبیر نہیں ہے تو تخلیق سے جدا تدبیر ممکن نہیں ہے۔

اگر آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں کائنات میں رہنے والوں کا خیال نہیں رکھا گیا ہے تو تخلیق سے بیرون کوئی طاقت ان رہنے والوں کے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔ مثلاً سورج کی تخلیق میں زمین پر بسنے والوں کی زندگی کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا، زمینی عناصر کی تخلیق و ترکیب میں اس پر بسنے والوں کے لیے کوئی حصہ نہیں رکھا گیا، اور پانی کی تخلیق میں اس بات کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا کہ اس سے زمین پر بسنے والوں کی کسی قسم کی ضرورت پوری ہو جائے تو کوئی بیرونی طاقت ان چیزوں میں وہ خاصیتیں ودیعت نہیں کر سکتی جو زمین پر بسنے والوں کو زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔ اگر کوئی بیرونی طاقت یہ خاصیتیں ان میں ودیعت کر سکتی ہے تو پھر خالق وہی ہے۔

مشرکین اپنے شریکوں کو خالق نہیں مانتے تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کو ہی خالق قبول کرتے تھے۔ اس بنا پر ان آیات میں اللہ کے مدبر اور رب ہونے پر استدلال کیا گیا ہے۔

اہم نکات

۱۔ تخلیق میں تدبیر نہیں ہے تو تخلیق سے بیرون تدبیر ممکن نہیں ہے۔

الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ مَہۡدًا وَّ جَعَلَ لَکُمۡ فِیۡہَا سُبُلًا لَّعَلَّکُمۡ تَہۡتَدُوۡنَ ۚ﴿۱۰﴾

۱۰۔ جس نے تمہارے لیے زمین کو گہوارہ بنایا اور اس میں تمہارے لیے راستے بنائے تاکہ تم راہ پا سکو۔

تفسیر آیات

۱۔ اللہ نے زمین کو صرف خلق نہیں فرمایا بلکہ اسے گہوارہ بھی بنایا۔ یعنی اسے اس طرح خلق کیا کہ انسان کے لیے گہوارے کا کام دے۔

واضح رہے کائنات کی فضا زندگی کے لیے سازگار نہیں ہے۔ اس ناسازگار فضا میں زمین کو زندگی کے لیے سازگار بنانے میں اللہ تعالیٰ کے چار دن لگے ہیں:

وَ جَعَلَ فِیۡہَا رَوَاسِیَ مِنۡ فَوۡقِہَا وَ بٰرَکَ اور اسی نے زمین میں اس کے اوپر پہاڑ بنائے اور اس

فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ۭ سَوَاۗءً لِّلسَّاۗىِٕلِيْنَ ۝ [1] میں برکات رکھ دیں اور اس میں چار دنوں میں حاجتمندوں کی ضروریات کے برابر سامان خوراک مقرر کیا۔

زمین کو اس آیت میں گہوارے سے تعبیر فرمایا گیا ہے جس میں بچے کو ہر قسم کی آسائش فراہم ہوتی ہے۔ فضائے عالم زندگی کے لیے نہایت ناسازگار ہے۔ اس ناسازگار فضا میں معلق زمین کی داخلی صورت یہ ہے کہ اس کا شکم آتش سے پر ہے اور بیرونی صورت یہ ہے کہ جس فضا میں یہ کرۂ سال بھر کی مسافت طے کرتا ہے وہ ساری فضا زندگی کے لیے نامساعد ہے۔

چنانچہ کرۂ ارض کو گہوارہ بننے میں اس کرہ کے حجم، پانی کی مقدار، انسان، حیوانات اور نباتات میں حیات بخش ہوا کے تبادلے، اجرام میں قوت جاذبہ کا تعادل، زمین کے گرد حفاظتی حصار، آسمان سے آنے والے شعاعوں کا کردار وغیرہ وغیرہ ہزاروں چیزوں کو دخل ہے۔

۲۔ جَعَلَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا: کرۂ ارض کے مختلف مناطق کے درمیان پہاڑ حائل ہیں۔ ان کا عبور کرنا کبھی مشکل اور کبھی ناممکن ہوتا ہے۔ قدرت نے پہاڑوں کے درمیان دروں کو پیدا کر کے انسان اور پانی کے لیے راہ ہموار فرمائی، جس سے یہاں زندگی گزارنے والوں کے بہت سے مسائل حل ہو جاتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ نامساعد فضائے بیکراں میں زندگی کے وسائل کو فراہمی تخلیق کے ساتھ تدبیر کا ثبوت ہے۔

وَالَّذِيْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءًۢ بِقَدَرٍ ۚ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ۚ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ۝۱۱

۱۱۔ اور جس نے آسمان سے پانی ایک مقدار میں نازل کیا جس سے ہم نے مردہ شہر کو زندہ کر دیا، تم بھی اسی طرح (قبروں سے) نکالے جاؤ گے۔

تفسیر آیات

۱۔ تمہارا رب وہی ہے جس نے آسمان سے پانی نازل کیا جس پر زمین والوں کی زندگی کا دارو مدار ہے۔

۲۔ بِقَدَرٍ: اہل ارض کی زندگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس پانی کی مقدار معین کی۔ نہ زیادہ کہ اہل ارض غرق ہو جائیں نہ کم کہ خشکی سے دوچار ہو جائیں۔

۳۔ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً: اس پانی کے ذریعے مردہ زمین زندہ کر کے ہم نے تمہارے لیے سامان زیست فراہم کیا۔ دیکھو! تدبیر حیات کس کے ہاتھ میں ہے۔

---

[1] ۴۱ فصلت: ۱۰

۴۔ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ: جس ذات نے زمین کو روئیدگی عنایت فرما کر اسے دوبارہ زندگی عنایت کی وہی ذات تمہیں کو زمین سے نکالے گی۔ حیات بعدالموت کا روز مشاہدہ کرنے کے باوجود یہ سوال اٹھاتے ہو کہ اللہ ان مردوں کو دوبارہ کیسے زندہ کرے گا؟

اہم نکات

۱۔ اللہ اس کائنات میں احیاء کا روز مظاہرہ فرماتا ہے۔ نافہم انسان پھر سوال کرتا ہے اللہ مردوں کو کیسے احیاء کرے گا؟

وَالَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ ﴿۱۲﴾

۱۲۔ اور جس نے تمام اقسام کے جوڑے پیدا کیے اور تمہارے لیے کشتیاں اور جانور آمادہ کیے جن پر تم سوار ہوتے ہو،

تفسیر آیات

۱۔ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا: وہی تمہارا رب اور مدبر ہے جس نے تمام جوڑوں کو پیدا کیا۔ یعنی اس کائنات کے تمام جوڑوں کو پیدا کر کے بتا دیا کہ خود خالق کا کوئی جوڑا نہیں ہے۔ اس کائنات میں کوئی یکتا نہیں ہے سوائے خالق ازواج کے۔ یہ زوجیت مرد و زن، مثبت منفی برقی توانائی، عناصر کی ترکیب میں منحصر نہیں ہے بلکہ زوجیت کا نظام کل کائنات پر حاکم ہے۔ سورہ یٰسٓ آیت ۳۶ میں ذکر آیا کہ زوجیت کا نظام عالم نباتات، عالم حیوانات کے علاوہ عالم مجہولات پر بھی حاکم ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ○

پاک ہے وہ ذات جس نے تمام جوڑے بنائے ان چیزوں سے جنہیں زمین اُگاتی ہے اور خود ان سے اور ان چیزوں سے جنہیں یہ جانتے ہی نہیں۔

۲۔ وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ: اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی میں نقل و حمل کی ضرورت کے پیش نظر اس کے لیے بھی وسائل خلق فرمائے ہیں۔ ان میں سے بطور مثال کشتی اور جانور کا ذکر ہے۔ کسی کے ذہن میں یہ سوال نہ آئے کہ ہمارے زمانے اور آنے والے زمانوں کے وسائل حمل و نقل کے مقابلے میں کشتی اور جانوروں کی کوئی خاص حیثیت نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ نے صرف ان دو چیزوں کا ذکر فرمایا؟

جواب یہ ہے کہ قیامت تک آنے والے وسائل حمل و نقل کی طرف اللہ تعالیٰ نے صاف لفظوں میں اشارہ فرمایا ہے۔ سورہ نحل آیت ۸ میں فرمایا:

وَّالْخَیْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِیْرَ لِتَرْكَبُوْهَا

اور (اس نے) گھوڑے خچر اور گدھے بھی (اس لیے

وَ زِیۡنَۃً ؕ وَ یَخۡلُقُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۝

پیدا کیے) تاکہ تم ان پر سوار ہو اور تمہارے لیے زینت بنیں، ابھی اور بھی بہت سی چیزیں پیدا کرے گا جن کا تمہیں علم نہیں ہے۔

وَ یَخۡلُقُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ: چنانچہ آج کی ایجادات عصر نزول قرآن کی مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ تھیں اور کل کی ایجادات آج ہمارے لیے مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ہیں۔ اس طرح ہر نسل کے لیے قرآن کا خطاب مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ زندہ رہے گا۔

لِتَسۡتَوٗا عَلٰی ظُہُوۡرِہٖ ثُمَّ تَذۡکُرُوۡا نِعۡمَۃَ رَبِّکُمۡ اِذَا اسۡتَوَیۡتُمۡ عَلَیۡہِ وَ تَقُوۡلُوۡا سُبۡحٰنَ الَّذِیۡ سَخَّرَ لَنَا ہٰذَا وَ مَا کُنَّا لَہٗ مُقۡرِنِیۡنَ ﴿ۙ۱۳﴾

وَ اِنَّاۤ اِلٰی رَبِّنَا لَمُنۡقَلِبُوۡنَ ﴿۱۴﴾

۱۳۔ تاکہ تم ان کی پشت پر بیٹھو پھر جب تم اس پر درست بیٹھ جاؤ تو اپنے پروردگار کی نعمت یاد کرو اور کہو: پاک ہے وہ جس نے اسے ہمارے لیے مسخر کیا ورنہ ہم اسے قابو میں نہیں لا سکتے تھے۔

۱۴۔ اور ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ لِتَسۡتَوٗا عَلٰی ظُہُوۡرِہٖ: ان سواریوں کی غرض تخلیق بیان فرمائی: کشتی کو پانی پر تیرنے کی صلاحیت دی اور حیوانات کی پشت کو اس طرح خلق فرمایا کہ انسان کی سواری کے لیے تسخیر ہو سکے۔

۲۔ ثُمَّ تَذۡکُرُوۡا نِعۡمَۃَ رَبِّکُمۡ: سواریوں کی پشت پر بیٹھ کر اپنے رب کی اس نعمت کو یاد کرو جس نے تمہاری سہولت کے لیے اس سواری کو مسخر کیا۔ ورنہ لَّمۡ تَکُوۡنُوۡا بٰلِغِیۡہِ اِلَّا بِشِقِّ الۡاَنۡفُسِ ....[1] تم اپنی منزل تک جانفشانی کے بغیر نہیں پہنچ سکتے تھے۔

۳۔ وَ تَقُوۡلُوۡا: اس کے بعد یہ دعائیہ جملے پڑھو جس میں اللہ تعالیٰ کی تنزیہ کے ساتھ شکر نعمت کا اظہار ہو۔ چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

یہ کہو: اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ ہَدَانَا لِلۡاِسۡلَامِ وَ عَلَّمَنَا الۡقُرۡآنَ وَ مَنَّ عَلَیۡنَا بِمُحَمَّدٍ ص

پھر پڑھو: سُبۡحٰنَ الَّذِیۡ سَخَّرَ لَنَا ہٰذَا وَ مَا کُنَّا لَہٗ مُقۡرِنِیۡنَ وَ اِنَّاۤ اِلٰی رَبِّنَا لَمُنۡقَلِبُوۡنَ۔[2]

اس روایت سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ شکر نعمت ادا کرتے ہوئے سُبۡحٰنَ کے ساتھ تنزیہ ہونی چاہیے۔

[1] ۱۶ نحل: ۷ [2] الکافی ۶: ۲۸۴

۴۔ وَ اِنَّاۤ اِلٰی رَبِّنَا لَمُنۡقَلِبُوۡنَ: انسان دنیا میں جو سفر کرتا ہے اس میں آخرت کے طویل سفر کو یاد رکھنا چاہیے جسے ہر انسان نے طے کرنا ہے۔ وہ طویل سفر دنیا سے کوچ کر کے اللہ کی بارگاہ میں جانے والا سفر ہے۔

اہم نکات

۱۔ نظام کائنات کی تدبیر میں زوجیت کا بڑا دخل ہے۔

۲۔ کشتیوں کی روانی اور حیوانات کی نقل و حمل میں تدبیر حیات کا اہم کردار ہے۔

وَ جَعَلُوۡا لَهٗ مِنۡ عِبَادِهٖ جُزۡءًا ؕ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَکَفُوۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿ؕ۱۵﴾ ع

۱۵۔ اور ان لوگوں نے اللہ کے بندوں میں سے (کچھ کو) اللہ کا جز (اولاد) بنا دیا، یہ انسان یقیناً کھلا ناشکرا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ ان مشرکوں نے اللہ کے بندوں میں سے کچھ (ملائکہ) کو اللہ کی حقیقی اولاد قرار دیا ہے۔ اولاد انسان کا حصہ ہوتی ہے جو انسان سے منفصل ہو کر اولاد کی شکل میں جدا اور مستقل حیثیت حاصل کرتی ہے۔ اس طرح اولاد اپنے باپ کی جزء شمار ہوتی ہے۔ اس آیت سے یہ بات بھی واضح ہو گئی مشرکین فرشتوں کو اللہ کی حقیقی اولاد قرار دیتے تھے، اعزازی نہیں۔

۲۔ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَکَفُوۡرٌ مُّبِیۡنٌ: اللہ کے لیے اولاد اور جزء کا تصور شان الٰہی میں عظیم گستاخی ہے چونکہ اس تصور میں اللہ کو مخلوق کی طرح قرار دیا اور پھر اولاد کا تصور کیا گیا ہے جو شان الٰہی کی ناقدری ہے۔

اہم نکات

۱۔ اولاد باپ کا حصہ ہے۔ اللہ کو حصوں میں تصور کرنا شان الٰہی میں گستاخی ہے۔

۲۔ اولاد احتیاج کی ایک صورت ہے۔ اللہ بے محتاج ہے۔

اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا یَخۡلُقُ بَنٰتٍ وَّ اَصۡفٰىکُمۡ بِالۡبَنِیۡنَ ﴿۱۶﴾

۱۶۔ کیا اللہ نے اپنی مخلوقات میں سے (اپنے لیے) بیٹیاں بنا لیں اور تمہیں بیٹوں کے لیے منتخب کیا؟

تفسیر آیات

مشرکین کے معاشرے میں کسی کے ہاں لڑکی کا پیدا ہونا ناقابل تلافی عار و ننگ سمجھا جاتا ہے۔ اللہ

نے اپنے لیے بیٹی کو انتخاب کیا ہو اور تمہارے لیے بیٹے کو منتخب کیا یعنی خود تمہارے نزدیک اللہ کو معاذ اللہ اتنا احساس نہیں تھا کہ اپنے لیے بہتر کا انتخاب کرتا۔ یہ بات مشرکین کے عقیدے کے مطابق بطور الزام بیان ہو رہی ہے ورنہ درحقیقت لڑکا، لڑکی دونوں انسانی قدروں کے مطابق برابر ہیں۔

وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمۡ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحۡمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجۡهُهٗ مُسۡوَدًّا وَّ هُوَ كَظِيۡمٌ ﴿۱۷﴾

۱۷۔ حالانکہ جب ان میں سے کسی ایک کو بھی اس (بیٹی) کا مژدہ سنایا جاتا ہے جو اس نے خدائے رحمٰن کی طرف منسوب کی تھی تو اندر ہی اندر غصے سے پیچ وتاب کھا کر اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے۔

تفسیر آیات

مشرکین فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے اور عورتوں کی شکل میں بت تراشتے تھے۔

اس آیت میں فرمایا: کیا یہ ادب اور مناسب ہے کہ اللہ کی طرف اس چیز کو منسوب کیا جائے کہ خود تمہارے لیے بیٹی پیدا ہو جائے تو تمہارا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور غم و غصے سے پھٹنے لگتے ہو بلکہ کبھی اسے زندہ درگور کرتے ہو اسے اللہ کے حصے میں رکھ دیا اور لڑکے جو تمہارے لیے باعث فخر ہیں وہ اپنے لیے۔

اَوَ مَنۡ يُّنَشَّؤُا فِى الۡحِلۡيَةِ وَهُوَ فِى الۡخِصَامِ غَيۡرُ مُبِيۡنٍ ﴿۱۸﴾

۱۸۔ کیا وہ جو زیور (ناز ونعم) میں پلتی ہے اور جھگڑے میں (اپنا) مدعا واضح نہیں کر سکتی (اللہ کے حصے میں ہے)؟

تفسیر آیات

کیا اللہ کے حصے میں ایسی اولاد رکھ دی جو زیورات میں پالی جاتی ہے۔ یعنی جو اولاد نازک اور ناز پرور ہے اور جس کا ہم و غم اپنا وجود ہوتا ہے، اسی لیے وہ زیور کی شوقین ہوتی ہے، اسے اللہ کے حصے رکھتے ہو۔

یہ باتیں لڑکیوں کے لیے نقص نہیں ہیں بلکہ مشرکین کے معاشرے اور ان کی سوچ کے مطابق بات ہو رہی ہے کہ گھر کی چار دیواری میں زیورات میں پلنا تمہارے یہاں نقص ہے۔ تمہارے نزدیک کمال یہ ہے کہ میدان میں اترے اور دشمن کا مقابلہ کرے۔ الۡخِصَامِ غَيۡرُ مُبِيۡنٍ جبکہ لڑکیاں دشمن کے مقابلے میں سامنے نہیں آتیں کہ اپنا مدعا بیان کریں اور اپنے موقف پر دلیل قائم کریں چونکہ عورتیں جذبات سے مغلوب ہوتی ہیں۔ یہ سب عورتوں کے لیے حقیقی نقص نہیں بلکہ مشرکین کے سماجی حالات کے تحت عورت کا کوئی مقام نہیں

تھا۔ اسے وہ اللہ کی طرف منسوب کرتے تھے۔

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِکَۃَ الَّذِیْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ؕ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْـَٔلُوْنَ ﴿۱۹﴾

۱۹۔ اور انہوں نے فرشتوں کو جو اللہ کے بندے ہیں عورتیں قرار دے دیا، کیا انہوں نے ان کو خلق ہوتے ہوئے دیکھا تھا؟ عنقریب ان کی گواہی لکھی جائے گی اور ان سے پوچھا جائے گا۔

تفسیر آیات

۱۔ مشرکین فرشتوں کو عورتیں قرار دیتے ہیں حالانکہ انہوں نے فرشتوں کی تخلیق کا مشاہدہ نہیں کیا، نہ ان کی جسمانی ساخت کا مشاہدہ کیا۔ یعنی ان لوگوں نے کبھی کسی فرشتے کو نہیں دیکھا۔ وہ صرف ظن وگمان اور اپنے آباء واجداد کی تقلید میں کہتے ہیں کہ فرشتے عورتیں ہیں۔ نہ ان کا خود اللہ سے رابطہ ہے، نہ رسالت کے قائل ہیں کہ کسی رسول نے انہیں خبر دی ہو۔

۲۔ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ: ان کی یہ باتیں محفوظ ہیں۔ قیامت کے دن ان سے سوال ہو گا۔

اہم نکات

۱۔ مشرکین اللہ کی شان میں گستاخی اس صورت میں بھی کرتے تھے کہ جس صنف (عورتوں) کو وہ اپنے لیے عار وننگ، غیر مؤثر سمجھتے تھے اسے اللہ حصے میں رکھتے تھے کہ وہ اللہ کی اولاد ہیں۔

وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ؕ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۲۰﴾ اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ ﴿۲۱﴾

۲۰۔ اور وہ کہتے ہیں: اگر خدائے رحمٰن چاہتا تو ہم ان (فرشتوں) کی پوجا نہ کرتے، انہیں اس کا کوئی علم نہیں یہ تو صرف اندازے لگاتے ہیں۔

۲۱۔ کیا ہم نے انہیں اس (قرآن) سے پہلے کوئی دستاویز دی ہے جس سے اب یہ تمسک کرتے ہیں؟

تفسیر آیات

اور وہ (مشرکین) کہتے ہیں اگر خدائے رحمٰن چاہتا تو ہم ان (فرشتوں) کی پوجا نہ کرتے۔ انہیں اس کا کوئی علم نہیں یہ تو صرف اندازے لگاتے ہیں۔

کیا ہم نے انہیں اس (قرآن) سے پہلے کوئی دستاویز دی ہے جس سے یہ اب تمسک کرتے ہیں؟

۱۔ وَ قَالُوۡا: یہی نظریۂ جبر ہے۔ اللہ کی عبادت کرنا خیر ا بھی اللہ کی طرف سے ہے اور بتوں کی پوجا کرنا شر ا بھی اللہ کی طرف سے ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے:

اگر اللہ کی منشاء یہ تھی کہ ہم بتوں کی پوجا نہ کریں تو ہمارے لیے بتوں کی پوجا کرنا ممکن ہی نہ تھا کیونکہ اللہ کے ارادے کو کوئی روک نہیں سکتا لیکن ہم بتوں کی پوجا کر رہے ہیں اس سے ثابت ہوا ہمارا بتوں کی پوجا کرنا اللہ کی منشاء کے مطابق ہے۔

یہی نظریہ جبر ہے جو مسلمانوں کے ایک کلامی مذہب نے اختیار کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کائنات میں جو کچھ رونما ہوتا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ کسی عمل، مثلاً ناحق قتل کو اللہ نہ چاہے پھر بھی وہ رونما ہو جائے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو لازم آتا ہے اللہ کا ارادہ مغلوب اور قاتل کا ارادہ غالب آ جائے۔

ایک مجلس میں نظریہ جبر کا عالم بیٹھا تھا۔ اس میں ایک دوسرا عالم جو نظریۂ جبر کا قائل نہ تھا وارد ہوتا ہے۔ اسے دیکھ کر اس نے جبریہ پر طنز کے طور پر کہا: سبحان من تنزه عن الفحشآء۔ پاکیزہ ہے وہ ذات جو قتل و زنا جیسے فحشاء سے پاک ہے۔ جبریہ نے جواب میں کہا: پاکیزہ ہے وہ ذات جس کی مملکت میں صرف اسی کی منشاء چلتی ہے۔

نظریۂ جبر والوں کو اس جگہ بہت بڑی غلط فہمی ہو گئی: ''اللہ کی مملکت میں صرف اس کی منشاء چلتی ہے۔'' چونکہ یہ بات اللہ کی تکوینی منشاء اور ارادے میں تو درست ہے۔ تشریعی ارادے میں نہیں۔ ان لوگوں کو اللہ کے تکوینی ارادے اور تشریعی ارادے میں خلط ہو گیا ہے۔

تکوینی ارادہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خود کوئی عمل انجام دینا چاہے۔

تشریعی ارادہ یہ ہے کہ اللہ یہ چاہے کہ بندہ اپنے اختیار سے یہ عمل انجام دے۔ آگے بندہ اس عمل کو انجام دیتا ہے اور نہیں بھی دیتا۔

صحیح ہے اللہ تعالیٰ خود کسی کام کے انجام دینے کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے اس ارادے کے سامنے کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی ہے۔ یہاں اللہ کا کن فیکون نافذ ہے۔

اِنَّمَاۤ اَمۡرُہٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیۡئًا اَنۡ یَّقُوۡلَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ۔ اسے ارادہ تکوینی کہتے ہیں۔ اللہ کے تکوینی ارادوں میں سے ایک ارادہ یہ بھی ہے کہ بندے اپنے ارادے کے مالک، خود مختار ہوں۔ اس کے تحت جب اللہ یہ ارادہ فرماتا ہے اس کے بندے اچھے اعمال بجا لائیں اور برے اعمال انجام نہ دیں تو اللہ کے اس ارادے کے مطابق بندے عمل کرتے بھی ہیں اور نہیں بھی کرتے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو خود مختار رکھا ہے، انہیں اپنے ارادے کا مالک بنایا ہے۔ چنانچہ طاقت اللہ کی طرف سے ہے، اس کا استعمال بندے کی طرف سے ہے۔ اللہ نے بندوں کو اچھا اور برا عمل کرنے کا اختیار دیا ہے لہٰذا اختیار اللہ کی طرف سے ہے،

انتخاب بندے کی طرف سے۔ اسی وجہ سے تو بندہ اپنے عمل کا ذمے دار ہے۔ اگر مجبور ہوتا تو جبر کرنے والا ذمے دار ہوتا۔

۲۔ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ : یہ جملہ نہایت قابل توجہ ہے کہ مشرکین کا یہ نظریۂ جبر جہالت پر مبنی ہے۔ انہیں اللہ کی مشیت کا علم نہیں ہے۔ اللہ کے ارادوں کا علم نہیں ہے۔ اللہ کی خوشنودی کا علم نہیں ہے۔

حضرت امام رضا علیہ السلام سے روایت ہے:

من قال بالجبر فلا تعطوه من الزكوة شيئا ولا تقبلوا له شهادة ابداً ان الله تعالىٰ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا و لا يحملها فوق طاقتها وَلَا تَكۡسِبُ كُلُّ نَفۡسٍ اِلَّا عَلَيۡهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰى ۔[1]

جو شخص جبر کا قائل ہے اسے زکوۃ میں سے کچھ بھی نہ دو، نہ کبھی بھی اس کی گواہی قبول کرو۔ اللہ کسی انسان کو اس کی گنجائش سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا اور اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بوجھ نہیں ڈالتا۔ انسان جو عمل کرتا ہے اس کا خود ذمے دار ہے کسی اور پر اس کا بوجھ نہیں ڈالا جاتا۔

۳۔ اِنۡ هُمۡ اِلَّا یَخۡرُصُوۡنَ : الخرص بنا بقولے کذب کو کہتے ہیں۔ اصل میں جو بات ظن و تخمین کی بنا پر اختیار کی جاتی ہے اسے خرص کہتے ہیں۔

۴۔ اَمۡ اٰتَیۡنٰهُمۡ کِتٰبًا : کیا ان کے پاس کوئی وحی نازل ہوئی جس کے ذریعے ان پر کوئی کتاب نازل ہوئی ہے کہ سند ہو جائے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ پس ان کے پاس نہ عقلی دلیل موجود ہے، نہ وحی کی دلیل ہے چونکہ وحی اور رسالت کے یہ لوگ قائل نہیں ہیں۔

اہم نکات

۱۔ نظریۂ جبر جہالت پر مبنی ہے: مَا لَهُمۡ بِذٰلِكَ مِنۡ عِلۡمٍ ....

۲۔ نظریہ جبر، ظن و تخمین پر مبنی ہے۔

۳۔ نظریۂ جبر شان الٰہی میں شرک کی طرح گستاخی ہے۔

بَلۡ قَالُوۡۤا اِنَّا وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰۤى اٰثٰرِهِمۡ مُّهۡتَدُوۡنَ ﴿۲۲﴾

۲۲۔ (نہیں) بلکہ یہ کہتے ہیں: ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک رسم پر پایا اور ہم انہی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔

---

[1] عیون اخبار الرضا ۱: ۱۴۳

تفسیر آیات

ان کی دلیل صرف اور صرف اندھی تقلید ہے۔ جب کہ ان کے آبا و اجداد کا موقف بھی کسی سند کے بغیر تھا۔

وَكَذٰلِكَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ فِیۡ قَرۡیَةٍ مِّنۡ نَّذِیۡرٍ اِلَّا قَالَ مُتۡرَفُوۡهَاۤ ۙ اِنَّا وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤی اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰۤی اٰثٰرِهِمۡ مُّقۡتَدُوۡنَ ﴿۲۳﴾

۲۳۔ اور اسی طرح ہم نے آپ سے پہلے کسی بستی کی طرف کوئی تنبیہ کرنے والا نہیں بھیجا مگر یہ کہ وہاں کے عیش پرستوں نے کہا: ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک رسم پر پایا اور ہم انہی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔

تفسیر آیات

مال و دولت سے انسان کی خواہشات کا درندہ بیدار ہو جاتا ہے پھر تمام اخلاقی قدروں کو چیر پھاڑ ڈالتا ہے۔ اسی لیے مراعات یافتہ طبقہ ہمیشہ ہر قوم میں فساد کی جڑ ہوا کرتا ہے۔ اس آیت کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ بنی اسرائیل آیت ۱۶ اور سورہ سبا آیت ۳۴۔

قٰلَ اَوَ لَوۡ جِئۡتُكُمۡ بِاَهۡدٰی مِمَّا وَجَدۡتُّمۡ عَلَیۡهِ اٰبَآءَكُمۡ ؕ قَالُوۡۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرۡسِلۡتُمۡ بِهٖ كٰفِرُوۡنَ ﴿۲۴﴾

فَانۡتَقَمۡنَا مِنۡهُمۡ فَانۡظُرۡ كَیۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُكَذِّبِیۡنَ ﴿۲۵﴾ ع

۲۴۔ (ان کے نبی نے) کہا: خواہ میں اس سے بہتر ہدایت لے کر آؤں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے؟ وہ کہنے لگے: جو کچھ دے کر تم بھیجے گئے ہو ہم اسے نہیں مانتے۔

۲۵۔ چنانچہ ہم نے ان سے انتقام لیا اور دیکھ لو تکذیب کرنے والوں کا کیا انجام ہوا۔

تفسیر آیات

چنانچہ ان میں سے ہر قوم کو ایک قسم کے عذاب سے دوچار کیا اور وہ نابود ہو گئی لیکن انبیاء علیہم السلام کے پیغامات ان کے بعد آنے والے مرسلین کے ذریعے زندہ ہیں۔

۲۔ فَانۡظُرۡ: عقل و فکر اور عبرت کی نگاہ سے دیکھو تو تکذیبی عناصر کا مستقبل تاریک نظر آئے گا۔

اہم نکات

۱۔ شرک کا مدرک جاہل کی اندھی تقلید کے سوا کچھ نہیں۔

۲۔ مشرک کا انجام رسوائی اور تباہی ہے۔

وَ اِذۡ قَالَ اِبۡرٰہِیۡمُ لِاَبِیۡہِ وَ قَوۡمِہٖۤ اِنَّنِیۡ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعۡبُدُوۡنَ ﴿۲۶﴾

۲۶۔ اور جب ابراہیم نے اپنے باپ (چچا) اور اپنی قوم سے کہا: جنہیں تم پوجتے ہو ان سے میں یقیناً بیزار ہوں۔

اِلَّا الَّذِیۡ فَطَرَنِیۡ فَاِنَّہٗ سَیَہۡدِیۡنِ ﴿۲۷﴾

۲۷۔ سوائے اپنے رب کے جس نے مجھے پیدا کیا، یقیناً وہی مجھے سیدھا راستہ دکھائے گا۔

تفسیر آیات

آبائی تقلید کے خلاف قیام کی بہترین مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سیرت میں ہے کہ ایک مشرک ماحول میں پلے بڑھے پھر بھی ایک مقتدر مشرک آزر کے خلاف قیام کرتے ہیں جو ان کے باپ کی جگہ تھا اور ساتھ اقتدار پر بھی اور بادشاہ کے بعد سب سے بڑے منصب (بت خانے کا انچارج) پر فائز تھا۔

اے مشرکین اگر تمہیں اپنے آباء کی تقلید کرنی ہے تو اپنے باپ بت شکن ابراہیم کی تقلید کیوں نہیں کرتے جو تمہارے آباء سے زیادہ محترم ہیں، جن پر تمہارے افتخارات کا دارومدار ہے۔

۱۔ وَ اِذۡ قَالَ اِبۡرٰہِیۡمُ لِاَبِیۡہِ وَ قَوۡمِہٖۤ: چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی اس توحیدی تحریک کا آغاز اپنے باپ (چچا) سے کیا جو ایک قوم کے برابر طاقت وقوت کا مالک تھا۔

۲۔ اِنَّنِیۡ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعۡبُدُوۡنَ: فرمایا: میں تمہارے معبودوں سے برائت چاہتا ہوں۔ یعنی اے مشرکو! تمہارے جداعلیٰ بتوں سے بیزاری اختیار کرتے ہیں۔ تم کس منطق کی رو سے ان بتوں کو معبود بناتے ہو۔

۳۔ اِلَّا الَّذِیۡ فَطَرَنِیۡ: میں اس ذات سے برائت نہیں اختیار کرتا بلکہ اسے معبود بناتا ہوں جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ صرف اور صرف میرا خالق لائق عبادت ہے۔ عبادت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ ذات میری راہنمائی کرتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس جگہ لائق عبادت ہونے کے لیے دو باتوں کا ذکر فرماتے ہیں۔ ایک خلق، دوسری ہدایت۔

۴۔ فَاِنَّہٗ سَیَہۡدِیۡنِ: واضح رہے اصل سرچشمہ ہدایت اللہ کی ذات ہے۔ وہ ہدایت فطرت اور خلقت میں ودیعت اور انبیاء علیہم السلام مبعوث فرماتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام اللہ سے ملنے والی ہدایت لوگوں کو پہنچاتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ معبود وہ ہوتا ہے جو خلقت کے ساتھ ہدایت کا بھی اہتمام کرے۔

وَ جَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۸﴾

۲۸۔ اور اللہ نے اس (توحید پرستی) کو ابراہیم کی نسل میں کلمہ باقیہ قرار دیا تاکہ وہ (اللہ کی طرف) رجوع کریں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ جَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً: اللہ تعالیٰ نے کلمۂ توحید کو دوام بخشا۔ جعل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فاعل حقیقی نہیں ہیں۔ کلمة سے مراد کلمہ لا الہ الا اللّٰہ ہے۔ اسے اللہ نے دوام بخشا۔

دوسری تفسیر یہ ہے جَعَلَهَا میں ضمیر برائت کی طرف جاتی ہے جو اِنَّنِيْ بَرَآءٌ میں ضمناً مذکور ہے۔ یہ تفسیر پہلی تفسیر سے مختلف نہیں ہے چونکہ کلمہ لا الہ الا اللّٰہ میں پہلے برائت ہے اور اس کا بھی نتیجہ توحید ہے چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تکبیر میں ایک برائت ہے لا الہ اور اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ میں الا اللّٰہ ہے۔

۲۔ فِيْ عَقِبِهٖ: ان کی اولاد میں کلمۂ توحید یا برائت از مشرکین کو دوام بخشا۔ عَقِبِهٖ سے مراد تقریباً سب کے نزدیک اولاد ابراہیم ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا تھی: وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ۔[۱] چنانچہ برائت از مشرکین اور کلمۂ توحید کے روئے زمین پر دوام حاصل کرنے میں آلِ ابراہیم ہی کا کردار ہے۔ ان میں سے تین اولوالعزم ہیں: موسیٰ، عیسیٰ علیہما السلام اور حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ و آلہ۔ آج روئے زمین پر اہم ادیان کی بانی، آپ اور انہیں دوام دینے والی آپ کی آل ہے: جَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَ الْكِتٰبَ۔[۲] اور دعائے ابراہیم بھی اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی: وَ اجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ۔[۳] چنانچہ ہر امت ان کی آل کی تعظیم و توقیر کرتی ہے۔

عَقِبِهٖ کے مصداق اس امت میں آل محمد علیہم السلام ہیں۔

۱۔ حضرت حذیفہ بن یمان راوی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ نے فرمایا:

ان اللّٰہ تبارك و تعالیٰ جعل الامامة فی عقب الحسین و ذلك قوله تعالیٰ وَ جَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ ....[۴]

اللہ تعالیٰ نے امامت کو حسین کی نسل میں رکھا ہے۔ چنانچہ اللہ کا فرمان ہے: وَ جَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ۔

۱۔ ۲ بقرہ: ۱۲۸　۲۔ ۲۹ عنکبوت: ۲۷　۳۔ ۲۶ شعراء: ۸۴

۴۔ ملاحظہ ہو کفایة الاثر صفحہ ۱۳۶ تالیف علی بن محمد الخزار کان حیا فی القرن الرابع

۲۔ ابو ہریرہ: الاعرج، ابوہریرہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے وَ جَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ کے بارے میں پوچھا تو فرمایا:

جعل الامامة فی عقب الحسین ع	اللہ نے امامت حسین علیہ السلام کی اولاد میں رکھی ہے۔
یخرج من صلبه تسعة من الائمة	آپؑ کی پشت سے نو اماموں کی ولادت ہوگی۔ ان
منهم مهدی هذه الامة....[1]	میں ایک اس امت کے مہدی ہیں۔

۳۔ حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے آپ نے آیۂ وَ جَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ کی تلاوت فرما کر فرمایا:

کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم عقب ابراهیم و نحن اهل البیت عقب ابراهیم و عقب محمد صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم ۔[2]	رسول اللہ ﷺ ابراہیم کی نسل اور ہم اہل بیت ابراہیم کی نسل اور محمد ﷺ کی نسل ہیں۔

۴۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ عَقِبِهٖ حضرت امام حسین کی اولاد کے بارے میں ہے۔[3]

۵۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے: وَ جَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ سے مراد امامت ہے جو قیامت تک اولاد حسین علیہ السلام میں رکھی گئی ہے۔[4]

۶۔ امام زین العابدین علیہ السلام سے روایت ہے:

وفینا نزلت وَ جَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ ۔[5]	فرمایا: یہ آیت ہمارے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

۷۔ سدی کا بھی یہی نظریہ ہے کہ عَقِبِهٖ سے مراد آل محمد علیہم السلام ہیں۔[6] یعنی برائت از مشرکین اور توحید کی تحریک جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے شروع فرمائی ہے اسے اللہ نے اولاد ابراہیم میں کلمہ باقیہ قرار دیا اور یہ اولاد ابراہیم حضرت خاتم الانبیاء ﷺ کے دست مبارک سے ایک ابدی مرحلے میں داخل ہو گئی۔ حضرت خلیل کے ایک بت شکن فرزند حضرت علی علیہ السلام نے ۹ ہجری کو حج اکبر کے موقع پر برائت از مشرکین کا اعلان فرمایا۔ تفصیل سورہ توبہ آیت ۳ ملاحظہ فرمائیں۔

لَعَلَّهُمۡ يَرۡجِعُوۡنَ: تاکہ لوگ شرک چھوڑ کر توحید کی طرف، غیر اللہ کو چھوڑ کر اللہ کی طرف رجوع کریں۔ چنانچہ آج روئے زمین پر جتنے بھی توحید پرست ہیں وہ ابراہیم علیہ السلام اور آل ابراہیم کی تحریک کا نتیجہ ہیں۔

---

[1] کفایة الاثر ص ۸۶ [2] تاویل الایات ص ۵۴۰ [3] بحار الانوار ۲۴: ۱۷۹۔ کمال الدین ۲: ۴۱۵
[4] مجمع البیان [5] بحار الانوار ۵۱: ۱۳۴ [6] تفسیر قرطبی ۱۶: ۷۷

اہم نکات

۱۔ قیامت تک توحید کے علمبردار ابراہیم علیہ السلام اور آل ابراہیم ہیں۔

بَلۡ مَتَّعۡتُ ہٰۤؤُلَآءِ وَ اٰبَآءَہُمۡ حَتّٰی جَآءَہُمُ الۡحَقُّ وَ رَسُوۡلٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۲۹﴾

۲۹۔ (ان کافروں کو فوری ہلاک نہیں کیا) بلکہ میں نے انہیں اور ان کے باپ دادا کو متاع حیات دی یہاں تک کہ ان کے پاس حق اور واشگاف بیان کرنے والا رسول آ گیا۔

تفسیر آیات

۱۔ عظیم اس توحیدی حرکت کے باوجود ان مشرکین اور ان کے آباء نے توحید کی طرف رجوع نہیں کیا اور اپنے شرک پر قائم رہے تو ہم نے انہیں عذاب دینے میں عجلت سے کام نہیں لیا بلکہ انہیں آج تک یعنی اللہ کی آخری حجت کے آنے تک مہلت دے دی۔

۲۔ حَتّٰی جَآءَہُمُ الۡحَقُّ: اب ان کے پاس قرآن جیسی حق اور حقیقت سے آگاہ کرنے والی کتاب آ گئی ہے۔

۳۔ وَ رَسُوۡلٌ مُّبِیۡنٌ: اور حق اور باطل میں کسی قسم کے ابہام کے بغیر واضح اور واشگاف لفظوں میں بیان کرنے والے ایک افصح العرب رسول ان کے پاس آئے ہیں۔

اس میں اشارہ ہے کہ اب تمہیں مہلت نہیں ملے گی۔

اہم نکات

۱۔ قرآن و خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے آنے کے بعد شرک بطور امت باقی نہیں رہے گا۔

وَ لَمَّا جَآءَہُمُ الۡحَقُّ قَالُوۡا ہٰذَا سِحۡرٌ وَّ اِنَّا بِہٖ کٰفِرُوۡنَ ﴿۳۰﴾

۳۰۔ اور جب حق ان کے پاس آیا تو کہنے لگے: یہ تو جادو ہے، ہم اسے نہیں مانتے۔

تفسیر آیات

جب حق واضح اور واشگاف الفاظ میں بیان کرنے والے نے پیش کیا تو ان لوگوں نے اس قرآن کو جادو کہہ کر ٹھکرا دیا جب کہ قرآن اور جادو میں کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب عصا کو

اژدھا بنا دیا تو اسے جادو اور نظروں کا دھوکہ کہہ کر رد کیا لیکن قرآن ایک ثابت عبارت پر مشتمل ہے جو ہمیشہ ہر شخص کے سامنے ہے۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴿٣١﴾

۳۱۔ اور کہتے ہیں: یہ قرآن دونوں بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہیں کیا گیا؟

تفسیر آیات

۱۔ اکثر انسان مادی سوچ سوچتے ہیں۔ ان کی عقل ان کی آنکھوں میں ہوتی ہے لہٰذا ان کی سوچ میں طبقاتی امتیاز رچا بسا ہوتا ہے۔ جاہلی سوچ آج بھی شخصیت کے بیرونی عوامل کو امتیاز دیتی ہے، انسان کی داخلی خصوصیات کو نہیں۔ لہٰذا یہ سوچ علم، شجاعت، روحانیت اعلیٰ انسانی قدروں اور اخلاق حمیدہ پر جو انسان کی داخلی خصوصیت ہیں، مال، دولت منصب، کرسی کو امتیاز دیتی ہے، جو انسانی شخصیت کے بیرونی عوامل ہیں جن سے انسان بعض حالات میں اہم انسانی خصوصیات سے محروم ہو سکتا ہے۔

اس ظاہری اور سطحی پیمانے کے تحت مشرکین نے کہا: مکہ اور طائف کے کسی رئیس قبیلہ کو اپنا نمائندہ بناتا جس کے پاس دولت اور سرداری ہے۔ اللہ کو عبد اللہ کا یتیم ملا جس کے پاس دولت ہے نہ سرداری۔

اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ۭ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ۭ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿٣٢﴾

۳۲۔ کیا آپ کے پروردگار کی رحمت یہ لوگ تقسیم کرتے ہیں؟ جب کہ دنیاوی زندگی کی معیشت کو ان کے درمیان ہم نے تقسیم کیا ہے اور ہم ہی نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر درجات میں فوقیت دی ہے تاکہ ایک دوسرے سے کام لے اور آپ کے پروردگار کی رحمت اس چیز سے بہتر ہے جسے یہ لوگ جمع کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ: نبوت جیسی آپ کے رب کی رحمت یہ لوگ تقسیم کرنے لگے ہیں کہ نبوت کسے ملنی چاہیے۔ انہیں الٰہی منصب بانٹنے کا حق کس نے دیا؟ یہ لوگ کہاں اور الٰہی منصب کے لیے افراد کا انتخاب کہاں!!

اَللّٰہُ اَعۡلَمُ حَیۡثُ یَجۡعَلُ رِسَالَتَہٗ ...[1] اللہ (ہی) بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کہاں رکھے۔

۲۔ نَحۡنُ قَسَمۡنَا بَیۡنَہُمۡ مَّعِیۡشَتَہُمۡ: ہم نے اس سے کمتر چیز یعنی ان کی معیشت ان کے ہاتھ میں نہیں دی۔ وہ معیشت جو ہر مومن و کافر اور منافق کو ملتی ہے، ہر جابر اور سرکش کو بھی ملتی ہے، ان کے اختیار میں نہیں رکھی تو نبوت جیسے عظیم الٰہی منصب کا اختیار انہیں دیں گے؟ روزی جو ہر اچھے برے کو ہم نے دینی ہے، اس کی تقسیم میں جو مصلحتیں ہیں وہ ان مصلحتوں کو نہیں جانتے تو کیا یہ لوگ ان قدروں کو پہچان سکیں گے جن کے تحت الٰہی منصب تقسیم کرنا ہے؟

۳۔ وَرَفَعۡنَا بَعۡضَہُمۡ فَوۡقَ بَعۡضٍ دَرَجٰتٍ: اور ہم نے ہی بعض انسانوں کی لیاقت اور استعداد میں فرق رکھا ہے جس کی وجہ سے مادی وسائل کے حصول میں فرق آتا ہے۔

اس فرق میں یہ مصلحت کارفرما ہے کہ انسان ایک دوسرے کے کام آتے ہیں یعنی استعداد میں اختلاف آنے سے ہنر اور فنون میں اختلاف آتا۔ ترکھان انجینئر کے کام آتے ہیں اور مستری ڈاکٹر کے کام آتے ہیں۔ ہر فن اور ہنر دوسروں کے لیے قابل تسخیر و استفادہ ہو جاتا ہے۔

۴۔ وَرَحۡمَتُ رَبِّکَ: جب کہ اللہ کی رحمت دنیاوی مال دولت سے کہیں بہتر ہے۔ دنیا کا مال قابل زوال ہے جب کہ اللہ کی رحمت یعنی ثواب ابدی اور لازوال ہے۔

اہم نکات

۱۔ الٰہی منصب بانٹنے کا حق صرف اللہ کو حاصل ہے۔

۲۔ اللہ نے روزی بانٹنے کا حق غیر اللہ کو نہیں دیا جو ہر مومن و کافر کو ملتی ہے۔

وَلَوۡلَاۤ اَنۡ یَّکُوۡنَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً لَّجَعَلۡنَا لِمَنۡ یَّکۡفُرُ بِالرَّحۡمٰنِ لِبُیُوۡتِہِمۡ سُقُفًا مِّنۡ فِضَّۃٍ وَّمَعَارِجَ عَلَیۡہَا یَظۡہَرُوۡنَ ﴿۳۳﴾

وَلِبُیُوۡتِہِمۡ اَبۡوَابًا وَّسُرُرًا عَلَیۡہَا یَتَّکِـُٔوۡنَ ﴿۳۴﴾

وَزُخۡرُفًا ؕ وَاِنۡ کُلُّ ذٰلِکَ لَمَّا

۳۳۔ اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ (کافر) لوگ سب ایک ہی جماعت (میں مجتمع) ہو جائیں گے تو ہم خدائے رحمٰن کے منکروں کے گھروں کی چھتوں اور سیڑھیوں کو جن پر وہ چڑھتے ہیں چاندی سے،

۳۴۔ اور ان کے گھروں کے دروازوں اور ان تختوں کو جن پر وہ تکیہ لگاتے ہیں،

۳۵۔ (چاندی) اور سونے سے بنا دیتے اور یہ

[1] ۶ انعام: ۱۲۴

مَتَاعُ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ؕ وَ الۡاٰخِرَۃُ عِنۡدَ رَبِّکَ لِلۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۳۵﴾ ع	سب دنیاوی متاع حیات ہے اور آخرت آپ کے پروردگار کے ہاں اہل تقویٰ کے لیے ہے۔

تشریح کلمات

زخرف : (ز خ ر ف) الزخرف اصل میں اس زینت کو کہتے ہیں جو ملمع سازی سے حاصل ہو۔ اسی سے سونے کو بھی زخرف کہتے ہیں۔ زخرف القول ملمع کی ہوئی باتیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ لَوۡ لَاۤ اَنۡ یَّکُوۡنَ: اگر اس بات کا خطرہ نہ ہوتا کہ کافروں کو دولت کی فراوانی ملنے سے سب لوگ کفر پر مجتمع ہو جائیں گے تو ہم کافروں کے گھروں کی چھتوں اور سیڑھیوں، دروازوں اور جن تختوں کو وہ اپنے لیے تکیہ گاہ بناتے ہیں ان سب کو چاندی اور سونے کے بنا دیتے۔

یعنی جس مال و دولت کو نادان لوگ باعث خوشحالی سمجھتے ہیں، حقیقت میں بدحالی ہے۔ دنیا میں اس سے امن و سکون چھن جاتا ہے۔ مال و دولت اور عیش و نوش کے وسائل کی فراوانی سے حیوانی خواہشات بیدار ہو جاتی ہیں۔ وہ خواہشات کا بندہ ہو جاتا ہے، پھر وہ نہ خواہشات کو سیر کر سکتا ہے، نہ روک سکتا ہے۔ اس طرح زندگی اندر سے دوزخ بن جاتی ہے۔ اس آیت میں ارشاد ہوتا ہے: اگر ان مالداروں کی ظاہری شان و شوکت دیکھ کر سب لوگوں کا کفر اختیار کرنے کا خطرہ نہ ہوتا تو ہم کافروں کو اس دوزخ میں مزید دھکیل دیتے اور انہیں سونے چاندی کے گھر دیتے۔

اہم نکات

۱۔ معیشت کی تقسیم میں کارفرما ایک بنیادی مصلحت کا ذکر ہے۔

وَ مَنۡ یَّعۡشُ عَنۡ ذِکۡرِ الرَّحۡمٰنِ نُقَیِّضۡ لَہٗ شَیۡطٰنًا فَہُوَ لَہٗ قَرِیۡنٌ ﴿۳۶﴾	۳۶۔ اور جو بھی رحمٰن کے ذکر سے پہلوتہی کرتا ہے ہم اس پر ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں تو وہی اس کا ساتھی ہو جاتا ہے۔
وَ اِنَّہُمۡ لَیَصُدُّوۡنَہُمۡ عَنِ السَّبِیۡلِ وَ یَحۡسَبُوۡنَ اَنَّہُمۡ مُّہۡتَدُوۡنَ ﴿۳۷﴾	۳۷۔ اور وہ (شیاطین) انہیں راہ (حق) سے روکتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ وہ راہ راست پر ہیں۔

تشریح کلمات

یَّعۡشُ : (ع ش و ۔ ی) عشی عن کذا کسی چیز سے آنکھیں بند کر لینا۔ اندھا ہو جانا۔

نُقَيِّضۡ: (ق ی ض) القیض کسی چیز پر غالب اور متولی ہونے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ مَنۡ یَّعۡشُ عَنۡ ذِکۡرِ الرَّحۡمٰنِ: ایک گناہ دوسرے گناہ اور ایک جرم دوسرے جرم کے ارتکاب کا زینہ بنتا ہے۔ جرم کا ارتکاب کرنے والا شیطان کے دام میں آسانی سے پھنس جاتا ہے۔ پھر جب وہ ناقابل ہدایت ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اسے شیطان کے دام میں چھوڑ دیتا ہے۔

اللہ کی طرف سے سب سے بڑی سزا یہ ہے کہ اللہ اس سے ہاتھ اٹھا لے اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دے۔ اس صورت میں اسے راہ حق دکھانے والا کوئی نہ ہوگا۔ اسی لیے لفظ نُقَیِّضۡ میں اسے شیطان کا ساتھی بنانے کی نسبت اللہ نے اپنی طرف دی ہے۔

۲۔ فَهُوَ لَهٗ قَرِیۡنٌ: اب شیطان اس کا ساتھی ہوگا۔ اس صورت میں شیطان اسے کسی اچھے عمل کی طرف رخ کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔

۳۔ وَ اِنَّهُمۡ لَیَصُدُّوۡنَهُمۡ عَنِ السَّبِیۡلِ: جب شیطان اس کا ساتھی ہو گا تو وہ ہر نیکی کی طرف جانے سے روکے گا اور شیطان کا یہ ساتھی رک جائے گا۔

۴۔ وَ یَحۡسَبُوۡنَ اَنَّهُمۡ مُّهۡتَدُوۡنَ: پھر نہ صرف یہ کہ وہ راہ حق سے دور ہو جائیں گے بلکہ اپنے آپ کو بڑے ہدایت یافتہ شمار کریں گے۔ اس غلط فہمی کی وجہ سے وہ کبھی راہ راست پر نہیں آئیں گے۔

چنانچہ بہت سے تارکین صلوۃ کو اسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا دیکھا گیا کہ وہ اپنے آپ کو بڑا ہدایت یافتہ تصور کرتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ ذکر اور عبادت خدا سے منہ موڑنے والے، شیطان کے دام میں ایسے مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ان سے اپنی گمراہی کا شعور چھن جاتا ہے۔

حَتّٰۤی اِذَا جَآءَنَا قَالَ یٰلَیۡتَ بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنَکَ بُعۡدَ الۡمَشۡرِقَیۡنِ فَبِئۡسَ الۡقَرِیۡنُ ﴿۳۸﴾

وَ لَنۡ یَّنۡفَعَکُمُ الۡیَوۡمَ اِذۡ ظَّلَمۡتُمۡ اَنَّکُمۡ فِی الۡعَذَابِ مُشۡتَرِکُوۡنَ ﴿۳۹﴾

۳۸۔ جب یہ شخص ہمارے پاس آئے گا تو کہے گا: اے کاش! میرے درمیان اور تیرے درمیان دو مشرقوں کا فاصلہ ہوتا، تو بہت برا ساتھی ہے۔

۳۹۔ اور جب تم ظلم کر چکے تو آج (ندامت) تمہیں فائدہ نہیں دے گی، عذاب میں یقیناً تم سب شریک ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَنَا: اللہ کی بارگاہ میں پہنچنے پر پتہ چلے گا کہ وہ کس دام میں مبتلا رہا ہے۔ اب اسے نظر آئے گا کہ اس کے ساتھی شیطان نے اسے کہاں پہنچا دیا۔ اب یہ حسرت سے کہے گا کاش میرے اور اس برے ساتھی کے درمیان مشرق و مغرب کا فاصلہ ہوتا جو دنیا میں قابل تصور دوری ہے۔ واضح رہے مشرق اور مغرب دونوں کے لیے مشرقین کہتے ہیں جیسے والد اور والدہ دونوں کے لیے والدین کہتے ہیں۔

۲۔ وَ لَنۡ یَّنۡفَعَکُمُ الۡیَوۡمَ: آج یہ ندامت اور یا لیت تمہیں کوئی فائدہ نہیں دے گی۔ دونوں ساتھیوں میں نفرت کے باوجود تم دونوں عذاب میں شریک ہوں گے۔ اکثر مفسرین نے کہا ہے: آج تم دونوں ساتھیوں کا عذاب میں شریک ہونا تمہیں فائدہ نہیں دے گا۔ میرے نزدیک یہ سیاق کے مطابق نہیں ہے کیونکہ یہ تو کہا جاتا ہے ندامت فائدہ نہیں دے گی، یہ نہیں کہا جاتا عذاب میں ساتھی کا شریک ہونا فائدہ نہیں دے گا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ندامت تمہیں فائدہ نہیں دے گی اور تم اور تمہارا ساتھی، دونوں عذاب میں شریک ہوں گے۔

اَفَاَنۡتَ تُسۡمِعُ الصُّمَّ اَوۡ تَہۡدِی الۡعُمۡیَ وَ مَنۡ کَانَ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۴۰﴾

۴۰۔ کیا آپ بہروں کو سنا سکتے ہیں یا اندھے کو یا اسے جو واضح گمراہی میں ہے راستہ دکھا سکتے ہیں؟

تفسیر آیات

جب کسی میں آواز سننے کی سرے سے صلاحیت نہ ہو تو اس کے دماغ تک حق کی آواز نہیں پہنچ سکے گی خواہ حق کی آواز کتنی ہی طاقتور اور پرکشش کیوں نہ ہو۔ اسی طرح اگر کسی کے پاس بینائی نہ ہو تو اسے صحیح راستہ نظر نہیں آئے گا خواہ وہ راستہ کتنا ہی واضح اور روشن کیوں نہ ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ارحم الرحمین ہے۔ اس کے باوجود جب کوئی شخص رحمت خدا کا اہل نہیں ہے تو رحمت خدا اسے نہیں ملے گی۔

اہم نکات

۱۔ کسی میں ہدایت کی اہلیت اگر نہیں تو اس پر ہدایت مسلط نہیں کی جاتی۔

فَاِمَّا نَذۡہَبَنَّ بِکَ فَاِنَّا مِنۡہُمۡ مُّنۡتَقِمُوۡنَ ﴿ۙ۴۱﴾

۴۱۔ پس اگر ہم آپ کو اٹھا بھی لیں تو یقیناً ہم ان سے انتقام لینے والے ہیں۔

اَوۡ نُرِیَنَّکَ الَّذِیۡ وَعَدۡنٰہُمۡ فَاِنَّا عَلَیۡہِمۡ مُّقۡتَدِرُوۡنَ ﴿۴۲﴾

۴۲۔یا (آپ کی زندگی میں) آپ کو وہ (عذاب) دکھا دیں جس کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے، یقیناً ہم ان پر قدرت رکھنے والے ہیں

تفسیر آیات

مکہ کے مشرکین اس توحیدی تحریک کو الٰہی نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کی ذات سے مربوط سمجھتے تھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ یہ شخص اگر ختم ہو جائے تو تحریک بھی خود بخود ختم ہو جائے گی۔ کفار کی اس خوش فہمی کو دور کرنے کے لیے فرمایا: ہمیں ان مشرکین سے انتقام لینا ہے۔ خواہ یہ عمل آپ ﷺ کے وصال کے بعد ہو یا آپ کی حیات میں ہو۔

چنانچہ چشم جہاں نے دیکھ لیا رسول کریم ﷺ اسی شہر مکہ میں فاتحانہ داخل ہوتے ہیں اور ان مشرکین میں جو بچ گئے تھے وہ ماتھے پر طلقاء کا داغ لے کر زندہ رہے۔

سیوطی الدر المنثور میں جابر بن عبد اللہ نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہے:

فَاِمَّا نَذۡہَبَنَّ بِکَ فَاِنَّا مِنۡہُمۡ مُّنۡتَقِمُوۡنَ آپ کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد ہم انتقام لینے والے ہیں نزلت فی علی بن ابی طالب۔ انہ ینتقم من الناکثین و القاسطین بعدی۔ یہ آیت علی بن ابی طالب (ع) کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ وہ میرے بعد بیعت توڑنے والوں اور ظالموں سے انتقام لے گا۔

اس طرح کی ایک روایت مغازلی نے اپنی مناقب صفحہ ۳۲۰ میں، حسکانی نے اپنی تفسیر شواھد التنزیل میں جابر اور ابن عباس دونوں سے روایت کی ہے۔ ابو نعیم نے حضرت حذیفہ سے فی ما نزل من القرآن فی علی میں روایت کی ہے: انا منتقمون۔ بعلی بن ابی طالب۔ ملاحظہ ہو غایۃ المرام۔

حاکم مستدرك میں باب مناقب علی علیہ السلام ابن عباس سے روایت ہے:

رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع میں ایک خطبہ ارشاد فرمایا: لا قتلن العمالقۃ فی کتیبۃ فقل لہ جبرئیل او علی۔ قال النبی او علی بن ابی طالب۔ میں ایک لشکر کے ساتھ عمالقہ کو قتل کروں گا تو جبرئیل نے کہا: یا علی قتل کریں گے تو نبیؐ نے فرمایا (میں) یا علی قتل کریں گے۔

فَاسۡتَمۡسِکۡ بِالَّذِیۡۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ ۚ

۴۳۔پس آپ کی طرف جو وحی کی گئی ہے اس سے

اِنَّکَ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۴۳﴾ تمسک کریں، آپ یقیناً سیدھے راستے پر ہیں۔

تفسیر آیات

مشرکین کی طرف سے تکذیبی حربوں کی پرواہ کیے بغیر آپ اے رسول ﷺ! وحی کے ذریعے ملنے والے حکم سے متمسک رہیں۔ وحی آپ کو مشکلات کا مقابلہ کرنے اور ان سے نکلنے کا راستہ بتائے گی۔ جس کے پاس وحی جیسی الٰہی راہنمائی موجود ہو اس کے لیے کوئی مشکل خواہ کتنی ہی کٹھن کیوں نہ ہو مشکل نہیں رہتی۔

۲۔ اِنَّکَ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ: آپ کے پاس دوسری قوت، حق، یعنی صراط مستقیم پر ہونا ہے۔ حق اور حقیقت سب سے بڑی طاقت ہے۔ جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

مَنْ صَارِعَ الْحَقَّ صَرَعَهُ۔[1] جو حق سے ٹکرائے گا حق اسے پچھاڑ دے گا۔

اہم نکات

۱۔ وحی اور حق، رسول کے دو طاقتور بازو تھے۔

وَ اِنَّہٗ لَذِکۡرٌ لَّکَ وَ لِقَوۡمِکَ ۚ وَ سَوۡفَ تُسۡـَٔلُوۡنَ ﴿۴۴﴾ ۴۴۔ اور یہ (قرآن) آپ کے اور آپ کی قوم کے لیے ایک نصیحت ہے اور عنقریب تم سب سے سوال کیا جائے گا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِنَّہٗ: اور جو وحی آپ کی طرف کی جا رہی ہے اس میں قرآن کے ساتھ وہ دستور حیات اور جامع نظام زندگی ہے جو رسول اللہ ﷺ کے ذریعے انسان کی سعادت کے لیے دیا گیا ہے۔

۲۔ لَذِکۡرٌ لَّکَ: اے رسول! یہ وحی آپ کے لیے عزت و شرف کا باعث ہے۔ چنانچہ اس ذکر کو اللہ نے اپنے ذکر کے ساتھ بلندی عنایت فرمائی: وَ رَفَعۡنَا لَکَ ذِکۡرَکَ۔[2] اور یہ ذکر رسول ﷺ کرۂ ارض کے ہر خطے میں پانچ وقت اللہ کے ذکر کے ساتھ بلند ہوتا ہے۔

۳۔ وَ لِقَوۡمِکَ: اور جس قوم کی طرف آپ ﷺ مبعوث ہوئے ہیں اس کے لیے یہ باعث عزت و شرف ہے۔ چنانچہ جمود کی شکار ایک گمنام قوم آج دنیا میں امت مسلمہ کے عنوان سے ایک فکری و علمی مقام رکھتی ہے۔

---

[1] نہج البلاغۃ کلامہ المحتاج الی تفسیر: ۴۰۸ [2] ۹۴ الشرح: ۴

آیت کی نظر اس امت کے مستقبل پر ہو سکتی ہے۔ یہ امت مسلمہ مستقبل میں اس کرۂ ارض کی واحد مقتدر امت ہوگی:

لِلّٰہِ الۡعِزَّۃُ وَ لِرَسُوۡلِہٖ وَ لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ...[1] عزت تو اللہ، اس کے رسول اور مومنین کے لیے ہے۔

۴۔ وَ سَوۡفَ تُسۡـَٔلُوۡنَ: اس وحی کے بارے میں سوال ہوگا۔ رسول سے سوال ہوگا: کیا آپ نے وحی لوگوں تک پہنچا دی؟ وَ لَنَسۡـَٔلَنَّ الۡمُرۡسَلِیۡنَ۔[2] ہم مرسلین سے سوال کریں گے۔ امت سے بھی سوال ہوگا: کیا تم نے اس پر لبیک کہا اور اس پر عمل کیا؟

حسکانی نے شواهد التنزیل ۲: ۲۱۶ میں جابر بن عبد اللہ انصاری سے روایت کی ہے:

وَ اِنَّہٗ لَذِکۡرٌ لَّکَ وَ لِقَوۡمِکَ ۚ وَ سَوۡفَ تُسۡـَٔلُوۡنَ عن محبة علی بن ابی طالب۔ تم سے علی بن ابی طالب کی محبت کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

وَ سۡـَٔلۡ مَنۡ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ مِنۡ رُّسُلِنَاۤ اَجَعَلۡنَا مِنۡ دُوۡنِ الرَّحۡمٰنِ اٰلِـہَۃً یُّعۡبَدُوۡنَ ﴿۴۵﴾ ع

۴۵۔ اور جو پیغمبر ہم نے آپ سے پہلے بھیجے ہیں ان سے پوچھ لیجیے: کیا ہم نے خدائے رحمٰن کے علاوہ معبود بنائے تھے کہ ان کی بندگی کی جائے؟

تفسیر آیات

سابقہ انبیاء علیہم السلام سے پوچھنے کا مطلب یہ ہے کہ ان انبیاء علیہم السلام نے جو تعلیمات چھوڑی ہیں ان میں کہیں غیر خدا کی عبادت کا کوئی ذکر ہے؟ دیکھ لو کیا توحید پرستی پر تمام انبیاء علیہم السلام کا اجماع نہیں ہے؟

روایات اہل بیت علیہم السلام میں آیا ہے: شب معراج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے تمام انبیاء علیہم السلام جمع کیے گئے پھر ان سے سوال کرنے کا حکم ہوا۔ (الاحتجاج)

ثعلبی نے اپنی تفسیر میں آیت کے ذیل میں عبد اللہ بن مسعود سے روایت درج کی ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وآله وسلم اتانی ملك وقال یا محمد واسئل من ارسلنا من قبلك من رسلنا علی ما بعثوا قال: قلت: علی ما بعثوا؟ قال: علی ولایتك و ولایة علی بن ابی طالب۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میرے پاس ایک فرشتہ آیا اور کہا: اے محمد جو پیغمبر ہم نے آپ سے پہلے بھیجے ہیں ان سے پوچھ لیجیے کہ وہ کس مقصد کے لیے مبعوث ہوئے۔ کہا: میں نے کہا: کس مقصد کے لیے مبعوث ہوئے؟ کہا: آپ کی ولایت اور علی کی ولایت کے لیے مبعوث ہوئے۔

---

[1] ۶۳ منافقون: ۸ [2] ۷ اعراف: ۶

ملاحظہ ہو شواھد التنزیل ذیل آیت۔ معرفۃ علوم الحدیث تالیف حاکم صفحہ ۹۶۔ تاریخ دمشق ۴۲: ۲۴۱ ط دار الفکر۔

وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰی بِاٰیٰتِنَاۤ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَ مَلَا۠ئِہٖ فَقَالَ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۴۶﴾	۴۶۔ اور ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف بھیجا، پس موسیٰ نے کہا: میں رب العالمین کا رسول ہوں۔
فَلَمَّا جَآءَہُمۡ بِاٰیٰتِنَاۤ اِذَا ہُمۡ مِّنۡہَا یَضۡحَکُوۡنَ ﴿۴۷﴾	۴۷۔ پس جب وہ ہماری نشانیاں لے کر ان کے پاس آئے تو وہ ان نشانیوں پر ہنسنے لگے۔

تفسیر آیات

۱۔ اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف اس لیے بھیجا چونکہ باقی لوگ اپنی ذاتی و استقلالی فکری حیثیت نہیں رکھتے تھے سب فرعون اور اس کے درباریوں کے تابع تھے۔

۲۔ فَقَالَ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ: حضرت موسیٰ علیہ السلام بے سہارا فرعون جیسے طاغوت کے سامنے ایسی بات کرتا ہے جو اس کے تخت و طاغوت کے خلاف ہے۔ اس کے خلاف حضرت موسیٰ کا یہ کہنا میں عالمین کے رب کا نمائندہ ہوں فرعون کی سلطنت کے غیر قانونی ہونے کا اعلان تھا۔

اس میں رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے تسلی اور مشرکین کے اس قول کا جواب ہے کہ اللہ نے طائف اور مکے کے کسی بڑے آدمی کو اپنا نمائندہ کیوں نہیں بنایا؟

۳۔ فَلَمَّا جَآءَہُمۡ: چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھ کر بھی وہ متاثر ہونے کی جگہ معجزات کا تمسخر اڑاتے تھے۔ ان لوگوں کی منطق بھی طبقاتی بنیاد پر قائم تھی جو آج کے مشرکین کی ہے۔

وَ مَا نُرِیۡہِمۡ مِّنۡ اٰیَۃٍ اِلَّا ہِیَ اَکۡبَرُ مِنۡ اُخۡتِہَا ۫ وَ اَخَذۡنٰہُمۡ بِالۡعَذَابِ لَعَلَّہُمۡ یَرۡجِعُوۡنَ ﴿۴۸﴾	۴۸۔ اور جو نشانی ہم انہیں دکھاتے تھے وہ پہلی سے بڑی ہوتی اور ہم نے انہیں عذاب میں پکڑ لیا کہ شاید وہ باز آ جائیں۔

تفسیر آیات

ان معجزوں سے مراد یہ معجزات تھے: جادوگروں کا مقابلہ، شدید قحط، طوفان کے ذریعے بستیوں اور

کھیتوں کی تباہی، ٹڈی دل کا تباہ کن حملہ، جوؤں اور سسریوں کا بے تحاشا پھیلنا، ملک کے گوشہ و کنار میں مینڈکوں کا سیلاب، نہروں چشموں اور کنوؤں کے پانی کا خون میں تبدیل ہو جانا۔

جیسا کہ سورۃ الاعراف میں ان معجزات کا ذکر آیا ہے۔

وَ قَالُوۡا یٰۤاَیُّہَ السّٰحِرُ ادۡعُ لَنَا رَبَّکَ بِمَا عَہِدَ عِنۡدَکَ ۚ اِنَّنَا لَمُہۡتَدُوۡنَ ﴿۴۹﴾

۴۹۔ اور (عذاب دیکھ کر) کہنے لگے: اے جادوگر! تیرے پروردگار نے تیرے نزدیک تجھ سے جو عہد کر رکھا ہے اس کے مطابق ہمارے لیے دعا کر، ہم یقیناً ہدایت یافتہ ہو جائیں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ یٰۤاَیُّہَ السّٰحِرُ: حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک طرف ساحر پکارنا اور دوسری طرف آئی ہوئی مصیبت کو ٹالنے کے لیے اللہ سے دعا کے لیے کہنا بظاہر تضاد لگتا ہے۔ ایک جواب یہ دیا گیا ہے مصری معاشرے میں ساحر کو بہت بڑا عالم سمجھا جاتا اور ساحروں کا معاشرے میں ایک مقام تھا جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں طبیبوں اور عربوں میں فصاحت و بلاغت رکھنے والوں کو حاصل تھا۔ چنانچہ فرمایا:

وَ ابۡعَثۡ فِی الۡمَدَآئِنِ حٰشِرِیۡنَ ﴿ۙ﴾ یَاۡتُوۡکَ بِکُلِّ سَحَّارٍ عَلِیۡمٍ ﴿﴾ [1]

اور شہروں میں ہرکارے بھیج دو کہ وہ تمام ماہر جادوگروں کو تمہارے پاس لے آئیں۔

ممکن ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزوں کی کثرت کی وجہ سے وہ دل میں موسیٰ علیہ السلام کو برحق رسول سمجھتے ہوں مگر ان پر ایمان نہیں لاتے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے وہ سحر اور معجزے کو دو چیزیں نہ سمجھتے ہوں اور یہ عقیدہ رکھتے ہوں کہ موسیٰ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت بڑے ساحر ہیں۔ اسی لیے دعا کی درخواست کی ہے۔ پہلے وہ ساحر کو رسول نہیں مانتے تھے چونکہ دوسرے ساحرین اللہ کے رسول نہیں تھے۔

۲۔ بِمَا عَہِدَ عِنۡدَکَ: اللہ کا نمائندہ ہونے کے اعتبار سے تمہاری دعا قبول ہونے کا وعدہ ہے اس کے مطابق دعا کرو۔ اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دل میں رسول برحق سمجھتے تھے۔

فَلَمَّا کَشَفۡنَا عَنۡہُمُ الۡعَذَابَ اِذَا ہُمۡ یَنۡکُثُوۡنَ ﴿۵۰﴾

۵۰۔ پھر جب ہم نے عذاب کو ان سے دور کر دیا تو وہ عہد شکنی کرنے لگے۔

---

[1] ۲۶ شعراء: ۳۶۔۳۷

تفسیر آیات

عذاب ٹلنے کے بعد عہد توڑنے کی بات سے معلوم ہوا فرعونی جو کچھ کہہ رہے تھے ایمان لانے کا ایک عہد تھا جسے ان لوگوں نے توڑا ہے۔

وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِیْ قَوْمِهٖ قَالَ یٰقَوْمِ اَلَیْسَ لِیْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۵۱﴾

۵۱۔اور فرعون نے اپنی قوم سے پکار کر کہا: اے میری قوم! کیا مصر کی سلطنت میرے لیے نہیں ہے اور یہ نہریں جو میرے (محلات کے) نیچے بہ رہی ہیں؟ کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟

تفسیر آیات

حضرت موسیٰ کی طرف سے تواتر سے معجزے آنے کے بعد فرعون کا تخت متزلزل ہو گیا اور فرعون کی بادشاہی کی قانونی حیثیت مشکوک ہونا شروع ہو گئی چونکہ وہ اپنے آپ کو سورج رب کا نمائندہ کہتا تھا۔

اس خطرے کے پیش نظر فرعون نے اپنی پراپیگنڈہ مشنری کو متحرک کرنے کے لیے وہی طبقات اور مادی قدروں پر مبنی منطق اختیار کی اور کہا:

> کہاں موسیٰ اور کہاں میری مصری عظیم سلطنت۔ کجا موسیٰ جس کے پاس ایک لاٹھی کے سوا کچھ نہیں اور کجا میری سلطنت کی دولت و اقتدار۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو دریائے نیل سے نکلی ہوئی نہریں کس کے اختیار میں ہیں؟

مصر اس وقت ایک زرعی ملک تھا۔ دریائے نیل سے نکلنے والی نہروں پر ان کی زراعت و معیشت کا انحصار تھا۔ فرعون یہ جتانا چاہتا ہے یہ سب میری کارگزاری ہے۔

اَمْ اَنَا خَیْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ مَهِیْنٌ ۙ وَّلَا یَكَادُ یُبِیْنُ ﴿۵۲﴾

۵۲۔کیا میں اس شخص سے بہتر نہیں ہوں جو بے توقیر ہے اور صاف بات بھی نہیں کر سکتا؟

تفسیر آیات

فرعون اب اس پوزیشن میں آ گیا تھا کہ اپنے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان موازنہ کرے۔ اپنے اقتدار اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات، اپنے جبر اور موسیٰ کی منطق کے درمیان موازنہ کرنے پر اتر آیا اور اس کے لیے تحقیری حربہ استعمال کیا۔

وَلَا یَکَادُ یُبِیۡنُ: فرعون کہتا ہے موسیٰ اپنا مدعا بھی کھل کر بیان نہیں کر سکتا۔ یہ اس لکنت کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں بچپن سے تھی۔ فرعون کو یہ معلوم نہیں ہوا ہوگا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں اب وہ لکنت نہیں ہے۔ بار نبوت اٹھاتے وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ سے دعا کی تھی:

وَاحۡلُلۡ عُقۡدَۃً مِّنۡ لِّسَانِیۡ ۝[1] اور میری زبان کی گرہ کھول دے

تو اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا فوری قبول فرمائی تھی:

قَالَ قَدۡ اُوۡتِیۡتَ سُؤۡلَکَ یٰمُوۡسٰی ۝[2] فرمایا: اے موسیٰ! یقیناً آپ کو آپ کی مراد دے دی گئی.

فَلَوۡ لَاۤ اُلۡقِیَ عَلَیۡہِ اَسۡوِرَۃٌ مِّنۡ ذَہَبٍ اَوۡ جَآءَ مَعَہُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ مُقۡتَرِنِیۡنَ ﴿۵۳﴾

۵۳۔ تو اس پر سونے کے کنگن کیوں نہیں اتارے گئے یا فرشتے اس کے ساتھ یکے بعد دیگرے کیوں نہیں آئے؟

تفسیر آیات

کہتے ہیں قدیم زمانے میں وزیروں اور شاہی نمائندوں کو دربار کی طرف سے خلعت کے طور پر سونے کے کنگن دیے جاتے اور سپاہیوں کا ایک دستہ بھی ان کے ہمراہ ہو لیتا تھا۔ فرعون مکہ والوں کے اعتراض کی مانند یہی بات کہ رہا ہے: یہ شخص اللہ کا نمائندہ کیسا ہے جس کے ہاتھ صرف خشک لاٹھی ہے اور بدن پر کھردرا کپڑا۔

فرعون اور اہل مکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ معجزے کو جو ایک کنگن اور سپاہیوں کے ایک دستے سے کہیں زیادہ مؤثر اور عظیم ہے، نظر انداز کرتے ہیں۔ لوگوں کی توجہ ان معجزات سے ہٹانے کے لیے رواجی باتوں کا سہارا لیتے ہیں۔

فَاسۡتَخَفَّ قَوۡمَہٗ فَاَطَاعُوۡہُ ؕ اِنَّہُمۡ کَانُوۡا قَوۡمًا فٰسِقِیۡنَ ﴿۵۴﴾

۵۴۔ چونکہ اس نے اپنی قوم کو بے وقعت کر دیا اور انہوں نے اس کی اطاعت کی، وہ یقیناً فاسق لوگ تھے۔

تفسیر آیات

ا۔ فرعون نے اپنی قوم کو بے وقعت کر دیا۔ جابر لوگ ہمیشہ اپنے رعیت سے انسانی قدریں چھین کر

---

[1] ۲۰ طہٰ: ۲۷ [2] ۲۰ طہٰ: ۳۶

انہیں بے وقعت کر دیتے پھر ان کے ضمیروں کا سودا کرتے ہیں۔ اس کے بعد ان کو جدھر چاہیں ہانک دیتے ہیں۔ مختلف وسائل سے یہ باور کراتے ہیں کہ حکمرانی ہمارا حق ہے اور آنکھیں بند کر کے ہماری اطاعت کرنا تم پر فرض ہے۔

جب قوم کی کوئی حیثیت نہیں رہتی تو پھر یہ جابر طاقتوں کی غلام بن جاتی ہے۔ چنانچہ اس آیت میں اسی نکتہ کو بیان فرمایا:

فرعون نے اپنی قوم کو جب بے حیثیت کر دیا تو قوم نے فرعون کی اطاعت کی چونکہ یہ قوم، ظلم اور انصاف کی قدروں کو نہیں سمجھتی تھی۔

چنانچہ جب لوگوں میں شعور اور بیداری نہ ہوگی، وہ ظلم اور ناانصافی کو نہیں سمجھ سکیں گے، اپنی انسانی حیثیت کو نہیں جانتے ہوں گے اور ذہن غلامانہ ہوگا۔

چنانچہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے یزید کی اطاعت کرنے والوں کے لیے اسی نکتے کی طرف اشارہ فرمایا:

ان لم یکن لکم دین و کنتم لا تخافون المعاد فکونوا احراراً فی دنیاکم۔[1] — اگر تمہارا کوئی دین نہیں ہے اور قیامت کا بھی کوئی خوف نہ ہو تو تم اپنی دنیا میں تو آزاد رہو۔

اس سلسلے میں حدیث ہے کہ اگر کسی قوم میں امر بمعروف نہی از منکر کا معاشرہ ساز عمل متروک ہو جائے تو برے لوگ ان پر مسلط ہوں گے۔ پھر اچھے لوگوں کی دعا بھی قبول نہ ہوگی۔[2]

۲۔ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا قَوۡمًا فٰسِقِيۡنَ: ظالم کے ظلم کو قبول کرنے والے لوگ بھی فاسق ہوتے ہیں کیونکہ ان پر ظالم حکمرانوں کے تسلط میں خود قوموں کی کوتاہی شامل ہے۔

فَلَمَّاۤ اٰسَفُوۡنَا انۡتَقَمۡنَا مِنۡهُمۡ فَاَغۡرَقۡنٰهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ﴿۵۵﴾ — ۵۵۔ پس جب انہوں نے ہمیں غصہ دلایا تو ہم نے ان سے انتقام لیا پھر ان سب کو غرق کر دیا۔

فَجَعَلۡنٰهُمۡ سَلَفًا وَّمَثَلًا لِّلۡاٰخِرِيۡنَ ﴿۵۶﴾ ع — ۵۶۔ پھر ہم نے انہیں قصہ پارینہ اور بعد (میں آنے) والوں کے لیے نشان عبرت بنا دیا۔

تشریح کلمات

اٰسَفُوۡنَا: (ا س ف) الاسف حزن اور غضب کے مجموعہ کو کہتے ہیں۔ اصل میں اس کے معنی جذبۂ انتقام سے دم قلب کے جوش مارنے کے ہیں۔ اگر یہ کیفیت اپنے سے کمزور آدمی پر پیش آئے تو پھیل کر غضب کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اگر اپنے سے قوی آدمی پر ہو حزن بن جاتی ہے۔

---

[1] بحار الانوار ۴۵: ۵۰ [2] الکافی ۷: ۵۱

تفسیر آیات

۱۔ فَلَمَّاۤ اٰسَفُوۡنَا: جب فرعونیوں نے ہمیں غضبناک کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کا غضب اس کا عذاب اور خوشنودی ثواب ہے۔ جب فرعونیوں نے اللہ کی طرف سے آنے والی ہدایات کے تمام راستے بند کر دیے جو رحمتوں کے راستے تھے تو اللہ تعالیٰ کے غضب و انتقام کا راستہ کھل گیا اور ان کو غرق کر دیا۔

۲۔ فَجَعَلۡنٰہُمۡ سَلَفًا: پھر ہم نے ان فرعونیوں کو قدیم قصہ و کہانی بنا دیا۔ یعنی گزشتہ قوموں کی داستان بنا دیا۔

۳۔ وَّ مَثَلًا: اور آنے والی مجرم قوموں کے لیے نشان عبرت بنا دیا۔

وَ لَمَّا ضُرِبَ ابۡنُ مَرۡیَمَ مَثَلًا اِذَا قَوۡمُکَ مِنۡہُ یَصِدُّوۡنَ ﴿۵۷﴾

۵۷۔ اور جب ابن مریم کی مثال دی گئی تو آپ کی قوم نے اس پر شور مچایا۔

تشریح کلمات

یَصِدُّوۡنَ: (ص د د) التصدیۃ ہر اس آواز کو کہتے ہیں جس کا کوئی مفہوم نہ ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ لَمَّا ضُرِبَ ابۡنُ مَرۡیَمَ مَثَلًا: ابن مریم کی مثال دینے والا کون تھا۔ اور وہ مثال کیا تھی۔

زمخشری و دیگر مفسرین نے اس آیت کے شان نزول میں روایت کی ہے:

جب یہ آیت نازل ہوئی: اِنَّکُمۡ وَ مَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ حَصَبُ جَہَنَّمَ ...[1] ”تحقیق تم اور تمہارے وہ معبود جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پوجتے تھے جہنم کا ایندھن ہیں“ تو ابن زبعری نے کہا: یا محمد یہ ہمارے معبودوں کے بارے میں ہے یا سب کے بارے میں ہے؟ فرمایا: سب کے بارے میں ہے۔ اس پر انہوں نے کہا: کیا آپ موسیٰ کو نبی نہیں سمجھتے، ان کی تعریف کرتے ہیں۔ نصاری عیسیٰ کی عبادت کرتے ہیں اور ملائکہ کو بھی لوگ پوجتے ہیں۔ اگر یہ لوگ جہنم جائیں گے تو ہمیں بھی منظور ہے کہ اپنے معبودوں کے ساتھ جہنم جائیں۔ اس پر لوگوں نے ہنسی مذاق شروع کیا۔

اس پر یہ آیت نازل ہوئی: اِنَّ الَّذِیۡنَ سَبَقَتۡ لَہُمۡ مِّنَّا الۡحُسۡنٰۤی ۙ اُولٰٓئِکَ عَنۡہَا مُبۡعَدُوۡنَ [2]

یہ روایت از روئے سند اور مضمون نا قابل قبول ہے۔

---

[1] ۲۱ انبیاء: ۹۸　[2] ۲۱ انبیاء: ۱۰۱

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

رسول اللہ ﷺ قریش والوں کے ایک حلقے میں تشریف فرما تھے۔ میں وہاں وارد ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا:

ماشبهك فی هذه الامة الا عیسی بن مریم فی امته، احبه قوم فافرطوا فیه حتی وضعوه حیث لم یکن۔۔۔۔	آپ اس امت میں عیسیٰ کی طرح اپنی امت ہیں۔ کچھ لوگوں نے ان سے محبت کی اور حد سے گزر گئے اور ایسا مقام دیا جو ان کا نہیں تھا۔

یہ سن کر قریش والوں نے ہنسنا شروع کیا، تمسخر کیا اور کہا: اپنے ابن عم کو عیسیٰ کے ساتھ تشبیہ دے رہے ہیں۔

اس روایت کو ابن عساکر نے اپنی تاریخ دمشق ۲: ۲۳۴ میں چار طریقوں سے بیان کیا ہے۔ حسکانی نے اس مضمون کی روایت شواهد التنزیل ذیل آیت میں متعدد اسناد سے ذکر کی ہے۔

ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی طرف سے بھی اس مضمون کی روایات منقول ہیں۔

متعدد طرق و اسناد سے منقول اس روایت کی نظر حضرت علی علیہ السلام کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تشبیہ پر مذکور ہے کہ دونوں کے محبت کرنے والے غلو کے مرتکب ہو گئے۔ اس پر مشرکین نے کہا ہے کہ جن فرشتوں کی ہم پوجا کرتے ہیں وہ اس علی بن ابی طالب سے تو بہتر ہیں۔ چونکہ مشرکین نے کہا: ہمارے معبود اچھے ہیں یا وہ۔ یہ نہیں کہا ہمارے معبود اچھے ہیں یا ان کے معبود۔

صاحب المیزان وَ قَالُوۡۤا ءَ اٰلِهَتُنَا خَیۡرٌ اَمۡ هُوَ کو جملۂ استثنا فیه قرار دیتے ہیں۔ اس کے لیے هُوَ ضمیر کے مرجع کا تعین ممکن نہ ہوگا۔

ایک امکانی صورت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس موقع پر آیت کی تلاوت فرمائی ہو، راوی نے نازل ہونا سمجھ لیا ہو۔

وَ قَالُوۡۤا ءَ اٰلِهَتُنَا خَیۡرٌ اَمۡ هُوَ ؕ مَا ضَرَبُوۡهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ؕ بَلۡ هُمۡ قَوۡمٌ خَصِمُوۡنَ ﴿۵۸﴾	۵۸۔ اور کہنے لگے: کیا ہمارے معبود اچھے ہیں یا وہ (عیسیٰ)؟ انہوں نے عیسیٰ کی مثال صرف برائے بحث بیان کی ہے بلکہ یہ لوگ تو جھگڑالو ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ قَالُوۡۤا ءَ اٰلِهَتُنَا خَیۡرٌ اَمۡ هُوَ: اگر اَمۡ هُوَ کی ضمیر عیسیٰ کی طرف تسلیم کر لی جائے تو آیت کا

مفہوم یہ ہوگا کہ مشرکین نے کہا: ہمارے معبود بہتر ہیں یا عیسیٰ؟ ظاہر آیت یہی ہے کہ ضمیر عیسیٰ کی طرف ہے جس پر اگلی آیت ۵۹ شاہد ہے۔ ہمارے معبود فرشتے بہتر ہیں یا عیسیٰ جو نصاریٰ کا معبود ہے۔ مشرکین کا موقف یہ تھا کہ ہمارے معبود فرشتے، عیسیٰ علیہ السلام سے بہتر ہیں تو جب عیسیٰ معبود ہو سکتا ہے تو فرشتے کیوں معبود نہیں ہو سکتے۔

مشرکین ایک مغالطہ پیدا کرنا چاہتے تھے کہ قرآن نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعریف کی ہے تو بعنوان معبود و تعریف کی ہے جب کہ قرآن نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعنوان نبی مرسل تعریف کی۔ قرآن عیسیٰ علیہ السلام کے معبود ہونے کو مسترد کرتا ہے اور یہ اسلامی تعلیمات کی اساس ہے۔

۲۔ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا: لہٰذا مشرکین کے معبودوں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معبود ہونے میں موازنہ ایک کج بحثی ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق یہ بات سرے سے قابل بحث ہی نہیں ہے کہ کون سے معبود بہتر ہیں چونکہ اسلام نہ عیسیٰ کو معبود قبول کرتا ہے، نہ فرشتوں کو۔

اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَ جَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۵۹﴾

۵۹۔ وہ تو بس ہمارے بندے ہیں جن پر ہم نے انعام کیا اور ہم نے انہیں بنی اسرائیل کے لیے نمونہ (قدرت) بنا دیا۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ: اسلام کے نزدیک عیسیٰ علیہ السلام نہ صرف یہ کہ معبود نہیں بلکہ ایک عبد ہیں: اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ ان پر اللہ نے انعام کیا ہے۔ وہ ایک محتاج عبد ہیں جو اللہ کے انعام کے محتاج ہیں۔

۲۔ جَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ: بنی اسرائیل کے لیے نمونہ بنا دیا یعنی قدرت الٰہی کا نمونہ بنا دیا۔ وہ مردوں کو زندہ کرتے، مادر زاد اندھوں کو بینائی دیتے اور مٹی کا پرندہ بنا کر اس میں روح پھونکتے ہیں تو وہ پرندہ زندہ ہو جاتا ہے۔

وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِي الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ ﴿۶۰﴾

۶۰۔ اور اگر ہم چاہتے تو زمین میں تمہاری جگہ فرشتوں کو جانشین بنا دیتے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَوْ نَشَآءُ: اس آیت کی ایک تفسیر یہ ہے: اگر چاہتے تو زمین میں تمہاری جگہ فرشتوں کو آباد

کرتے لیکن ہم نے زمین میں بشر اور انسان کو آباد کیا ہے جو اللہ کی بندگی کرتے ہیں۔ اس تفسیر کے مطابق مِنۡکُمۡ میں مِن بدل کے لیے ہے یعنی تمہاری جگہ۔

دوسری تفسیر یہ ہے: اگر ہم چاہتے تو تم میں سے فرشتہ صفت لوگ پیدا کرتے جو ایک دوسرے کے جانشین ہوتے۔ وہ ظاہر میں بشر لیکن باطن میں فرشتوں کی طرح ہوتے۔

یہ تفسیر غیر ضروری توجیہ و تاویل پر مبنی ہے۔ اور ساتھ وَلَوۡ نَشَآءُ ''اگر ہم چاہتے'' کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے نہیں چاہا کہ زمین پر تمہاری جگہ فرشتے ہوں۔ اس تفسیر میں یہ بات درست نہیں بیٹھتی: اگر ہم چاہتے تو زمین میں فرشتہ صفت انسان پیدا کرتے مگر ہم نے ایسا نہیں کیا۔ لہٰذا پہلی تفسیر درست ہے۔

وَ اِنَّہٗ لَعِلۡمٌ لِّلسَّاعَۃِ فَلَا تَمۡتَرُنَّ بِہَا وَ اتَّبِعُوۡنِ ؕ ہٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِیۡمٌ ﴿۶۱﴾	۶۱۔ اور وہ (عیسیٰ) یقیناً قیامت کی علامت ہے پس تم ان میں ہرگز شک نہ کرو اور میری اتباع کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِنَّہٗ لَعِلۡمٌ لِّلسَّاعَۃِ: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بے باپ پیدا ہونا قدرت الٰہی کا ایک نمونہ ہے کہ وہ قیامت میں انسان کو دوبارہ زندہ کر سکتا ہے اور ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات میں بھی قیامت کے ممکن ہونے پر دلائل ہیں کہ وہ مردوں کو زندہ کرتے، مٹی سے پرندہ بناتے اور اس میں روح پھونکتے تھے۔

۲۔ فَلَا تَمۡتَرُنَّ بِہَا: عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت اور معجزات کے بعد قیامت کے وقوع میں شک باقی نہیں رہتا کہ جو ذات عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا کر سکتی ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کے ذریعے مردوں کو زندہ کر سکتی ہے وہ قیامت کے دن سب کو زندہ کر سکتی ہے۔

۳۔ وَ اتَّبِعُوۡنِ: میرے رسول کے ذریعہ میری پیروی کرو۔ راہ راست توحید پرستی میں ہے، بت پرستی میں نہیں۔

وَ لَا یَصُدَّنَّکُمُ الشَّیۡطٰنُ ۚ اِنَّہٗ لَکُمۡ عَدُوٌّ مُّبِیۡنٌ ﴿۶۲﴾	۶۲۔ اور شیطان کہیں تمہارا راستہ نہ روکے وہ یقیناً تمہارا کھلا دشمن ہے۔

تفسیر آیات

اللہ تعالیٰ کی رحمت کا تقاضا ہے ہر قدم پر دشمن سے بچنے کا حکم دیتا ہے اور اس کی طرف سے آنے

والے خطرات سے آگاہ فرماتا ہے۔

وَ لَمَّا جَآءَ عِيۡسٰى بِالۡبَيِّنٰتِ قَالَ قَدۡ جِئۡتُكُمۡ بِالۡحِكۡمَةِ وَ لِاُبَيِّنَ لَكُمۡ بَعۡضَ الَّذِىۡ تَخۡتَلِفُوۡنَ فِيۡهِ‌ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوۡنِ ﴿۶۳﴾

۶۳۔ اور عیسیٰ جب واضح دلائل لے کر آئے تو بولے: میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں اور جن بعض باتوں میں تم اختلاف رکھتے ہو انہیں تمہارے لیے بیان کرنے آیا ہوں، پس اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ لَمَّا جَآءَ عِيۡسٰى بِالۡبَيِّنٰتِ: حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بینات (واضح معجزے) پیش کرنے کے بعد اپنے مبعوث برسالت ہونے کی غرض و غایت بیان فرمائی کہ میں کیا چیز لے کر آیا ہوں۔

۲۔ قَالَ قَدۡ جِئۡتُكُمۡ بِالۡحِكۡمَةِ: فرمایا میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں یعنی حقائق کی نشاندہی کرنے والا ہنر لے کر آیا ہوں۔ روایت میں آیا ہے: الحکمۃ: الفھم و القضاء۔ حکمت فہم و فیصلے کا نام ہے۔ حکمت کی ضد خطا ہے۔ اس طرح حکمت، فہم حقائق کا نام ہے۔

۳۔ وَ لِاُبَيِّنَ: اور ان حقائق کو بیان کرنے آیا ہوں جن میں تمہیں اختلاف ہے چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کی امت میں بہت سی باتوں میں اختلاف آ گیا تھا اور لاحق نبی، سابق نبی کی تعلیمات میں آنے والی تحریفات و اختلاف کو ختم کرنے کے لیے آتا ہے۔

۴۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوۡنِ: اللہ کی ناراضگی یا اللہ کے عذاب سے بچو اور بچنے کی واحد صورت میری اطاعت کرنا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّىۡ وَ رَبُّكُمۡ فَاعۡبُدُوۡهُ‌ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِيۡمٌ ﴿۶۴﴾

۶۴۔ یقیناً اللہ ہی میرا رب ہے اور تمہارا رب ہے پس اسی کی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔

تفسیر آیات

میری اطاعت کی اساس توحید ہے کہ اللہ ہی میرا اور تمہارا رب ہے۔ اسی توحیدی راستے کو اختیار کرنے کی صورت میں صراط مستقیم حاصل ہوتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کبھی نہیں کہا کہ میں خدا یا خدا کا بیٹا ہوں۔ میری عبادت کرو۔

فَاخۡتَلَفَ الۡاَحۡزَابُ مِنۡۢ بَیۡنِہِمۡ ۚ فَوَیۡلٌ لِّلَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡ عَذَابِ یَوۡمٍ اَلِیۡمٍ ﴿۶۵﴾

۶۵۔ پھر گروہوں نے آپس میں اختلاف کیا، پس ظالموں کے لیے دردناک دن کے عذاب سے تباہی ہے۔

تفسیر آیات

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں لوگوں کے گروہوں میں بڑا اختلاف آیا۔ ایک گروہ نے انہیں خدا کہا، دوسرے نے اللہ کا بیٹا، تیسرے نے شریک اللہ، چوتھے نے تین کا تیسرا ثَالِثُ ثَلٰثَۃٍ کہا، پانچویں نے ان کی ولادت کو ناجائز قرار دیا اور اپنے زعم میں انہیں سولی چڑھا دیا۔

فَوَیۡلٌ لِّلَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا: یہ اختلاف کرنے والے ظلم کا ارتکاب کرنے والے ہیں جو حق سے تجاوز کرنا ہے چونکہ حق کی بات یہ تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے رسول ہیں۔ انہوں نے اللہ کی بندگی کرنے کی دعوت دی۔

ہَلۡ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَّا السَّاعَۃَ اَنۡ تَاۡتِیَہُمۡ بَغۡتَۃً وَّ ہُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۶۶﴾

۶۶۔ کیا یہ لوگ صرف قیامت کے منتظر ہیں کہ وہ ان پر اچانک آ پڑے اور انہیں خبر بھی نہ ہو؟

تشریح کلمات

بَغۡتَۃً: (ب غ ت) البغت کے معنی کسی چیز کے یکبارگی ایسی جگہ سے ظاہر ہونا کے ہیں جہاں سے اس کے ظہور کا گمان تک نہ ہو۔

تفسیر آیات

اللہ کی وحدانیت کے منکرین کی حالت اس مجرم کی طرح ہے جو جرم کا ارتکاب کر کے سزا کے انتظار میں ہو۔ اسی طرح کافر لوگ جرم کا ارتکاب جاری رکھے ہوئے ہیں اور سزا سے بچنے کے سارے دروازے بند کر کے اس سزا کے انتظار میں ہیں جو اچانک ان کے سر پر آنے والی ہے۔

وَّ ہُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ: جب قیامت آئے گی تو انہیں خبر تک نہ ہوگی کہ کیا مصیبت ان کے سر پر آ رہی ہے۔

اَلۡاَخِلَّآءُ یَوۡمَئِذٍۭ بَعۡضُہُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الۡمُتَّقِیۡنَ ﴿ؑ۶۷﴾ ع ۶ ۱۱ ۱۲

۶۷۔ اس دن دوست بھی ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے سوائے پرہیزگاروں کے۔

تفسیر آیات

ا۔ اَلۡاَخِلَّآءُ یَوۡمَئِذٍۭ: اس دنیا میں لوگ ظلم، ناانصافی اور اللہ کی نافرمانی میں ایک دوسرے کی دوستی کی بنیاد پر مدد کر رہے ہیں۔ یہی لوگ قیامت کے دن ایک دوسرے پر الزام لگا رہے ہوں گے۔ اس وقت ان کے لیے سب سے بڑا دشمن ان کا وہ دوست ہو گا جس نے دنیا میں انہیں گمراہی پر لگا دیا تھا:

یَقُوۡلُ یٰلَیۡتَنِی اتَّخَذۡتُ مَعَ الرَّسُوۡلِ سَبِیۡلًا ﴿﴾ یٰوَیۡلَتٰی لَیۡتَنِیۡ لَمۡ اَتَّخِذۡ فُلَانًا خَلِیۡلًا ﴿﴾ [1] — کہے گا: کاش میں نے رسول کے ساتھ راستہ اختیار کیا ہوتا۔ ہائے تباہی! کاش میں نے فلاں کو دوست نہ بنایا ہوتا۔

۲۔ اِلَّا الۡمُتَّقِیۡنَ: صرف اہل تقویٰ ہیں جن کی قیامت کے دن بھی دنیا کی دوستی قائم رہے گی چونکہ اہل تقویٰ، تقویٰ اختیار کرنے میں ایک دوسرے کے معاون ثابت ہوں گے۔ قیامت کے دن اس تعاون کے اثرات دیکھ کر ایسے دوستوں کی زیادہ قدر ہو گی۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے شاگرد رشید حضرت ابو بصیر سے اس آیت کی تلاوت فرما کر فرمایا:

وَاللّٰہِ مَا اَرَادَ بِھٰذَا غَیْرَکُم... [2] — قسم بخدا اس آیت سے تمہیں ہی مراد لیا گیا ہے۔

یٰعِبَادِ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡکُمُ الۡیَوۡمَ وَ لَاۤ اَنۡتُمۡ تَحۡزَنُوۡنَ ﴿۶۸﴾

۶۸۔ (پرہیزگاروں سے کہا جائے گا) اے میرے بندو! آج تمہارے لیے کوئی خوف نہیں ہے اور نہ ہی تم غمگین ہو گے۔

تفسیر آیات

یہ خطاب اہل تقویٰ سے ہے کہ آج کے دن تمہارے لیے کسی آنے والے خطرے کا خوف نہیں ہے، نہ کسی چیز کے ہاتھ سے جانے کا غم ہے جب کہ کافر خوف اور غم دونوں سے دوچار ہوں گے۔

اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاٰیٰتِنَا وَ کَانُوۡا مُسۡلِمِیۡنَ ﴿۶۹﴾

۶۹۔ (یہ وہی ہوں گے) جو ہماری آیات پر ایمان لائے اور وہ مسلمان تھے۔

اُدۡخُلُوا الۡجَنَّۃَ اَنۡتُمۡ وَ اَزۡوَاجُکُمۡ

۷۰۔ (انہیں حکم ملے گا) تم اور تمہاری ازواج

---

[1] ۲۵ فرقان: ۲۸۔۲۹ [2] الکافی ۸: ۳۵ خطبۃ الطالوتیۃ

تُحۡبَرُوۡنَ ﴿۷۰﴾ خوشی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ۔

تشریح کلمات

تُحۡبَرُوۡنَ: (ح ب ر) الحبر خوشی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جیسے اس آیت میں۔

تفسیر آیات

ان کی دو اہم خصوصیتوں کا ذکر ہے: ایمان اور تسلیم۔ وہ ایمان و عقیدے میں اپنا وہ مقام رکھتے تھے جس کے نتیجے میں اللہ کے ہر حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرتے تھے۔ یہ وہی اوصاف ہیں جنہیں قرآن ایمان و عمل صالح کے نام سے یاد کرتا ہے لیکن اس آیت میں عمل صالح کی جگہ تسلیم و رضا کا ذکر ہے۔

اُدۡخُلُوا الۡجَنَّۃَ: انہیں اپنی ازواج کے ساتھ جنت میں داخل ہونے کا حکم ملے گا۔ ازواج سے مراد بیویاں ہو سکتی ہیں یعنی وہ بیویاں جو دنیا میں شریک حیات ہونے کے ساتھ ایمان و عمل صالح میں بھی شریک ہوں۔

تُحۡبَرُوۡنَ: خوشی کی حالت میں۔ ظاہر ہے جنت میں داخل ہونے کا حکم ملنے پر مومن کے لیے اس سے زیادہ خوشی کی کوئی اور بات ہو نہیں سکتی۔

یُطَافُ عَلَیۡہِمۡ بِصِحَافٍ مِّنۡ ذَہَبٍ وَّ اَکۡوَابٍ ۚ وَ فِیۡہَا مَا تَشۡتَہِیۡہِ الۡاَنۡفُسُ وَ تَلَذُّ الۡاَعۡیُنُ ۚ وَ اَنۡتُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۷۱﴾

۷۱۔ ان کے سامنے سونے کے تھال اور جام پھرائے جائیں گے اور اس میں ہر وہ چیز موجود ہوگی جس کی نفس خواہش کرے اور جس سے نگاہیں لذت حاصل کریں اور تم اس میں ہمیشہ رہو گے۔

تشریح کلمات

بِصِحَافٍ: (ص ح ف) صحاف برتن کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ یُطَافُ عَلَیۡہِمۡ بِصِحَافٍ مِّنۡ ذَہَبٍ: سونے کے برتنوں میں کھانے پینے کی چیزیں پھرائی جاتی ہوں گی۔ یُطَافُ عَلَیۡہِمۡ ان کی خدمت میں پھرائے جائیں گے کا مطلب یہ ہوا جس چیز کی وہ خواہش کریں گے یا جو چیزیں کھانے اور پینے کا ارادہ کریں گے وہ ارادہ نافذ ہو گا اور وہ چیزیں ان کے سامنے پھرائی

جائیں گی۔

۲۔ وَفِیۡهَا مَا تَشۡتَهِیۡهِ الۡاَنۡفُسُ وَتَلَذُّ الۡاَعۡیُنُ: جنت کی نعمتوں کی ایک ایسی جامع تعریف اور تعبیر آ گئی جو اس دنیا کے انسانوں کے لیے قابل فہم ہے۔

جس طرح ایک جنین کے لیے عالم دنیا اور اس کی چیزیں قابل فہم نہیں ہیں اسی طرح دنیا والوں کے لیے عالم آخرت اور اس کی چیزیں قابل فہم نہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ دنیا کی چیزوں کا ذکر فرماتا ہے جنت میں باغات، نہریں، حوریں اور میوے ہوں گے کیونکہ عالم دنیا کا انسان صرف انہی چیزوں کو سمجھ سکتا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہے جیسے اللہ اپنی قدرت کو ہاتھ سے تعبیر فرماتا ہے کیونکہ انسان کے لیے مانوس تعبیر یہی ہے۔

اس آیت میں جنت کی نعمتوں کی ایسی جامع تعبیر اختیار فرمائی جو محسوس فہم اہل دنیا کے لیے قابل فہم ہے۔

مَا تَشۡتَهِیۡهِ الۡاَنۡفُسُ جس جس چیز کی نفس خواہش کرے، ارادہ کرے، جو بھی انسانی نفس کی خواہش اور ارادے کے دائرے میں آ سکے اس کے لیے وہ موجود ہو گی خواہ اس کا تعلق لذتوں سے ہو یا آوازوں سے یا خوشبوؤں سے یا دیگر محسوسات سے ہو یا ان کی کیفیت سے ہو۔ اگر یہ خواہش ہو کہ جنت کی لذتوں میں تکرار نہ ہو ہر مرتبہ نئی لذت ہو تو بھی میسر ہوں گی۔

وَتَلَذُّ الۡاَعۡیُنُ اور جس جس چیز سے نگاہیں لذت حاصل کریں۔ اس میں بصری نعمتوں کا ذکر آیا ہے۔ ان میں سرفہرست جمالیات ہیں۔ خوبصورت چہرے، حسین مناظر، زیب و زینت کی چیزیں۔ ان دو لفظوں میں قابل تصور تمام نعمتوں کی ایک جامع تعریف آ گئی تاہم عالم جنت میں موجود نعمتیں اور انسانی خواہشات اور اس عالم کے مطابق جمالیات ہمارے لیے قابل فہم نہیں ہیں۔

مثلاً ایک بوڑھی عورت سے، جس نے عالم تمدن کا چہرہ دیکھا ہی نہ ہو، کہا جائے آپ کا بیٹا شہر میں کمپیوٹر سیکھ رہا ہے اس عورت کے لیے کمپیوٹر قابل فہم نہیں ہو گا تاہم اسے سمجھانے کے لیے اس عورت کے گرد و پیش موجود چیزوں سے استفادہ کیا جائے گا۔ اس طرح خواہشات اور لذت کی تعبیر انسان کو کسی حد تک مطلب کے نزدیک کر دیتی ہے۔

۳۔ اَنۡتُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ: جن نعمتوں کا ذکر ہے ان کے بارے میں اس بات کا اندیشہ بھی نہیں ہے کہ کسی وقت ان نعمتوں سے محروم ہو جائیں گے یا یہ نعمتیں ختم ہو جائیں گی بلکہ ان میں دوام ہے۔ الی الابد ان نعمتوں میں نازاں رہنا ہے۔

وَ تِلۡكَ الۡجَنَّةُ الَّتِیۡۤ اُوۡرِثۡتُمُوۡهَا بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۷۲﴾

۷۲۔ اور یہ وہ جنت ہے جس کا تمہیں وارث بنا دیا گیا ہے ان اعمال کے صلے میں جو تم کرتے رہے ہو۔

لَكُمۡ فِيۡهَا فَاكِهَةٌ كَثِيۡرَةٌ مِّنۡهَا تَاۡكُلُوۡنَ﴿۷۳﴾

۷۳۔ اس میں تمہارے لیے بہت سے میوے ہیں جنہیں تم کھاؤ گے۔

تفسیر آیات

میراث: بلا زحمت کسی چیز کے حصول کو کہتے ہیں جس کی تفصیل سورہ مومنون میں آ گئی ہے۔

اس آیت میں میراث میں دینے سے مراد عطا کرنا ہوسکتا ہے چونکہ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ جنت اللہ تعالیٰ اعمال خیر کی جزا میں دے رہا ہے۔

البتہ یہ بات بھی ذہن میں رہے اگرچہ جنت ملنے کا سبب اعمال خیر ہیں لیکن اعمال خیر سے جنت کا مستحق ہونا ضروری نہیں ہے۔

اس کی وضاحت اس طرح ہے: انسان دنیا میں جو اعمال خیر انجام دیتا ہے اس سے ان نعمتوں کا بھی حق ادا نہیں ہوتا جو اللہ نے دنیا میں اسے دی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ان اعمال خیر کے مقابلے میں ابدی نعمتوں والی جنت عنایت فرماتا ہے۔ اگر یہ اعمال خیر نہ ہوتے، نہ دنیا کی نعمتوں کا حق ادا ہوتا، نہ جنت ملتی۔

لَكُمۡ فِيۡهَا فَاكِهَةٌ كَثِيۡرَةٌ مِّنۡهَا تَاۡكُلُوۡنَ: اس جنت میں میوے کثرت سے موجود ہوں گے۔ ختم ہونے کا تصور نہ ہوگا۔ چنانچہ جس طرح جنت ابدی ہے اس میں موجود نعمتیں بھی ابدی ہیں۔

اِنَّ الۡمُجۡرِمِيۡنَ فِىۡ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوۡنَ﴿۷۴﴾

۷۴۔ جو لوگ مجرم ہیں یقیناً وہ ہمیشہ جہنم کے عذاب میں رہیں گے۔

لَا يُفَتَّرُ عَنۡهُمۡ وَ هُمۡ فِيۡهِ مُبۡلِسُوۡنَ﴿۷۵﴾

۷۵۔ ان سے (عذاب میں) تخفیف نہ ہوگی اور وہ اس میں مایوس پڑے رہیں گے۔

وَمَا ظَلَمۡنٰهُمۡ وَلٰـكِنۡ كَانُوۡا هُمُ الظّٰلِمِيۡنَ﴿۷۶﴾

۷۶۔ اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود ہی ظالم تھے۔

تشریح کلمات

لَا يُفَتَّرُ: (ف ت ر) الفتور کے معنی تیزی کے بعد ٹھہرنے، سختی کے بعد نرم، قوت کے بعد کمزور پڑ جانا کے ہیں۔

مُبۡلِسُوۡنَ: (ب ل س) الابلاس کے معنی سخت ناامیدی کے باعث غمگین ہونے کے ہیں۔

تفسیر آیات

ا۔ اہل تقویٰ کے مقابلے اہل جرم آتے ہیں۔ مجرم کافر بھی ہوتا ہے اور مسلم یعنی کلمہ گو بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ تاریخ میں کلمہ گو مجرمین کی لمبی فہرست موجود ہے۔ وہ جہنم میں ہوں گے۔ عذاب کی سنگینی یہ ہے کہ وہ اس عذاب میں الی الابد دائماً رہیں گے۔

اس سوال کا پہلے بھی جواب دیا گیا ہے کہ جرم محدود، عذاب لامحدود کیوں ہے؟ جواب یہ ہے:

اولاً: مجرم سے جرم ختم نہیں ہوا، خود مجرم ختم ہو گیا۔ مر گیا۔

ثانیاً: جرم و سزا میں مدت برابر نہیں ہوا کرتی۔ گولی سے ایک شخص کو قتل کرنے پر کم از کم عمر قید کی سزا کیوں؟ جب کہ اس کے قتل پر دس سیکنڈ لگے تھے۔

ثالثاً: مجرم کو خود اس کا جرم عذاب دیتا ہے۔ اس کے جرم کا عمل انرجی ہے جسے دوام حاصل ہے۔ لہٰذا اگر انسان کا عمل اچھا ہے تو وہ اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا اور اگر برا ہے تو اس کی جان نہیں چھوڑتا۔

۲۔ لَا یُفَتَّرُ عَنۡهُمۡ: عذاب کی سنگینی میں یہ بات بھی ہے کہ اس عذاب میں تخفیف نہیں ہو گی۔ اگر کوئی عذاب دے رہا ہے تو کسی وقت تخفیف ہو سکتی ہے لیکن اگر اس کے عمل سے عذاب ہو رہا ہے تو اس میں تخفیف نہیں ہوتی۔

عذاب کی سنگینی میں تیسری بات یہ ہو گی کہ اس عذاب سے نجات کی کوئی امید نہ ہو گی۔

۳۔ وَ مَا ظَلَمۡنٰهُمۡ: یہ سب کچھ ان مجرمین کا اپنا کیا دھرا ہے۔ ان کے اپنے اعمال کی طرف سے ہے۔ اللہ کی طرف سے ان کے ساتھ کوئی زیادتی ناانصافی نہیں ہوتی۔

وَ نَادَوۡا یٰمٰلِکُ لِیَقۡضِ عَلَیۡنَا رَبُّکَ ؕ قَالَ اِنَّکُمۡ مّٰکِثُوۡنَ ﴿۷۷﴾

۷۷۔ اور وہ پکاریں گے: اے مالک (پہریدار) تیرا پروردگار ہمیں ختم ہی کر دے تو وہ کہے گا: بے شک تمہیں یہیں پڑے رہنا ہے۔

تفسیر آیات

ا۔ وَنَادَوۡا یٰمٰلِکُ: مالک سے مراد جہنم کا داروغہ ہے اور جواب بھی داروغہ ہی کی طرف سے ہو گا چونکہ جہنمی اللہ سے دعا تک کرنے کے مجاز نہ ہوں گے۔

قَالَ اخۡسَـُٔوۡا فِیۡهَا وَ لَا تُکَلِّمُوۡنِ ۝[1] — اللہ فرمائے گا خوار ہو کر اسی میں پڑے رہو اور مجھ سے بات نہ کرو۔

---

[1] ۲۳ مومنون: ۱۰۸

۲۔ لِيَقۡضِ عَلَيۡنَا رَبُّكَ: ہمارا خاتمہ کر دے تاکہ اس عذاب سے نجات مل جائے۔ جیسا کہ دنیا میں ان کا خیال تھا کہ موت سے انسان نابود ہو جاتا ہے۔ وہ آج بھی اپنی نابودی چاہتے ہیں۔

۳۔ قَالَ اِنَّكُمۡ مّٰكِثُوۡنَ: جہنم کا داروغہ جواب دے گا: تم نے تو ہمیشہ عذاب میں رہنا ہے۔ تم سے دنیا میں کہا گیا تھا کہ تم نے نابود نہیں ہونا ہے۔ وجود میں آنے والی کوئی چیز معدوم نہیں ہوا کرتی۔ وجود کو دوام حاصل ہے۔

لَقَدۡ جِئۡنٰكُمۡ بِالۡحَقِّ وَ لٰكِنَّ اَكۡثَرَكُمۡ لِلۡحَقِّ كٰرِهُوۡنَ ﴿۷۸﴾

۷۸۔ تحقیق ہم تمہارے پاس حق لے کر آئے تھے لیکن تم میں سے اکثر حق سے کراہت کرنے والے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ لَقَدۡ جِئۡنٰكُمۡ بِالۡحَقِّ: ممکن ہے داروغہ کا جواب ہو کہ ہم فرشتوں نے تمہارے سامنے حق پیش کیا تھا اور ممکن ہے کلام خدا ہو، کفار مکہ سے خطاب ہو چونکہ اللہ اہل جہنم سے بات نہیں کرے گا۔

اَمۡ اَبۡرَمُوۡۤا اَمۡرًا فَاِنَّا مُبۡرِمُوۡنَ ﴿۷۹﴾ۚ

اَمۡ يَحۡسَبُوۡنَ اَنَّا لَا نَسۡمَعُ سِرَّهُمۡ وَ نَجۡوٰىهُمۡ ؕ بَلٰى وَ رُسُلُنَا لَدَيۡهِمۡ يَكۡتُبُوۡنَ ﴿۸۰﴾

۷۹۔ کیا انہوں نے کسی بات کا پختہ عزم کر رکھا ہے؟ (اگر ایسا ہے) تو ہم بھی مضبوط ارادہ کرنے والے ہیں۔

۸۰۔ کیا یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کی راز کی باتیں اور سرگوشیاں نہیں سنتے؟ ہاں! اور ہمارے فرستادہ (فرشتے) ان کے پاس ہی لکھ رہے ہیں۔

تشریح کلمات

اَبۡرَمُوۡۤا: (ب ر م) الابرام کے معنی کسی معاملہ کو محکم اور مضبوط کرنے کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اَمۡ اَبۡرَمُوۡۤا اَمۡرًا: کیا کفار قریش نے اپنی خفیہ مجلسوں میں ہمارے رسول کے خلاف کچھ کر گزرنے کا پختہ فیصلہ کر لیا ہے؟ تو ہم نے بھی انہیں ذلت آمیز ناکامی سے دوچار کرنے کا مضبوط فیصلہ کر لیا ہے۔ اب

دیکھنا ہے اللہ کے فیصلے کے مقابلے میں تمہارے فیصلے کی کیا حیثیت ثابت ہوگی؟

۲۔ اَمۡ یَحۡسَبُوۡنَ: کیا وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ اپنی خفیہ مجلسوں میں اسلام اور رسول اسلام کے خلاف جو سازشیں کرتے ہیں ان سے ہم بے خبر ہیں اور ان کی راز کی باتوں اور سرگوشیوں کو ہم نہیں سنتے ؟

۳۔ بَلٰی وَ رُسُلُنَا لَدَیۡہِمۡ یَکۡتُبُوۡنَ: اللہ کے فرستادہ فرشتے انسان کی ہر حرکت اور ہر بات کو ریکارڈ کر رہے ہیں تاکہ کل قیامت کے دن یہ خود اپنے اعمال کا مشاہدہ کرے۔ چنانچہ قیامت کے دن جب انسان ان اعمال کا مشاہدہ کرے گا تو کہے گا: ہائے ندامت! یہ کیسا نامۂ اعمال ہے اس نے کسی چھوٹی بڑی بات کو نہیں چھوڑا۔

قُلۡ اِنۡ کَانَ لِلرَّحۡمٰنِ وَلَدٌ ٭ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الۡعٰبِدِیۡنَ ﴿۸۱﴾

۸۱۔ کہدیجیے: اگر رحمٰن کی کوئی اولاد ہوتی تو میں سب سے پہلے (اس کی) عبادت کرنے والا ہوتا۔

تفسیر آیات

ایک ناممکن کو ممکن فرض کر لینے کے بعد اس کی نفی کرنا مقصود ہے۔ اگرچہ اللہ کے لیے اولاد کا ہونا محال ہے تاہم بفرض محال اگر اس کی اولاد ہوتی تو سب سے پہلے میں اس کی عبادت کرنے والا ہوتا۔ اب جو میری طرف سے انکار ہے وہ حقیقت میں اللہ کی اولاد نہ ہونے کی وجہ سے ہے، نہ کسی ضد کی وجہ سے۔

سُبۡحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ رَبِّ الۡعَرۡشِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ ﴿۸۲﴾

۸۲۔ آسمانوں اور زمین کا رب، عرش کا رب، پاکیزہ ہے ان باتوں سے جو یہ لوگ بیان کر رہے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ سُبۡحٰنَ: اللہ کی ذات پاک و منزہ ہے ان باتوں سے جو مشرکین اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ کائنات اور اللہ کا تعلق ربّ یعنی مالک اور مملوک کا ہے لہٰذا کوئی موجود اللہ کا مملوک تو ہو سکتا ہے، اولاد نہیں ہو سکتا۔

۲۔ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ: آسمانوں اور زمین کے ربّ کے بعد عرش کے ربّ کا ذکر بتلاتا ہے کہ ان دونوں کی ربوبیت میں فرق ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا مقام تخلیق میں ربّ ہے اور عرش کا مقام تدبیر میں ربّ ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ رب الخلق و التدبیر ہے۔ واضح رہے کہ عرش اللہ تعالیٰ کے مقام تدبیر کا نام ہے۔

فَذَرۡهُمۡ يَخُوۡضُوۡا وَ يَلۡعَبُوۡا حَتّٰى يُلٰقُوۡا يَوۡمَهُمُ الَّذِىۡ يُوۡعَدُوۡنَ ﴿۸۳﴾	۸۳۔ پس انہیں بیہودہ باتوں میں مگن اور کھیل میں مشغول رہنے دیجیے یہاں تک کہ وہ اپنے اس دن کو پائیں جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَذَرۡهُمۡ: ان کو چھوڑ دو۔ ان سے اپنی رحمت کا ہاتھ اٹھا دو۔ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔ ان کا اپنا حال تو یہ ہے کہ وہ بیہودہ باتوں اور کھیل میں مشغول ہوتے ہیں جس سے ان کے جرم میں اضافہ ہوتا ہے۔ رحمت خدا سے دور تر ہو جاتے ہیں۔

۲۔ حَتّٰى يُلٰقُوۡا يَوۡمَهُمُ: یہاں تک کہ وہ اپنی بدقسمتی کا فیصلہ سننے کا دن پائیں۔ وہ قیامت کا دن بھی ہو سکتا ہے اور موت کا دن بھی۔

وَهُوَ الَّذِىۡ فِى السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِى الۡاَرۡضِ اِلٰهٌ ؕ وَهُوَ الۡحَكِيۡمُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۸۴﴾	۸۴۔ اور وہ وہی ہے جو آسمان میں بھی معبود ہے اور زمین میں بھی معبود ہے اور وہ بڑا حکمت والا، خوب جاننے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وہ اللہ العالمین ہے۔ کل کائنات میں صرف ایک ہی معبود ہے۔ تمام زمینی اور آسمانی معبودوں کی نفی ہے۔ آسمان میں بھی اللہ معبود ہے، فرشتے نہیں اور زمین میں بھی اللہ ہی معبود ہے، اصنام نہیں۔

۲۔ وَهُوَ الۡحَكِيۡمُ الۡعَلِيۡمُ: اللہ وہ معبود ہے جو حکیم ہے۔ کائنات کی حکیمانہ تدبیر کرتا ہے راز ہائے زیست جاننے والا ہے۔ وہی رب ہو سکتا ہے اور معبود۔

وَتَبٰرَكَ الَّذِىۡ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَيۡنَهُمَا ۚ وَعِنۡدَهٗ عِلۡمُ السَّاعَةِ ۚ وَاِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۸۵﴾	۸۵۔ اور بابرکت ہے وہ جس کے لیے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے سب کی بادشاہی ہے اور اسی کے پاس قیامت کا علم ہے اور تم سب اسی کی طرف پلٹائے جاؤ گے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَتَبٰرَكَ الَّذِىۡ: تدبیر کائنات اس بابرکت ذات کے ہاتھ میں ہے جس کے قبضۂ قدرت

میں کل کائنات کی ملکیت ہے۔ لہٰذا وہی ربّ وہی معبود ہے۔

۲۔ وَعِنۡدَہٗ عِلۡمُ السَّاعَۃِ: جس ذات کے پاس قیامت کا علم ہے۔ جو اسی کے پاس ہے اور قیامت کے دن کا مالک بھی ہے۔ چونکہ سب نے قیامت کے دن اسی ذات کی بارگاہ میں حاضری دینا ہے پھر اپنی دائمی قسمت کا فیصلہ سننا ہے۔

وَلَا یَمۡلِکُ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِہِ الشَّفَاعَۃَ اِلَّا مَنۡ شَہِدَ بِالۡحَقِّ وَہُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸۶﴾

۸۶۔ اور اللہ کے سوا جنہیں یہ لوگ پکارتے ہیں وہ شفاعت کا کچھ اختیار نہیں رکھتے سوائے ان کے جو علم رکھتے ہوئے حق کی گواہی دیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَا یَمۡلِکُ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ: جن غیر اللہ کو یہ مشرکین پکارتے ہیں وہ ان کے بارے میں کوئی سفارش نہیں کر سکتے یعنی سفارش کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ چونکہ مشرکین اپنے معبودوں کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ اللہ کے ہاں ان کی سفارش کرتے ہیں:

وَیَقُوۡلُوۡنَ ہٰۤؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنۡدَ اللّٰہِ ...[۱] اور (پھر بھی) کہتے ہیں: یہ اللہ کے پاس ہماری شفاعت کرنے والے ہیں۔

۲۔ اِلَّا مَنۡ شَہِدَ بِالۡحَقِّ: سوائے ان ہستیوں کے جو حق کی گواہی دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے یعنی توحید کی گواہی دینے والے اس سے مستثنیٰ ہیں۔

۳۔ وَہُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ: توحید کی یہ گواہی اس علم و آگہی کی بنیاد پر ہو گی جو یہ گواہی دینے والے رکھتے ہیں یا ممکن ہے مطلب یہ ہو وَہُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ وہ ان لوگوں کا حال جانتے ہوں گے جن کی شفاعت کی جا رہی ہے۔ ان کا حال معلوم ہو کہ وہ مستحق شفاعت ہیں جیسے فرمایا:

وَلَا یَشۡفَعُوۡنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارۡتَضٰی ...[۲] وہ فقط ان لوگوں کی شفاعت کر سکتے ہیں جن سے اللہ راضی ہے۔

وَلَئِنۡ سَاَلۡتَہُمۡ مَّنۡ خَلَقَہُمۡ لَیَقُوۡلُنَّ اللّٰہُ فَاَنّٰی یُؤۡفَکُوۡنَ ﴿۸۷﴾

۸۷۔ اور اگر آپ ان سے پوچھیں: انہیں کس نے خلق کیا ہے؟ تو یہ ضرور کہیں گے: اللہ نے، پھر کہاں الٹے جا رہے ہیں۔

---

[۱] ۱۰ یونس: ۱۸　[۲] ۲۱ انبیاء: ۲۸

وَ قِيْلِهٖ يٰرَبِّ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾	۸۸۔ اور (اللہ جانتا ہے) رسول کے اس قول کو: اے پروردگار! یہ ایسے لوگ ہیں جو ایمان نہیں لاتے۔
فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَ قُلْ سَلٰمٌ ؕ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾ ع	۸۹۔ پس ان سے درگزر کیجیے اور سلام کہدیجیے کہ عنقریب یہ جان لیں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ: مشرکین کا جب اعتراف ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی خالق ہے تو خالق کو ہی مدبر ماننا پڑے گا کیونکہ خلق و تدبیر قابل تفریق نہیں۔ واضح رہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ کا رسول تسلیم نہ کرنے والوں کا عقیدہ یہ تھا ان کا خالق اللہ ہے۔ وہ مشرک فی التدبیر تھے، مشرک فی التخلیق نہ تھے۔

۲۔ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ: تو پھر غیر اللہ کو مدبر مان کر اور اپنے خالق کی مدبریت کا انکار کر کے حق کے خلاف کہاں الٹے جا رہے ہو۔

قرآن مجید میں متعدد بار مشرکین کے اللہ کے خالق ہونے کے اعتراف پر، مدبر ہونے پر استدلال فرمایا گیا ہے کہ خلق و تدبیر قابل تفریق نہیں ہیں۔

سُورَةُ الدُّخَان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورة المبارکة کا نام آیت فَارۡتَقِبۡ یَوۡمَ تَاۡتِی السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِیۡنٍ ۝ سے ماخوذ ہے۔

اس سورة المبارکة کی آیات کی تعداد کوفی قرائت کے مطابق ۵۹ ہیں۔ دیگر قرائتوں کے مطابق اس سے کم تعداد ذکر کیا جاتا ہے۔ ہم نے پہلے بھی ذکر کیا کہ کوفی قرآئت معتبر قرائت ہے چونکہ یہ قرائت قاری عاصم بن ابی النجود اور ابو عبدالرحمن سلمی کے ذریعے حضرت امیر المؤمنین علی علیہ السلام کی قرائت ہے۔ چنانچہ مجمع البیان میں آیا ہے:

اعلم ان عدد اھل الکوفة اصح الاعداد واعلاھا اسناداً لانه مأخوذ عن امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیه السلام۔

اہل کوفہ کی تعداد سب میں صحیح ترین تعداد اور اعلیٰ ترین سند کی حامل ہے چونکہ یہ قرائت امیر المؤمنین علی علیہ السلام سے ماخوذ ہے۔

بعض اہل تحقیق سورہ ہائے حوامیم کے بارے میں یہ نکتہ بیان کرتے ہیں کہ یہ سورتیں جو لفظ حٰمٓ سے شروع ہوتی ہیں اول تو ان سب کے مضامین ایک جیسے ہیں دوم یہ کہ حم کے لفظ کے بعد تنزیل کتاب اور وحی کا ذکر ہوتا ہے۔ ان میں سے تین سورة حٰمٓ کے بعد تَنۡزِیۡلُ الۡکِتٰبِ سے، دو سورتیں حٰمٓ ۝ وَالۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ سے، سورة شوری، کَذٰلِکَ یُوۡحِیۡۤ اِلَیۡکَ سے اور ایک سورہ، تَنۡزِیۡلٌ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ سے شروع ہوتی ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	بنام خدائے رحمن رحیم
حٰمٓ ۝	۱۔ حا، میم۔
وَالۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ۝	۲۔ اس روشن کتاب کی قسم۔
اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰہُ فِیۡ لَیۡلَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ اِنَّا کُنَّا مُنۡذِرِیۡنَ ۝	۳۔ ہم نے اسے ایک بابرکت رات میں نازل کیا ہے، یقیناً ہم ہی تنبیہ کرنے والے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ حٰمٓ: یہ سورہائے حوامیم کی پانچویں سورہ ہے۔

۲۔ وَالۡكِتٰبِ الۡمُبِيۡنِ: انسان کو راہ نجات و سعادت بیان کرنے والی اس کتاب کی قسم ہے کہ یہ قرآن ہم نے ایک مبارک رات میں نازل کیا ہے۔

۳۔ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ: یہ قرآن ایک مبارک رات میں نازل ہوا۔ سورۃ القدر میں فرمایا: وہ شب لیلۃ القدر ہے اور سورۃ البقرۃ آیت ۱۸۵ میں فرمایا: وہ شب ماہ رمضان میں ہے۔

۴۔ اِنَّا كُنَّا مُنۡذِرِيۡنَ: یہ قرآن اس لیے نازل کیا کیونکہ ہم تنبیہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ یعنی اس راہ نجات و سعادت سے منحرف ہونے والے غافل انسان کی تنبیہ کرنے کا جو ارادہ تھا اس کے نفاذ کے لیے یہ قرآن نازل کیا۔

یہاں ایک سوال نے مفسرین کے اذہان کو مشغول کیا ہے:

قرآن ۲۳ سالوں میں تدریجاً نازل ہوتا رہا ہے۔ ایک رات میں نازل کرنے کا کیا مطلب ہے؟

اس کا مشہور جواب یہ دیا گیا ہے کہ قرآن دو مرتبہ نازل ہوا ہے۔ ایک مرتبہ دفعۃً قلب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا اور دوسری بار تدریجاً ۲۳ سالوں میں نازل ہوا ہے۔

میرا گمان یہ ہے یہ سوال ہمارے زمانی ذہن میں آتا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ کا عمل زمانی نہیں ہے لہٰذا جب قرآن کا نازل کرنا اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوگا جیسے اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ ہے تو غیر زمانی ہوگا دفعۃً یا تدریجاً کا سوال نہیں آتا اور جب اہل ارض کی طرف منسوب ہوگا تو زمانی اور تدریجی ہوگا۔ جیسے:

وَقُرۡاٰنًا فَرَقۡنٰهُ لِتَقۡرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكۡثٍ وَّنَزَّلۡنٰهُ تَنۡزِيۡلًا ○ [1]	اور قرآن کو ہم نے جدا جدا کر کے نازل کیا تاکہ آپ ٹھہر ٹھہر کر لوگوں کو پڑھ کر سنائیں اور ہم نے اسے بتدریج نازل کیا۔

لہٰذا عین ممکن ہے قلب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعلق غیر زمانی اور زمانی دونوں سے ہو لہٰذا دفعۃً و تدریجاً دونوں قابل جمع ہیں۔

فِيۡهَا يُفۡرَقُ كُلُّ اَمۡرٍ حَكِيۡمٍ ۙ﴿۴﴾	۴۔ اس رات میں ہر حکیمانہ امر کی تفصیل وضع کی جاتی ہے۔

---

[1] ۱۷ اسراء: ۱۰۶

اَمۡرًا مِّنۡ عِنۡدِنَا ؕ اِنَّا کُنَّا مُرۡسِلِیۡنَ ۚ﴿۵﴾	۵۔ ایسا امر جو ہمارے ہاں سے صادر ہوتا ہے (کیونکہ) ہمیں رسول بھیجنا مقصود تھا۔
رَحۡمَۃً مِّنۡ رَّبِّکَ ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ۙ﴿۶﴾	۶۔ (رسول کا بھیجنا) آپ کے پروردگار کی طرف سے رحمت کے طور پر، وہ یقیناً خوب سننے والا، جاننے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اس آیت سے اور سورۃ القدر کی آیت:

تَنَزَّلُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ وَ الرُّوۡحُ فِیۡہَا بِاِذۡنِ رَبِّہِمۡ ۚ مِنۡ کُلِّ اَمۡرٍ ۟ۙ [1]	فرشتے اور روح اس شب میں اپنے رب کے اذن سے تمام (تعیین شدہ) حکم لے کر نازل ہوتے ہیں۔

سے معلوم ہوتا ہے ملائکہ اور روح اس رات اللہ کا حکم لے کر نازل ہوتے ہیں۔ ان آیات سے اس بات کا علم ہوجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ملکوتی نظام میں ایک رات ایسی ہے جس میں سال بھر کے امور کے فیصلے صادر ہوتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ سال میں ایک بار لوگوں کے مقدرات کی تجدید فرماتا ہے۔ تقدیر کی تجدید کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دو فیصلے ہوتے ہیں: ایک فیصلہ اٹل لایتغیر ہوتا ہے جس کو سُنَّۃَ اللّٰہِ سے تعبیر فرمایا:

وَ لَنۡ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبۡدِیۡلًا ﴿﴾ [2]	اور اللہ کے دستور میں آپ کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے۔

دوسرا فیصلہ قابل تغیر ہے فرمایا:

یَمۡحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَ یُثۡبِتُ ۚۖ وَ عِنۡدَہٗۤ اُمُّ الۡکِتٰبِ ﴿﴾ [3]	اللہ جسے چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے قائم رکھتا ہے اور اسی کے پاس ام الکتاب ہے۔

اگر اللہ کے حتمی فیصلے نہ ہوتے تو اس کائنات کی کسی چیز پر بھروسہ نہ آتا اور اگر کچھ فیصلوں میں لچک کی گنجائش نہ ہوتی تو انسان مجبور ہوتا اور اپنے اعمال و کردار کا اس پر کوئی اثر مترتب نہ ہوتا۔ اس سلسلے میں فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ ... [4]	اللہ کسی قوم کا حال یقیناً اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت کو نہ بدلے۔

---

[1] ۹۷ قدر: ۴ [2] ۳۳ احزاب: ۶۲ [3] ۱۳ رعد: ۳۹ [4] ۱۳ رعد: ۱۱

حدیث میں ہے:

لا یرد القضاء الا الدعاء ولا یزید فی العمر الا البر[۱]

اللہ کے فیصلے کو صرف دعا روک سکتی ہے اور نیکی ہی سے عمر لمبی ہوتی ہے۔

اور جب انسان کے اعمال اور کردار کے اس کی قسمت اور تقدیر پر اثرات مترتب ہوتے ہیں تو ان اثرات پر مشتمل ایک نئی تقدیر کی ترتیب کے لیے سال میں ایک شب کا تعین فرمایا۔ اپنی تقدیر سازی نہ ہو سکی تو ایک رات میں اپنی قسمت سنوار سکتا ہے۔

۲۔ کُلُّ اَمۡرٍ حَکِیۡمٍ: اس رات میں ہر حکیمانہ امر کی تفصیل و تقسیم ہو گی۔ اللہ کا ہر امر حکمت و مصلحت پر مشتمل ہوتا ہے۔ اللہ کا کوئی امر حساب و کتاب کے بغیر صادر نہیں ہوتا۔

۳۔ اَمۡرًا مِّنۡ عِنۡدِنَا: یہ حکیمانہ امر ہمارے ہاں سے صادر ہونے والا ہے۔ کسی غیر اللہ سے ممکن نہیں کہ انسان کی ہدایت و سعادت سے متعلق کوئی امر صادر ہو جائے۔

۴۔ اِنَّا کُنَّا مُرۡسِلِیۡنَ رَحۡمَۃً مِّنۡ رَّبِّکَ: یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا تقاضا ہے کہ انسان کی ہدایت و سعادت کے لیے انبیاء علیہم السلام بھیجے جائیں۔ اس سے عندیہ ملتا ہے کہ یہ حکیمانہ امر انسان کی ہدایت و سعادت سے متعلق ہے۔

۵۔ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ: وہ ضمیروں تک کی آواز کی سنتا ہے اور اپنی مخلوق کی خیر و سعادت کی ہر بات کا علم رکھتا ہے۔

رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ مَا بَیۡنَہُمَا ۘ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّوۡقِنِیۡنَ ﴿۷﴾	۷۔ وہ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا پروردگار ہے اگر تم یقین رکھنے والے ہو۔
لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ یُحۡیٖ وَ یُمِیۡتُ ؕ رَبُّکُمۡ وَ رَبُّ اٰبَآئِکُمُ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۸﴾	۸۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی زندگی اور موت دیتا ہے، وہی تمہارا رب ہے اور تمہارے پہلے باپ دادا کا رب ہے۔
بَلۡ ہُمۡ فِیۡ شَکٍّ یَّلۡعَبُوۡنَ ﴿۹﴾	۹۔ لیکن یہ لوگ شک میں پڑے کھیل رہے ہیں۔

وقف لازم

تفسیر آیات

۱۔ مشرکین مختلف اور متعدد ارباب کا عقیدہ رکھتے تھے بلکہ ہر قوم کا ایک معبود رب ہوا کرتا تھا۔

---

[۱] ترمذی ۸: ۳۵۰

رسول اللہ ﷺ سے خطاب میں جب رَبِّكَ آپ کا رب فرمایا تو مشرکین کو یہ گمان ہو سکتا تھا محمد اپنے لیے مخصوص ربّ بناتا ہے اور ہم اپنا جدا رب بناتے ہیں تو مسترد کر دیتا ہے۔ اس احتمال کو ختم کرتے ہوئے فرمایا: وہ کل کائنات کا ربّ ہے: رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ۔

۲۔ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّوۡقِنِیۡنَ: یہ بات کہ اللہ تعالیٰ کل کائنات کا ربّ ہے اہل یقین جانتے ہیں۔ اگر تم اہل یقین میں سے ہو تو تم پر یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ کائنات میں ایک اللہ کے سوا کوئی ربّ نہیں ہے۔

۳۔ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ: اہل یقین پر یہ بات واضح ہے کہ اس ایک ربّ کے علاوہ کوئی اور قابل پرستش نہیں ہے۔ عبادت صرف ربّ کی ہوتی ہے اور ربّ صرف ایک ہے۔

۴۔ یُحۡیٖ وَ یُمِیۡتُ: رب اور معبود وہ ہے جس کے قبضۂ قدرت میں موت و حیات ہے۔ جس کے ہاتھ میں موت و حیات ہے اسی کے ہاتھ میں تمہاری زندگی کی تدبیریں ہیں۔

۵۔ رَبُّکُمۡ وَ رَبُّ اٰبَآئِکُمُ الۡاَوَّلِیۡنَ: یہ نہ کہو ہم اپنے آباء و اجداد کے رب کو کیسے چھوڑیں؟ چونکہ اللہ ہی تمہارے آباء و اجداد کا ربّ ہے۔ اگر ان کی تقلید کرنا ہی ہے تو ان کے حقیقی ربّ کو اپنا کر تقلید کرو۔

۶۔ بَلۡ ہُمۡ فِیۡ شَکٍّ یَّلۡعَبُوۡنَ: وہ اللہ کی ربوبیت اور مدبریت کے بارے میں شک میں مبتلا ہیں۔ یہ شک اس وجہ سے نہیں کہ ان لوگوں نے اپنی عقل و فکر سے کام لیا ہو، اس بارے میں ممکنہ تحقیق کی ہو۔ تمام فکری و استدلالی ذرائع استعمال کیے ہوں، پھر وہ نتیجے تک نہ پہنچ سکے ہوں بلکہ وہ اس لیے شک میں مبتلا ہیں کہ وہ اپنی فکری و عقلی توانائی استعمال کرنے کی جگہ بیہودہ لغویات میں مشغول ہیں۔ ظاہر ہے جو دماغ لہویات اور بے مقصد چیزوں میں مشغول ہو وہ کسی مقصد تک نہیں پہنچ سکتا۔

فَارۡتَقِبۡ یَوۡمَ تَاۡتِی السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۱۰﴾	۱۰۔ پس آپ اس دن کا انتظار کریں جب آسمان نمایاں دھواں لے کر آئے گا،
یَّغۡشَی النَّاسَ ؕ ہٰذَا عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۱۱﴾	۱۱۔ جو لوگوں پر چھا جائے گا، یہ عذاب دردناک ہو گا۔

تفسیر آیات

۱۔ فَارۡتَقِبۡ: اس آیت کی دو تفسیریں منقول ہیں:

پہلی تفسیر یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی مخالفت جب بڑھ گئی تو آپ نے کفار قریش کے خلاف بددعا کی:

خدایا یوسف کے قحط کی طرح قحط سے میری مدد فرماتا۔ چنانچہ شدید قحط پڑا لوگ مردار چمڑے تک کھا گئے۔ بھوک سے لوگوں کی یہ حالت ہوگئی کہ وہ آسمان کی طرف دیکھتے تو دھواں ہی دھواں نظر آتا تھا۔

اس روایت کے تحت دھویں سے مراد حقیقی دھواں نہیں ہے۔ بھوک کی وجہ سے نظریں پھیرنے والی دھویں کی مانند تاریکی تھی۔ ان لوگوں نے وعدہ کیا کہ اگر یہ بلا ٹل جائے تو ہم ایمان لے آئیں گے لیکن یہ لوگ بلا ٹلنے کے بعد ایمان نہیں لائے۔

دوسری تفسیر یہ ہے:

قیامت کے قریب چند ایک علامات ایسی ظاہر ہونے والی ہیں جو قیامت نزدیک ہونے کی علامات ہوں گی۔ ان میں سے ایک دھواں ہے۔

امامیہ و غیر امامیہ مصادر میں یہ روایت متعدد طرق سے منقول ہے کہ یہ دھواں قیامت کے قریب کی علامات میں سے ایک ہے۔ غیر امامیہ مآخذ میں آیا ہے کہ قیامت کی علامات میں سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، دھواں، دابۃ الارض، یا جوج و ماجوج کا خروج، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول، عدن سے آگ کا نکلنا اور جزیرۃ العرب میں زمین کا دھنسا شامل ہے۔ امامیہ مآخذ میں ان مذکورہ علامات کے علاوہ سفیانی اور دجال کا خروج اور حضرت امام مہدی عجل اللہ فرجہ کے ظہور کا اضافہ ہے۔

لیکن آیت ۱۰ سے ۱۵ تک کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے پہلی تفسیر قرین واقع ہے چونکہ ان آیات میں لوگوں کا رسول سے منہ پھرنے اور رسول کو مجنون کہنے کا ذکر ہے۔

۲۔ یہ دھواں ایسا تھا جس نے سب لوگوں کو لپیٹ میں لے لیا اور ساتھ عذاب بھی ہے۔ اگر یہ قحط ہے تو بھی یہ تعبیر درست ہے کہ اس نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور عَذَابٌ اَلِیۡمٌ بھی ہے۔

رَبَّنَا اکۡشِفۡ عَنَّا الۡعَذَابَ اِنَّا مُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۲﴾	۱۲۔ (وہ فریاد کریں گے) ہمارے پروردگار! ہم سے یہ عذاب ٹال دے، ہم ایمان لاتے ہیں۔

تفسیر آیات

یہ اس درخواست کا مضمون ہو سکتا ہے جو قریش والوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے کی ہے۔ جس میں اس بات کا بھی ذکر ہے کہ ابھی ایمان لانے کی گنجائش موجود ہے۔ یعنی عذاب ٹلنے کے بعد ایمان لانا مؤثر ہو سکتا ہے۔ اگر یہ آیات قیامت سے مربوط ہوتیں تو اِنَّا مُؤۡمِنُوۡنَ کی گنجائش نہ ہوتی۔

اَنّٰی لَهُمُ الذِّکْرٰی وَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِیْنٌ ﴿۱۳﴾

۱۳۔ان کے لیے نصیحت کہاں سودمند ہے جب کہ ان کے پاس واضح بیان کرنے والا رسول آیا تھا؟

تفسیر آیات

یہ لوگ نصیحت لینے والے نہیں ہیں۔ اس دھوویں کی بلا ہٹانے سے زیادہ مؤثر معجزات سے ان لوگوں نے اثر نہیں لیا۔

ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَ قَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ﴿۱۴﴾ وقف لازم

۱۴۔ پھر انہوں نے اس سے منہ پھیر لیا اور کہا: یہ تو تربیت یافتہ دیوانہ ہے۔

تفسیر آیات

حالانکہ دیوانے کی تربیت نہیں ہوسکتی۔ ان مشرکین کو اپنے عائد کردہ الزام کے مضمون کی بھی خبر نہیں کہ ہم کیا الزام لگا رہے ہیں۔ آج مستشرقین بھی یہی الزام عائد کرتے ہیں کہ یہ قرآن کسی اور کا سکھایا پڑھایا ہوا ہے۔ فرق یہ ہے کہ قرآن کے اعجازی پہلو کی یہ لوگ توجیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نابغہ تھے اور مشرکین کہتے تھے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پڑھایا سکھایا ہوا دیوانہ ہے جبکہ دیوانے کو سکھایا پڑھایا نہیں جا سکتا۔ نابغہ ہیں تو دیگر نابغہ افراد بھی ایسا کلام پیش کر سکتے ہیں؟

اِنَّا کَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِیْلًا اِنَّکُمْ عَآئِدُوْنَ ﴿۱۵﴾ وقف لازم

۱۵۔ہم تھوڑا سا عذاب ہٹا دیتے ہیں، تم یقیناً وہی کچھ کرو گے جو پہلے کیا کرتے تھے۔

تفسیر آیات

اس آیت سے یہی مفہوم ہوتا ہے کہ عذاب ٹلنے کے بعد وہ دوبارہ اپنے معمول جو کفر و شرک ہے، میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

یَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْکُبْرٰی ۚ اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ﴿۱۶﴾

۱۶۔ جس دن ہم بڑی کاری ضرب لگائیں گے ہم (اس دن) انتقام لینے والے ہیں۔

تفسیر آیات

اس آیت کا تعلق قیامت سے معلوم ہوتا ہے۔ قیامت کی بڑی کاری ضرب کی نسبت یہ عذاب

بہت بڑا عذاب نہ تھا۔

دوسری تفسیر کے مطابق قیامت سے پہلے یوم دخان کا ذکر ہے کہ منافقوں اور کافروں کو قیامت سے پہلے بھی ایک ضرب اور انتقام کے دن کا سامنا کرنا ہوگا۔

وَ لَقَدۡ فَتَنَّا قَبۡلَہُمۡ قَوۡمَ فِرۡعَوۡنَ وَ جَآءَہُمۡ رَسُوۡلٌ کَرِیۡمٌ ﴿۱۷﴾

۱۷۔ اور تحقیق ان سے پہلے ہم نے فرعون کی قوم کو آزمائش میں ڈالا اور ان کے پاس ایک معزز رسول آیا۔

اَنۡ اَدُّوۡۤا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہِ ؕ اِنِّیۡ لَکُمۡ رَسُوۡلٌ اَمِیۡنٌ ﴿۱۸﴾

۱۸۔ (اس رسول نے کہا) کہ اللہ کے بندوں کو میرے حوالے کر دو میں تمہارے لیے امانتدار رسول ہوں۔

تفسیر آیات

قوم فرعون کی آزمائش حضرت موسیٰ علیہ السلام کے توسط سے ہوئی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مدعا یہ تھا کہ بنی اسرائیل کو میرے حوالے کرو۔ اَدُّوۡۤا کے معنی حوالہ کرو زیادہ مناسب ہے اور عِبَادَ اللّٰہِ سے مراد بنی اسرائیل ہو سکتے ہیں۔ یہ وہی مضمون ہے جسے سورۃ الشعراء آیت ۱۷ میں فرمایا:

اَنۡ اَرۡسِلۡ مَعَنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ؁ کہ تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے۔

یعنی جانے دے۔

اِنِّیۡ لَکُمۡ رَسُوۡلٌ اَمِیۡنٌ: میں تمہارے لیے امانتدار رسول ہوں۔ بنی اسرائیل کو میرے حوالہ کرو کا مطالبہ کوئی دھوکہ نہیں ہے۔ اس میں کسی قسم کی خیانت کا شائبہ نہیں ہے۔

وَّ اَنۡ لَّا تَعۡلُوۡا عَلَی اللّٰہِ ۚ اِنِّیۡۤ اٰتِیۡکُمۡ بِسُلۡطٰنٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۱۹﴾

۱۹۔ اور اللہ کے مقابلے میں برتری دکھانے کی کوشش نہ کرو، میں تمہارے پاس واضح دلیل لے کر آیا ہوں۔

تفسیر آیات

۱۔ میری رسالت کے مقابلے میں برتری دکھانے کی کوشش درحقیقت اللہ کے مقابلہ میں برتری دکھانا ہے۔

۲۔ اِنِّیۡۤ اٰتِیۡکُمۡ بِسُلۡطٰنٍ مُّبِیۡنٍ: اللہ کی طرف سے معجزات پر مشتمل واضح دلیل لے کر آیا ہوں

جو میری نبوت کی تصدیق کے لیے کافی ہے اور ساتھ اللہ کی برتری کی بھی نشانی ہو گی۔

وَ اِنِّیۡ عُذۡتُ بِرَبِّیۡ وَ رَبِّکُمۡ اَنۡ تَرۡجُمُوۡنِ ﴿۲۰﴾ — ۲۰۔ اور میں اپنے رب اور تمہارے رب کی پناہ میں آ گیا ہوں (اس بات سے) کہ تم مجھے سنگسار کرو۔

وَ اِنۡ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا لِیۡ فَاعۡتَزِلُوۡنِ ﴿۲۱﴾ — ۲۱۔ اور اگر تم مجھ پر ایمان نہیں لاتے تو مجھ سے دور رہو۔

تفسیر آیات

میں جب اللہ کی پناہ میں ہوں تو تم مجھے قتل نہیں کر سکو گے۔ چونکہ ابتدائے رسالت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تحفظ دیا تھا:

لَا تَخَافَاۤ اِنَّنِیۡ مَعَکُمَاۤ اَسۡمَعُ وَ اَرٰی ﴿﴾[1] — فرمایا: آپ دونوں خوف نہ کریں میں آپ دونوں کے ساتھ ہوں اور (دونوں کی بات) سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔

۲۔ وَ اِنۡ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا: اگر تم میری رسالت پر ایمان نہیں لاتے تو مجھے میری حالت پر چھوڑ دو لیکن فرعون کے لیے یہ بات ممکن نہ تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کو ان کی حالت پر چھوڑ دے۔ اس طرح تو روز بروز ان کا نفوذ بڑھتا جائے گا۔

فَدَعَا رَبَّہٗۤ اَنَّ ہٰۤؤُلَآءِ قَوۡمٌ مُّجۡرِمُوۡنَ ﴿۲۲﴾ — ۲۲۔ پس موسیٰ نے اپنے رب کو پکارا کہ یہ مجرم لوگ ہیں۔ الثلثۃ

فَاَسۡرِ بِعِبَادِیۡ لَیۡلًا اِنَّکُمۡ مُّتَّبَعُوۡنَ ﴿۲۳﴾ — ۲۳۔ (اللہ نے فرمایا) پس میرے بندوں کو لے کر رات کو چل پڑیں، یقیناً تم لوگوں کا پیچھا کیا جائے گا۔

تفسیر آیات

۱۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھ لیا ان میں ایمان کی روشنی آنے والی نہیں ہے۔ مضمون دعا کا ذکر نہیں ہے لیکن سیاق کلام سے معلوم ہوتا ہے اس مجرم قوم سے نجات کے لیے دعا کی ہے تو اللہ نے نجات

---

[1] ۲۰ طہ: ۴۶

کا راستہ بتا دیا۔
۲۔ اس دعا کے نتیجے میں یہ حکم ملا کہ رات کو بنی اسرائیل کو لے کر اپنے وطن کی طرف چل پڑو اور یہ بات ذہن میں رکھو کہ وہ تمہارا تعاقب کریں گے۔ اس تعاقب کے نتیجے سے بھی باخبر رکھا گیا تھا۔

وَاتۡرُكِ الۡبَحۡرَ رَهۡوًا ؕ اِنَّهُمۡ جُنۡدٌ مُّغۡرَقُوۡنَ ﴿۲۴﴾

۲۴۔ اور سمندر کو شگافتہ چھوڑ دیجیے ان کے لشکری یقیناً غرق ہونے والے ہیں۔

تشریح کلمات

رَهۡوًا: (ر ھ و) الرھو کے معنی ساکن کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے: اس سے راستہ کی کشادگی مراد ہے۔

تفسیر آیات

دریا کے اس شگاف کو اپنے عصا کے ذریعے دوبارہ پہلی حالت میں لانے کی کوشش نہ کرنا۔ جیسے شگاف کی حالت ہے اسی حالت پر چھوڑے رکھنا۔ فرعون اور اس کے لشکر کے اس راستے سے داخل ہونے کے بعد دریا پہلی حالت میں آ جائے گا اور فرعون اپنے لشکر سمیت غرق ہو جائے گا۔

كَمۡ تَرَكُوۡا مِنۡ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوۡنٍ ﴿۲۵﴾ **۲۵۔ وہ لوگ کتنے ہی باغات اور چشمے چھوڑ گئے،**

وَّ زُرُوۡعٍ وَّ مَقَامٍ كَرِيۡمٍ ﴿۲۶﴾ **۲۶۔ اور کھیتیاں اور عمدہ محلات،**

وَّ نَعۡمَةٍ كَانُوۡا فِيۡهَا فٰكِهِيۡنَ ﴿۲۷﴾ **۲۷۔ اور نعمتیں جن میں وہ مزے لیتے تھے،**

تفسیر آیات

دریائے نیل کی وجہ سے مصر ایک زراعتی ملک تھا۔ ہر طرف باغات تھے اور نیل سے نکلنے والی نہریں۔ ممکن ہے ان نہروں کو عُيُوۡنٍ (چشمے) فرمایا ہو۔ مقام کریم کا مطلب عمدہ محلات ہیں۔ کریم قابل ستائش کو کہتے ہیں۔ ہر چیز کی ستائش اسی کے مطابق ہوتی ہے۔ محلات اگر عمدہ اور آرام دہ ہوں تو وہ قابل ستائش ہیں، خواہ ان میں کوئی جابر اور سرکش رہتا ہو۔ تلوار اگر عمدہ ہے تو قابل ستائش ہے خواہ اس سے کسی مومن کا گلا کاٹ دے۔

وَّ نَعۡمَةٍ كَانُوۡا: جن نعمتوں میں یہ لوگ نازاں تھے ان سب سے ہاتھ اٹھانا پڑا اور آخر میں سمندر کی تہ میں وہ مچھلیوں کے لیے خوراک اور نعمت بن گئے۔

كَذٰلِكَ ۫ وَ اَوۡرَثۡنٰهَا قَوۡمًا اٰخَرِیۡنَ ﴿۲۸﴾

۲۸۔ (یہ قصہ) اسی طرح واقع ہوا اور ہم نے دوسروں کو ان چیزوں کا وارث بنا دیا۔

تفسیر آیات

۱۔ كَذٰلِكَ: جس طرح ان لوگوں کو نعمتوں سے نکالا اسی طرح ان چیزوں کو ان سے چھین کر دوسروں کو دے دیا۔

۲۔ قَوۡمًا اٰخَرِیۡنَ: دوسری قوم سے مراد وہ قوم ہو سکتی ہے جو آل فرعون کے بعد مصر کی وارث بن گئی۔ بنی اسرائیل کی تاریخ میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں ملتا کہ وہ واپس مصر گئے ہوں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ الشعراء آیت ۵۹۔

فَمَا بَكَتۡ عَلَیۡهِمُ السَّمَآءُ وَ الۡاَرۡضُ وَ مَا كَانُوۡا مُنۡظَرِیۡنَ ﴿۲۹﴾ ع

۲۹۔ پھر نہ آسمان و زمین نے ان پر گریہ کیا اور نہ ہی وہ مہلت ملنے والوں میں سے تھے۔

تفسیر آیات

فرعون اور آل فرعون جب اقتدار پر تھے تو سب ان کے قصیدہ خواں تھے۔ جب وہ غرق آب ہوئے تو نہ چشم فلک نے گریہ کیا، نہ زمین کے کسی قطعہ نے آہ و فغاں کیا۔ چونکہ نہ چشم فلک نے اس کی کوئی نیکی دیکھی تھی، نہ زمین کا کوئی قطعہ ایسا تھا جس پر اس سے کوئی کار خیر صادر ہوا ہو۔

چنانچہ حدیث میں آیا ہے: انس نے روایت کی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا:

ما من مومن الا و له باب يصعد منه عمله وباب ينزل منه رزقه فاذا مات بكيا عليه۔[1]

ہر مومن کے لیے ایک دروازہ ہے جس سے اس کا عمل اوپر جاتا ہے اور ایک دروازے سے اس کی روزی نیچے آتی ہے۔ جب یہ مومن فوت ہو جاتا ہے تو یہ دونوں دروازے اس پر گریہ کرتے ہیں۔

الدرالمنثور میں آیا ہے:

ان يحيى بن زكريا لما قتل احمرت السماء و قطرت دما و ان حسين بن على يوم قتل احمرت السماء۔

جب یحییٰ بن زکریا (علیہما السلام) قتل ہوئے تو آسمان سرخ ہو گیا اور خون کی بارش ہوئی اور جب حسین بن علی (علیہما السلام) قتل ہوئے تو آسمان سرخ ہو گیا۔

---

[1] مجمع البیان اور الدرالمنثور عن الترمذی

ابن ابی حاتم زید بن زیاد سے روایت کرتے ہیں:

لما قتل الحسین احمرت افاق السماء اربعة اشهر۔[1]

جب حسین بن علی (علیہما السلام) قتل ہوئے تو چار ماہ تک آسمان کے آفاق و اطراف سرخ رہے۔

وَ لَقَدۡ نَجَّیۡنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ مِنَ الۡعَذَابِ الۡمُہِیۡنِ ﴿۳۰﴾

۳۰۔ اور بتحقیق ہم نے بنی اسرائیل کو ذلت آمیز عذاب سے نجات دی،

مِنۡ فِرۡعَوۡنَ ؕ اِنَّہٗ کَانَ عَالِیًا مِّنَ الۡمُسۡرِفِیۡنَ ﴿۳۱﴾

۳۱۔ (یعنی) فرعون سے، جو حد سے تجاوز کرنے والوں میں بہت اونچا چلا گیا تھا۔

تفسیر آیات

۱۔ بنی اسرائیل کو مصر میں ایک اجنبی اور کمتر حیثیت کی حامل قوم کی طرح ذلت آمیز زندگی گزارنا پڑتی تھی۔ اس سے اللہ تعالیٰ نے نجات دلائی۔

۲۔ مِنَ الۡعَذَابِ الۡمُہِیۡنِ: ایک ایسے عذاب سے نجات دلائی جو ذلت آمیز تھا۔ جب عذاب کے ساتھ مذلت بھی اٹھانا پڑے تو یہ عذاب جسمانی و نفسیاتی دونوں حوالوں سے نہایت کربناک ہوتا ہے۔

۳۔ عَالِیًا مِّنَ الۡمُسۡرِفِیۡنَ: عذاب بھی معمول کا نہ تھا بلکہ ظلم و زیادتی کی حدود سے آگے کا عذاب تھا۔ الۡمُسۡرِفِیۡنَ حد سے تجاوز کرتے ہیں۔ وہ عَالِیًا پہاڑ کی طرح اونچا تھا۔ یعنی فرعون اونچے درجے کا ظالم تھا جس نے بنی اسرائیل کی نسل کشی کو عام کر رکھا تھا۔

وَ لَقَدِ اخۡتَرۡنٰہُمۡ عَلٰی عِلۡمٍ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۳۲﴾

۳۲۔ اور بتحقیق ہم نے انہیں (بنی اسرائیل کو) اپنے علم کی بنیاد پر اہل عالم پر فوقیت بخشی۔

تفسیر آیات

۱۔ اللہ نے بنی اسرائیل کو اس زمانے کی اقوام پر فوقیت دی۔ اسی لیے بیشتر انبیاء علیہم السلام بنی اسرائیل میں مبعوث ہوئے۔ سب سے زیادہ معجزات انہیں دکھائے گئے۔ ان کے لیے دریا شق ہو گیا اور من و سلویٰ سے نوازا گیا۔

۲۔ عَلٰی عِلۡمٍ: یہ انتخاب اس علم کی بنیاد پر عمل میں آیا جو اس زمانے میں اس قوم کی اہلیت اور مستحق ہونے پر اللہ تعالیٰ کو حاصل تھا۔

---

[1] الدرالمنثور ذیل آیت

۳۔ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ: بنی اسرائیل کے اپنے زمانے میں عالمین پر انہیں فوقیت دی گئی ہے۔ انہیں امت مسلمہ پر فوقیت نہیں دی گئی ہے۔ امت مسلمہ سے فرمایا گیا:

کُنۡتُمۡ خَیۡرَ اُمَّۃٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ ...[1] تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی اصلاح) کے لیے پیدا کیے گئے۔

وَ اٰتَیۡنٰہُمۡ مِّنَ الۡاٰیٰتِ مَا فِیۡہِ بَلٰٓـؤٌا مُّبِیۡنٌ ﴿۳۳﴾ ۳۳۔ اور ہم نے انہیں ایسی نشانیاں دیں جن میں صریح امتحان تھا۔

تفسیر آیات

۱۔ بنی اسرائیل کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے معجزانہ نعمتوں کا ذکر قرآن میں متعدد مقامات پر ہوا ہے۔ ان میں فرعون کے ظلم سے نجات، دریا کا شق ہونا، من و سلویٰ کا نزول، بادلوں کا سایہ، چشموں کا پھوٹنا شامل ہیں۔

۲۔ مَا فِیۡہِ بَلٰٓـؤٌا مُّبِیۡنٌ: ان معجزاتی نعمتوں کی فراوانی میں ایک واضح آزمائش تھی کہ وہ ان نعمتوں کی قدر دانی، اپنے نبی کی اطاعت کرتے ہیں یا نہیں؟

چنانچہ تاریخ کے اوراق میں بنی اسرائیل کی ناقدری اور اپنے نبی کی نافرمانی نمایاں طور پر ثبت ہے۔

اِنَّ ہٰۤؤُلَآءِ لَیَقُوۡلُوۡنَ ﴿۳۴﴾ ۳۴۔ یہ لوگ ضرور کہیں گے

اِنۡ ہِیَ اِلَّا مَوۡتَتُنَا الۡاُوۡلٰی وَ مَا نَحۡنُ بِمُنۡشَرِیۡنَ ﴿۳۵﴾ ۳۵۔ کہ یہ صرف ہماری پہلی موت ہے پھر ہم اٹھائے نہیں جائیں گے۔

فَاۡتُوۡا بِاٰبَآئِنَاۤ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۳۶﴾ ۳۶۔ پس اگر تم سچے ہو تو ہمارے باپ دادا کو (دوبارہ زندہ کر کے) پیش کرو۔

تفسیر آیات

تاریخ انبیاء علیہم السلام خاص کر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کی تاریخ بیان اس لیے بھی کی جاتی ہے کہ رسول اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے لیے باعث تسلی اور منکرین کے لیے مایۂ عبرت بن جائے۔ چنانچہ بنی اسرائیل اور فرعون کا عبرتناک واقعہ سنانے کے بعد رسول اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے معاصر منکرین کی طرف کلام کا رخ ہو گیا۔

---

[1] ۳ آل عمران: ۱۱۰

۱۔ مَوۡتَتَنَا الۡاُوۡلٰی: انکار معاد کے بارے میں مشرکین کہتے ہیں: صرف پہلی موت ہو گی۔ اس کے بعد کوئی حیات نہیں ہے۔ ممکن ہے مشرکین کا یہ خیال ہو کہ موت کے بعد اگر کوئی حیات ہے تو اس کے بعد پھر ایک اور موت ہو گی۔ وہ حیات ابدی کا تصور نہیں کر سکتے تھے۔

۲۔ فَاۡتُوۡا بِاٰبَآئِنَاۤ: روایت ہے کہ ابوجہل نے یہ کہا تھا: اگر آپ اپنے اس دعویٰ میں سچے ہیں تو اپنے جد اعلیٰ قصی بن کلاب کو زندہ کریں۔ وہ ایک سچا انسان تھا۔ ہم ان سے مرنے کے بعد کے حالات پوچھیں گے۔ (مجمع البیان)

جواب یہ دیا گیا ہے: رسول ﷺ نے فرمایا کہ مرنے کے بعد جزا کے لیے اٹھایا جائے گا۔ دنیا دار تکلیف ہے، دار جزا نہیں ہے۔ مزید کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ الجاثیہ آیت ۲۵۔

اَهُمۡ خَیۡرٌ اَمۡ قَوۡمُ تُبَّعٍ ۙ وَّ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ؕ اَهۡلَکۡنٰهُمۡ ۫ اِنَّهُمۡ کَانُوۡا مُجۡرِمِیۡنَ ﴿۳۷﴾

۳۷۔ کیا یہ لوگ بہتر ہیں یا تبع کی قوم اور ان سے پہلے کے لوگ؟ انہیں ہم نے ہلاک کیا کیونکہ وہ سب مجرم تھے۔

تفسیر آیات

کیا یہ مشرکین جو گدلے، متعفن پانی پر گزارہ کرنے والے لوگ، اپنی قوت و سلطنت میں بہتر حالت میں تھے یا تُبّع کی قوم جو اپنی سلطنت، تہذیب اور تمدن میں ان مشرکین سے بہت بہتر حالت میں تھی؟ اور قوم تُبّع سے قبل کی اقوام بھی ان لوگوں سے بہت زیادہ قوت و سلطنت کے مالک تھیں۔ جب انہیں اللہ نے ہلاکت میں ڈال دیا تو تمہاری کوئی حیثیت نہیں ہے۔

قوم تُبّع: قبیلہ حمیر کے شاہان کا لقب تُبّع ہے۔ جیسے قیاصرۃ، فراعنہ، کسریٰ مختلف ممالک کے شاہان کے القاب رہے ہیں۔ یہ لقب ان شاہان کا ہے جو بہ یک وقت یمن کے تمام علاقوں پر حکومت کرتے تھے جن میں حِمیَر، سبا اور حضر موت شامل ہیں۔ کہتے ہیں سنہ ۵۱۱ قبل مسیح سے لے کر سنہ ۳۰۰ عیسوی تک ان کی حکومت رہی۔

قریش کا جد اعلیٰ عدنان اور حمیر کا جد اعلیٰ قحطان دونوں عرب قبائل سے ہیں۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے فرمایا:

> تُبّع نے قبائل اوس اور خزرج سے کہا تھا: تم یہاں (یثرب) میں اس نبی کے مبعوث ہونے تک قیام کرو۔ اگر میں انہیں پا لیتا تو ان کی خدمت کرتا اور ان کے ساتھ (جہاد کے لیے) نکلتا۔ (مجمع البیان)

وَ مَا خَلَقۡنَا السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَ مَا بَیۡنَہُمَا لٰعِبِیۡنَ ﴿۳۸﴾

۳۸۔اور ہم نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کو کھیل نہیں بنایا۔

مَا خَلَقۡنٰہُمَاۤ اِلَّا بِالۡحَقِّ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَہُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۹﴾

۳۹۔ہم نے ان دونوں کو بس برحق پیدا کیا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

تفسیر آیات

۱۔ اگر اس دنیوی زندگی کے بعد کوئی اور عالم اور زندگی نہیں ہے تو اس کائنات کا پیدا کرنا ایک عبث کام ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی سزا جزا اور عدالت کا دن نہیں ہے تو یہ ساری کائنات بے مقصد کھلونا بن جاتی ہے۔ یہاں کی اچھائی اور برائی کا کوئی نتیجہ نہیں ہے۔ بولہبی اور بوذری میں امتیاز نہیں۔ مظلوم کے خون میں اپنا لقمہ تر کرنے والا اور اپنے خون پسینے سے غریب پروری کرنے والا، دونوں یکساں ہیں تو کائنات کی تخلیق حق پر مبنی نہ ہو گی۔

اِنَّ یَوۡمَ الۡفَصۡلِ مِیۡقَاتُہُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿ۙ۴۰﴾

۴۰۔ یقیناً فیصلے کا دن ان سب کے لیے طے شدہ ہے۔

یَوۡمَ لَا یُغۡنِیۡ مَوۡلًی عَنۡ مَّوۡلًی شَیۡئًا وَّ لَا ہُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ ﴿ۙ۴۱﴾

۴۱۔ اس دن کوئی قریبی کسی قریبی کے کچھ کام نہ آئے گا اور نہ ہی ان کی مدد کی جائے گی،

اِلَّا مَنۡ رَّحِمَ اللّٰہُ ؕ اِنَّہٗ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ ﴿٪۴۲﴾

۴۲۔مگر جس پر اللہ رحم کرے، یقیناً وہ بڑا غالب آنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ یَوۡمَ الۡفَصۡلِ: تقریباً یہ جواب ہے مشرکین کے اس سوال کا کہ ہمارے آباء کو زندہ کرو، اگر آپ سچے ہیں۔ فرمایا: ان سب منکرین کے جرائم کا فیصلہ کرنے کا ایک وقت مقرر ہے۔ جس میں نیکی کرنے اور جرائم کا ارتکاب کرنے والوں میں فیصلہ ہو گا۔ مومن اور مشرک، ظالم اور مظلوم میں فیصلہ ہو گا۔

۲۔ یَوۡمَ لَا یُغۡنِیۡ: اس دن ہر ایک کو اپنے عمل کی روشنی میں جواب دینا ہے۔ عمل سے ہٹ کر کوئی دیگر شخص کام نہ آئے گا خواہ وہ اس کا قریبی یا دوست ہو یا کسی ذریعے سے اس کا ہمدرد ہو۔ وَّ لَا ہُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ نہ کسی بھی ذریعے سے انہیں کوئی مدد ملے گی۔

۳۔ اِلَّا مَنۡ رَّحِمَ اللّٰہُ: البتہ جسے اللہ کی رحمت نصیب ہو جائے اسے نجات مل جائے گی۔ یہی ایک صورت ہے نجات کی لیکن اس صورت کے لیے اللہ کی رحمت کا سزاوار بننا ہوگا چونکہ اللہ کی رحمت اندھی بانٹ نہیں ہے۔ یہ رحمت ایمان و عمل صالح کی بنیاد پر نصیب ہوگی۔

۴۔ اِنَّہٗ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ: وہ سزا دینے کے لیے بالادست اور غالب آنے والا ہے اور رحمت کے مستحق لوگوں کے لیے رحیم ہے۔

اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوۡمِ ﴿۴۳﴾　۴۳۔ بے شک زقوم کا درخت،

طَعَامُ الۡاَثِیۡمِ ﴿ۖۛ۴۴﴾　۴۴۔ گنہگار کا کھانا ہے،

کَالۡمُہۡلِ ۚۛ یَغۡلِیۡ فِی الۡبُطُوۡنِ ﴿۴۵﴾　۴۵۔ پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہے جو شکموں میں کھولتا ہے،

کَغَلۡیِ الۡحَمِیۡمِ ﴿۴۶﴾　۴۶۔ جس طرح گرم پانی کھولتا ہے۔

منزل ۶

تشریح کلمات

الزَّقُّوۡمِ: (ز ق م) ایک ایسے پودے کو کہتے ہیں جو نہایت بدمزہ اور بدبودار ہے۔

المھل: (م ھ ل) کے معنی پگھلا ہوا تانبا کے ہیں۔

تفسیر آیات

یوم الفصل کے فیصلے کا ذکر: اس فیصلے کے نتیجے میں منکرین معاد کو زقوم کا طعام کھانا ہوگا جو ان کے شکم میں کھولتا ہوگا جس طرح پگلا ہوا تانبا ہوتا ہے۔

طَعَامُ الۡاَثِیۡمِ: یہاں ایک مسئلہ نہایت قابل توجہ ہے کہ قرآن کے بارے میں ایک موقف ایسا اختیار کیا جاتا ہے جس کے مطابق قرآن کے الفاظ کو دوسرے لفظوں کے ساتھ تبدیل کرنا جائز قرار دیا جاتا ہے۔ مثلاً یہاں طَعَامُ الۡاَثِیۡمِ کی جگہ طعام الفاجر کہنا جائز ہے۔ اس سلسلے میں ابوالدرداء کی ایک روایت سے استدلال کرتے ہیں۔ روح المعانی میں آیا ہے:

واستدل بذلك عى ان ابدال كلمة مكان كلمة جائز اذا كانت مؤدية معناها۔	اس سے استدلال کیا گیا ہے کہ ایک کلمہ کو دوسرے کلمہ سے بدلنا جائز ہے۔ اگر وہی معنی ادا ہو جاتا ہے۔

آلوسی اس آیت کے ذیل میں روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایک فارسی شخص سے فرمایا: اگر اثیم کہنا نہیں آتا ہے تو طعام الظلام کہدو۔ پھر لکھا ہے:

و فی الباب اخبار کثیرۃ جیاد الاسانید۔ اس سلسلے میں عمدہ سندوں پر مشتمل روایات بہت زیادہ ہیں۔

ہم نے مقدمہ میں لکھا ہے کہ اس سے تحریف قرآن کا جواز نکل آتا ہے چونکہ قرآن کی فصاحت و بلاغت میں کلمات کے لحن کو بڑا دخل ہے۔ چنانچہ طَعَامُ الۡاَثِیۡمِ میں موجود ملاحت و شیرینی طعام الفاجر میں نہیں ہے۔

خُذُوۡہُ فَاعۡتِلُوۡہُ اِلٰی سَوَآءِ الۡجَحِیۡمِ ﴿۴۷﴾	۴۷۔ اسے پکڑ لو اور جہنم کے بیچ تک گھسیٹتے ہوئے لے جاؤ،
ثُمَّ صُبُّوۡا فَوۡقَ رَاۡسِہٖ مِنۡ عَذَابِ الۡحَمِیۡمِ ﴿۴۸﴾	۴۸۔ پھر اس کے سر پر کھولتے ہوئے پانی کا عذاب انڈیل دو۔
ذُقۡ ۚۙ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡکَرِیۡمُ ﴿۴۹﴾	۴۹۔ چکھ (عذاب) بے شک تو (جہنم کی ضیافت میں) بڑی عزت والا، اکرام والا ہے۔
اِنَّ ہٰذَا مَا کُنۡتُمۡ بِہٖ تَمۡتَرُوۡنَ ﴿۵۰﴾	۵۰۔ یقیناً یہ وہی چیز ہے جس میں تم شک کیا کرتے تھے۔

تشریح کلمات

فَاعۡتِلُوۡہُ: (ع ت ل) العتل: کے معنی بزور گھسیٹنے کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ خُذُوۡہُ: جہنم پر موکل فرشتوں کو یہ حکم ملے گا اس منکر کو پکڑ کر گھسیٹ کر جہنم کی طرف لے جاؤ۔ چونکہ یہ جہنم کی طرف چلنا نہیں چاہے گا اسے گھسیٹ کر لے جانا پڑے گا۔ سَوَآءِ الۡجَحِیۡمِ مطلب ہے جہنم کی درمیانی جگہ جہاں حرارت شدید ہو گی۔

۲۔ ثُمَّ صُبُّوۡا: شدید ترین حرارت والی جگہ پر بٹھانے کے بعد اس کے سر پر کھولتا ہوا پانی انڈیل دیا جائے گا۔ یہ اس عذاب کے علاوہ ہو گا جو جہنم کے درمیان میں ہونے کی وجہ سے مل رہا ہے۔

۳۔ ذُقۡ: پھر اس جسمانی عذاب پر نفسیاتی عذاب کا بھی اضافہ ہو گا اور اسے بطور طنز کہا جائے گا: اس جہنم کا مزہ خوب چکھ۔ آج جہنم کی ضیافت میں تمہیں بہتر پذیرائی ملے گی۔

۴۔ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡکَرِیۡمُ: آج تو جہنم میں عزت و اکرام والا ہے۔ لہٰذا تجھے عذاب کی عزت سے نوازا جائے گا۔ ہر طرف سے عذاب کی فراوانی ہو گی۔ اس ضیافت میں کسی عذاب کی کمی نہ ہو گی۔ تو اکرام والا بھی ہو گا۔ یہاں ہر قسم کی اہانت و ذلت کا سامنا کرنا ہو گا۔ تو دنیا میں انکارحق پر مبنی اپنا اکرام رکھتا تھا آج یہاں تجھے جہنمی اکرام سے نوازا جائے گا۔

۵۔ تَمۡتَرُوۡنَ: یہ وہی جہنم ہے، وہی عذاب ہے جس پر تمہیں یقین نہیں آتا تھا۔

اِنَّ الۡمُتَّقِیۡنَ فِیۡ مَقَامٍ اَمِیۡنٍ ﴿۵۱﴾　۵۱۔ اہل تقویٰ یقیناً امن کی جگہ میں ہوں گے۔

فِیۡ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوۡنٍ ﴿۵۲﴾　۵۲۔ باغوں اور چشموں میں۔

یَّلۡبَسُوۡنَ مِنۡ سُنۡدُسٍ وَّ اِسۡتَبۡرَقٍ مُّتَقٰبِلِیۡنَ ﴿۵۳﴾　۵۳۔ حریر اور دیبا پہنے ہوئے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ الۡمُتَّقِیۡنَ: تقویٰ والے ایسے محلات میں ہوں گے جہاں ہر قسم کی مکروہ اور نامطلوب چیزوں سے امن میں ہوں گے۔

۲۔ فِیۡ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوۡنٍ: ایسے باغات میں ہوں گے جن میں چشمے پھوٹ رہے ہوں گے۔

۳۔ یَّلۡبَسُوۡنَ: ان کے لباس ریشمی کپڑے کے ہوں گے۔ سندس باریک ریشمی کپڑوں کو کہتے ہیں اور اِسۡتَبۡرَقٍ یہ بھی ریشمی ہو گا جو بھاری ہو گا۔ بعض تفاسیر نے لکھا ہے: سندس پہننے کے لیے اور استبرق فرش کے لیے ہوتا ہے۔

۴۔ مُّتَقٰبِلِیۡنَ: باہم ایک دوسرے کے مقابل میں بیٹھے ہوں گے۔ ایک دوسرے سے مانوس احباب کی محفلیں ہوں گی۔ احباب کے ساتھ نشست بھی ایک نعمت ہے۔ جنت میں یہ نعمت بھی حاصل ہو گی۔

کَذٰلِکَ ۟ وَ زَوَّجۡنٰہُمۡ بِحُوۡرٍ عِیۡنٍ ﴿۵۴﴾　۵۴۔ اسی طرح (ہو گا) اور ہم انہیں بڑی آنکھوں والی حوروں سے بیاہ دیں گے۔

یَدۡعُوۡنَ فِیۡہَا بِکُلِّ فَاکِہَۃٍ اٰمِنِیۡنَ ﴿۵۵﴾　۵۵۔ وہاں وہ اطمینان سے ہر طرح کے میوے کی فرمائش کریں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ جنت میں اہل تقویٰ حور العین کے ساتھ زندگی گزاریں گے۔

حور: جمع حوراء کی۔ جس کے معنی ہے آنکھ کی سیاہی میں تھوڑی سی سفیدی ظاہر ہونا عین جمع ہے عیناء کی۔ بڑی آنکھوں والی کو کہتے ہیں۔

۲۔ یَدۡعُوۡنَ: وہ صرف طلب کریں گے۔ ہر قسم کا میوہ اس کے طلب و ارادے پر آمادہ ہو جائے گا۔ چونکہ جنت میں اہل جنت کا ارادہ نافذ ہوتا ہے۔ ارادے اور مراد کے درمیان علل و اسباب حائل نہیں ہوتے۔ جب کہ دنیا میں انسان کا ارادے اور مراد کے درمیان علل و اسباب حائل ہوتے ہیں۔ ان علل و اسباب سے گزر کر مراد تک پہنچنا پڑتا ہے۔

۳۔ اٰمِنِیۡنَ: ارادے کے نفوذ پر کوئی خرچ نہیں اٹھے گا، نہ ختم ہونے کا خوف ہوگا، نہ اس کی قیمت ادا کرنا پڑے گی۔

لَا یَذُوۡقُوۡنَ فِیۡہَا الۡمَوۡتَ اِلَّا الۡمَوۡتَۃَ الۡاُوۡلٰی ۚ وَ وَقٰہُمۡ عَذَابَ الۡجَحِیۡمِ ﴿۵۶﴾

۵۶۔ وہاں وہ پہلی موت کے سوا کسی اور موت کا ذائقہ نہیں چکھیں گے اور اللہ انہیں جہنم کے عذاب سے بچا لے گا۔

فَضۡلًا مِّنۡ رَّبِّکَ ؕ ذٰلِکَ ہُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ﴿۵۷﴾

۵۷۔ یہ آپ کے پروردگار کے فضل سے ہوگا، یہی تو بڑی کامیابی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اس آیت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مومن کو جنت سے پہلے صرف ایک موت سے واسطہ پڑتا ہے۔ یعنی صرف وہی موت جو دنیا میں آ چکی ہے۔ اس کے بعد کسی اور موت سے دوچار نہ ہوگا۔ جب کہ اہل جہنم کو ہر وقت موت کی طرح کے عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا:

وَ یَاۡتِیۡہِ الۡمَوۡتُ مِنۡ کُلِّ مَکَانٍ وَّ مَا ہُوَ بِمَیِّتٍ ...[۱] — اسے ہر طرف سے موت آئے گی مگر وہ مرنے نہ پائے گا۔

۲۔ وَ وَقٰہُمۡ: جنت میں داخل ہونا اور عذاب جہنم سے نجات، اللہ کا فضل شامل حال ہونے کی بنا پر ہے۔ وگرنہ بندہ اللہ کی توفیق کے بغیر کوئی اچھا عمل انجام نہیں دے سکتا، نہ اس سے ایسے اعمال صادر ہو

---

[۱] ۱۴ ابراھیم: ۱۷

سکتے ہیں جن سے وہ جنت کی دائمی اور لا محدود نعمتوں کا سزاوار بنے۔

۳۔ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ: اس ابدی کامیابی سے بڑھ کر کون سی کامیابی ہوسکتی ہے۔

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝۵۸

۵۸۔ پس ہم نے اس (قرآن) کو آپ کی زبان میں آسان کر دیا تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

فَارْتَقِبْ اِنَّهُمْ مُّرْتَقِبُوْنَ ۝۵۹ ع ۳

۵۹۔ پس اب آپ بھی منتظر رہیں، یقیناً یہ بھی منتظر ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اس سورہ مبارکہ کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اس نعمت کا ذکر فرمایا جس سے انسانیت کو ہدایت کی صورت میں میسر آئی اور اس قرآن کو آسان بنا دیا کہ ہر کوئی اس سے اپنی بساط کے مطابق فیض حاصل کر سکے۔

۲۔ فَارْتَقِبْ: اس آسانی کے باوجود اگر کوئی اس قرآن سے فائدہ نہیں اٹھاتا تو اے رسول! آپ ان کے انجام بد کے منتظر رہیں اور یہ منکرین بھی اپنے بدترین انجام کے لاشعوری طور پر انتظار میں ہیں۔

سُورَةُ الجَاثِيَةِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اس سورۃ المبارکہ کا نام الحاثیۃ ہے جو آیت وَ تَرٰی کُلَّ اُمَّۃٍ جَاثِیَۃً .... (۲۸) سے ماخوذ ہے۔
اس سورۃ کی آیات کی تعداد کوفی قرائت کے مطابق ۳۷ اور دوسری قرائتوں کے مطابق ۳۶ ہے۔
وجہ یہ ہے کہ کوفی قرائت میں حروف مقطعہ حٰمٓ ایک مستقل آیت ہے۔ یہ قرائت حضرت امیر المؤمنین علی علیہ السلام سے ماخوذ ہے اس لیے راز دانِ قرآن کو معلوم ہے کہ حٰمٓ کن اسرار پر مشتمل اور مستقل آیت ہے۔
یہ سورۃ مکی ہے اس لیے اس کے مضامین اصول عقائد پر مشتمل ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	بنام خدائے رحمن رحیم
حٰمٓ ۚ﴿۱﴾	۱۔ حا، میم۔
تَنۡزِیۡلُ الۡکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَکِیۡمِ ﴿۲﴾	۲۔ اس کتاب کا نزول بڑے غالب آنے والے، حکمت والے اللہ کی طرف سے ہے۔

183

تفسیر آیات

اس آیت کی تشریح سورہ ہائے زمر آیت ۱، غافر ۲ میں ہو چکی ہے کہ کفار مکہ کے اس الزام کو رد کرنے کے لیے کہ قرآن خود محمدؐ کا تصنیف ہے مکی سورتوں میں عموماً اور سورہ ہائے حوامیم میں خصوصاً اس بات کو مکرر بیان فرما رہا ہے کہ یہ قرآن خدائے دانا و حکیم کا نازل کردہ ہے۔

اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ؕ﴿۳﴾	۳۔ آسمانوں اور زمین میں ایمان والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

وَ فِيْ خَلْقِكُمْ وَ مَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ۙ۴

۴۔ اور تمہاری خلقت میں اور ان جانوروں میں جنہیں اللہ نے پھیلا رکھا ہے یقین رکھنے والی قوم کے لیے نشانیاں ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ: ان آیات کے مخاطبین چونکہ اللہ تعالیٰ کے وجود کے معترف اور اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور مدبریت کے منکر تھے اس لیے انہیں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کی آیات کی نشاندہی ہو رہی ہے۔

کبھی ارشاد ہوتا ہے: اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ ...[۱] آسمانوں اور زمین کو جس نہج پر خلق فرمایا ہے اس میں اللہ کی ربوبیت کے دلائل موجود ہیں کہ خالق نے اس کائنات میں حیات کو فروغ دینے کے لیے کیا کیا سامان خلق فرمایا ہے اور کبھی فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ آسمانوں اور زمین کے وجود میں آنے کے بعد ان کے وجود میں بھی اس کی ربوبیت پر دلالت کرنے والے معجزات موجود ہیں۔ لہٰذا آسمانوں اور زمین میں دو قسم کی آیات و معجزات موجود ہیں۔ ایک خالق کے اعتبار سے اور دوسرا مخلوق کے اعتبار سے۔ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ میں خالقیت کے اعتبار سے اور فِي السَّمٰوٰتِ میں مخلوق کے اعتبار سے آیات کا ذکر ہے۔

دوسری قسم کی نشانیوں کا متعدد آیات میں ذکر ہے:

وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ۝ [۲] اور تمہاری روزی آسمان میں ہے اور وہ بھی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے۔

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ۝ [۳] اور زمین میں اہل یقین کے لیے نشانیاں ہیں۔

آسمانوں اور زمین میں انسان کی بقائے حیات و تدبیر زندگی کے لیے موجود آیات کا شمار کرنا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔

۲۔ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ: آیات کو ذریعہ ایمان بنانے والوں کے لیے یہ دلائل و معجزات ہیں۔ جو لوگ ایمان نہیں لاتے وہ ان معجزات کے معجزاتی پہلو سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ اس لیے عملاً وہ ان کے لیے آیات نہیں بن پاتیں جبکہ اصولاً یہ سب کے لیے آیات تھیں۔

۳۔ وَ فِيْ خَلْقِكُمْ: خود تم انسانوں کو جس نہج پر خلق کیا ہے اس میں خالقیت کے اعتبار سے آیات موجود ہیں۔ اگر انسانوں کے خالق نے انسانوں کو اس طرح خلق کیا ہوتا کہ وہ خالق کے محتاج نہ رہیں تو ممکن تھا اللہ انسان کا خالق ہے، رازق و مدبر حیات نہیں ہے لیکن یہ انسان ہر لحظہ ہر سانس میں اللہ کی خلق کردہ چیزوں کا محتاج ہے تو پھر خالق ہی مدبر ہوا۔

---

[۱] ۳ آل عمران: ۱۹۰ [۲] ۵۱ ذاریات: ۲۲ [۳] ۵۱ ذاریات: ۲۰

۴۔ وَ مَا یَبُثُّ مِنۡ دَآبَّۃٍ: دَآبَّۃٍ رینگنے والے کو کہتے ہیں جس میں تمام قسم کے جاندار شامل ہو جاتے ہیں۔ لفظ دَآبَّۃٍ کے ساتھ یَبُثُّ پھیلانے کا ذکر قابل توجہ ہے۔ اس میں دَآبَّۃٍ کی کثرت کی طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ دَآبَّۃٍ جانداروں کی انواع کی تعداد لاکھوں میں ہے، افراد کی تعداد کا علم صرف اللہ کو ہے۔

ان جانداروں میں ایک سیل پر مشتمل جانداروں سے لے کر نہنگ اور ہاتھی تک تمام ایک نظام تخلیق سے منسلک ہیں۔ ایک نامرئی جاندار میں بھی دماغ، اعصاب، حواس، ہاضمہ، جاذبہ دافعہ وغیرہ سب موجود ہیں۔ پھر ان سب میں، ہر ایک تخلیق میں پوشیدہ حکمت اور مصلحت موجود ہے جس کا انکشاف انسان کی رشد کے ساتھ ساتھ ہوتا جاتا ہے۔

۵۔ اٰیٰتٌ لِّقَوۡمٍ یُّوۡقِنُوۡنَ: ان میں اہل یقین کے لیے آیات و معجزات پوشیدہ ہیں۔ طالب یقین کو یہ نشانیاں نظر آئیں گی کہ یہ سب ایک ہی قوت کی نگرانی میں چل رہے ہیں۔ ان موجودات میں موجود نظام کی وحدت، نظام دہندہ کی وحدت پر دلالت کرتی ہے۔

وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّہَارِ وَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ رِّزۡقٍ فَاَحۡیَا بِہِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا وَ تَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ اٰیٰتٌ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۵﴾

۵۔ اور رات اور دن کی آمد و رفت میں نیز اس رزق میں جسے اللہ آسمان سے نازل فرماتا ہے پھر زمین کو اس سے زندہ کر دیتا ہے اس کے مردہ ہونے کے بعد اور ہواؤں کے بدلنے میں عقل رکھنے والی قوم کے لیے نشانیاں ہیں۔

اس آیت کی تشریح کے لیے سورہ بقرہ آیت ۱۶۴ ملاحظہ فرمائیں۔

تِلۡکَ اٰیٰتُ اللّٰہِ نَتۡلُوۡہَا عَلَیۡکَ بِالۡحَقِّ ۚ فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۭ بَعۡدَ اللّٰہِ وَ اٰیٰتِہٖ یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۶﴾

۶۔ یہ اللہ کی آیات ہیں جنہیں ہم آپ کو برحق سنا رہے ہیں، پھر یہ اللہ اور اس کی آیات کے بعد کس بات پر ایمان لائیں گے؟

تفسیر آیات

کسی بات کو قبول کرانے کے لیے درکار معجزہ پیش کیا گیا۔ کسی بات کو سمجھانے کے لیے انتہائی وضاحت و بلاغت کے ساتھ بات سمجھا دی گئی۔ نہ معجزات میں کوئی کمی رہ گئی ہے، نہ بیان میں کوئی خلل ہے۔ اس کے باوجود اللہ کی آیات اور بیان کو نہیں مانتے ہو تو کس معجزے اور کس بیان کو مانو گے۔ تمہارا نہ ماننا معجزات اور بیان میں خلل کی وجہ سے نہیں ہے۔ خود اپنی سمجھ میں خلل کی وجہ سے ایمان نہیں لاتے ہو۔ آفاق

والفس میں موجود واضح نشانیوں اور انبیاءؑ کے ذریعے حجت پوری کرنے کے بعد بھی وہ ایمان نہیں لاتے تو حقائق بیان کرنے کا کون سا ذریعہ اور دلیل و حجت کا کون سا اسلوب باقی رہ جاتا ہے کہ انسان اس پر ایمان لے آئے۔

وَيۡلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيۡمٍ ۙ﴿۷﴾ ۷۔ تباہی ہے ہر جھوٹے گنہگار کے لیے،

يَّسۡمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتۡلٰى عَلَيۡهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسۡتَكۡبِرًا كَاَنۡ لَّمۡ يَسۡمَعۡهَا ۚ فَبَشِّرۡهُ بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ ﴿۸﴾ ۸۔ وہ اللہ کی آیات کو جو اس کے سامنے پڑھی جاتی ہیں سن تو لیتا ہے پھر تکبر کے ساتھ ضد کرتا ہے گویا اس نے انہیں سنا ہی نہیں، سو اسے دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجیے۔

تشریح کلمات

وَيۡلٌ: (و ی ل) اصمعی نے کہا ہے: ويل برے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ حسرت کے موقع پر ویل، تحقیر کے لیے ویس اور ترحم کے لیے ویح استعمال ہوتا ہے۔

اَفَّاكٍ: (ا ف ك) الافك ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو اپنے صحیح رخ سے پھیر دی گئی ہو۔

اَثِيۡمٍ: (ا ث م) الاثم وہ افعال و اعمال جو ثواب سے روکنے اور پیچھے رکھنے والے ہوں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَيۡلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ: ہلاکت اور تباہی اس شخص کا مقدر ہے جو بہت جھوٹ بولتا ہے اور ساتھ گناہ کا بھی ارتکاب کرتا ہے۔ جھوٹ یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے۔ گناہ یہ کہ انسان سوز جرائم کا ارتکاب کرنا ہے۔

۲۔ يَّسۡمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ: جھوٹ زیادہ بولنے والا ہونے کی وجہ سے سچ اسے پسند نہیں ہوتا اور گناہ کا زیادہ مرتکب ہونے کی وجہ سے آیات الٰہی کا اس پر اثر نہیں ہوتا بلکہ ان دو باتوں کا حامل انسان تکبر اور خود بینی میں مبتلا رہتا ہے۔

۳۔ ثُمَّ يُصِرُّ: کفر پر اڑ جانا اور معجزات اور دلائل کے مقابلے میں اپنی ضد پر ڈٹ جانا تکبر اور خود بینی کا لازمہ ہے۔

۴۔ فَبَشِّرۡهُ بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ: ایسے شخص کو دردناک عذاب کی خوش خبری دے دو۔ یہ خبر اگرچہ اس کے لیے خوش نہیں ہے لیکن دنیا میں اس متکبرانہ مزاج کے لیے یہ خبر تمسخر اور استہزا کے طور پر خوشخبری قرار دی

جیسا کہ ذُقۡ ۚ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡكَرِيۡمُ ۔[1] میں ذکر ہوا کہ جسمانی عذاب کے ساتھ نفسیاتی عذاب میں بھی مبتلا کیا جائے گا۔

وَ اِذَا عَلِمَ مِنۡ اٰيٰتِنَا شَيۡـًٔا اتَّخَذَهَا هُزُوًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمۡ عَذَابٌ مُّهِيۡنٌ ؕ ۝۹

۹۔ اور جب اسے ہماری آیات میں سے کچھ کا پتہ چلتا ہے تو ان کی ہنسی اڑاتا ہے، ایسے لوگوں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِذَا عَلِمَ: جب اس منکر کے سامنے کوئی آیت آتی ہے تو اس میں غور و فکر کرنے کی جگہ اس پر اعتراض کا کوئی نہ کوئی موقع تلاش کر لیتا ہے۔ پھر اسے لے کر تمسخر شروع کرتا ہے۔

۲۔ اُولٰٓئِكَ لَهُمۡ عَذَابٌ مُّهِيۡنٌ: عذاب کے ساتھ مذلت اس لیے ہے کہ ان لوگوں نے انکار کے ساتھ تمسخر بھی کیا تھا۔

مِنۡ وَّرَآئِهِمۡ جَهَنَّمُ ۚ وَ لَا يُغۡنِيۡ عَنۡهُمۡ مَّا كَسَبُوۡا شَيۡـًٔا وَّ لَا مَا اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَوۡلِيَآءَ ۚ وَ لَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ؕ ۝۱۰

۱۰۔ ان کے پیچھے جہنم ہے اور جو کچھ ان کا کیا دھرا ہے وہ انہیں کچھ بھی فائدہ نہ دے گا اور نہ وہ جنہیں اللہ کے سوا انہوں نے کارساز بنایا تھا اور ان کے لیے تو بڑا عذاب ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ مِنۡ وَّرَآئِهِمۡ: ورء۔ اَمَام (سامنے) کے مقابلے میں سمجھا جائے تو وہی ترجمہ ہو گا جو متن میں اختیار کیا ہے یعنی پیچھے اور اگر اس لفظ کو موارات سے ماخوذ سمجھا جائے تو اس کے معنی ہوں گے آدمی کی نظر سے اوجھل ہو۔ خواہ آگے ہو یا پیچھے۔ اس صورت میں آیت کا ترجمہ یہ بنے گا: ان کی اوٹ میں جہنم ہے۔

۲۔ وَ لَا يُغۡنِيۡ: ان کے وہ اعمال جو غیر اللہ کی قربت کے لیے انجام دیے ہیں انہیں فائدہ نہیں دیں گے۔ نہ وہ لوگ فائدہ دیں گے جنہیں ان لوگوں نے ولی، اپنا آقا بنا رکھا ہے۔

۳۔ وَ لَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ: جس عذاب کا یہ لوگ سامنا کریں گے وہ اس لحاظ سے بھی عظیم ہو گا کہ اس سے بڑا عذاب نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ ختم نہ ہونے والا عذاب ہو گا۔

---

[1] ۴۴ دخان: ۴۹ (ترجمہ): چکھ (عذاب) بے شک تو (جہنم کی ضیافت میں) بڑی عزت والا، اکرام والا ہے۔

هٰذَا هُدًى ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ﴿١١﴾ ع

۱۱۔ یہ (قرآن) ہدایت ہے اور جو لوگ اپنے پروردگار کی آیات کا انکار کرتے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب کی سخت سزا ہو گی۔

تفسیر آیات

۱۔ هٰذَا هُدًى: یہ قرآن ہدایت ہے۔ انسان کو اپنی حقیقی منزل پر پہنچانے کے لیے راہنما ہے۔

۲۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا: جو لوگ اس قرآن میں بیان کردہ آیات کا انکار کرتے اور اس راہنمائی کو مسترد کرتے ہیں وہ اپنی منطقی انجام کو پہنچنے والے ہوں گے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ فِيْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿١٢﴾ ج

۱۲۔ اللہ وہی ہے جس نے تمہارے لیے سمندر کو مسخر کیا تاکہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں چلیں اور تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو اور شاید تم شکر کرو۔

تفسیر آیات

۱۔ اَللّٰهُ الَّذِيْ: اللہ کی ہی ہے جس نے تمہارے سامان زندگی کی فراہمی کے لیے سمندر کو مسخر کیا اور پانی کی سنگینی کی وجہ سے اس کی پشت جہازوں کو اٹھانے کی قابل بنائی۔

۲۔ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ فِيْهِ: پانی سنگین ہونے کی وجہ سے اپنی پشت پر کم سنگین چیزوں کو اٹھا لیتا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ پانی کو سیال بنانے میں جہاں دوسری بے شمار حکمتیں پوشیدہ ہیں ان میں سے ایک اس پر کشتیوں کا چلنا ہے۔ اگر پانی زمین کی طرح ٹھوس ہوتا تو اس پر کشتی نہیں چل سکتی تھی۔

۳۔ بِاَمْرِهٖ: سمندر میں کشتی کا چلنا اس امر و حکمت الٰہی کا نتیجہ ہے جو پانی اور کشتی کی طبیعت میں ودیعت فرمائی ہے۔

۴۔ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ: کشتی کی اس روانی سے مسافتوں کا طے کرنا آسان بنا دیا تاکہ اطراف زمین میں موجود اللہ کے فضل و کرم تک رسائی ہو سکے۔ آیت کے اس جملے میں حمل و نقل کے وسائل کو فضل خدا کے حصول کا ذریعہ بتایا ہے۔

۵۔ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ: اس وسیلہ حمل و نقل کی فراہمی پر اللہ کا شکر ادا کرنا بھی مقصود ہے۔ یہ

اس وقت ممکن ہے جب اسے اللہ کے وضع کردہ قانون طبیعت کا کرشمہ قبول کیا جائے۔

وَسَخَّرَ لَكُمۡ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا مِّنۡهُ ؕ اِنَّ فِيۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يَّتَفَكَّرُوۡنَ ﴿۱۳﴾

۱۳۔اور جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اس نے اپنی طرف سے تمہارے لیے مسخر کیا، غور کرنے والوں کے لیے یقیناً اس میں نشانیاں ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَسَخَّرَ لَكُمۡ: تسخیر آسمان و زمین کے موضوع پر تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورہ ابراھیم آیت ۳۲۔ سورہ لقمان آیت ۲۰۔

۲۔ جَمِيۡعًا مِّنۡهُ: ان سب کی تسخیر اللہ کی طرف سے ہے یا ان سب کی ابتدا اللہ کی طرف سے ہے۔ کسی غیر اللہ کی طرف سے نہیں تو پھر تمہاری زندگی کو کون چلا رہا ہے؟

۳۔ اِنَّ فِيۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يَّتَفَكَّرُوۡنَ: قرآن کا مخاطب عقل وفکر ہے اور عقل وفکر سے کہا جا رہا ہے: کس نے تمہاری زندگی کے لیے آسمانوں اور زمین کی موجودات کو مسخر کیا ہے؟ اگر بتوں نے یہ کام کیا ہے تو انہیں رَبّ بناؤ، اگر اللہ نے کیا ہے تو اللہ کو رَبّ تسلیم کرو۔ اس میں انسانی ضمیر اور وجدان کو جھنجھوڑا ہے۔

قُلۡ لِّلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا يَغۡفِرُوۡا لِلَّذِيۡنَ لَا يَرۡجُوۡنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجۡزِيَ قَوۡمًۢا بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ ﴿۱۴﴾

۱۴۔ایمان والوں سے کہدیجیے: جو لوگ ایام اللہ پر عقیدہ نہیں رکھتے ان سے درگزر کریں تاکہ اللہ خود اس قوم کو اس کے کیے کا بدلہ دے۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ لِّلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا: یہ سورہ مکی ہے اور مکہ میں مشرکین مسلمانوں سے تمسخر اور آئے دن مسلمانوں کی اہانت کرتے تھے۔ ساتھ رسول اللہ ﷺ کی بھی اہانت کرتے اور اللہ کی آیات کا مذاق اڑاتے تھے جس سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوتے تھے۔

اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کو حکم ہوا کہ مومنین سے کہدیں کہ وہ مشرکین کی ان اہانتوں سے درگزر کریں، ان کے ساتھ نہ الجھیں۔ ان کے تمسخرات کا جواب دینے کی کوشش نہ کریں بلکہ انہیں ان کے اپنے اعمال کے حوالہ کریں۔ پھر ان کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیں۔

۲۔ لَا یَرۡجُوۡنَ اَیَّامَ اللّٰہِ: اَیَّامَ اللّٰہِ سے مراد وہ دن ہیں جن میں کفار اپنے اعمال کی سزا کا سامنا کریں گے۔ اُن دنوں میں صرف اللہ کا فیصلہ نافذ ہو گا۔ اسی لیے ان دنوں کو اَیَّامَ اللّٰہِ کہا ہے چونکہ باقی دنوں میں مجرم اور سرکش کو بھی اپنی سرکشی کی مہلت دی جاتی ہے لیکن اَیَّامَ اللّٰہِ میں صرف اللہ کا حکم چلے گا۔ یعنی ان لوگوں سے درگزر کریں جو اپنی عاقبت بد اور قیامت پر ایمان نہیں رکھتے۔ یہ آیت، اس آیت کی طرح ہے جس میں فرمایا:

وَذَرۡنِیۡ وَالۡمُکَذِّبِیۡنَ اُولِی النَّعۡمَۃِ وَمَھِّلۡھُمۡ قَلِیۡلًا ﴿﴾ اِنَّ لَدَیۡنَاۤ اَنۡکَالًا وَّجَحِیۡمًا ﴿﴾ [1]

ان جھٹلانے والوں اور نعمتوں پر ناز کرنے والوں کو مجھ پر چھوڑ دیجیے اور انہیں تھوڑی مہلت دے دیجیے۔ یقیناً ہمارے پاس (ان کے لیے) بیڑیاں ہیں اور سلگتی آگ ہے۔

واضح رہے اس آیت کا تعلق جہاد و عدم جہاد سے نہیں ہے کہ آیہ جہاد کے ذریعہ اس آیت کو منسوخ سمجھا جائے بلکہ اس آیت کا تعلق کافروں کی طرف سے ہونے والی اہانتوں میں نہ الجھنے سے ہے۔

مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفۡسِہٖ ۚ وَمَنۡ اَسَآءَ فَعَلَیۡہَا ۫ ثُمَّ اِلٰی رَبِّکُمۡ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۱۵﴾

۱۵۔ جو نیکی کرتا ہے وہ اپنے لیے کرتا ہے اور جو برائی کا ارتکاب کرتا ہے اس کا وبال اسی پر ہے، پھر تم اپنے پروردگار کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

تفسیر آیات

نیک اعمال بجا لانے کی دعوت میں کوئی مفاد ہے تو وہ خود عمل کرنے والے کا ہے۔ اس دعوت کا مقصد انسان کی خیر خواہی ہے کہ وہ نیکی کرے اور برائی نہ کرے۔ اگر یہ لوگ اس خیر خواہی کے خلاف ہیں تو ان لوگوں کو اپنی بداعمالیوں میں رہنے دو۔ چونکہ اچھے اور برے عمل کا خود ان لوگوں نے ہمارے پاس آ کر سامنا کرنا ہے۔

وَلَقَدۡ اٰتَیۡنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ الۡکِتٰبَ وَالۡحُکۡمَ وَالنُّبُوَّۃَ وَرَزَقۡنٰہُمۡ مِّنَ

۱۶۔ اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب، حکمت اور نبوت دی اور ہم نے انہیں پاکیزہ چیزیں عطا

[1] ۷۳ مزمل: ۱۱۔۱۲

الطَّیِّبٰتِ وَ فَضَّلۡنٰہُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۶﴾	کیں اور ہم نے انہیں اہل عالم پر فضیلت دی۔
وَ اٰتَیۡنٰہُمۡ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الۡاَمۡرِ ۚ فَمَا اخۡتَلَفُوۡۤا اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَہُمُ الۡعِلۡمُ ۙ بَغۡیًۢا بَیۡنَہُمۡ ؕ اِنَّ رَبَّکَ یَقۡضِیۡ بَیۡنَہُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ فِیۡمَا کَانُوۡا فِیۡہِ یَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۱۷﴾	۱۷۔ اور ہم نے انہیں امر (دین) کے بارے میں واضح دلائل دیے تو انہوں نے اپنے پاس علم آ جانے کے بعد آپس کی ضد میں آ کر اختلاف کیا، آپ کا پروردگار قیامت کے دن ان کے درمیان ان باتوں کا فیصلہ فرمائے گا جن میں یہ لوگ اختلاف کرتے تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَقَدۡ اٰتَیۡنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ الۡکِتٰبَ: توحید و ربوبیت پر فکر و تعقل کی دعوت دینے اور وجدانوں کو جھنجوڑنے کے بعد رسالت کے موضوع کی طرف رخ کلام ہو گیا چونکہ مشرکین ان دونوں کے منکر تھے۔ فرمایا: رسالت کوئی نئی چیز نہیں ہے جو پہلے انسانوں نے نہ دیکھی ہو۔ ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب، حکم اور نبوت عنایت فرمائی۔

الۡکِتٰبَ سے مراد توریت، انجیل اور زبور ہیں۔ صرف توریت مراد لینا درست نہیں ہے چونکہ نبوت سے مراد صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت نہیں ہے کتاب سے مراد صرف توریت لیں۔

وَ الۡحُکۡمَ: فیصلہ صادر کرنے کی صلاحیت اور بینش دے دی۔ الۡحُکۡمَ کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو انعام آیت ۸۹۔

وَ النُّبُوَّۃَ: بنی اسرائیل میں کثیر تعداد میں انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے ہیں۔ ایک روایت کے مطابق ایک ہزار انبیاء علیہم السلام ان میں مبعوث ہوئے ہیں۔

وَ رَزَقۡنٰہُمۡ: پاکیزہ رزق، من و سلوی اور فلسطین جیسی زرخیزی کی شکل میں عنایت فرمایا۔

وَ فَضَّلۡنٰہُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ: اپنے زمانے کے تمام عالمین پر بنی اسرائیل کو فضیلت دی۔

وَ اٰتَیۡنٰہُمۡ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الۡاَمۡرِ: بَیِّنٰتٍ سے مراد معجزات ہیں جو بنی اسرائیل کے انبیاء علیہم السلام کی صداقت پر واضح دلائل ہیں۔

مِّنَ الۡاَمۡرِ سے مراد کہتے ہیں امر دین ہے۔ یعنی دین کی حقانیت پر واضح دلائل دیے۔

فَمَا اخۡتَلَفُوۡۤا اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ: حق کی پوری طرح وضاحت کے بعد ان میں اختلاف آنا تعلیمات دینی میں کسی ابہام کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ آپس میں ایک دوسرے کو زیر کرنے کی سعی کے نتیجے میں اختلاف آیا۔

ثُمَّ جَعَلۡنٰکَ عَلٰی شَرِیۡعَۃٍ مِّنَ الۡاَمۡرِ فَاتَّبِعۡہَا وَ لَا تَتَّبِعۡ اَہۡوَآءَ الَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۸﴾

۱۸۔ پھر ہم نے آپ کو امر (دین) کے ایک آئین پر قائم کیا، لہٰذا آپ اسی پر چلتے رہیں اور نادانوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلیں۔

تفسیر آیات

۱۔ ثُمَّ: بنی اسرائیل کو مذکورہ تمام عنایتوں سے نوازنے کے باوجود ان لوگوں نے ان عنایتوں کا حق ادا کرنے کی جگہ آپس میں ایک دوسرے کے خلاف سرکشی شروع کر دی تو وہ اس بار امانت اور ان عنایتوں کے اہل نہیں رہے۔ اس لیے ان کے بعد ہم آپ کی طرف متوجہ ہیں۔

۲۔ جَعَلۡنٰکَ عَلٰی شَرِیۡعَۃٍ: آپ کو ہم نے ایک آئین کی ذمہ داری دی۔ جعل قرار دینا، حکم دینا کے معنوں میں ہے۔ آیت کا یہ مفہوم بنتا ہے: ہم نے آپ کو ایک آئین کا حکم دیا۔ ایک جامع نظام حیات دیا ہے۔

۳۔ مِّنَ الۡاَمۡرِ: مفسرین نے کہا ہے الۡاَمۡرِ سے مراد یہاں بھی دین ہے۔ لہٰذا اس آیت میں شریعت کو دین کی تشریح قرار دیا ہے۔ یعنی شریعۃ من الدین۔ چنانچہ ہم نے سورہ روم آیت ۳۰ میں بیان کیا ہے کہ شریعت اور دین میں اجمال و تفصیل کا فرق ہے۔

۴۔ فَاتَّبِعۡہَا وَ لَا تَتَّبِعۡ اَہۡوَآءَ: پس آپ اس شریعت کی اتباع کریں اور اس شریعت کے نفاذ کے بارے میں علم نہ رکھنے والوں کی طرف سے آپ کو رکاوٹ درپیش ہوں گی چونکہ خواہشات کو صحیح سمت دینے کے لیے علم نہ ہو تو خواہشات کا درندہ بے قابو ہو جاتا ہے۔ مولائے متقیان علیہ السلام سے منقول ہے:

اَلنَّاسُ اَعۡدَاءُ مَا جَهِلُوا۔[۱]　　لوگ اس چیز کے دشمن ہوتے ہیں جسے وہ نہیں جانتے۔

روایت ہے امام محمد باقر علیہ السلام سے سوال ہوا: بندوں پر اللہ تعالیٰ کا کیا حق ہے؟ فرمایا:

اَنۡ یَقُولُوا مَا یَعۡلَمُونَ وَ یَقِفُوا عِنۡدَ مَا لَا یَعۡلَمُونَ۔[۲]　　جس چیز کا علم ہے اسے بیان کریں اور جس چیز کا علم نہیں وہاں رک جائیں۔

اِنَّہُمۡ لَنۡ یُّغۡنُوۡا عَنۡکَ مِنَ اللّٰہِ شَیۡئًا ؕ وَ اِنَّ الظّٰلِمِیۡنَ بَعۡضُہُمۡ اَوۡلِیَآءُ بَعۡضٍ ۚ وَ اللّٰہُ وَلِیُّ الۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۱۹﴾

۱۹۔ بلاشبہ یہ لوگ اللہ کے مقابلے میں آپ کے کچھ بھی کام نہیں آئیں گے اور ظالم تو یقیناً ایک دوسرے کے حامی ہوتے ہیں اور اللہ پرہیزگاروں کا حامی ہے۔

---

[۱] نہج البلاغۃ کلمات قصار: ۴۳۸　[۲] الکافی ۱: ۴۳

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّهُمۡ لَنۡ یُّغۡنُوۡا: یہ علم نہ رکھنے والے لوگ آپ کے کسی کام نہیں آئیں گے۔ اہم یہ ہے کہ یہ ناخواندہ لوگ آپ کو اللہ سے بے نیاز نہیں کریں گے۔ یعنی یہ لوگ آپ کے لیے اللہ کی جگہ نہیں لیں گے۔

خطاب اگرچہ رسول اللہ ﷺ سے ہے لیکن سمجھانا دوسروں کو مقصود ہے کہ خدائی مشن میں علم نہ رکھنے والے جاہل، خواہش پرست لوگ آڑے آئیں گے، اس صورت میں اللہ تعالیٰ اور ان جاہل، خواہش پرستوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ اگر کسی ناداں نے ان نادانوں کو انتخاب کیا اور وہ ان کے دباؤ میں آیا تو یہ لوگ اللہ سے بے نیاز کرنے پر بھی قادر نہیں ہیں اور خود اپنے پلے بھی کچھ نہیں رکھتے۔

۲۔ وَ اِنَّ الظّٰلِمِیۡنَ: یہ نادان لوگ اعتدال کا راستہ نہیں لے سکتے۔ یہ لوگ ظالم ہیں:

لَا تَرَى الْجَاهِلَ اِلَّا مُفْرِطاً اَوْ مُفَرِّطاً۔[1]	جاہل کو نہ پاؤ گے مگر یا حد سے آگے بڑھا ہوا یا اس سے بہت پیچھے۔

یہ ایک دوسرے کی حمایت بھی کریں، ناکام رہیں گے۔

۳۔ وَ اللّٰهُ وَلِیُّ الۡمُتَّقِیۡنَ: جبکہ اللہ تعالیٰ اہل تقویٰ کا حامی ہے۔ اہل تقویٰ جاہل نہیں ہو سکتے چونکہ مضرات کا علم نہ ہو تو ان سے پرہیز ممکن نہیں ہے۔

هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَ هُدًى وَّ رَحۡمَةٌ لِّقَوۡمٍ یُّوۡقِنُوۡنَ ﴿۲۰﴾	۲۰۔ یہ (قرآن) لوگوں کے لیے بصیرت افروز اور یقین رکھنے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ هٰذَا: یعنی هذا المذکور۔ جس میں شریعت، اس کے نفاذ اور اس کے سامنے آنے والی رکاوٹ کا ذکر ہے۔

۲۔ بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ: ان مذکورہ امور میں پوری انسانیت کے لیے بصیرتیں ہیں جن سے وہ اپنی دینی و دنیوی سعادتوں سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں۔ بصیرت، قلبی بینش کو کہتے ہیں۔ رسول اسلام ﷺ نے پوری انسانیت کے لیے ایک ایسی بینش پیش کی ہے جس نے دنیا میں ایک فکری انقلاب پیدا کیا۔

۳۔ وَ هُدًى وَّ رَحۡمَةٌ: اس بصیرت سے استفادہ کرنے کی صورت میں دو باتیں حاصل ہو جاتی ہیں: ہدایت اور رحمت۔ یہ دونوں صرف اصحاب یقین یا طالبانِ یقین حاصل کر لیتے ہیں۔ جن کے سامنے یہ ہدف نہ ہو وہ غافل ہوتے ہیں اور غافل کسی منزل تک نہیں پہنچ سکتے۔

[1] نہج البلاغۃ حکمت: ۷۰

اَمۡ حَسِبَ الَّذِیۡنَ اجۡتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنۡ نَّجۡعَلَہُمۡ کَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحۡیَاہُمۡ وَ مَمَاتُہُمۡ ؕ سَآءَ مَا یَحۡکُمُوۡنَ ﴿۲۱﴾ ع ۲/۱۸

۲۱۔ برائی کا ارتکاب کرنے والے کیا یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم انہیں اور ایمان لانے والوں اور نیک اعمال بجا لانے والوں کو ایک جیسا بنائیں گے کہ ان کا جینا اور مرنا یکساں ہو جائے؟ برا فیصلہ ہے جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اجۡتَرَحُوا: یعنی اکتسبوا۔ اسی سے اعضاء کو جوارح کہتے ہیں۔ ایسا ہو نہیں سکتا کہ برائی کا ارتکاب کرنے والوں اور ایمان و عمل صالح والوں کو اللہ تعالیٰ ایک جیسا بنائے: اَمۡ نَجۡعَلُ الۡمُتَّقِیۡنَ کَالۡفُجَّارِ ۔[۱] یہ بھی عدل الٰہی کے خلاف ہے کہ فاجر اور متقی ایک جیسے ہو جائیں۔

اگر ظالم و مظلوم، نیک اور بد، فاجر اور متقی کا ایک جیسا انجام ہو تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اس کائنات میں اقدار کی حکمرانی نہیں ہے اور جہاں اقدار کے لیے کوئی جگہ نہ ہو وہ کائنات عبث اور بے معنی کھیل ہو کر رہ جائے گی۔

فضیلت: حضرت ابن عباس کی ایک روایت کے مطابق اجۡتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ برائی کا ارتکاب کرنے والے مشرکین کے تین سرکردہ افراد عتبہ، شیبہ اور ولید بن عتبہ ہیں۔ اور کَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ علی (علیہ السلام) حمزہ اور عبیدہ کی شان میں ہے۔ ملاحظہ ہو: شواھد التنزیل ذیل آیت، کفایۃ الطالب تالیف گنجی شافعی باب ۱۲ صفحہ ۲۴۷۔ تفسیر فخر رازی ذیل آیت۔

ابن عباس کی دوسری روایت کے مطابق اجۡتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ بنی امیہ ہیں اور کَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ نبیؐ، علیؑ، حمزہ، جعفر، حسن و حسین اور فاطمہ (علیہم السلام) ہیں۔ ملاحظہ ہو شواھد التنزیل ذیل آیت۔

۲۔ سَوَآءً مَّحۡیَاہُمۡ وَ مَمَاتُہُمۡ: ان کا جینا مرنا برابر نہیں ہو سکتا۔ جب زندہ ہوتے ہیں تو مومن کو احترام اور ایمان کی وجہ سے سکون قلب حاصل ہے، جب کہ منکر کی زندگی بھی اجیرن ہوتی ہے:

وَ مَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِکۡرِیۡ فَاِنَّ لَہٗ مَعِیۡشَۃً ضَنۡکًا ...[۲]

اور جو میرے ذکر سے منہ موڑے گا اسے یقیناً ایک تنگ زندگی نصیب ہو گی۔

جب اس دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں تو مومن اللہ کی رحمتوں سے مالا مال ہو جائے گا جب کہ منکر ابدی عذاب اور رسوائی میں رہے گا۔

۳۔ سَآءَ مَا یَحۡکُمُوۡنَ: یہ کتنا نامعقول فیصلہ ہے جو یہ منکرین کرتے ہیں کہ اگر قیامت ہوئی تو وہاں

---

[۱] ۳۸ ص: ۲۸ [۲] ۲۰ طٰہٰ: ۱۲۴

بھی مومنوں سے ہم بہتر حالت میں ہوں گے۔ چنانچہ ایک منکر معاد کا کہنا ہے:

وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنۡ رُّدِدۡتُّ اِلٰی رَبِّیۡ لَاَجِدَنَّ خَیۡرًا مِّنۡهَا مُنۡقَلَبًا ○[1]

اور میں خیال نہیں کرتا کہ قیامت آنے والی ہے اور اگر مجھے میرے رب کے حضور پلٹا دیا گیا تو میں ضرور اس سے بھی اچھی جگہ پاؤں گا۔

وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ وَلِتُجۡزٰی كُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا كَسَبَتۡ وَهُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ ﴿۲۲﴾

۲۲۔ اور اللہ نے آسمانوں اور زمین کو برحق خلق کیا ہے تاکہ ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلہ دیا جائے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَخَلَقَ اللّٰهُ: اس کائنات کو اللہ نے برحق خلق فرمایا ہے کا مطلب یہی ہے کہ بدکار اور نیک کردار ایک جیسے نہ ہوں گے۔ ہر شخص کو اس کے کیے کا نتیجہ مل جائے۔ اچھے عمل کا اچھا نتیجہ اور برے عمل کا برا نتیجہ۔ جب یہ بات دنیا میں نہیں ہو رہی تو ایک دوسرا عالم ہونا ضروری ہے جہاں انسان کے اعمال کے نتائج سامنے آئیں۔

۲۔ وَهُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ: ان پر ظلم نہ ہو گا یعنی اگر اچھے اور برے عمل کا ایک ہی نتیجہ ہوا تو یہ ظلم ہو گا۔ ایسا ہرگز نہ ہو گا۔

اَفَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلۡمٍ وَّخَتَمَ عَلٰی سَمۡعِهٖ وَقَلۡبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنۡ یَّهۡدِیۡهِ مِنۡۢ بَعۡدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوۡنَ ﴿۲۳﴾

۲۳۔ کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود بنا رکھا ہے اور اللہ نے (اپنے) علم کی بنیاد پر اسے گمراہ کر دیا ہے اور اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی ہے اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہے؟ پس اللہ کے بعد اسے کون ہدایت دے گا؟ کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے؟

تفسیر آیات

۱۔ اَفَرَءَیۡتَ: کیا آپ نے اس تعجب آمیز شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہشات کو اپنے اللہ کی

---

[1] ۱۸ کہف: ۳۶

جگہ رکھا ہوا ہے۔ جہاں اپنے رب کی اطاعت کرنے چاہیے وہاں اپنی خواہشات کی اطاعت کرتا ہے۔ خواہشات کے مطالبات اور اللہ کی ہدایات میں اگر تصادم ہو جائے تو یہ شخص خواہشات کے مطالبات پورے کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت پس پشت ڈال دیتا ہے۔

لہٰذا معبود وہ ہے جس کی اطاعت کی جائے۔ چنانچہ شیطان کی اطاعت اس کی عبادت شمار کی گئی ہے:

اَلَمۡ اَعۡہَدۡ اِلَیۡکُمۡ یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ اَنۡ لَّا تَعۡبُدُوا الشَّیۡطٰنَ ۚ اِنَّہٗ لَکُمۡ عَدُوٌّ مُّبِیۡنٌ ۙ[1]

اے اولاد آدم! کیا ہم نے تم سے عہد نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کی پرستش نہیں کرنا؟ بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

۲۔ وَاَضَلَّہُ اللّٰہُ عَلٰی عِلۡمٍ: اس خواہش پرست سے اللہ نے ہاتھ اٹھا لیا اور اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ اس صورت میں گمراہی میں جانے کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ ایسا اللہ نے اس پر حجت پوری کرنے اور آیندہ کے لیے اس کے ایمان نہ لانے پر اپنے علم کی بنیاد پر کیا ہے۔

چنانچہ قوم نوح کے بارے میں فرمایا:

وَ اُوۡحِیَ اِلٰی نُوۡحٍ اَنَّہٗ لَنۡ یُّؤۡمِنَ مِنۡ قَوۡمِکَ اِلَّا مَنۡ قَدۡ اٰمَنَ ...[2]

اور نوح کی طرف یہ وحی کی گئی کہ جو لوگ ایمان لا چکے ہیں ان کے علاوہ آپ کی قوم میں سے ہرگز کوئی اور ایمان نہیں لائے گا۔

تو اللہ نے اس علم کی بنیاد پر قوم نوح کو غرق کر دیا۔

۳۔ وَّخَتَمَ عَلٰی سَمۡعِہٖ وَقَلۡبِہٖ: جب مصدر ہدایت، اللہ اس ہواپرست سے ہاتھ اٹھا لیتا ہے تو پھر حق آواز سننے کی صلاحیت سلب ہو جاتی ہے اور عقل سے بھی کام نہیں لے سکتا کیونکہ دل پر بھی مہر لگ جاتی ہے اور بینائی پر بھی پردہ پڑ جاتا ہے۔ یعنی ہدایت کے سارے راستہ بند ہو جاتے ہیں۔

۴۔ فَمَنۡ یَّہۡدِیۡہِ مِنۡۢ بَعۡدِ اللّٰہِ: جب ہدایت کے واحد سرچشمہ اللہ نے اس سے ہاتھ اٹھا لیا تو اللہ کے بعد کون ہے جو اسے ہدایت دے؟ آیت کے اس جملے سے یہ بات واضح ہو گئی کہ خَتَمَ (مہر لگائی) سے مراد ہدایت نہ دینا ہے۔

وَ قَالُوۡا مَا ہِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنۡیَا نَمُوۡتُ وَ نَحۡیَا وَ مَا یُہۡلِکُنَاۤ اِلَّا الدَّہۡرُ ۚ وَ مَا لَہُمۡ بِذٰلِکَ مِنۡ

۲۴۔ اور وہ کہتے ہیں: زندگی تو بس یہی دنیاوی زندگی ہے (جس میں) ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہمیں صرف زمانہ ہی مارتا ہے اور انہیں

---

[1] ۳۶ یٰس: ۶۰　[2] ۱۱ ھود: ۳۶

عِلۡمٍ ۚ اِنۡ هُمۡ اِلَّا یَظُنُّوۡنَ ﴿۲۴﴾ اس کا کچھ علم نہیں ہے، وہ صرف ظن سے کام لیتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ بظاہر یہ منکرین معاد کا قول ہے، منکرین خدا کا نہیں۔ منکرین معاد زندگی کو اسی دنیوی زندگی میں منحصر سمجھتے تھے۔

۲۔ نَمُوۡتُ وَ نَحۡیَا: پرانی نسلیں مر جاتی ہیں اور نئی نسل پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح کی موت و حیات پر مشتمل دنیا چل رہی ہے۔ لہٰذا موت و حیات کا یہی سلسلہ ہے جو ہم اس دنیا میں دیکھ رہے ہیں کہ کچھ لوگ مر جاتے ہیں اور کچھ زندہ ہو کر دنیا میں آتے ہیں۔

۳۔ وَ مَا یُہۡلِکُنَاۤ اِلَّا الدَّہۡرُ: ہمیں گردش ایام نابود کرتی ہے۔ یہ زمانہ ہے جس کے ہاتھوں ہر جدید پرانی ہو جاتی ہے۔ ہر طراوت و تازگی میں تعفن آتا ہے۔ پھر ہر زندہ اسی زمانے کی زد میں آ کر موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔ کوئی دوسری زندگی نہیں ہے۔

۴۔ وَ مَا لَہُمۡ بِذٰلِکَ مِنۡ عِلۡمٍ: ان کے پاس اس نظریے کو اپنانے کے لیے کوئی دلیل نہیں ہوتی جب کہ دلیل کے بغیر نہ کوئی نظریہ اپنایا جا سکتا ہے، نہ اسے رد کیا جا سکتا ہے اور دلیل صرف علم ہے۔ علم کے سوا ظن و گمان کسی موقف کے لیے دلیل نہیں بن سکتا۔

ان مشرکین کے پاس کوئی علم یقیناً نہیں ہے کیونکہ یہ کہنا کہ اس زندگی کے سوا کوئی زندگی نہیں ہے، پوری کائنات کے بارے میں مکمل علم پر موقوف ہے کہ وہ یہ کہیں: ہم نے پوری کائنات کو ابتدا سے انتہا تک چھان مارا لیکن کہیں بھی دوسری زندگی کی علامت نظر نہیں آئی۔ لہٰذا دوسری زندگی نہیں ہے۔ اس قسم کے علم کا دعویٰ وہ نہیں کر سکتے لہٰذا یہ موقف اختیار نہیں کر سکتے کہ دوسری زندگی نہیں ہے۔

اکثر بت پرستوں کا عقیدہ اگرچہ تناسخ پر مبنی ہے تاہم تناسخ میں بھی یہ بات ہو سکتی ہے: ہمارے اس وجود کو گردش ایام ختم کر دیتی ہے۔

وَ اِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ مَّا کَانَ حُجَّتَہُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوا ائۡتُوۡا بِاٰبَآئِنَاۤ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۲۵﴾

۲۵۔ اور جب ان کے سامنے ہماری آیات پوری وضاحت کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں تو ان کی حجت صرف یہی ہوتی ہے کہ وہ کہتے ہیں: اگر تم سچے ہو تو ہمارے باپ دادا کو (زندہ کر کے) لے آؤ۔

تفسیر آیات

۱۔ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ: جب منکرینِ معاد کو دوسری زندگی پر دلالت کرنے والی واضح دلیلیں اور حیات بعد الموت کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں اور اس دنیا میں بھی وہ طبیعاتی عالم میں اموات کو زندہ ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں اور ان کو دکھایا جاتا ہے تو ان پر توجہ دینے کی جگہ وہ یہ مطالبہ پیش کرتے ہیں: اگر اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی ہے تو ہمارے باپ دادا کو زندہ کر لاؤ۔

حالانکہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت میں معاد کا تصور یہ نہیں تھا کہ اسی دنیا میں، جو دار عمل اور دار تکلیف ہے، دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ انبیاء علیہم السلام کی دعوت میں تصور معاد یہ ہے کہ اس عالم کا خاتمہ ہو جائے گا، یہ نظام درہم برہم ہو جائے گا، عالم آخرت کے عنوان سے ایک جدید نظام وجود میں آئے گا۔ اس جدید نظام کے تحت لوگوں کو زندہ کیا جائے گا۔ ذیل کی آیت میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ ع

۲۶۔ کہہ دیجیے: اللہ ہی تمہیں زندہ کرتا ہے پھر تمہیں مار ڈالتا ہے پھر تمہیں قیامت کے دن جس میں کوئی شبہ نہیں جمع کرے گا لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ: ان کے جواب میں کہہ دیجیے: جس نے تمہیں زندگی بخشی اور جس کے قبضۂ قدرت میں تمہاری موت ہے، وہی تمہاری پچھلی اور اگلی نسلوں کو ایک جگہ جمع کرے گا۔

۲۔ لَا رَيْبَ فِيْهِ: قیامت کے دن کے آنے میں کسی قسم کے شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر کسی کو شبہ لاحق ہے تو اس کی کوتاہ فکری ہے۔ جو ذات عدم سے زندگی دینے پر قادر ہے وہ اعادۂ زندگی پر کیوں قادر نہیں ہے؟

۳۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ: لیکن ان لوگوں نے علم کے دروازے اپنے اوپر بند کیے ہیں بلکہ علم کے ذرائع سے دشمنی کی ہے۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ

۲۷۔ اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اللہ کے لیے ہے اور جس دن قیامت برپا ہو گی اس روز

يَّخۡسَرُ الۡمُبۡطِلُوۡنَ ﴿۲۷﴾ اہل باطل خسارے میں پڑ جائیں گے۔

تفسیر آیات

ا۔ جس کے قبضۂ قدرت میں کل کائنات ہے وہ اس کائنات کو عدم سے وجود میں لاسکتا ہے تو اس کے لیے اعادہ بھی ممکن ہے بلکہ اعادہ، انسانی ذہن کے مطابق زیادہ آسان ہے۔

۲۔ وَيَوۡمَ تَقُوۡمُ السَّاعَةُ: اگر بفرض محال قیامت کی کوئی حقیقت نہیں ہے تو اس کے قائل لوگوں کو کوئی ندامت نہ ہوگی۔ اگر مرنے کا مطلب نیست و نابود ہو جانا ہے تو ندامت کسے ہوگی؟ ایک نابود کو کوئی خسارہ بھی نہ ہوگا لیکن اگر قیامت کا دن ثابت ہوا تو اس دن منکرین قیامت، باطل پرست لوگ خسارے میں ہوں گے۔

وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۫ كُلُّ اُمَّةٍ تُدۡعٰۤى اِلٰى كِتٰبِهَا ؕ اَلۡيَوۡمَ تُجۡزَوۡنَ مَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲۸﴾

۲۸۔ اور آپ ہر امت کو گھٹنوں کے بل گرا ہوا دیکھیں گے اور ہر ایک امت اپنے نامہ اعمال کی طرف بلائی جائے گی، آج تمہیں ان اعمال کا بدلہ دیا جائے گا جو تم کرتے رہے ہو۔

تشریح کلمات

جَاثِيَةً: (ج ث و) جثواً گھٹنوں کے بل بیٹھنا۔

تفسیر آیات

۱۹۹

ا۔ وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً: آپ دیکھیں گے ہر امت قیامت کے دن اپنے حساب کے لیے گھٹنوں کے بل انتظار میں ہوگی جس طرح ہر شخص انفرادی طور پر حساب یا عدل خواہی کے لیے اللہ کی بارگاہ میں دو زانو ہوگا اسی طرح ہر امت بھی۔

صحیح بخاری کتاب المغازی میں حضرت علی علیہ السلام کا یہ فرمان مذکور ہے:

انا اول من یحثو بین یدی الرحمن للخصومة یوم القیامة۔ قیامت کے دن میں پہلا شخص ہوں گا جو اللہ کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کرنے کے لیے دو زانو ہوگا۔

۲۔ كُلُّ اُمَّةٍ تُدۡعٰۤى اِلٰى كِتٰبِهَا: ہر امت اپنے نامۂ عمل کی طرف بلائی جائے گی۔

اس سے معلوم ہوا انسان کے دو نامہ اعمال ہوں گے ایک انفرادی نامۂ عمل اور ایک اجتماعی نامہ عمل۔ یعنی ان اعمال کا جدا حساب ہوگا جن کے ارتکاب میں ساری قوم ملوث ہوگی۔ جرم تو ایک یزید سے

سرزد ہوتا ہے لیکن ایک قوم ایسی ہے جو اس عمل پر خوش ہے۔ خودکش حملوں سے خون مسلم کی ارزانی چند لوگ کرتے ہیں[۱] لیکن جو لوگ فتویٰ دیتے اور ان کی پشت پر ہوتے ہیں وہ سب اس جرم میں شامل ہیں۔ یہ جرم اس امت اور اس قوم کے نامہ اعمال میں شامل ہوگا۔ جیسا کہ ہم حضرت سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کی زیارت میں پڑھتے ہیں:

لَعَنَ اللّٰهُ اُمَّةً سَمِعَتْ بِذٰلِكَ فَرَضِيَتْ بِهِ...۔[۲]　اس قوم پر بھی اللہ کی لعنت ہو جس نے آپ کے قتل کی خبر سنی اور خوش ہوئی۔

جیسا کہ فرمایا:

وَاتَّقُوۡا فِتۡنَۃً لَّا تُصِیۡبَنَّ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡکُمۡ خَآصَّۃً ۚ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ ○ [۳]　اور اس فتنے سے بچو جس کی لپیٹ میں تم میں سے صرف ظلم کرنے والے ہی نہیں (سب) آئیں گے اور یہ جان لو کہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔

جیسے امر بمعروف اور نہی از منکر ترک کرنے کی صورت میں برے نتائج کی زد میں سب لوگ آ جاتے ہیں۔ جیسا کہ روایت ہے:

لَتَامُرُنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَ لَتَنْهَنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ اَوْ لَيَسْتَعْمِلَنَّ عَلَيْكُمْ شِرَارُكُمْ فَيَدْعُو خِيَارُكُمْ فَلَا يُسْتَجَابُ لَهُمْ۔ [۴]　تم امر بمعروف اور نہی از منکر کرو، ورنہ برے لوگ تمہارے حاکم بنیں گے۔ پھر تمہارے اچھے لوگ دعا کریں گے مگر قبول نہ ہوگی۔

اس بات کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ ہر امت کی ایک جدا سرنوشت ہے:

مَا تَسۡبِقُ مِنۡ اُمَّۃٍ اَجَلَہَا وَ مَا یَسۡتَاۡخِرُوۡنَ ○ [۵]　کوئی امت اپنے مقررہ وقت سے آگے جا سکتی ہے نہ وہ پیچھے رہ سکتی ہے۔

جس طرح ہر امت کا جدا نامہ اعمال ہوگا اسی طرح ہر امت کے لیے جدا ایک گواہ بھی ہوگا۔

وَ یَوۡمَ نَبۡعَثُ فِیۡ کُلِّ اُمَّۃٍ شَہِیۡدًا عَلَیۡہِمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِہِمۡ ...۔[۶]　اور جس روز ہم ہر امت میں سے ایک ایک گواہ خود انہیں میں سے اٹھائیں گے۔

۳۔ اَلۡیَوۡمَ تُجۡزَوۡنَ: ہر قوم اس کے نامہ اعمال کی طرف اس لیے بلائی جائے گی کہ اس کے مطابق سزا جزا دی جائے۔ آیت کے اس جملے سے واضح ہوتا ہے کِتٰبِہَا میں کتاب سے مراد نامۂ اعمال ہے۔ چنانچہ اگلی آیت میں صراحت ہے کہ مراد نامۂ اعمال ہے۔

---

[۱] گزشتہ چند سالوں سے آج ۲۰۱۰ تک خودکش حملوں کا سلسلہ جاری ہے جن میں مسجدوں کے نمازی ہوں یا عزاداری میں شریک لوگ یا کاروباری لوگ ہوں، سب بے گناہوں کا قتل عام جاری ہے جن میں بے گناہ بچے اور عورتیں شامل ہیں۔ یہ سب کچھ اسلام کے نام پر ہو رہا ہے۔

[۲] تہذیب الاحکام ۶: ۱۱۳　[۳] ۸ انفال: ۲۵　[۴] الکافی ۵: ۵۶　[۵] ۲۳ مومنون: ۴۳　[۶] ۱۶ النحل: ۸۹

هٰذَا كِتٰبُنَا يَنۡطِقُ عَلَيۡكُمۡ بِالۡحَقِّ ؕ اِنَّا كُنَّا نَسۡتَنۡسِخُ مَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲۹﴾

۲۹۔ ہماری یہ کتاب تمہارے بارے میں سچ سچ بیان کر دے گی جو تم کرتے تھے، ہم اسے لکھواتے رہتے تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ هٰذَا كِتٰبُنَا: جب ہر امت کو اس کے نامہ عمال کی طرف بلایا جائے گا تو اس امت سے خطاب ہوگا: هٰذَا كِتٰبُنَا۔ یہ ہے ہماری کتاب۔ چونکہ اس کتاب کی تدوین کرنے والا اللہ ہے اس لیے اس کتاب کی نسبت اپنی طرف دی اور چونکہ اس کتاب کے مندرجات اس امت کے اعمال ہیں اس لیے كِتٰبُنَا کہہ کر اس امت کی طرف نسبت دی۔

۲۔ يَنۡطِقُ عَلَيۡكُمۡ بِالۡحَقِّ: یہ نامہ اعمال حق اور واقع کو آشکار کرے گا۔ نطق کلام کرنے کو کہتے ہیں اور کلام کسی مطلب کو ظاہر کرنے کو کہتے ہیں۔ خواہ لفظوں میں یا دوسرے ذرائع سے۔ دیگر قرآن کے ظواہر سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ قیامت کے دن خود اعمال سامنے کیے جائیں گے۔

يَوۡمَ تَجِدُ كُلُّ نَفۡسٍ مَّا عَمِلَتۡ مِنۡ خَيۡرٍ مُّحۡضَرًا ۚۖ وَّ مَا عَمِلَتۡ مِنۡ سُوۡٓءٍ ...[1]

اس دن ہر شخص اپنا نیک عمل حاضر پائے گا، اسی طرح ہر برا عمل بھی۔

۳۔ اِنَّا كُنَّا نَسۡتَنۡسِخُ مَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ: ہم تمہارے اعمال کی نسخہ برداری کرتے تھے۔ نسخہ، اصل کے مطابق دوسرا نسخہ بنانے کو کہتے ہیں۔ چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی مروی ایک روایت میں اس آیت کی تشریح ہے:

فهو الكتاب المكنون الذی منه النسخ كلها۔ او لستم عربا فكيف لا تعرفون معنى الكلام و احدكم يقول لصاحبه: انسخ ذلك الكتاب او ليس انما ينسخ من كتاب آخذ من الاصل۔۔۔۔[2]

یہ نامہ اعمال اس کتاب مکنون سے ہے جس سے تمام نسخے بنتے ہیں۔ کیا تم عرب نہیں ہو اس کلام کے معنی کیسے نہیں جانتے ہو جب کہ تم میں سے کوئی دوسرے سے کہتا ہے: اس کتاب کا ایک نسخہ بناؤ۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ دوسری کتاب سے جو اصل ہے نسخہ برداری ہوتی ہے۔

ممکن ہے روایت اور آیت کا مطلب یہ ہو کہ اعمال جب وجود میں آتے ہیں تو اس کو بعینہ محفوظ کیا جاتا ہے اور عمل جو انسان سے صادر ہوتا ہے اصل کی حیثیت رکھتا ہے اور اسے کتاب مبین سے تعبیر کیا ہو اور جو محفوظ کیا جاتا ہے اسے نسخہ کہا گیا ہو۔ چنانچہ آیت کی تعبیر میں بھی عمل اور نسخہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

---

[1] ۳ آل عمران: ۳۰ [2] تفسیر قمی ۲: ۲۷۹

اہم نکات

۱۔ اعمال انرجی ہیں جنہیں دوام حاصل ہے۔ وجود میں آنے کے بعد معدوم نہ ہوں گے۔ اچھا عمل ساتھ نہیں چھوڑے گا، برا عمل جان نہیں چھوڑے گا مگر یہ کہ حبط اور مغفرت ہو جائے۔

فَاَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُدۡخِلُہُمۡ رَبُّہُمۡ فِیۡ رَحۡمَتِہٖ ؕ ذٰلِکَ ہُوَ الۡفَوۡزُ الۡمُبِیۡنُ ﴿۳۰﴾

۳۰۔ پھر جو لوگ ایمان لائے اور اعمال صالح بجا لائے انہیں ان کا رب اپنی رحمت میں داخل کرے گا، یہی تو نمایاں کامیابی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ نامہ اعمال پیش ہونے کے بعد عمل صالح والوں کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت میں داخل فرمائے گا۔ جنت اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے مظاہر میں سے ایک مظہر ہے۔ اللہ کی رحمت جنت سے بھی زیادہ وسیع ہے:

یامن وسعت رحمته کل شیء...[۱]　　اے وہ ذات جس کی رحمت ہر چیز پر محیط ہے۔

۲۔ ذٰلِکَ ہُوَ الۡفَوۡزُ الۡمُبِیۡنُ: جسے اللہ کی رحمت کے حصول میں کامیابی حاصل ہوئی ہو اس سے بڑھ کر کوئی کامیابی نہیں۔ حدیث ہے:

الفقر و الغنی بعد العرض علی اللہ...[۲]　　فقیری اور امیری کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے کے بعد ہو گا۔

وَ اَمَّا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا ۟ اَفَلَمۡ تَکُنۡ اٰیٰتِیۡ تُتۡلٰی عَلَیۡکُمۡ فَاسۡتَکۡبَرۡتُمۡ وَ کُنۡتُمۡ قَوۡمًا مُّجۡرِمِیۡنَ ﴿۳۱﴾

۳۱۔ اور جنہوں نے کفر کیا (ان سے کہا جائے گا) کیا میری آیات تمہیں سنائی نہیں جاتی تھیں؟ پھر تم نے تکبر کیا اور تم مجرم قوم تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اَمَّا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا: کافروں کے سامنے جب ان کا نامہ اعمال پیش کیا جائے گا تو ان سے سوال ہو گا تم نے کفر ایسے حالات میں اختیار کیا کہ تم پر ہماری آیات ہماری دلیل پیش کی گئی تھی۔

۲۔ فَاسۡتَکۡبَرۡتُمۡ: تم نے تکبر سے کام لیا۔ تم نے ہماری آیات کو قابل اعتنا نہ سمجھا۔ تم نے ہماری آیات پڑھ کر سنانے والے کو اپنے سے کمتر سمجھا۔

---

[۱] بحار ۳: ۸۸　　[۲] بحار الانوار ۶۹: ۵

۳۔ وَكُنۡتُمۡ قَوۡمًا مُّجۡرِمِيۡنَ: صرف تکبر پر اکتفا نہیں کیا بلکہ تم سے ایسے جرائم سرزد ہوئے جو ناقابل عفو ہیں۔ آج تمہیں ان جرائم کے نتائج کا سامنا کرنا ہوگا۔

وَ اِذَا قِيۡلَ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَيۡبَ فِيۡهَا قُلۡتُمۡ مَّا نَدۡرِىۡ مَا السَّاعَةُ ۙ اِنۡ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحۡنُ بِمُسۡتَيۡقِنِيۡنَ ﴿۳۲﴾

۳۲۔ اور جب (تم سے) کہا جاتا تھا کہ یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت میں کوئی شک نہیں ہے تو تم کہتے تھے: ہم نہیں جانتے قیامت کیا ہے، ہمیں گمان سا ہوتا ہے اور ہم یقین کرنے والے نہیں ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِذَا قِيۡلَ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ: جب ان مشرکین کو وعدۂ الٰہی کی حقانیت اور قیامت کی آمد کی خبر دی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ قیامت ایک ایسی حقیقت ہے جو قابل شک تردید نہیں ہے چونکہ قیامت نہ ہونے کی صورت میں یہ جہاں بے معنی اور عبث کھیل بن جاتا ہے تو مشرکین اس حقیقت کو قبول کرنے کی جگہ انتہائی بے اعتنائی کے ساتھ کہتے ہیں:

۲۔ مَّا نَدۡرِىۡ مَا السَّاعَةُ: ہم نہیں جانتے قیامت کیا چیز ہے؟ وہ سمجھتے تو تھے قیامت کسے کہتے ہیں مگر وہ از روئے بے اعتنائی کہتے ہیں اور اسے ناقابل قبول سمجھتے تھے۔

۳۔ اِنۡ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا: ظَنًّا وہ مصدر ہے جو نوعیت بیان کرنے کے لیے بھی آتا ہے۔ یہاں ظن کی نوعیت بتانے کے لیے ہے کہ قیامت کے بارے میں ہلکا سا ایک گمان ہم رکھتے ہیں جو بہت ناچیز ہے۔ ظنا ضعیفا اور قابل اعتنا نہیں ہے۔

۴۔ وَّمَا نَحۡنُ بِمُسۡتَيۡقِنِيۡنَ: قیامت کے وقوع کے بارے میں ہمیں یقین نہیں آتا۔ بعض کے مطابق قیامت کے امکان کے بارے میں یقین نہیں آتا۔

وَبَدَا لَهُمۡ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوۡا وَحَاقَ بِهِمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ﴿۳۳﴾

۳۳۔ اور ان پر اپنے اعمال کی برائیاں ظاہر ہو گئیں اور جس چیز کی وہ ہنسی اڑاتے تھے اس نے انہیں گھیر لیا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَبَدَا لَهُمۡ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوۡا: جب قیامت برپا ہوگی تو ان کا کردار خود ان کے سامنے آئے گا

اور انہیں اپنی قسمت کا فیصلہ معلوم ہو جائے گا۔ یہ آیت بھی ان آیات میں سے ہے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اعمال مٹ نہیں جاتے اور قیامت کے دن خود عمل حاضر کیا جائے گا۔

۲۔ وَحَاقَ بِهِمۡ: جس عذاب کا وہ دنیا میں مذاق اڑاتے اور کہتے تھے کہ جس عذاب کی ہمیں دھمکی دی جاتی ہے وہ آتا کیوں نہیں؟ مجرم جب جرم کا ارتکاب کر رہا ہوتا ہے تو اسے اپنے جرم کا اندازہ نہیں ہوتا لیکن جب مکافات عمل کا وقت آتا ہے تو اس وقت برائی کھل کر سامنے آتی ہے کہ وہ کس درجے کا جرم تھا۔

وَ قِيۡلَ الۡيَوۡمَ نَنۡسٰٮكُمۡ كَمَا نَسِيۡتُمۡ لِقَآءَ يَوۡمِكُمۡ هٰذَا وَ مَاۡوٰٮكُمُ النَّارُ وَمَا لَـكُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِيۡنَ ﴿۳۴﴾

۳۴۔ اور کہا جائے گا: آج ہم تمہیں اسی طرح بھلا دیتے ہیں جس طرح تم نے اپنے اس دن کے آنے کو بھلا دیا تھا اور تمہارا ٹھکانا جہنم ہے اور کوئی تمہارا مددگار نہیں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ قِيۡلَ الۡيَوۡمَ نَنۡسٰٮكُمۡ: حقیقی نسیان جو یادداشت کے فقدان سے عبارت ہے اللہ تعالیٰ کے لیے متصور نہیں ہے۔ لہٰذا یہاں نسیان سے مراد بے اعتنائی ہے جو نسیان کا لازمہ ہے۔ چنانچہ جب کسی چیز کو بھول جاتا ہے تو اس کی طرف سرے سے توجہ نہیں رہتی اور مکمل بے اعتنائی ہو جاتی ہے۔ آیت کے اس جملے کا یہ مفہوم بنتا ہے:

> جس طرح تم نے دنیا میں قیامت اور روز جزا کو قابل اعتنا نہیں سمجھا آج اللہ تعالیٰ تمہیں قابل اعتنا نہیں سمجھے گا۔

دنیا میں تو اللہ تعالیٰ نے منکر معاد کو بھی اپنی رحمتوں سے محروم نہیں رکھا چونکہ دنیا دار تکلیف و امتحان ہے لیکن آخرت میں یہ لوگ اللہ کی رحمتوں سے محروم ہوں گے چونکہ قیامت دار جزا ہے۔

۲۔ مَاۡوٰٮكُمُ النَّارُ: جب منکر لوگ اللہ کی بے اعتنائی کا شکار ہو کر ہر قسم کی رحمت سے محروم ہوں گے تو سوائے آتش کے اور کوئی ٹھکانا قابل تصور نہ ہو گا چونکہ آتش میں نہ ہونے کے لیے رحمت الٰہی درکار ہے۔

۳۔ وَمَا لَـكُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِيۡنَ: خود قابل اعتنا نہیں ہیں تو کوئی اور ان کی سفارش اور شفاعت بھی نہیں کر سکے گا چونکہ شفاعت، ایک توجہ اور رحمت ہے جس سے یہ لوگ محروم ہوں گے۔

ذٰلِكُمۡ بِاَنَّكُمُ اتَّخَذۡتُمۡ اٰيٰتِ اللّٰهِ

۳۵۔ یہ (سزا) اس لیے ہے کہ تم نے اللہ کی آیات

هُزُوًا وَّ غَرَّتۡكُمُ الۡحَیٰوةُ الدُّنۡیَا ۚ فَالۡیَوۡمَ لَا یُخۡرَجُوۡنَ مِنۡهَا وَ لَا هُمۡ یُسۡتَعۡتَبُوۡنَ ﴿۳۵﴾

کو مذاق بنایا تھا اور دنیاوی زندگی نے تمہیں دھوکے میں ڈال رکھا تھا، پس آج کے دن نہ تو یہ اس (جہنم) سے نکالے جائیں گے اور نہ ان کی معذرت قبول کی جائے گی۔

تفسیر آیات

۱۔ ذٰلِكُمۡ بِاَنَّكُمُ اتَّخَذۡتُمۡ اٰیٰتِ اللّٰهِ: جہنم ان کا ٹھکانا بننے کی وجہ ان کے جرم کی نوعیت ہے۔ جرم یہ تھا کہ وہ آیات الٰہی کے نہ صرف منکر تھے بلکہ ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ مذاق اڑانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ آیات الٰہی کو ناقابل اعتنا سمجھ کر ان کی تحقیر کرتے تھے۔

۲۔ وَّ غَرَّتۡكُمُ الۡحَیٰوةُ الدُّنۡیَا: آیات الٰہی کی تحقیر اور ان کا مذاق اڑانے کی وجہ یہ تھی کہ دنیا کی رعنائیوں نے انہیں اس دھوکے میں ڈال دیا تھا کہ جو کچھ ہے، یہی دنیوی زندگی ہے۔

۳۔ فَالۡیَوۡمَ لَا یُخۡرَجُوۡنَ مِنۡهَا: آج یعنی قیامت کے دن وہ جہنم سے نہیں نکل سکیں گے اور الی الابد جہنم میں رہیں گے۔ ہم نے اس سے پہلے کئی بار اس کا جواب دیا ہے کہ مشرک جہنم میں ہمیشہ کیوں رہیں گے۔

۴۔ وَ لَا هُمۡ یُسۡتَعۡتَبُوۡنَ: ان کا کوئی عذر بھی قبول نہیں کیا جائے گا چونکہ فی الواقع ان کے پاس کوئی ایسا عذر ہوگا نہیں جس کے تحت وہ شرک کرنے اور آیات الٰہی کا مذاق اڑانے پر مجبور ہو گئے ہوں یا ان پر حجت پوری نہ ہوئی ہو۔

فَلِلّٰهِ الۡحَمۡدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ رَبِّ الۡاَرۡضِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۳۶﴾

۳۶۔ پس ثنائے کامل اس اللہ کے لیے ہے جو آسمانوں کا رب اور زمین کا رب ہے، عالمین کا رب ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَلِلّٰهِ الۡحَمۡدُ: پس تمام تعریفیں اور ثنائے کامل اللہ تعالیٰ کے لیے مختص ہے۔ اس سورہ مبارکہ میں مذکور تمام حقائق کا نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ تمام تعریفیں اور ثنائے کامل صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں چونکہ اس سورہ مبارکہ میں بیان شدہ تمام حقائق اس بات پر مبنی ہیں کہ اس کائنات کا خالق، رب، مالک اور اس کا مدبر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ پس اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساری حمد اللہ کے ساتھ مختص ہے۔ کسی غیر اللہ کو اس بنا پر حمد کا لائق نہیں ٹھہرایا جا سکتا کہ وہ خالق، رب اور مدبر ہے۔

۲۔ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الۡاَرۡضِ: زمین کا رب وہی ہے جو آسمانوں کا رب ہے۔ نہ آسمانوں میں اللہ کے علاوہ کوئی رب ہے نہ زمین میں۔ لہٰذا حمد صرف اس کے لیے مختص ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔

۳۔ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ: یہ جملہ بدل ہے رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الۡاَرۡضِ کا۔ یعنی عالمین کی دوسری تعبیر ہے۔ اگر عالمین کو آسمانوں اور زمین سے وسیع تر سمجھا جائے تو دوسری تعبیر (بدل) نہ ہو گی بلکہ وسیع تر تعبیر ہو گی۔ چونکہ عالمین میں وما بینھما وغیرہ بھی ہے۔

وَلَہُ الۡکِبۡرِیَآءُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۪ وَہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۳۷﴾ ع

۳۷۔ اور آسمانوں اور زمین میں بڑائی اسی کے لیے ہے اور وہی بڑا غالب آنے والا، حکمت والا ہے۔

تفسیر آیات

اَلۡکِبۡرِیَآءُ راغب کے مطابق الترفع عن الانقیاد کسی کی فرمان برداری سے بالاتر ہونا ہے۔ اللہ کی کبریائی اور عظمت کے ساتھ نہ آسمانوں میں کوئی شریک ہے نہ زمین میں۔ لَہٗ کا مقدم آنا، اس بات کے حصر کو بیان کرنا مقصود ہے کہ یہ کبریائی صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے۔ جس طرح حمد اس کے ساتھ مختص ہے۔

۲۔ وَہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ: چنانچہ عزت و غلبہ اور حکمت و رحمت میں بھی اللہ کی ذات کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔ اللہ سے بالاتر کوئی غالب آنے والا، حکمت والا نہیں ہے۔

سُورَۃُ الۡاَحۡقَافِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اس سورۃ المبارکۃ کا نام آیت وَاذۡکُرۡ اَخَا عَادٍ ؕ اِذۡ اَنۡذَرَ قَوۡمَہٗ بِالۡاَحۡقَافِ ...۔ (۲۱) سے ماخوذ ہے بعض اہل قلم کی رائے ہے کہ سورہ سنہ ۱۰ بعثت میں حضرت ابو طالب اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ کی رحلت اور شعب ابوطالب میں تین سالہ محاصرے کے بعد نازل ہوئی ہے۔

قرائت کوفی میں حٰمٓ ایک مستقل آیت ہے۔ یہ قرائت چونکہ عارف اسرار قرآن امیر المومنین علی علیہ السلام کی روایت ہے لہٰذا امیر المومنین علی علیہ السلام حا، میم کے رموز سے واقف ہیں اور اسے ایک مستقل آیت شمار فرمایا ہے۔

یہ سورۃ مبارکہ مکی ہے۔ ابن عباس اور قتادہ کے مطابق آیت قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ کَانَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ مدنی ہے اور بعض کے نزدیک آیت فَاصۡبِرۡ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الۡعَزۡمِ مِنَ الرُّسُلِ ...۔ (۳۵) اور آیت اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىہُ ...۔ (۸) بھی مدنی ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ — بنام خدائے رحمٰن رحیم

الجزء ۲۶ حٰمٓ ۝۱ — ۱۔ حا، میم۔

یہ سورہ ہائے حوامیم کی ساتویں سورۃ ہے۔

تَنۡزِیۡلُ الۡکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَکِیۡمِ ۝۲ — ۲۔ اس کتاب کا نزول بڑے غالب آنے والے، حکمت والے اللہ کی طرف سے ہے۔

اس آیت کی تفسیر پہلے ہو چکی ہے۔

مَا خَلَقۡنَا السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَ مَا بَیۡنَہُمَاۤ اِلَّا بِالۡحَقِّ وَ اَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا عَمَّاۤ اُنۡذِرُوۡا مُعۡرِضُوۡنَ ③	۳۔ ہم نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے کو برحق اور ایک معینہ مدت کے لیے پیدا کیا ہے اور جو لوگ کافر ہو گئے ہیں وہ اس چیز سے منہ موڑے ہوئے ہیں جس کی انہیں تنبیہ کی گئی تھی۔

تفسیر آیات

۱۔ مَا خَلَقۡنَا السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ: اللہ نے کل کائنات کو بے مقصد خلق نہیں فرمایا بلکہ اس کی تخلیق حق اور حقیقت پر مبنی ہے۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ حجر آیت ۸۵، سورہ روم آیت ۸۔

۲۔ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا عَمَّاۤ اُنۡذِرُوۡا مُعۡرِضُوۡنَ: جس چیز کی تنبیہ کی گئی تھی وہ یہی تھی کہ یہ کائنات بے مقصد خلق نہیں ہوئی۔ اس کی غرض و غایت آخرت کے دن ظاہر ہو گی جہاں عدالت الٰہی میں حاضر ہو کر اس غرض خلقت کا جواب دینا ہو گا لیکن کافر اس آخرت کو نہیں مانتے جس پر اس کائنات کی تخلیق کی حقانیت کا دارومدار ہے۔

قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ مَّا تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اَرُوۡنِیۡ مَاذَا خَلَقُوۡا مِنَ الۡاَرۡضِ اَمۡ لَہُمۡ شِرۡکٌ فِی السَّمٰوٰتِ ؕ اِیۡتُوۡنِیۡ بِکِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ ہٰذَاۤ اَوۡ اَثٰرَۃٍ مِّنۡ عِلۡمٍ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ④	۴۔ کہدیجیے: یہ تو بتاؤ جنہیں اللہ کے سوا تم پکارتے ہو، مجھے بھی دکھاؤ انہوں نے زمین کی کون سی چیز پیدا کی ہے یا آسمانوں میں ان کی شرکت ہے؟ اگر تم سچے ہو تو اس سے پہلے کی کوئی کتاب یا کوئی باقی ماندہ علمی (ثبوت) میرے سامنے پیش کرو۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ: یہ ترکیب ہمیشہ اخبرونی کے معنوں میں ہے۔ یعنی مجھے بتاؤ۔

۲۔ اَرُوۡنِیۡ مَاذَا خَلَقُوۡا: یہ بات ذہن میں رہے کہ کائنات خلق کرنے (تخلیق) اور چلانے (تدبیر) کے دو الگ الگ سرچشمے نہیں ہو سکتے کہ ایک ہستی خلق کرے اور دوسری ہستی تدبیر کرے۔ قرآن نے بڑی شد و مد، تکرار اور پوری وضاحت کے ساتھ اس بات کو بیان کیا ہے کہ جس نے کائنات کو خلق کیا ہے وہی اس کی تدبیر کر سکتا ہے، چلا سکتا ہے۔

مشرکین جن ہستیوں اور بتوں کی طرف تدبیر کائنات کی نسبت دیتے تھے، ان سے یہ کہا جا رہا ہے: پھر ان کی طرف سے خلق بھی ہونا چاہیے۔ مشرکین خود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ خلق کا کام صرف اللہ کر سکتا ہے:

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝[1]

اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا اور سورج اور چاند کو کس نے مسخر کیا تو ضرور کہیں گے: اللہ نے، تو پھر یہ کہاں الٹے جا رہے ہیں؟

اگر ایسا ہے کہ تخلیق میں بھی کسی غیر اللہ کا کردار ہے تو فرمایا: اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مجھے دکھاؤ زمین میں انہوں نے کیا خلق کیا ہے یا آسمان کی تخلیق میں ان کا کیا حصہ ہے۔ اس کے اثبات کے لیے دو علمی مصادر کا ذکر فرمایا:

۳۔ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ: ایک علمی مصدر کتاب ہے جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ جیسے توریت اور انجیل، ان میں کسی غیر اللہ کی پرستش یا ان کے خالق ہونے کا ذکر ملتا ہو تو پیش کرو۔ چنانچہ وہ وحی اور رسالت کے قائل نہیں ہیں۔

۴۔ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ: دوسرا مصدر وہ منقول وماثور علم ہے جو مصادر وحی سے مربوط ہو جسے اسلامی اصطلاح میں سنت کہتے ہیں۔ چنانچہ اسلام میں علمی مصادر انہی دو مصادر میں منحصر ہیں۔ کتاب اور سنت اور سنت کی سند عترت ہے۔

چنانچہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے:

و اَثَارَةٍ مِنْ عِلْمٍ فَاِنَّمَا عَنَى بِذٰلِكَ عِلْمَ اَوْصِيَاءِ الْاَنْبِيَاءِ۔[2]

اور اَثَارَةٍ مِنْ عِلْمٍ سے انبیاء کے اوصیاء کا علم مراد لیا گیا ہے۔

اس آیت سے ضمناً یہ بات واضح ہوگئی تمام ادیان میں دینی مآخذ و مصادر دو ہیں: کتاب اور جس نبی پر کتاب نازل ہوئی ہے اس سے منقول سنت۔ مشرکین، رسالت قبول نہیں کرتے۔ جب ان دونوں مصادر کو تم مانتے نہیں ہو تو تمہیں کس نے بتایا کہ اللہ کے ساتھ کوئی شریک ہے؟ جواب میں وہ یہی کہتے ہیں: ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا کرتے دیکھا ہے۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ

۵۔ اور اس شخص سے بڑھ کر گمراہ کون ہو گا جو اللہ کے سوا ایسوں کو پکارے جو قیامت تک اسے

---

[1] ۲۹ عنکبوت: ۶۱ [2] الکافی ۱: ۴۲۶

الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝۵	جواب نہ دے سکیں بلکہ جو ان کے پکارنے تک سے بے خبر ہوں؟
وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّ كَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ۝۶	۶۔ اور جب لوگ جمع کیے جائیں گے تو وہ ان کے دشمن ہوں گے اور ان کی پرستش سے انکار کریں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمَنْ اَضَلُّ: اللہ کو چھوڑ غیر اللہ سے اپنی توقعات وابستہ کرنا اور اس غیر اللہ کی عبادت کرنا گمراہی کی انتہائی منزل ہے جس سے بڑھ کر کوئی گمراہی نہیں ہو سکتی چونکہ ان غیر اللہ کا حال یہ ہے:

۲۔ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ: قیامت تک اسے پکارتے ہو تو وہ اسے جواب نہیں دے گا۔ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ سے مراد ابدیت بتانا ہے کہ کبھی بھی اس کی طرف سے جواب نہیں آ سکتا۔ وہ معبود اس قسم کے ہیں کہ وہ جواب دے ہی نہیں سکتے۔

۳۔ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ: چونکہ وہ غیر اللہ اس کی پکار کا علم ہی نہیں رکھتا کہ کوئی اسے پکار رہا ہے۔ اگر یہ غیر اللہ جامد اور بے جان بت ہیں تو ظاہر ہے وہ اس کی پکار سننے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور اگر وہ غیر اللہ فرشتے اور مقدس ہستیاں ہیں جیسے عیسیٰ علیہ السلام تو وہ بھی ان کی پکار کا علم نہیں رکھتے چونکہ وہ معبود حقیقی نہیں ہیں لہٰذا معبود کی حیثیت سے ان کی پکار اور عبادت وصول نہیں کرتے۔ چنانچہ اگلی آیت میں فرمایا ہے کہ یہ معبود ان کی عبادت کا انکار کریں گے۔

۴۔ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً: جب قیامت کے دن وہاں ان کے ساتھ محشور ہوں گے تو یہ معبود ان کی کسی قسم کی مدد کرنے کی جگہ ان سے دشمنی کریں گے چونکہ یہ مشرک، دشمن خالق ہے لہٰذا خدا کے برگزیدہ بندے بھی ان کے دشمن ہوں گے۔

۵۔ وَّ كَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ: وہ معبود ان کی عبادت سے بے خبر ہوں گے لہٰذا قیامت کے دن وہ اس عبادت کا انکار کریں گے جو یہ مشرک دنیا میں بجا لاتا رہا ہے چونکہ وہ ہستیاں نہ معبود تھیں، نہ یہ حرکات جو اس مشرک سے صادر ہوتی رہی ہیں عبادت تھیں۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ	۷۔ اور جب ان کے سامنے ہماری واضح آیات کی تلاوت کی جاتی ہے تو جب حق ان کے پاس آ جاتا

هٰذَا سِحۡرٌ مُّبِيۡنٌ ؕ۷

ہے تو کفار کہتے ہیں: یہ تو صریح جادو ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ جب ان مشرکین کو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر دلالت کرنے والے واضح دلائل پڑھ کر سنائے جاتے ہیں جن سے رسول کی دعوت کا برحق اور مطابق واقع ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔ تو:

۲۔ قَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لِلۡحَقِّ: ان کافروں نے اس حق اور واقع کو خلاف واقع اور خلاف حق کہدیا۔ اس کے لیے بہانہ یہ بنایا کہ یہ جادو ہے چونکہ جادو برحق نہیں ہوتا اور وہ اس بات سے بھی آگاہ تھے کہ یہ پیغام جادو کے اوصاف کا حامل نہیں ہے۔

اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰٮهُ ؕ قُلۡ اِنِ افۡتَرَيۡتُهٗ فَلَا تَمۡلِكُوۡنَ لِىۡ مِنَ اللّٰهِ شَيۡـئًا ؕ هُوَ اَعۡلَمُ بِمَا تُفِيۡضُوۡنَ فِيۡهِ ؕ كَفٰى بِهٖ شَهِيۡدًاۢ بَيۡنِىۡ وَبَيۡنَكُمۡ ؕ وَ هُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِيۡمُ ۸

۸۔ کیا یہ کہتے ہیں: اس نے اسے خود گھڑ لیا ہے؟ کہدیجیے: اگر میں نے اسے خود گھڑ لیا ہے تو تم میرے لیے اللہ کی طرف سے (بچاؤ کا) کوئی اختیار نہیں رکھتے، تم اس (قرآن) کے بارے میں جو گفت و شنید کرتے ہو اس سے اللہ خوب باخبر ہے اور میرے درمیان اور تمہارے درمیان اس پر گواہی کے لیے وہی کافی ہے اور وہی بڑا بخشنے والا، مہربان ہے۔

تشریح کلمات

تُفِيۡضُوۡنَ: (ف ی ض) افاضوا فی الحدیث محاورہ مستعار ہے۔ جس کے معنی باتوں میں مشغول ہونے اور چرچا کرنے کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰٮهُ: مشرکین کی طرف سے انکار رسالت کا لازمہ یہی ہے کہ وہ اس قرآن کو اللہ کی طرف سے وحی نہیں سمجھتے بلکہ وہ قرآن کو خود رسول اللہ ﷺ کا ساختہ سمجھتے تھے۔ اس صورت کو سامنے رکھ کر یہ حقیقت بیان فرما رہا ہے:

۲۔ قُلۡ اِنِ افۡتَرَيۡتُهٗ: اگر میں نے اللہ پر افتراء باندھا ہے تو میں اللہ کی گرفت سے نہیں بچ سکوں

گا۔ فَلَا تَمۡلِكُوۡنَ لِيۡ تم مجھے نہیں بچا سکتے اور اگر تم افتراء باندھتے ہو تو تم اللہ کی گرفت سے نہیں بچ سکو گے۔ میں تمہیں نہیں بچا سکتا۔

۳۔ هُوَ اَعۡلَمُ بِمَا تُفِيۡضُوۡنَ: اللہ تمہاری آپس کی گفت وشنید سے آگاہ ہے جس میں تم کبھی رسول کو ساحر کہتے ہو، کبھی افتراء باز اور کبھی مجنون کہتے ہو۔

۴۔ كَفٰى بِهٖ شَهِيۡدًۢا بَيۡنِيۡ وَبَيۡنَكُمۡ: ہمارے درمیان گواہی کے لیے اللہ کافی ہے جو میری صداقت اور تبلیغ کی گواہی دے گا اور تمہارے انکار اور کفر کی گواہی دے گا۔

۵۔ وَهُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِيۡمُ: اپنے کفر و انکار کے باوجود اگر تم کفر چھوڑ دو تو اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور رحمت کا بہت وسیع دامن تمہیں قبول کرنے کے لیے آمادہ ہے۔

قُلۡ مَا كُنۡتُ بِدۡعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَ مَاۤ اَدۡرِيۡ مَا يُفۡعَلُ بِيۡ وَلَا بِكُمۡ ؕ اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوۡحٰۤى اِلَيَّ وَمَاۤ اَنَا اِلَّا نَذِيۡرٌ مُّبِيۡنٌ ۝

۹۔ کہدیجیے: میں رسولوں میں انوکھا (رسول) نہیں ہوں اور میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا اور تمہارے ساتھ کیا ہو گا، میں تو صرف اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے اور میں تو صرف واضح طور پر تنبیہ کرنے والا ہوں۔

تشریح کلمات

بِدۡعًا: (ب د ع) بدعا۔ نیا۔ نرالا۔ یہ لفظ اسم فاعل اور اسم مفعول دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ مَا كُنۡتُ بِدۡعًا: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کے منکرین کہتے تھے:

وَقَالُوۡا مَالِ هٰذَا الرَّسُوۡلِ يَاۡكُلُ الطَّعَامَ وَيَمۡشِيۡ فِي الۡاَسۡوَاقِ ؕ لَوۡلَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡهِ مَلَكٌ فَيَكُوۡنَ مَعَهٗ نَذِيۡرًا ۙ اَوۡ يُلۡقٰۤى اِلَيۡهِ كَنۡزٌ اَوۡ تَكُوۡنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاۡكُلُ مِنۡهَا ...[1]

اور وہ کہتے ہیں: یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟ اس پر کوئی فرشتہ کیوں نازل نہیں ہوتا؟ تاکہ اس کے ساتھ تنبیہ کر دیا کرے یا اس کے لیے کوئی خزانہ نازل کر دیا جاتا یا اس کا کوئی باغ ہوتا جس سے وہ کھا لیا کرتا۔

ان کے جواب میں فرمایا: آپ کہدیں میں کوئی نرالا رسول نہیں ہوں کہ میں پہلی بار کسی انسان کی

---

[1] ۲۵ فرقان: ۸۔ ۷

شکل میں رسول بن کر آیا ہوں۔ میری طرح کے رسول پہلے اور بھی آئے ہیں جو کھاتے پیتے تھے۔ کسی رسول کے ساتھ کوئی فرشتہ نہیں آیا۔

۲۔ مَاۤ اَدۡرِیۡ مَا یُفۡعَلُ: میں نہیں جانتا میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا۔ اس میں بذات خود وحی سے ہٹ کر علم غیب کی نفی ہے کہ اگر مجھ پر وحی نازل نہ ہوتی تو میں خود یہ بھی نہیں جان سکتا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ وحی کی صورت میں علم کی حد بندی کا ذکر نہیں ہے۔

۳۔ اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ: میرے علم کا مأخذ وحی ہے۔ اس کی روشنی میں چلتا ہوں، جانتا ہوں، علم رکھتا ہوں۔ میں اللہ کا رسول ہوں۔ میرے علم کا منبع اور مأخذ خدا ہے اور خدا وحی کے ذریعے مجھے علم عنایت فرماتا ہے۔ میرے رسول ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ میں اللہ سے ہٹ کر استقلالی طور پر سب کچھ ہوں۔

۴۔ وَ مَاۤ اَنَا اِلَّا نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ: میں صرف تنبیہ کرنے والا ہوں۔ ابدی گمراہی میں جانے کے بارے میں تمہیں تنبیہ کرتا ہوں۔ اس تنبیہ کے بارے میں مجھ پر پوری ذمے داری عائد ہوتی ہے۔

قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ کَانَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ وَ کَفَرۡتُمۡ بِہٖ وَ شَہِدَ شَاہِدٌ مِّنۡۢ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ عَلٰی مِثۡلِہٖ فَاٰمَنَ وَ اسۡتَکۡبَرۡتُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۰﴾ ع

۱۰۔ کہدیجیے: یہ تو بتاؤ اگر یہ (قرآن) اللہ کی طرف سے ہو اور تم نے اس سے انکار کیا ہو جب کہ بنی اسرائیل کا ایک گواہ اس جیسی کتاب پر گواہی دے چکا ہے اور پھر وہ ایمان بھی لا چکا ہو اور تم نے تکبر کیا ہو (تو تمہارا کیا بنے گا؟) بیشک اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ: کہدیجیے یہ تو بتاؤ تمہارا کیا حال ہوگا اگر فی الواقع یہ قرآن اللہ کی طرف سے ہونے کے باوجود تم نے انکار کیا ہے۔

۲۔ وَ شَہِدَ شَاہِدٌ: اور بنی اسرائیل کا ایک گواہ اس قرآن کی ہم مضمون کتاب (توریت) کے مندرجات کی گواہی دینے کے بعد اس قرآن پر ایمان لے آیا۔

۳۔ عَلٰی مِثۡلِہٖ: سے مراد مثل قرآن ہے۔ یعنی توریت۔ چونکہ غیر محرف توریت، تصور توحید، رسالت، آخرت اور احکام میں قرآن کی مانند مضامین کی حامل ہے لہٰذا حقیقی توریت پر ایمان لانے والا قرآن پر بھی ایمان لے آئے گا۔

ممکن ہے توریت کا شاھد، قرآن کا مومن اس لحاظ سے بنے گا چونکہ توریت میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

کی آمد کی باوصافہ خبر دی گئی ہے:

اَلَّذِیۡنَ یَتَّبِعُوۡنَ الرَّسُوۡلَ النَّبِیَّ الۡاُمِّیَّ الَّذِیۡ یَجِدُوۡنَہٗ مَکۡتُوۡبًا عِنۡدَہُمۡ فِی التَّوۡرٰىۃِ وَ الۡاِنۡجِیۡلِ ۔۔۔ [1]

جو لوگ اس رسول کی پیروی کرتے ہیں جو نبی امی کہلاتے ہیں جن کا ذکر وہ اپنے ہاں توریت اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔

اکثر مفسرین نے اس روایت کو اختیار کیا ہے کہ شَہِدَ شَاہِدٌ سے مراد یہودی عالم عبد اللّٰہ بن سلام ہیں جنہوں نے قرآن کو توریت کے مطابق پا کر اسلام قبول کیا۔

عبد اللّٰہ بن سلام نے مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کے وصال سے دو سال قبل اسلام قبول کیا۔

مفسرین نے اس بارے میں یہ موقف اختیار کیا ہے کہ سورہ احقاف مکی ہونے اور اس آیت کے مدنی ہونے میں کوئی منافات نہیں ہے۔ قرآن میں ایسے نظائر زیادہ ہیں کہ سورہ مکی ہو اور آیت مدنی ہو۔

اس کے باوجود بعض حضرات کو آیۂ مودت کے مدنی ہونے میں تامل ہے۔

وَ قَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَوۡ کَانَ خَیۡرًا مَّا سَبَقُوۡنَاۤ اِلَیۡہِ ؕ وَ اِذۡ لَمۡ یَہۡتَدُوۡا بِہٖ فَسَیَقُوۡلُوۡنَ ہٰذَاۤ اِفۡکٌ قَدِیۡمٌ ﴿۱۱﴾

۱۱۔ جو لوگ کافر ہو گئے وہ ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں: اگر یہ (دین) بہتر ہوتا تو یہ لوگ اس کی طرف جانے میں ہم سے سبقت نہ کر جاتے اور چونکہ انہوں نے اس (قرآن) سے ہدایت نہ پائی اس لیے وہ کہیں گے: یہ تو (وہی) پرانا جھوٹ ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قریش کے مشرکین رائے عامہ کو گمراہ کرنے کے لیے کہتے ہیں: اگر قرآن کسی معقولیت پر مشتمل ہوتا تو معاشرے کے اہل الرائے اس پر ایمان لے آتے اور یہ چند سادہ لوح، سطحی سوچ کے لوگ اس پر ایمان لانے میں پہل نہ کرتے۔

قریش کے مشرکین اپنے آپ کو خیر و شر کا محور قرار دیتے ہوئے کہتے تھے: اگر قرآن کو تسلیم کر لینا اچھا کام ہوتا تو ہم سب سے پہلے اسے مان لیتے۔

۲۔ وَ اِذۡ لَمۡ یَہۡتَدُوۡا: چونکہ ہم نے نہیں مانا لہٰذا یہ خیر اور مبنی بر حق نہیں ہے بلکہ پرانا جھوٹ یعنی اساطیر الاولین داستانہائے پارینہ ہیں لہٰذا تم اسے مسترد کر دو۔

---

[1] ۷ اعراف: ۱۵۷

وَ مِنۡ قَبۡلِہٖ کِتٰبُ مُوۡسٰۤی اِمَامًا وَّ رَحۡمَۃً ؕ وَ ہٰذَا کِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِیًّا لِّیُنۡذِرَ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا ٭ۖ وَ بُشۡرٰی لِلۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۱۲﴾

۱۲۔ اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب رہنما اور رحمت تھی اور یہ (قرآن) ایسی کتاب ہے جو عربی زبان میں (کتاب موسیٰ کی) تصدیق کرنے والی ہے تاکہ ظالموں کو تنبیہ کرے اور نیکی کرنے والوں کو بشارت دے۔

تفسیر آیات

قرآن بھی رسول کی طرح نرالا نہیں ہے۔ قرآن سے پہلے موسیٰ کی کتاب، توریت بھی انہی حقائق کی طرف دعوت دینے کے لیے راہنما اصول بیان کر چکی ہے جو لوگوں کے لیے باعث رحمت تھی۔ قرآن بھی انہی راہنما اصولوں کی طرف دعوت دیتا ہے۔

۲۔ وَ ہٰذَا کِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ: یہ قرآن اسی توریت کا تسلسل ہے۔ توریت میں بیان شدہ حقائق کی تصدیق و تائید کرتا ہے تو یہ لوگ صرف قرآن کی تکذیب نہیں کر رہے بلکہ ایک سلسلے اور ایک الٰہی نظام رسالت کی تکذیب کر رہے ہیں۔

۳۔ لِّسَانًا عَرَبِیًّا: قرآن کی زبان عربی رکھی ہے تاکہ ان ظالموں کی تنبیہ ہو جائے جو شرک و کفر اور تکذیب کے مرتکب ہیں اور اہل ایمان کے لیے ابدی سعادت کی نوید ہو جائے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿ۚ۱۳﴾

اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۴﴾

۱۳۔ جنہوں نے کہا: ہمارا رب اللہ ہے پھر استقامت دکھائی، ان کے لیے یقیناً نہ کوئی خوف ہے اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔

۱۴۔ یہ لوگ جنت والے ہوں گے (جو) ہمیشہ اسی میں رہیں گے ان اعمال کے صلے میں جو وہ بجا لایا کرتے تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ: ان منکرین اور مشرکین کے مقابلے میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو ربوبیت میں توحید کے قائل ہیں اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو رب سمجھتے ہیں۔ آیت کے جملے کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ حٰمٓ السجدہ آیت ۳۰۔

۲۔ فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ : اللہ کی ربوبیت کے اقرار وعقیدہ کے بعد مرتے دم تک اس میں کسی قسم کے انحراف نہ کرنے والوں کے لیے دو اہم خوشخبریاں ہیں: خوف نہ ہونا۔ کسی آنے والے کا خوف نہ ہو گا یعنی قیامت کے دن یہ لوگ امن وسکون میں ہوں گے۔ فزع اکبر کے دن بے خوفی کی حالت میں ہونا بہت بڑی خوشخبری ہے۔

۳۔ وَلَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ: نہ انہیں کوئی غم ہو گا۔ غم کسی مطلوبہ چیز کے فقدان کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ان لوگوں نے ماضی میں کوئی ایسا عمل نہیں کیا ہو گا جس کی وجہ سے وہ ابدی زندگی کا خسارہ اٹھائیں۔

۴۔ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ: وہ اپنے عقیدۂ توحید اور استقامت کے نتیجے میں ہمیشہ کے لیے جنت میں ہوں گے۔

وَ وَصَّیۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَیۡہِ اِحۡسٰنًا ؕ حَمَلَتۡہُ اُمُّہٗ کُرۡہًا وَّ وَضَعَتۡہُ کُرۡہًا ؕ وَ حَمۡلُہٗ وَ فِصٰلُہٗ ثَلٰثُوۡنَ شَہۡرًا ؕ حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّہٗ وَ بَلَغَ اَرۡبَعِیۡنَ سَنَۃً ۙ قَالَ رَبِّ اَوۡزِعۡنِیۡۤ اَنۡ اَشۡکُرَ نِعۡمَتَکَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتَ عَلَیَّ وَ عَلٰی وَالِدَیَّ وَ اَنۡ اَعۡمَلَ صَالِحًا تَرۡضٰہُ وَ اَصۡلِحۡ لِیۡ فِیۡ ذُرِّیَّتِیۡ ۚ اِنِّیۡ تُبۡتُ اِلَیۡکَ وَ اِنِّیۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ﴿۱۵﴾

۱۵۔ اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ پر احسان کرنے کا حکم دیا، اس کی ماں نے تکلیف سہ کر اسے پیٹ میں اٹھائے رکھا اور تکلیف اٹھا کر اسے جنا اور اس کے حمل اور دودھ چھڑانے میں تیس ماہ لگ جاتے ہیں، یہاں تک کہ جب وہ رشد کامل کو پہنچا اور چالیس سال کا ہو گیا تو کہنے لگا: پروردگارا! مجھے توفیق دے کہ میں تیری اس نعمت کا شکر ادا کروں جس سے تو نے مجھے اور میرے والدین کو نوازا اور یہ کہ میں ایسا نیک عمل کروں جسے تو پسند کرے اور میری اولاد کو میرے لیے صالح بنا دے، میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں اور بے شک میں مسلمانوں میں سے ہوں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ وَصَّیۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَیۡہِ اِحۡسٰنًا: سورہ عنکبوت آیت ۸ اور سورہ لقمان آیت ۳۳ میں اس کی تشریح ہو گئی ہے۔

قرآن مجید میں والدین پر احسان کو خود اللہ تعالیٰ کے حق عبودیت اور نفی شرک کے بعد سب سے

اہم فریضے کے عنوان سے ذکر فرمایا ہے۔ سورۃ الانعام ۱۵۱ میں فرمایا:

اَلَّا تُشۡرِكُوۡا بِهٖ شَيۡـًٔا وَّبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا ...	تم لوگ کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ اور والدین پر احسان کرو۔

یہاں نفی شرک کا ذکر ہے۔ جو انسان پر عائد ہونے والے حق عبودیت میں سب سے اہم ترین ہے۔ اس کے بعد وَّبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا کا ذکر بتاتا ہے کہ اللہ کی توحید کے بعد والدین پر احسان کا درجہ آتا ہے۔

سورہ بنی اسرائیل آیت ۲۳ میں فرمایا:

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ وَبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا ...	اور آپ کے پروردگار نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو اور والدین کے ساتھ نیکی کرو۔

اس آیت میں بھی توحید کے بعد والدین پر احسان کا ذکر ہے۔

اللہ تعالیٰ کی اس رحمت کا تقاضا یہی تھا جسے اللہ نے اپنی اوپر واجب کر دیا ہے:

كَتَبَ عَلٰى نَفۡسِهِ الرَّحۡمَةَ ... [1]	اس نے رحمت کو اپنے پر لازم کر دیا ہے۔

آنے والی نسل کا تحفظ فطرت میں ودیعت فرمایا چونکہ نومولود بچہ نہایت بے بس ہوتا ہے اور جانے والی نسل کا تحفظ شریعت میں ودیعت فرمایا اور اپنی توحید کے بعد کا درجہ عنایت فرمایا۔

۲۔ حَمَلَتۡهُ اُمُّهٗ كُرۡهًا: والدین کے ذکر کے بعد خصوصی طور پر ماں کے تین احسانات کا ذکر ہے: پیٹ میں اٹھانے کی مشقت برداشت کرنا۔ پھر بڑی مشقتوں کے ساتھ جننا۔ پھر دو سال تک اسے دودھ پلانا۔

حمل کے دنوں میں بچہ ماں کا رحم چیر کر ماں کے جسم سے اتصال قائم کرتا ہے تاکہ ماں کا خون اپنے وجود میں منتقل کرے اور نشوونما حاصل ہو جو ماں کے لیے نہایت مشقت کا عمل ہے مگر یہ ماں ہے اللہ تعالیٰ کی مہربانی کا محسوس نمونہ جو اپنی جان پر بھی کھیل جاتی ہے اور بچے کو تحفظ اور پیار و محبت فراہم کرتی ہے۔

۳۔ وَّوَضَعَتۡهُ كُرۡهًا: اور تکلیف اٹھا کر اسے جنا۔ بچے کی ولادت کے موقع پر ماں کو جو مشقت اٹھانا پڑتی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے لیکن یہ ماں ہے جو اس مشقت کو پورے صبر و حوصلہ کے ساتھ قبول کرتی ہے اور جیسے بچہ دنیا میں آ جاتا ہے ماں ان تمام مشقتوں کو بھول کر اپنے لخت جگر کی طرف تمام تر توجہات مبذول کرتی ہے۔ ماں اگرچہ ولادت کی مشقت و آلام سے ابھی دوچار ہے مگر اسے ہرگز اپنی فکر نہیں ہے۔ بچے کی رونے کی آواز سن کر ماں کا پورا وجود مہر و محبت میں بدل جاتا ہے۔ ماں اپنے درد کو ہی نہیں، اپنے وجود تک کو بھول جاتی ہے۔ اپنا وجود اپنے بچے کے وجود میں اتار دیتی ہے اور اپنے وجود سے ہاتھ اٹھا لیتی ہے۔ یہ ہے رحمت الٰہی کا مظہر اور زمین میں اللہ کی مہربانی کی نمائندگی۔

---

[1] ۶ انعام: ۱۲

۳۔ وَحَمۡلُہٗ وَفِصٰلُہٗ ثَلٰثُوۡنَ شَہۡرًا: اس کے حمل اور دودھ چھڑانے میں تیس ماہ لگ جاتے ہیں۔ یہ تیس ماہ وہ دورانیہ ہے جسے انسان کی زندگی کا بے بس ترین دورانیہ کہ سکتے ہیں۔ دو سال کے بعد بچہ اپنے ما فی الضمیر کا اظہار کر سکتا، چل پھر سکتا ہے۔

ماں ہی وہ مہربان ذات ہے جس نے صبر آزما مشقتوں کو برداشت، رات کی نیندوں کا سکون برباد کر کے اس بچے کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بنایا۔ پھر بھی ہنوز یہ بچہ مہر مادری کا محتاج ہے۔ یہ وہ مہر و محبت ہے جس پر اس بچے کی شخصیت کا اعتدال موقوف ہے۔ اس مہر مادری سے محروم ہونے کی صورت میں یہ بچہ غیر معتدل، غیر مہذب، درندہ صفت بن جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اولاد پر ماں کا حق باپ کی نسبت تین گنا زیادہ ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے:

ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی:

يَا رَسُولَ اللّٰهِ مَنْ اَبَرُّ؟ قَالَ: اُمَّكَ قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: اُمَّكَ، قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: اُمَّكَ۔ قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: اَبَاكَ۔[1]

میں کس پر احسان کروں؟ فرمایا: اپنی ماں پر۔ کہا: پھر کس پر؟ فرمایا: اپنی ماں پر۔ کہا: پھر کس پر؟ فرمایا: اپنی ماں پر۔ کہا: پھر کس پر؟ فرمایا اپنے باپ پر۔

اس آیت سے حمل کی کم از کم مدت کا استنباط ہوتا ہے۔ چونکہ دودھ چھڑانے کی مدت قرآن کی صراحت کے مطابق دو سال ہے۔ تیس ماہ میں سے ۲۴ ماہ منفی کر دیے جائیں تو حمل کی مدت چھ ماہ رہ جاتی ہے۔

تفسیر ابن کثیر اور الاحکام جصاص میں آیا ہے:

> ایک شخص نے حضرت عثمان کی عدالت میں بیان دیا میرے ہاں چھ ماہ میں بچہ پیدا ہوا ہے۔ حضرت عثمان نے اس عورت کو سنگسار کرنے کا حکم صادر کیا۔ حضرت علی علیہ السلام کو علم ہوا تو آپ علیہ السلام نے حضرت عثمان سے فرمایا: یہ کیا کیا؟ کہا چھ ماہ میں بچہ پیدا ہو سکتا؟ فرمایا: کیا آپ قرآن نہیں پڑھتے؟ کہا: پڑھتا ہوں۔ فرمایا: اللہ کا یہ فرمان سننے کا اتفاق نہیں ہوا: وَحَمۡلُہٗ وَفِصٰلُہٗ ثَلٰثُوۡنَ شَہۡرًا؟ اور فرمایا: حَوۡلَیۡنِ کَامِلَیۡنِ ....[2] دو سال کامل دودھ پلانا ہے تو چھ ماہ حمل کی مدت رہ جاتی ہے۔ حضرت عثمان نے کہا: میں یہ بات نہیں سمجھ سکا۔ حکم دیا اس عورت کو پیش کیا جائے۔ معلوم ہوا وہ سنگسار ہو چکی تھی۔

اس آیت سے رضاعت کی زیادہ سے زیادہ مدت کا بھی تعین ہوتا ہے۔ جو دو سال ہے اس مدت کے گزرنے کے بعد اگر کوئی عورت کسی بچے کو دودھ پلائے تو اس پر رضاعت کے احکام لاگو نہیں ہوں گے۔

---

[1] الکافی ۲: ۱۵۹　[2] ۲ بقرہ: ۲۳۳

چنانچہ حدیث میں ہے:

لَا رَضَاعَ بَعْدَ فِطَامٍ۔[1] فطام دو سال میں دودھ چھڑانے کی مدت گزرنے کے بعد رضاعت غیر موثر ہے۔

اس سے رضاعة الکبیر کی حضرت عائشہ کی روایت جو سنن ابن ماجه اور مسند امام احمد بن حنبل میں ہے اس آیت کے ساتھ متصادم ہے۔

۴۔ حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ: قرآن اشد کا لفظ بلوغ کے لیے استعمال فرماتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

وَ لَا تَقۡرَبُوۡا مَالَ الۡیَتِیۡمِ اِلَّا بِالَّتِیۡ هِیَ اَحۡسَنُ حَتّٰی یَبۡلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ ...[2]	اور یتیم کے مال کے نزدیک نہ جانا مگر ایسے طریقے سے جو (یتیم کے لیے) بہترین ہو یہاں تک کہ وہ اپنے رشد کو پہنچ جائے۔

لہٰذا اشد رشد عقلی کو کہتے ہیں۔ بچہ اس حد تک رشید ہو جائے کہ نفع نقصان کو سمجھنے لگ جائے۔ اس طرح اشد رشد عقلی کی ابتدا ہے اور اس کی تکمیل چالیس میں ہوتی ہے۔

۵۔ وَبَلَغَ اَرۡبَعِیۡنَ سَنَةً: چالیس سال کا ہونے پر اس کی رشد عقلی مکمل ہو جاتی ہے اور اپنے ماضی اور آیندہ سے مربوط حقائق کا ادراک کر سکتا ہے۔ اس کی رشد عقلی کمال کو پہنچ جانے کی وجہ سے قدروں کو سمجھنے لگتا ہے۔

۶۔ قَالَ رَبِّ اَوۡزِعۡنِیۡۤ: اب وہ اپنی زندگی کے ماضی کی قدروں کو یاد کرنے لگ جاتا ہے اور ان نعمتوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس پر کی ہیں اور ساتھ والدین کے احسانوں کا خیال آنا شروع ہو جاتا ہے چونکہ اب تو وہ خود بھی صاحب اولاد ہو چکا ہوگا۔

۷۔ وَاَنۡ اَعۡمَلَ صَالِحًا تَرۡضٰىهُ: اپنے مستقبل کا خیال آتا ہے، نیک عمل کی توفیق کی خواہش ہوتی ہے اور انسان کی ہوشیاری کی علامت آخرت کی فکر ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے:

المومن کیس۔[3]	مومن ہوشیار ہوتا ہے۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے:

وَ اِنَّمَا الْکَیْسُ کَیْسُ الْآخِرَةِ.[4]	اور آخرت کے لیے سمجھدار ہونا ہی سمجھداری ہے۔

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے روایت ہے:

اِذَا بَلَغَ الرَّجُلُ اَرْبَعِینَ سَنَةٍ نَادَی مُنَادٍ مَنَ السَّمَاءِ دَنَا الرَّحِیلُ فَاعِدَّ زَادا۔[5]	جب انسان چالیس کی عمر کو پہنچ جاتا ہے تو آسمان سے ایک منادی ندا دیتا ہے روانگی نزدیک ہے زاد راہ تیار کرلو۔

[1] الکافی ۵: ۴۴۳ [2] ۶ انعام: ۱۵۲ [3] بحار ۶۴: ۳۰۷ [4] الکافی ۴: ۵۵۷ [5] مستدرک الوسائل ۱۲: ۱۵۶

۸۔ وَاَصۡلِحۡ لِیۡ فِیۡ ذُرِّیَّتِیۡ: اولاد کے صالح ہونے کی دعا اس عقل و شعور کی علامت ہے کہ عاقل انسان اپنی زندگی کے بعد اپنی اولاد کے ذریعے اپنے وجود اور صالح اعمال کا دوام چاہتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے:

اِذَامَاتَ ابۡنُ آدَمَ انۡقَطَعَ عَمَلُهُ اِلَّا عَنۡ ثَلَاثٍ وَلَدٍ صَالِحٍ یَدۡعُولَهُ وَ عِلۡمٍ یُنۡتَفَعُ بِهِ وَ صِدَقَةٍ جَارِیَةٍ۔[1]

جب ابن آدم مرجاتا ہے تو اس کے عمل کا سلسلہ بند ہوجاتا ہے سوائے تین چیزوں کے نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرے، وہ علم جس سے فائدہ اٹھایا جائے اور صدقہ جاریہ۔

۹۔ اِنِّیۡ تُبۡتُ اِلَیۡکَ: سمجھداری کی ایک علامت یہ بھی آ گئی کہ اپنی کوتاہیوں کی طرف متوجہ ہونا شروع ہو گیا ہے ورنہ جوانی کی رعونت میں انسان کو اپنی غلطیوں کا احساس تک نہیں ہوتا لیکن عقل و شعور کے پختہ ہونے پر وہ غلطیوں سے توبہ و انابت کی طرف آ جاتا ہے۔

۱۰۔ وَاِنِّیۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ: میں تسلیم و رضا کی منزل پر ہوں۔ تیرے ہر حکم کو تسلیم کرتا ہوں۔

اہم نکات

۱۔ توحید کے بعد والدین پر احسان کا ذکر قابل توجہ ہے۔

۲۔ ماں کا حق باپ سے تین گناہ زیادہ ہے۔

۳۔ کم از کم مدت حمل چھ ماہ ہے۔

۴۔ دو سال رضاعت کی مدت ہے۔

۵۔ رشد عقلی کی صورت میں انسان مقام شکر پر فائز ہوتا ہے۔

۶۔ نیک عمل، نیک اولاد کی دعا کرنی چاہیے۔

اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ نَتَقَبَّلُ عَنۡهُمۡ اَحۡسَنَ مَا عَمِلُوۡا وَ نَتَجَاوَزُ عَنۡ سَیِّاٰتِهِمۡ فِیۡۤ اَصۡحٰبِ الۡجَنَّةِ ؕ وَعۡدَ الصِّدۡقِ الَّذِیۡ کَانُوۡا یُوۡعَدُوۡنَ ﴿۱۶﴾

۱۶۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے بہترین اعمال کو ہم قبول کرتے ہیں اور ان کے گناہوں سے درگزر کرتے ہیں، (یہ) اہل جنت میں شامل ہوں گے اس سچے وعدے کے مطابق جو ان سے کیا جاتا رہا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ: جب لوگ رشد عقلی کو پہنچ جاتے ہیں تو اعلیٰ قدروں کے مالک اور مقام شکر

---

[1] الوسائل ۱۲: ۲۳۰

پر فائز ہو جاتے ہیں۔ اپنے والدین پر ہونے والی نعمتوں کا بھی یہ شکر ادا کرتے اور رضائے رب کے خواہاں ہوتے ہیں۔

ان اوصاف کے مالک لوگوں میں وہ خوبی آ جاتی ہے جس کی وجہ سے ان کے اعمال میں حسن آتا ہے۔ یہاں سے قبول عمل کی منزل آ جاتی ہے۔

۲۔ وَنَتَجَاوَزُ عَنۡ سَیِّاٰتِهِمۡ: ان قدروں کے مالک سے اگر گناہ بھی سرزد ہو جاتے ہیں تو ان کے اعمال کے حسن میں یہ خوبی بھی ہے کہ گناہوں کے ٹکنے نہیں دیتے:

اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡهِبۡنَ السَّیِّاٰتِ ...[1] نیکیاں بیشک برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔

۳۔ فِیۡۤ اَصۡحٰبِ الۡجَنَّةِ: جب اعمال قبول اور گناہ دور ہوں گے تو جنت ان کی منزل ہو گی۔

۴۔ وَعۡدَ الصِّدۡقِ: یہ جنت، اللہ کا وہ وعدہ ہے جو سچا ہے۔ یہ وہ وعدہ ہے جو اللہ نے ایسے نیک عمل کرنے والوں کے ساتھ کر رکھا ہے۔

اہم نکات

۱۔ اعمال ان لوگوں کے قبول ہوتے ہیں جو شکر الٰہی کی قدروں کو جانتے ہیں۔

۲۔ ان قدروں کے مالک لوگوں کے گناہ بھی معاف ہو جائیں گے۔

وَالَّذِیۡ قَالَ لِوَالِدَیۡهِ اُفٍّ لَّکُمَاۤ اَتَعِدٰنِنِیۡۤ اَنۡ اُخۡرَجَ وَقَدۡ خَلَتِ الۡقُرُوۡنُ مِنۡ قَبۡلِیۡ ۚ وَهُمَا یَسۡتَغِیۡثٰنِ اللّٰهَ وَیۡلَکَ اٰمِنۡ ٭ۖ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚۖ فَیَقُوۡلُ مَا هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۱۷﴾

۱۷۔ اور جس نے اپنے والدین سے کہا: تم دونوں پر اف ہو! کیا تم دونوں مجھے ڈراتے ہو کہ میں (قبر سے) پھر نکالا جاؤں گا؟ جبکہ مجھ سے پہلے بہت سی نسلیں گزر چکی ہیں (ان میں سے کوئی واپس نہیں آیا) اور وہ دونوں اللہ سے فریاد کرتے ہوئے (اولاد سے) کہتے تھے: تیری تباہی ہو! تو مان جا کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے، پھر (بھی) وہ کہتا ہے: یہ تو صرف اگلوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَالَّذِیۡ قَالَ لِوَالِدَیۡهِ اُفٍّ لَّکُمَا: اس شخص کا ذکر ہے جو انسانی قدروں کا حامل نہیں ہے۔ اس کا اپنے والدین کے ساتھ کیا رویہ ہوتا ہے؟ وہ والدین جو اسے ابدی ہلاکت سے بچانا چاہتے اور ایمان بہ

---

[1] ۱۱ ہود: ۱۱۴

آخرت کی دعوت دیتے ہیں۔

۲۔ تو یہ قدروں سے محروم شخص اپنے والدین کی اس مہر و محبت پر مبنی دعوت کو ٹھکراتے ہوئے کہتا ہے: اَتَعِدٰنِنِیۡۤ اَنۡ اُخۡرَجَ مجھے اس بات سے ڈراتے ہو میں قبر سے نکالا جاؤں گا، دوبارہ زندہ ہو جاؤں گا۔ کسی حساب کتاب کا سامنا کرنا ہو گا۔ وَ قَدۡ خَلَتِ الۡقُرُوۡنُ مِنۡ قَبۡلِیۡ: ایک نہیں، کئی نسلیں گزر چکی ہیں۔ آج تک کوئی ایک شخص دوبارہ زندہ ہوا ہے نہ آئندہ زندہ ہو گا۔

۳۔ وَ ہُمَا یَسۡتَغِیۡثٰنِ اللّٰہَ: مہربان والدین اس سرکش اور گستاخ فرزند کی ہدایت و نجات کے لیے اللہ کی مدد مانگ رہے ہیں اور دعا کر رہے ہیں: اے اللہ اس فرزند کو راہ راست پر لانے میں ہماری مدد فرما مگر بیٹے میں اس بات کی اہلیت نہیں ہے کہ اس کے بارے میں والدین تک کی دعا قبول ہو۔

۴۔ وَیۡلَکَ اٰمِنۡ ٭ۖ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقٌّ: اے بیٹا! ایمان لے آ، اللہ کا وعدۂ قیامت برحق ہے۔ اس دنیا میں کوئی دوبارہ واپس نہیں آئے گا، نہ اللہ نے کوئی ایسا وعدہ کیا ہے۔ وعدہ آخرت کا ہے مگر بیٹا اپنی گمراہی پر اڑا ہوا ہے اور کہتا ہے:

۵۔ فَیَقُوۡلُ مَا ہٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ: دوبارہ زندگی کی کہانی داستانہائے پارینہ ہے جو کسی حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔

تفسیر ابن کثیر و دیگر تفسیر میں اس آیت کے ذیل میں یہ واقعہ مذکور ہے:

> جب معاویہ نے اپنے بیٹے (یزید) کے لیے بیعت لینے کا حکمنامہ مروان کو لکھا تو عبد الرحمن بن ابی بکر نے کہا: تم نے خلافت کو ملوکیت بنا دیا کہ اپنے بیٹے کے لیے بیعت لینے لگے۔ مروان نے کہا: لوگو یہ وہی آدمی ہے جس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی وَ الَّذِیۡ قَالَ لِوَالِدَیۡہِ اُفٍّ لَّکُمَاۤ ..... حضرت عائشہ کو یہ خبر ملی تو غصے میں آ کر کہا: یہ آیت عبدالرحمٰن کے بارے میں نہیں ہے۔ اگر چاہوں تو کہہ سکتی ہوں کس کے بارے میں ہے لیکن اے مروان! تو وہی ہے کہ تمہارے باپ پر اللہ کے رسولؐ نے اس وقت لعنت بھیجی جب تو اس کے صلب میں تھا۔

حضرت عائشہ کو یہ گمان تک نہ تھا کہ مستقبل میں کچھ ایسے لوگ بھی پیدا ہوں گے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف سے ہونے والی لعنت کو رحمت سمجھیں گے۔

اہم نکات

۱۔ انسانی قدروں سے محروم شخص راہ راست پر نہیں آتا خواہ اس کی دعوت دینے والے اس کے والدین کیوں نہ ہوں۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ ⑱	۱۸۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر فیصلہ حتمی ہو چکا ہے جنوں اور انسانوں کے ان گروہوں کے ساتھ جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں بے شک یہ خسارہ اٹھانے والے تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ اُولٰٓئِكَ: مشار الیہ الذی مفرد کے لیے، اُولٰٓئِكَ جمع کا لفظ کیسے؟ جواب دیا گیا ہے: الذی سے مراد جنس ہے۔ یعنی ہر وہ شخص جو کافر، عاق والدین اور منکر معاد ہے۔

۲۔ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ: یہ لوگ تاریخ انسان کے ان گمراہ لوگوں میں شامل ہیں جن کے بارے میں فیصلہ حتمی ہو چکا ہے کہ یہ اپنی ابدی زندگی کا خسارہ اٹھانے والے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ انسان کا عمل اس کی ابدی زندگی کی قسمت کا تعین کرتا ہے۔

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ وَلِيُوَفِّيَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ⑲	۱۹۔ اور ہر ایک کے لیے اپنے اعمال کے مطابق درجات ہیں تاکہ انہیں ان کے اعمال کا (بدلہ) پورا دیا جائے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ: نیک عمل کرنے والے ہوں یا برے عمل، دونوں میں سے ہر ایک کے لیے اس کے عمل کے مطابق درجہ بندی موجود ہے۔ یہاں نیک و بد دونوں کے لیے لفظ درجات از باب تغلیب استعمال ہوا ہے۔ ورنہ اچھے لوگوں کے لیے درجات اور برے لوگوں کے لیے درکات کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

۲۔ وَلِيُوَفِّيَهُمْ اَعْمَالَهُمْ: ان کے اعمال کا بدلہ پورا دیا جائے گا۔ کسی کے عمل خیر اور عمل بد کا بدلہ پورا دیا جائے گا۔

۳۔ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ: کسی کی حق تلفی نہ ہوگی بلکہ دیگر آیت میں فرمایا ہے: ان کے عمل کے اجر وثواب کا جتنا حق بنتا ہے اس سے زیادہ دیا جائے گا اور کسی کے عمل بد کو معاف کیا جائے گا، اگر توبہ عمل میں آ جاتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ ہر عمل کے بدلہ اور درجہ بندی کا تعین ہو چکا ہے۔

وَ یَوۡمَ یُعۡرَضُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا عَلَی النَّارِ ؕ اَذۡہَبۡتُمۡ طَیِّبٰتِکُمۡ فِیۡ حَیَاتِکُمُ الدُّنۡیَا وَ اسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِہَا ۚ فَالۡیَوۡمَ تُجۡزَوۡنَ عَذَابَ الۡہُوۡنِ بِمَا کُنۡتُمۡ تَسۡتَکۡبِرُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ وَ بِمَا کُنۡتُمۡ تَفۡسُقُوۡنَ ﴿۲۰﴾ ع ۲

۲۰۔ اور جس روز کفار آگ کے سامنے لائے جائیں گے (تو ان سے کہا جائے گا) تم نے اپنی نعمتوں کو دنیاوی زندگی میں ہی برباد کر دیا اور ان سے لطف اندوز ہو چکے، پس آج تمہیں ذلت کے عذاب کی سزا اس لیے دی جائے گی کہ تم زمین میں ناحق تکبر کرتے رہے اور بدکاری کرتے رہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ یَوۡمَ یُعۡرَضُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا عَلَی النَّارِ: جس روز کفار کو آتش جہنم ڈالنے کا فیصلہ ہو جائے گا، انہیں آتش جہنم کے سامنے لایا جائے گا اور وہ جہنم کی آتش کا مشاہدہ کریں گے اس یقین کے ساتھ کہ ہم اس آتش میں ہمیشہ کے لیے جانے والے ہیں،

۲۔ اَذۡہَبۡتُمۡ طَیِّبٰتِکُمۡ فِیۡ حَیَاتِکُمُ الدُّنۡیَا: تو ان کفار سے کہا جائے گا: تم اپنے حصے کی نعمتیں دنیا میں تباہ کر کے آئے ہو۔ اگر تم آج کے دن کے لیے کوئی نعمت لے کر آتے تو تمہیں وہ ضرور مل جاتی لیکن تم آج کے لیے کسی قسم کی نعمت ہمراہ لانے کی جگہ عذاب لے کر آئے ہو۔

۳۔ فَالۡیَوۡمَ تُجۡزَوۡنَ عَذَابَ الۡہُوۡنِ: آج ذلت کا عذاب چکھنا ہو گا۔ یہ ذلت اس تکبر کا نتیجہ ہے جو تم دنیا میں اللہ کے رسول اور اس پر ایمان لانے والے مومنین کے مقابلے میں کیا کرتے تھے اور ساتھ فسق و فجور کا بھی ارتکاب کیا کرتے تھے۔

اہم نکات

۱۔ حکم اللہ کی تعمیل میں تکبر اور فسق و فجور سے قیامت کی نعمتیں تباہ ہو جاتی ہیں۔

وَ اذۡکُرۡ اَخَا عَادٍ ؕ اِذۡ اَنۡذَرَ قَوۡمَہٗ

۲۱۔ اور (قوم) عاد کے بھائی (ہود) کو یاد کیجیے جب

بِالۡاَحۡقَافِ وَقَدۡ خَلَتِ النُّذُرُ مِنۡۢ بَیۡنِ یَدَیۡہِ وَمِنۡ خَلۡفِہٖۤ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰہَ ؕ اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ﴿۲۱﴾	انہوں نے احقاف (کی سرزمین) میں اپنی قوم کو تنبیہ کی اور ان سے پہلے اور بعد میں بھی تنبیہ کرنے والے گزر چکے ہیں کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، مجھے تمہارے بارے میں بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَاذۡکُرۡ اَخَا عَادٍ: ہود کا ذکر کیجیے۔ حضرت ہود علیہ السلام قوم عاد ہی کا ایک فرد تھے۔ اس لیے انہیں اَخَا عَادٍ کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

۲۔ اِذۡ اَنۡذَرَ قَوۡمَہٗ بِالۡاَحۡقَافِ: ہود علیہ السلام کو الاحقاف کی باشندہ قوم کی طرف مبعوث کیا گیا۔ الاحقاف، حقف کی جمع ہے۔ لغت میں ریت کے لمبے اور اونچے ٹیلوں کو کہتے ہیں جو ہواؤں کی وجہ سے بنتے ہوتے ہیں۔

صحرائے عرب کے جنوب مغربی علاقے کو الاحقاف کہتے ہیں۔ ممکن ہے ہزاروں سال قبل یہ علاقہ نہایت سرسبز رہا ہو۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ حضرموت اور عمان کا درمیانی علاقہ احقاف کا علاقہ ہے۔ کہتے ہیں اس علاقے کی ریت اس قدر باریک ہے کہ اس میں کوئی چیز گر جائے تو وہ ریت میں غرق ہوتی چلی جاتی ہے اور بوسیدہ ہو جاتی ہے۔ اسی لیے یہ علاقہ اس قدر خوفناک ہے کہ وہاں جانے کی کوئی ہمت نہیں کرتا۔ بنا بر قولے یہی علاقہ وادی برہوت ہے۔ ایک روایت میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام الاحقاف سے آنے والے ایک اعرابی سے فرمایا:

ان من ورائکم لوادیا یقال البرھوت تسکنه البوم و الھام یعذب فیه ارواح المشرکین....[1]	تمہارے علاقے کے پیچھے ایک وادی ہے جسے برہوت کہتے ہیں جہاں کیڑے مکوڑے ہوتے ہیں جو مشرکین کی ارواح کو عذاب دیتے ہیں۔

ایک حدیث نبوی میں ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

وَ خَیۡرُ مَاءٍ عَلَی وَجۡهِ الۡاَرۡضِ مَاءُ زَمۡزَمَ وَ شَرُّ مَاءٍ عَلَی وَجۡهِ الۡاَرۡضِ مَاءُ بَرَهُوتَ وَ هُوَ وَادٍ بِحَضۡرَمَوۡتَ یَرِدُ عَلَیۡهِ هَامُ الۡکُفَّارِ وَ صَدَاهُمۡ.[2]	روئے زمین پر بہترین پانی زم زم کا پانی ہے اور روئے زمین پر بدترین پانی برہوت کا پانی ہے۔ یہ پانی حضرموت کے علاقے میں کفار کی کھوپڑیوں اور دماغ تک پہنچ جاتا ہے۔

---

[1] بحار الانوار ۶۱: ۳۳۱ [2] الکافی ۳: ۲۴۶

۲۔ وَقَدۡخَلَتِ النُّذُرُ: النُّذُرُ نذیر کی جمع ہے۔ یعنی الاحقاف کے علاقوں میں بہت سے انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے ہیں۔

۳۔ مِنۡۢ بَیۡنِ یَدَیۡہِ وَمِنۡ خَلۡفِہٖۤ: کچھ انبیاء علیہم السلام حضرت ہود علیہ السلام سے پہلے اور بعد گزرے ہیں۔ خَلَتِ کی تعبیر وقت نزول قرآن کے اعتبار سے ہے لہٰذا مِنۡ خَلۡفِہٖۤ اور خَلَتِ میں کوئی منافات نہیں ہے۔

۴۔ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰہَ: ہود اور تمام انبیاء علیہم السلام جو اس علاقے میں مبعوث ہوئے، ایک دعوت لے کر آئے۔ وہ یہ کہ صرف اللہ کی عبادت کی جائے اور غیر اللہ کی بندگی ترک کرو۔

۴۔ اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ: یوم عظیم کے عذاب سے مراد قیامت کے دن کا عذاب ہے جس سے غیر اللہ کی عبارت کرنے والے دوچار ہوں گے۔

قَالُوۡۤا اَجِئۡتَنَا لِتَاۡفِکَنَا عَنۡ اٰلِـہَتِنَا ۚ فَاۡتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنۡ کُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ ﴿۲۲﴾

۲۲۔ وہ کہنے لگے: کیا تم ہمیں ہمارے معبودوں سے باز رکھنے کے لیے ہمارے پاس آئے ہو؟ اگر تم سچے ہو تو لے آؤ وہ (عذاب) جس سے تم ہمیں ڈرا رہے ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالُوۡۤا: ہود کی قوم نے کہا: کیا تم ہمارے آبائی مذہب کو ترک کرنے کی دعوت دینے آئے ہو کہ ہم اپنے معبووں کو تیرے کہنے پر ترک کریں؟

۲۔ فَاۡتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ: وہ عذاب لے آ جس کی تو ہمیں دھمکی دے رہا ہے۔ تم جس عذاب سے ہمیں ڈراتے ہو اس عذب کے آنے پر تم سچے ثابت ہو سکتے ہو۔

قَالَ اِنَّمَا الۡعِلۡمُ عِنۡدَ اللّٰہِ ۫ۖ وَ اُبَلِّغُکُمۡ مَّاۤ اُرۡسِلۡتُ بِہٖ وَ لٰکِنِّیۡۤ اَرٰىکُمۡ قَوۡمًا تَجۡہَلُوۡنَ ﴿۲۳﴾

۲۳۔ انہوں نے کہا: (اس کا) علم تو صرف اللہ ہی کے پاس ہے اور جس پیغام کے ساتھ مجھے بھیجا گیا تھا وہ تمہیں پہنچا رہا ہوں لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تم ایک نادان قوم ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالَ اِنَّمَا الۡعِلۡمُ عِنۡدَ اللّٰہِ: جواب میں حضرت ہود علیہ السلام نے فرمایا: وہ عذاب تم پر کب اور کس

وقت آنا ہے؟ اس کا علم اللہ کے پاس ہے۔ وقت کا تعین علم خدا میں ہے۔ یہ میری ذمہ داری میں نہیں ہے۔

۲۔ وَ اُبَلِّغُکُمۡ مَّاۤ اُرۡسِلۡتُ بِہٖ: میری ذمہ داری صرف یہ ہے کہ جو پیغام دے کر مجھے تمہاری طرف بھیجا گیا ہے اسے تم تک پہنچا دوں۔

۳۔ اَرٰىکُمۡ قَوۡمًا تَجۡہَلُوۡنَ: عذاب کی عجلت مچانا تمہاری جہالت کی وجہ سے ہے۔ اگر تمہیں اس کا کچھ شائبہ ہوتا تو اس عذاب کا نام سن کر کانپ جاتے۔

اہم نکات

۱۔ جاہل اپنی عاقبت کے بارے میں لاپرواہ ہوتا ہے۔

فَلَمَّا رَاَوۡہُ عَارِضًا مُّسۡتَقۡبِلَ اَوۡدِیَتِہِمۡ ۙ قَالُوۡا ہٰذَا عَارِضٌ مُّمۡطِرُنَا ؕ بَلۡ ہُوَ مَا اسۡتَعۡجَلۡتُمۡ بِہٖ ؕ رِیۡحٌ فِیۡہَا عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۲۴﴾

۲۴۔ پھر جب انہوں نے عذاب کو بادل کی صورت میں اپنی وادیوں کی طرف آتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگے: یہ تو ہمیں بارش دینے والا بادل ہے، (نہیں) بلکہ یہ وہ عذاب ہے جس کی تمہیں عجلت تھی (یعنی) آندھی جس میں ایک دردناک عذاب ہے۔

تشریح کلمات

عارض: (ع ر ض) اس بادل کو کہتے ہیں جو شام کے وقت آسمان کی ایک طرف سے نمودار ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ فَلَمَّا رَاَوۡہُ عَارِضًا: کہتے ہیں قوم ہود خشک سالی کی وجہ سے قحط اور گرمی کی شدت میں مبتلا تھے۔ سیاہ بادل دیکھ کر خوش ہوئے۔

۲۔ قَالُوۡا ہٰذَا عَارِضٌ: اور کہنے لگے یہ ہمیں بارش دینے والا بادل ہے۔ خشک سالی ختم ہو گی اور خوشحالی آنے والی ہے۔

۳۔ بَلۡ ہُوَ مَا اسۡتَعۡجَلۡتُمۡ بِہٖ: خوشحالی آنے والی نہیں ہے بلکہ تباہی آنے والی ہے۔ وہی تباہی جس کی تم عجلت مچاتے اور کہتے تھے: اے ہود اگر تو سچا ہے تو وہ عذاب آتا کیوں نہیں ہے؟

۴۔ رِیۡحٌ فِیۡہَا عَذَابٌ اَلِیۡمٌ: یہ بادل وہ طوفان لے کر آ رہا ہے جس میں تمہاری تباہی اور نابودی پر مشتمل عظیم عذاب ہے۔

تُدَمِّرُ کُلَّ شَیۡءٍۭ بِاَمۡرِ رَبِّہَا فَاَصۡبَحُوۡا لَا یُرٰۤی اِلَّا مَسٰکِنُہُمۡ ؕ کَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡقَوۡمَ الۡمُجۡرِمِیۡنَ ﴿۲۵﴾

۲۵۔ جو اپنے رب کے حکم سے ہر چیز کو تباہ کر دے گی، پھر وہ ایسے ہو گئے کہ ان کے گھروں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا، مجرم قوم کو ہم اس طرح سزا دیا کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

ا۔ تُدَمِّرُ کُلَّ شَیۡءٍ: یہ طوفان ہر چیز کو تباہ کرنے والا ہے۔ یہاں ہر چیز سے مراد ہر وہ چیز ہے جو انسان کو بچانے اور زندہ رہنے کے لے ضروری ہے۔ یہ ہوا چند دن جاری رہی۔ چنانچہ سورہ حاقۃ آیت ۷ میں فرمایا:

سَخَّرَهَا عَلَيۡهِمۡ سَبۡعَ لَيَالٍ وَّ ثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ....

جسے اس نے مسلسل سات راتوں اور آٹھ دنوں تک ان پر مسلط رکھا۔

ظاہر ہے اس سے علاقے کی ریت نے انہیں دبایا ہو گا اور یہ بوسیدہ ہو چکے ہوں گے۔ صرف گھروں کی نشانیاں رہ گئی ہوں۔

وَ لَقَدۡ مَکَّنّٰہُمۡ فِیۡمَاۤ اِنۡ مَّکَّنّٰکُمۡ فِیۡہِ وَ جَعَلۡنَا لَہُمۡ سَمۡعًا وَّ اَبۡصَارًا وَّ اَفۡـِٕدَۃً ۫ۖ فَمَاۤ اَغۡنٰی عَنۡہُمۡ سَمۡعُہُمۡ وَ لَاۤ اَبۡصَارُہُمۡ وَ لَاۤ اَفۡـِٕدَتُہُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِذۡ کَانُوۡا یَجۡحَدُوۡنَ ۙ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَ حَاقَ بِہِمۡ مَّا کَانُوۡا بِہٖ یَسۡتَہۡزِءُوۡنَ ﴿۲۶﴾ ع

۲۶۔اور بتحقیق انہیں ہم نے وہ قدرت دی جو قدرت ہم نے تم لوگوں کو نہیں دی اور ہم نے انہیں سماعت اور بصارت اور قلب عطا کیے تو جب انہوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا تو نہ ان کی سماعت نے انہیں کوئی فائدہ دیا اور نہ ہی ان کی بصارت نے اور نہ ان کے قلوب نے اور جس چیز کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے وہ اسی چیز کے نرغے میں آ گئے۔

تفسیر آیات

ا۔ وَلَقَدۡ مَکَّنّٰہُمۡ: اہل مکہ سے خطاب ہے: احقاف والوں کو ہم نے وہ قدرت، اقتدار اور مال و دولت دی تھی جو تمہیں نہیں دی۔ احقاف والے ایک اہم تمدن کے مالک تھے۔ تم گدلا پانی پینے والے ہو۔

۲۔ وَجَعَلۡنَا لَہُمۡ سَمۡعًا: ہم نے احقاف والوں کو حق شناسی کے تمام اوزار فراہم کیے۔ سماعت اور

بصارت، عقل کے لیے آلۂ کار ہیں اور جب عقل پر خواہشات و دیگر منفی عوامل غالب آ جاتے ہیں تو یہ آلۂ کار اپنے مقاصد پورے نہیں کر سکتے۔ آواز کانوں میں تو جاتی ہے لیکن معانی و مطالب کو عقل وصول نہیں کرتی۔ اسی طرح نقش آنکھوں میں آ جاتا ہے مگر عقل حقائق اپنی گرفت میں نہیں لیتی۔

۳۔ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ: ان حقائق کا ادراک اس لیے نہیں ہو سکا اور ان کی عقل نے کام اس لیے نہیں کیا چونکہ آیات الٰہی کا انکار ان لوگوں نے اپنے ذہنوں میں راسخ کر رکھا تھا جس سے ان کی عقل اندھی ہو گئی تھی۔

اہم نکات

۱۔ عقل اس وقت اپنا کام نہیں کر سکتی جب اس پر کوئی باطل نظریہ مسلط کیا جائے۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴿۲۷﴾

۲۷۔ اور بتحقیق ہم نے تمہارے گرد و پیش کی بستیوں کو تباہ کر دیا اور ہم نے (اپنی) نشانیوں کو بار بار ظاہر کیا تا کہ وہ باز آ جائیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ: خطاب مشرکین مکہ سے کہ ہم نے تمہارے گرد و پیش میں موجود بہت بستیوں کو نابود کیا۔ اس نابودی اور دیگر قوموں کی نابودی کا ذکر اس سے پہلے کی آیات میں آ گیا ہے۔ ان میں سے ایک احقاف میں موجود بستیاں ہیں۔ ان بستیوں کا علم اہل مکہ کو بھی تھا۔

بعض اہل تحقیق مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى سے مراد ہمارے نظام شمسی میں موجود دیگر کرات لیتے ہیں یعنی زہرہ مریخ وغیرہ۔ وہ کہتے ہیں:

> جیسے آج ہماری موجودہ زمین والوں کو جس عذاب سے متنبہ کیا جا رہا ہے وہ سابق ہی میں مریخ وغیرہ کی زمینوں پر بعینہ نازل ہو بھی چکا ہے۔ وہاں ماضی میں جاری و ساری تہذیب وتمدن کا کوئی نشان تک باقی نہیں رہ سکا۔
>
> (مولانا سعید الرحمٰن ماہنامہ الحق شمارہ ستمبر ۲۰۰۹)

لیکن یہ ظاہر قرآن کے خلاف ہے کہ دیگر کرہ ہائے آسمانی کو الْقُرٰى (بستیوں) سے تعبیر کیا جائے اور عربی بدوؤں کو ایسے حقائق کا مخاطب قرار دیا جائے جو ان کے لیے تو دور کی بات ہیں، آج بھی لوگوں کے لیے قابل خطاب نہیں ہیں۔ جن کی تباہی کا علم نہ ہو وہ ان کے لیے نشان عبرت کیسے بنے؟

فَلَوۡ لَا نَصَرَهُمُ الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ قُرۡبَانًا اٰلِهَةً ؕ بَلۡ ضَلُّوۡا عَنۡهُمۡ ۚ وَ ذٰلِكَ اِفۡكُهُمۡ وَ مَا كَانُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ ﴿۲۸﴾	۲۸۔ پس انہوں نے قرب الٰہی کے لیے اللہ کے سوا جنہیں اپنا معبود بنا لیا تھا انہوں نے ان کی مدد کیوں نہ کی؟ بلکہ وہ تو ان سے غائب ہو گئے اور یہ ان کا جھوٹ تھا اور وہ بہتان جو وہ گھڑتے تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَلَوۡ لَا نَصَرَهُمُ: قیامت کے دن ان مشرکوں سے کہا جائے گا جنہوں نے اپنے بتوں کو اس لیے معبود بنایا تھا کہ ان سے اللہ کا قرب حاصل کریں۔ اور وہ کہتے تھے:

مَا نَعۡبُدُهُمۡ اِلَّا لِيُقَرِّبُوۡنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلۡفٰى ...[1]	ہم انہیں صرف اس لیے پوجتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کا مقرب بنا دیں۔

ان مشرکین سے کہا جائے گا: آج ان معبودوں نے تمہاری مدد کیوں نہیں کی۔ نہ صرف مدد نہیں کی بلکہ ان کا وجود تک دکھائی نہیں دیتا۔

۲۔ وَ ذٰلِكَ اِفۡكُهُمۡ: یہ ان مشرکین کا جھوٹ اور واہمہ تھا۔ کسی حقیقی چیز کو وہ پوجتے نہیں تھے۔

۳۔ وَ مَا كَانُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ: اورانہوں نے جھوٹے معبود افتراء کیے تھے جس کی وجہ سے آج وہ ناپید ہیں۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کے علاوہ جسے بھی معبود بنایا جائے وہ جھوٹ، افتراء ہے۔

وَ اِذۡ صَرَفۡنَاۤ اِلَيۡكَ نَفَرًا مِّنَ الۡجِنِّ يَسۡتَمِعُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوۡهُ قَالُوۡۤا اَنۡصِتُوۡا ۚ فَلَمَّا قُضِىَ وَلَّوۡا اِلٰى قَوۡمِهِمۡ مُّنۡذِرِيۡنَ ﴿۲۹﴾	۲۹۔ اور (یاد کیجیے) جب ہم نے جنات کے ایک گروہ کو آپ کی طرف متوجہ کیا تاکہ قرآن سنیں، پس جب وہ رسول کے پاس حاضر ہو گئے تو (آپس میں) کہنے لگے: خاموش ہو جاؤ! جب تلاوت ختم ہو گئی تو وہ تنبیہ (ہدایت) کرنے اپنی قوم کی طرف واپس لوٹ گئے۔

---

[1] ۳۹ زمر: ۳

تفسیر آیات

اس آیت کے شان نزول کے بارے میں ابن عباس اور سعید بن جبیر کی روایت ہے کہ رسالتمآب ﷺ طائف کے لوگوں سے ناامید ہو کر واپس مکہ کی طرف روانہ ہوئے تو آپؐ بطن نخلۃ نامی جگہ فجر کی نماز میں قرآن کی تلاوت فرما رہے تھے۔ اس وقت وہاں سے جنات کے ایک قافلے کا گزر ہوا تو انہوں نے قرآن کی تلاوت سنی۔

۱۔ وَ اِذۡ صَرَفۡنَاۤ اِلَیۡکَ: جنوں کے اس گروہ کو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی طرف بھیجا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جنات بھی انسانوں کی طرح مکلّف ہیں۔

۲۔ فَلَمَّا حَضَرُوۡہُ قَالُوۡۤا اَنۡصِتُوۡا: جب وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بعض کے نزدیک حَضَرُوۡہُ کی ضمیر قرآن کی طرف ہے۔

۳۔ قَالُوۡۤا اَنۡصِتُوۡا: آپس میں کہنے لگے خاموش رہو۔ یعنی خاموشی اور توجہ سے اس کلام کو سنو۔ قرآن کے کلمات اور لہجۂ رسول نے ان کی توجہ مبذول کی کہ یہ کوئی معمولی کلام نہیں ہے۔

۴۔ فَلَمَّا قُضِیَ وَلَّوۡا اِلٰی قَوۡمِہِمۡ مُّنۡذِرِیۡنَ: جب تلاوت ختم ہو گئی اور معلوم ہوا یہ مخلوق کا کلام نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آئے اور رسول اللہ ﷺ نے انہیں اپنی قوم کی طرف مبلغ بنا کر روانہ فرمایا۔

قَالُوۡا یٰقَوۡمَنَاۤ اِنَّا سَمِعۡنَا کِتٰبًا اُنۡزِلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مُوۡسٰی مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ یَہۡدِیۡۤ اِلَی الۡحَقِّ وَ اِلٰی طَرِیۡقٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۳۰﴾

۳۰۔ انہوں نے کہا: اے ہماری قوم! ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے، وہ حق اور راہ راست کی طرف ہدایت کرتی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالُوۡا: ان افراد نے اپنی قوم میں جا کر قرآن مجید کا اس طرح تعارف کرایا: ہم نے ایک کتاب کی تلاوت سنی ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد نازل ہوئی ہے۔ یعنی توریت کے بعد۔ توریت کے بعد کہا، انجیل کے بعد نہیں کہا۔ شاید اس لیے کہ توریت کو یہودی مسیحی دونوں قبول کرتے ہیں۔ ممکن ہے ان کی قوم میں یہودی و عیسائی دونوں ہوں اور ان کی تبلیغ کا رخ دونوں کی طرف ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان کی قوم یہودی ہو۔

۲۔ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ: یہ کتب آسمانی سے مختلف کتاب نہیں ہے بلکہ ان آسمانی کتابوں کا

تسلسل ہے۔ دلیل یہ ہے کہ قرآن سابقہ کتب آسمانی کی تصدیق و تائید کرتا ہے۔ یہ سب اللہ کی طرف سے ہیں۔

۴۔ یَهۡدِیۡۤ اِلَی الۡحَقِّ: یہ کتاب حق اور حقیقت کی طرف ہدایت کرتی ہے لہٰذا حق کی تلاش رکھنے والوں کو اس کتاب پر ایمان لانا چاہیے۔

۵۔ وَ اِلٰی طَرِیۡقٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ: اس حق تک رسائی حاصل کرنے کے لیے یہ کتاب سیدھے راستے کی راہنمائی کرتی ہے۔ یعنی یہ کتاب حق کی نشاندہی کرتی اور ساتھ اس حق تک رسائی بھی دیتی ہے۔

یٰقَوۡمَنَاۤ اَجِیۡبُوۡا دَاعِیَ اللّٰهِ وَ اٰمِنُوۡا بِهٖ یَغۡفِرۡ لَکُمۡ مِّنۡ ذُنُوۡبِکُمۡ وَ یُجِرۡکُمۡ مِّنۡ عَذَابٍ اَلِیۡمٍ ﴿۳۱﴾

۳۱۔ اے ہماری قوم! اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت قبول کرو اور اس پر ایمان لے آؤ کہ اللہ تمہارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا اور تمہیں دردناک عذاب سے بچائے گا۔

تفسیر آیات

۱۔ یٰقَوۡمَنَاۤ اَجِیۡبُوۡا دَاعِیَ اللّٰهِ: جنات نے رسول اللہ ﷺ کا تعارف داعی اللہ سے کرایا کہ اللہ کا نمائندہ اللہ کی طرف سے دعوت دینے والا ہے۔ اس کی دعوت کو قبول کرو۔ اس پر ایمان لے آؤ۔

۲۔ یَغۡفِرۡ لَکُمۡ: اس دعوت کو قبول کرنے اور ایمان لانے کے دو نتائج کا ذکر ہے: ایک یہ کہ گزشتہ شرک و کفر و دیگر جرائم معاف ہو جائیں گے چونکہ ایمان تمام جرائم کا کفارہ ہے اور دوسرا یہ کہ عذاب سے نجات مل جائے گی چونکہ معاف ہونے کا مطلب عذاب نہ ہونا ہے۔

اہم نکات

۱۔ ایمان سابقہ تمام گناہوں کا کفارہ ہے۔

وَ مَنۡ لَّا یُجِبۡ دَاعِیَ اللّٰهِ فَلَیۡسَ بِمُعۡجِزٍ فِی الۡاَرۡضِ وَ لَیۡسَ لَهٗ مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اَوۡلِیَآءُ ؕ اُولٰٓئِکَ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۳۲﴾

۳۲۔ اور جو اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت قبول نہیں کرتا وہ زمین میں (اللہ کو) عاجز نہیں کر سکے گا اور اللہ کے سوا اس کا کوئی سرپرست بھی نہیں ہو گا، یہی لوگ کھلی گمراہی میں ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ مَنۡ لَّا یُجِبۡ دَاعِیَ اللّٰهِ: جنات کے مبلغین اپنی قوم کو اس نکتے کی طرف متوجہ کرا رہے ہیں کہ اس دعوت پر لبیک نہ کہنے سے خود تمہارا اپنا نقصان ہو گا۔ اللہ کو اس سے کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے نہ ہی

تمہارے اس انکار پر اللہ کو مواخذہ کرنے سے کوئی روک سکتا ہے: فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ۔

طبرسی نے الاحتجاج میں روایت کی ہے کہ ایک یہودی نے حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام سے کہا:
حضرت سلیمان کے لیے جنات مسخر تھے اور ان کے لیے محرابیں اور تمثالیں بناتے تھے۔
حضرت علیہ السلام نے جواب میں فرمایا:
حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس سے افضل عطا ہوا ہے۔ سلیمان کے لیے کافر جنات مسخر تھے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے جنات، ایمان کے لیے مسخر ہوئے ہیں۔ چنانچہ آپؐ کی خدمت میں جنات کے نو روسائے قبائل حاضر ہوئے۔ ایک رئیس قبیلہ نصیبین سے اور آٹھ سردار احجر کے عمرو بن عامر کی اولاد سے ...الخ

اَوَلَمۡ يَرَوۡا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِىۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَلَمۡ يَعۡىَ بِخَلۡقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنۡ يُّحۡیِۦَ الۡمَوۡتٰى ؕ بَلٰٓى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۳۳﴾

۳۳۔ کیا وہ نہیں دیکھتے کہ جس اللہ نے آسمانوں اور زمین کو خلق فرمایا ہے اور جو ان کے خلق کرنے سے عاجز نہیں آیا وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ مردوں کو زندہ کر دے؟ ہاں! وہ یقیناً ہر چیز پر قادر ہے۔

تشریح کلمات

يَعۡىَ: (ع ی ی) العی عاجز آنے کے معنوں میں زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ کہتے ہیں: و قد عیّ عن حجته عيًّا وہ دلیل قائم کرنے سے عاجز رہ گیا۔ (العین) الداء العیاء اس بیماری کو کہتے ہیں جس کا علاج نہ ہو۔ قرآن میں اسی معنوں میں استعمال ہوا ہے:

اَفَعَيِيۡنَا بِالۡخَلۡقِ الۡاَوَّلِ ....[1] کیا ہم پہلی بار کی تخلیق سے عاجز آ گئے تھے؟

یعنی جو ذات ایک بیکراں کائنات کو عدم سے وجود میں لانے پر قادر ہے وہ اس موجود انسان کو دوبارہ وجود میں لا سکتی ہے۔ اس آیت کی مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ یٰسٓ آیت ۸۱

تفسیر آیات

اس آیت میں العیُّ کے معنی میں تھک جانے کے بھی کیے جاتے ہیں۔ ہم نے عاجز ہونے کے معنی مراد لیے ہیں۔ لغت کے اعتبار سے بھی یہ لفظ عاجز ہونے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور مشرکین حیات بعد موت کے امکان کے منکر تھے یعنی اللہ کو عاجز تصور کرتے تھے۔ جو لوگ العیّ کو تھکاوٹ کے معنی میں لیتے

---

[1] ۵۰ق: ۱۵

ہیں وہ کہتے ہیں: اس سے یہود کی رد مراد ہے جو کہتے ہیں: خدا چھ دنوں میں کائنات کی تخلیق کے بعد تھک گیا تھا۔ یہ معنی سیاق آیت کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتے چونکہ آیت مشرکین کی رد میں ہے، اہل کتاب کی رد میں نہیں ہے۔

وَ یَوۡمَ یُعۡرَضُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا عَلَی النَّارِ ؕ اَلَیۡسَ ہٰذَا بِالۡحَقِّ ؕ قَالُوۡا بَلٰی وَ رَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ بِمَا کُنۡتُمۡ تَکۡفُرُوۡنَ ﴿۳۴﴾

۳۴۔ اور جس روز کفار آگ کے سامنے لائے جائیں گے (اس وقت ان سے پوچھا جائے گا) کیا یہ برحق نہیں ہے؟ وہ کہیں گے: ہاں! ہمارے پروردگار کی قسم (یہ حق ہے) اللہ فرمائے گا: پھر عذاب چکھو اپنے اس کفر کی پاداش میں جو تم کرتے رہے ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ یَوۡمَ یُعۡرَضُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا عَلَی النَّارِ: جب کافروں کو آگ کے سامنے لایا جائے گا اور جس عذاب کی انہیں تنبیہ کی گئی تھی جب وہ سامنے آچکا ہو گا تو ان سے طنزاً کہا جائے گا:

۲۔ اَلَیۡسَ ہٰذَا بِالۡحَقِّ: کیا یہ حق نہ تھا؟ یا یہ داستانہائے پارینہ تھا؟ اور ہمارے رسول نے خود سے گڑھ دیا تھا؟

۳۔ قَالُوۡا بَلٰی وَ رَبِّنَا: کافروں کو اعتراف کرنا پڑے گا: ہاں! یہ حق ہے۔ چونکہ جب عذاب سامنے ہو گا تو اسے جھٹلانا ممکن نہ ہو گا:

اِذَا وَقَعَتِ الۡوَاقِعَۃُ ۙ لَیۡسَ لِوَقۡعَتِہَا کَاذِبَۃٌ ۘ[۱]

۱۔ جب ہونے والا واقعہ ہو چکے گا۔ تو اس کے وقوع کو جھٹلانے والا کوئی نہ ہو گا۔

۴۔ قَالَ فَذُوۡقُوا: ان سے کہا جائے گا: اگر یہ عذاب برحق ہے تو پھر اسے چکھ لو۔ تم دنیا میں اسی عذاب کے منکر تھے۔ اب اس انکار کا نتیجہ بھگت لو۔

فَاصۡبِرۡ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الۡعَزۡمِ مِنَ الرُّسُلِ وَ لَا تَسۡتَعۡجِلۡ لَّہُمۡ ؕ کَاَنَّہُمۡ یَوۡمَ یَرَوۡنَ مَا یُوۡعَدُوۡنَ ۙ

۳۵۔ پس (اے رسول) صبر کیجیے جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا اور ان کے لیے (طلب عذاب میں) جلدی نہ کیجیے جس دن یہ اس عذاب کو دیکھیں گے جس کا انہیں خوف دلایا جا رہا ہے تو

---

[۱] ۵۶ واقعۃ: ۱۔ ۲

لَمۡ یَلۡبَثُوۡۤا اِلَّا سَاعَۃً مِّنۡ نَّہَارٍ ؕ بَلٰغٌ ۚ فَہَلۡ یُہۡلَکُ اِلَّا الۡقَوۡمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۳۵﴾

انہیں یوں محسوس ہوگا گویا (دنیا میں دن کی) ایک گھڑی بھر سے زیادہ نہیں رہے، (یہ ایک) پیغام ہے، پس وہی لوگ ہلاکت میں جائیں گے جو فاسق ہیں۔

تفسیر آیات

ا۔ فَاصۡبِرۡ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الۡعَزۡمِ: اے رسول! اولوا العزم رسولوں کی طرح صبر کرو۔ اولوا العزم کے لفظی معنی ہیں صاحبان عزم۔ عزم ارادے کو کہتے ہیں:

فَاِذَا عَزَمۡتَ فَتَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ ...[1] پھر جب آپ عزم کر لیں تو اللہ پر بھروسہ کریں۔

اور سورہ شوری میں صبر اور درگزر کو عزم کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ عزم و ارادہ اگر پختہ ہو اور عزم میں کسی قسم کا تزلزل نہ ہو تو اس کے اثرات عام حالات میں بھی حیرت انگیز ہوتے ہیں اور اگر اس عزم کا تعلق ارادۂ الٰہی سے ہو تو اس عزم کی طاقت بھی الٰہی ہو جاتی ہے۔ اس لیے صبر کے لیے عزم درکار ہوتا ہے۔ عزم و ارادے میں کمزوری رکھنے والا صبر نہیں کر سکتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو صبر کے حکم کے ساتھ صاحب عزم ہونے کا بھی عندیہ دیا جا رہا ہے۔

عزم سے مراد عزیمت اور شریعت ہے۔ ہمارے نزدیک صاحبان شریعت انبیاء اولوالعزم ہیں اور وہ پانچ انبیاء علیہم السلام ہیں۔ حضرات نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ اور خاتم الانبیاء صلوات اللہ علیہم اجمعین۔ چنانچہ فرمایا:

شَرَعَ لَکُمۡ مِّنَ الدِّیۡنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوۡحًا وَّ الَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ وَ مَا وَصَّیۡنَا بِہٖۤ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ مُوۡسٰی وَ عِیۡسٰۤی ...[2] اس نے تمہارے لیے دین کا وہی دستور معین کیا جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا اور جس کی ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی ہے اور جس کا ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا۔

اس آیت میں مذکور انبیاء علیہم السلام کو صاحب شریعت بتایا ہے اور ائمہ اہل البیت علیہم السلام کی طرف سے متعدد روایات سے بھی یہی ثابت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو صبر کا حکم ہے کہ اولوالعزمی صبر کا مظاہرہ کریں۔ اگرچہ آپؐ نے فرمایا:

ما اوذی نبی مثل ما اوذیت....[3] کسی نبی کو اتنی اذیت نہیں دی گئی جتنی مجھے اذیت دی گئی ہے۔

یتیم پیدا ہوئے۔ بچپن میں ماں کا سایہ اٹھ گیا۔ باپ ماں کا سایہ نہیں، اب وفادار بیوی اور عظیم محافظ چاچا سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔ ہر طرف سے حملہ، تمسخر اور ایذا رسانی ہے۔ لوگ آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی

---
[1] ۳ آل عمران: ۱۵۹ [2] ۴۲ شوری: ۱۳

طرف پتھر مارتے ہیں، دونوں پائے مبارک سے خون جاری ہو جاتا ہے مگر صبر و استقامت کے کوہ گراں فرماتے ہیں:

اللّٰھم اھدقومی فانھم لا یعلمون۔ [1]	اے اللہ! میری قوم کی ہدایت فرما یہ جانتے نہیں ہیں۔

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا:

یاعائشه! ان الدنیا لا تنبغی لمحمد ولا لآل محمد یا عائشه! ان اللّٰه لم یرض من اولی العزم من الرسل الا الصبر علی مکروهها۔ [3]	اے عائشہ! محمد اور آل محمد کے لیے دنیا شائستہ نہیں ہے۔ اے عائشہ! اللہ تعالیٰ رسولوں میں سے جو اولوالعزم ہیں ان سے دنیا کے مصائب پر صرف صبر پسند فرماتا ہے۔

۲۔ وَلَا تَسۡتَعۡجِلۡ لَّهُمۡ : ان کے لیے طلب عذاب میں عجلت سے کام نہ لیں۔ رسول اللہ ﷺ نے عذاب طلب نہیں کیا لیکن رسول اللہ ﷺ ایسے حالات سے دوچار تھے کہ عذاب الٰہی کے سوا اس قوم کا کوئی علاج نہ تھا۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ کو گمان ہو گیا ہوگا کہ جس عذاب کا خوف دلایا جا رہا ہے، وہ آنے ہی والا ہوگا۔ فرمایا: یہ دنیا ایک مختصر سی زندگی ہے۔ دو دن اور صبر کریں۔

۳۔ یَوۡمَ یَرَوۡنَ مَا یُوۡعَدُوۡنَ : جس عذاب کا خوف دلایا جا رہا ہے اس عذاب کے آنے پر انہیں احساس ہو گا کہ عذاب کے آنے میں کوئی تاخیر نہیں ہوئی ہے بلکہ وہ اس دنیا کی پوری زندگی کو ایک دن کا حصہ شمار کریں گے۔

۴۔ لَمۡ یَلۡبَثُوۡۤا اِلَّا سَاعَۃً مِّنۡ نَّہَارٍ : جب وہ پوری زندگی کو ایک دن کا ایک حصہ سمجھیں گے تو اس وقت یہ بات ان پر واضح ہو جائے گی کہ عذاب الٰہی آنے میں نہ کوئی دیر ہوئی، نہ قیامت کے آنے میں کوئی زیادہ وقت صرف ہوا۔

۵۔ بَلٰغٌ : یہ ایک تبلیغ، حق ہے جو اللہ کی طرف سے تمہارے لیے بیان کی گئی ہے۔

۶۔ فَہَلۡ یُہۡلَکُ اِلَّا الۡقَوۡمُ الۡفٰسِقُوۡنَ : اس تبلیغ، اتمام حجت اور حق کے واضح ہو چکنے کے بعد اگر ہلاکت کی طرف جاتے ہیں تو وہ صرف فاسق لوگ ہوں گے یعنی اللہ کے حکم کی تعمیل سے روگردانی کرنے والے ہوں گے۔

---

[1] بحار ۳۹: ۵۵	[2] بحار ۱۱: ۲۹۸	[3] تفسیر ابن کثیر ذیل آیت

سُوۡرَۃُ مُحَمَّدٍ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس سورۃ المبارکۃ نام آیت وَاٰمَنُوۡا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ .... سے ماخوذ ہے۔

یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوئی جس میں پہلی بار قتال کا حکم نازل ہوا ہے اور ساتھ انفاق پر بھی زور دیا گیا ہے اور منافقین کا بھی ذکر ہے۔ اس سورہ کے مضامین اچھے اور برے لوگوں کے تقابل پر مشتمل ہیں۔

حضرت امیر المؤمنین علی علیہ السلام کی روایت ہے:

سورۃ محمد اٰیۃ فینا و اٰیۃ فی بنی امیۃ۔[1]	سورہ محمد میں ایک آیت ہمارے بارے میں ہے اور ایک آیت بنی امیہ کے بارے میں ہے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام سے بھی روایت ہے کہ اس سورہ کی پہلی آیت تلاوت فرما کر فرمایا:

نزلت فینا و فی بنی امیۃ۔[2]	یہ سورۃ ہمارے اور بنی امیہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے آپ نے فرمایا:

من اراد ان یعرف حالنا وحال اعدائنا فلیقرأ سورۃ محمد فانہ یراھا فینا و آیۃ فی اعدائنا۔[3]	جو ہمارا اور ہمارے دشمنوں کا حال معلوم کرنا چاہتا ہے تو اسے سورہ محمد کی تلاوت کرنی چاہیے۔ وہ اس کی ایک آیت ہماری شان میں اور ایک آیت ہمارے دشمنوں کے بارے میں پائے گا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	بنام خدائے رحمن رحیم
اَلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ صَدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَضَلَّ اَعۡمَالَہُمۡ ①	۱۔ جنہوں نے کفر اختیار کیا اور راہ خدا میں رکاوٹ ڈالی اللہ نے ان کے اعمال حبط کر دیے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا: جب لوگوں نے توحید، رسالت اور معاد کا انکار کیا۔

---

[1] شواہد التنزیل ۲: ۲۴۰۔ روح المعانی ۱۳: ۱۹۳۔ الدر المنثور ۶: ۱۱۶ [2] شواہد التنزیل ۲: ۲۴۱ [3] مجمع البیان

۲۔ وَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ: صرف انکار پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ایمان لانے والوں کی راہ میں رکاوٹیں ڈالیں۔

واضح رہے کہ اسلام کا موقف یہ ہے کہ اسلام پیش کیا جائے۔ اگر کوئی قبول نہیں کرتا ہے تو اس پر ایمان لانے کے لیے کسی قسم کا جبر نہیں ہو گا، نہ اس کے خلاف کوئی طاقت استعمال کی جائے گی لیکن جب کفار ایمان نہ لانے پر اکتفا نہ کریں اور صَدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ایمان لانے والوں کے خلاف طاقت استعمال کریں تو اس صورت میں اسلام اس طاقت کے مقابلے میں طاقت استعمال کرتا ہے۔ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام جنگیں اسی قسم کی تھیں۔

۳۔ اَضَلَّ اَعۡمَالَہُمۡ: اللہ نے ان کی یہ ساری کوششیں ناکارہ بنا دیں۔ اسلام کے خلاف کافروں نے جو بھی قدم اٹھایا وہ سب بے نتیجہ رہے۔ ان کی تمام سازشیں ناکام رہ گئیں اور ان لوگوں نے اسلام کے سامنے رکاوٹ ڈالنے کے لیے جو اموال خرچ کیے، جو قربانیاں دیں سب کی سب بے نتیجہ رہ گئیں۔

وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اٰمَنُوۡا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ ہُوَ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّہِمۡ ۙ کَفَّرَ عَنۡہُمۡ سَیِّاٰتِہِمۡ وَ اَصۡلَحَ بَالَہُمۡ ﴿۲﴾

۲۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور صالح اعمال بجا لائے اور جو کچھ محمدؐ پر نازل کیا گیا ہے اس پر بھی ایمان لائے اور ان کے رب کی طرف سے حق بھی یہی ہے، اللہ نے ان کے گناہ ان سے دور کر دیے اور ان کے حال کی اصلاح فرمائی۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: کفار جب اپنے کفر پر پوری طرح قائم رہتے ہیں تو اسلامی اصولوں کے منکر ہوتے ہیں اور ایمان کی رہ میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔

ان کے مقابلے میں مومنوں کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ اسلام کے عناصر اپنے اندر پیدا کریں۔ پہلا عنصر ایمان، دوسرا عنصر عمل صالح اور تیسرا عنصر جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا ہے ان سب پر ایمان لائیں۔

لوگوں کے لیے اجمالی ایمان آسان ہوتا ہے۔ یعنی ایمان باصول اسلام اور عمل صالح لیکن جب تفصیلی ایمان کی نوبت آتی ہے تو قدم پھسل جاتے ہیں۔ تفصیلی ایمان بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان ہے۔ جو کچھ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہو اس پر ایمان لے آنا۔ بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ میں قرآن کے ساتھ سنت بھی ہے۔ سنت پر ایمان کا تعلق زندگی میں پیش آنے والے ہر مسئلہ کے ساتھ ہے۔

چنانچہ سورۃ الحشر میں جنگی غنائم اور کفار سے بغیر جنگ کے ہاتھ آنے والے اموال کی تقسیم کے حکم کے بعد فرمایا:

وَمَاۤ اٰتٰىکُمُ الرَّسُوۡلُ فَخُذُوۡہُ ٭ وَمَا نَہٰىکُمۡ عَنۡہُ فَانۡتَہُوۡا ۔۔۔[۱]
اور رسول جو تمہیں دے دیں وہ لے لو اور جس سے روک دیں اس سے رک جاؤ۔

اس جگہ رسولؐ کے فرمان کی تعمیل کی تاکید سے یہ عندیہ ملتا ہے زندگی میں پیش آنے والے مالی، سیاسی مسائل میں بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ پر ایمان لانا آسان کام نہیں تھا۔ اسی لیے لوگوں کے لیے قرآن پر ایمان لے آنا تو آسان تھا لیکن سنت پر عمل کرنا بہت دشوار ہوتا رہا ہے۔ کبھی صرف قرآن کافی ہے کا نعرہ بلند کیا گیا اور کبھی سنت کی تدوین کو ممنوع قرار دے دیا گیا۔

سفیان ثوری بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ پر ایمان کی تشریح میں کہتے ہیں:

لم یخالفوہ فی شیء۔[۲]
کسی چیز میں بھی رسول اللہؐ کے خلاف نہ جائیں۔

یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں منکر قرآن نہیں پائے جاتے منکر حدیث موجود ہیں اور قرآن کی تحریف ممکن نہیں رہی، حدیث کی لفظی اور معنوی تحریف کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔

۲۔ وَّ ہُوَ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّہِمۡ : جو کچھ محمدؐ پر نازل ہوا ہے۔ وہ ان کے رب کی طرف سے برحق ہے اور محمد جو بیان کریں گے وہ اپنی طرف سے نہ ہوگا:

وَمَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡہَوٰی ؕ﴿۳﴾ اِنۡ ہُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی ﴿۴﴾[۳]
وہ خواہش سے نہیں بولتا۔ یہ تو صرف وحی ہوتی ہے جو (اس پر) نازل کی جاتی ہے۔

اسی وجہ سے اطاعت رسول اطاعت خدا ثابت ہوئی ہے:

مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہَ ۔۔۔[۴]
جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے رسول کی اطاعت کی۔

چونکہ بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ پر ایمان لانا اور اس پر عمل کرنا نہایت مشکل مسئلہ تھا اس لیے وَّ ہُوَ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّہِمۡ کی تاکید بیان فرمائی۔

۳۔ کَفَّرَ عَنۡہُمۡ سَیِّاٰتِہِمۡ : ان عناصر کی تکمیل کی صورت میں یہ کامل ایمان، ان کے گناہوں کا کفارہ ہوگا:

اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡہِبۡنَ السَّیِّاٰتِ ۔۔۔[۵]
نیکیاں بے شک برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔

۴۔ وَ اَصۡلَحَ بَالَہُمۡ : البال حالت کو کہتے ہیں۔ ایمان کی تکمیل کی صورت میں اللہ ان کے احوال درست کر دے گا۔ چنانچہ ایمان کی تکمیل کی صورت میں اسے دنیا میں کوئی پریشانی لاحق نہ ہوگی اور آخرت میں بھی اس کا حال بہتر ہوگا۔ اگر البال کو قلب کے معنوں میں لیا جائے تو مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اس کی قلبی اور نفسیاتی حالت کی اصلاح ہوگی۔ ایمان سے قلب میں اطمینان اور ضمیر میں سکون آ جاتا ہے۔ دل کی اصلاح

---

[۱] ۵۹ حشر: ۷ [۲] تفسیر قرطبی [۳] ۵۳ نجم: ۳۔۴ [۴] ۴ نساء: ۸۰ [۵] ۱۱ ہود: ۱۱۴

ہو گی سے یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ جو بیماریاں غیر مومن کے دلوں میں موجود ہوتی ہیں، مومن کا دل ان تمام بیماریوں سے پاک ہو گا۔

اہم نکات

۱۔ تمام مثبت اثرات تفصیلی ایمان پر مترتب ہوتے ہیں۔ اجمالی ایمان پر صرف ظاہری اثرات مترتب ہوتے ہیں۔

ذٰلِکَ بِاَنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوا اتَّبَعُوا الۡبَاطِلَ وَ اَنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الۡحَقَّ مِنۡ رَّبِّہِمۡ ؕ کَذٰلِکَ یَضۡرِبُ اللّٰہُ لِلنَّاسِ اَمۡثَالَہُمۡ ﴿۳﴾

۳۔ یہ اس لیے ہے کہ کفار نے باطل کی پیروی کی اور ایمان لانے والوں نے اس حق کی اتباع کی جو ان کے پروردگار کی طرف سے ہے، اللہ تعالیٰ اسی طرح لوگوں کے لیے ان کے اوصاف بیان فرماتا ہے۔

تفسیر آیات

سابقہ آیت میں فرمایا: کافروں کی ساری کوششیں لا حاصل ہیں اور مومنین کی کوششیں بار آور ہیں۔ اس آیت میں فرمایا اس کامیابی و ناکامی کی بنیاد وہ دستور ہے جس کی طرفین اتباع کرتے ہیں۔ کفار باطل کی اتباع کرتے ہیں جس کا مقدر تباہی و نابودی ہے اور مومنین حق کی اتباع کرتے ہیں جسے ثبات اور دوام حاصل ہے۔

۲۔ کَذٰلِکَ یَضۡرِبُ اللّٰہُ لِلنَّاسِ: مومن اور کافر کے انجام کی مثالیں حق اور باطل، ثبات اور تباہی کے ساتھ بیان کر کے سب لوگوں کے لیے ایک درس عبرت بیان فرما دیا ہے۔

اہم نکات

۱۔ مومن مثال ہدایت اور کافر مثال ہلاکت ہے۔

فَاِذَا لَقِیۡتُمُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَضَرۡبَ الرِّقَابِ ؕ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَثۡخَنۡتُمُوۡہُمۡ فَشُدُّوا الۡوَثَاقَ ٭ۙ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعۡدُ وَ اِمَّا فِدَآءً حَتّٰی

۴۔ پس جب کفار سے تمہارا سامنا ہو تو (ان کی) گردنیں مارو یہاں تک کہ جب انہیں خوب قتل کر چکو تو (بچنے والوں کو) مضبوطی سے قید کر لو، اس کے بعد احسان رکھ کر یا فدیہ لے کر (چھوڑ دو) تاوقتیکہ لڑائی تھم جائے، حکم یہی ہے اور اگر اللہ

۴ تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ۚۛ ذٰلِكَ ۛ وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَ لٰكِنْ لِّيَبْلُوَا۟ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ؕ وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ۴
سَيَهْدِيْهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ ۵ ۚ
وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ ۶

(قد یبتدا بقولہ ذلک و لکن حسن اتصالہ بما قبلہ ویوقف علی ذلک ط)

چاہتا تو ان سے انتقام لیتا لیکن (اللہ کو یہ منظور ہے کہ) تم میں سے ایک کا امتحان دوسرے کے ذریعے سے لے اور جو لوگ راہ خدا میں شہید کیے جاتے ہیں اللہ ان کے اعمال ہرگز حبط نہیں کرے گا۔

۵۔ وہ عنقریب انہیں ہدایت دے گا اور ان کی حالت کی اصلاح فرمائے گا۔

۶۔ اور انہیں جنت میں داخل کرے گا جس کی انہیں پہچان کرا دی ہے۔

تشریح کلمات

اثخن: (ث خ ن) کسی چیز کا گاڑھا ہو جانا کہ بہنے سے رک جائے۔ اسی سے کہتے ہیں: اثخنتہ ضرباً میں نے اسے اتنا پیٹا کہ وہ حرکت نہ کر سکا۔ اسی سے خوب قتل کے لیے استعمال ہوا ہے۔

الْوَثَاق: (و ث ق) الوثاق اس زنجیر یا رسی کو کہتے ہیں جس میں باندھا جائے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: کافروں کے ساتھ جنگ کی نوبت آنے کی صورت میں جب میدان جنگ میں کافروں کا سامنا ہو جائے تو درج ذیل جنگی حکمت عملی پر عمل کرنے کا حکم ہے:

۲۔ پہلا حکم یہ ہے کہ فَضَرْبَ الرِّقَابِ دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے اور میدان جنگ میں دشمن کی طاقت پر ضرب لگانا ہی جنگ ہے جہاں جنگ ناگزیر ہے۔

۳۔ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ: یہاں تک کہ جب دشمن پر کاری ضرب لگا چکو اور دشمن کی قوت و طاقت کو خوب اچھی طرح ناکارہ کر چکو تو اسیر پکڑنے کی نوبت آتی ہے۔

۴۔ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ: دشمن کو کچلنے کے بعد بچے کھچے لوگوں کو قیدی بنانے کی اجازت ہے۔

۵۔ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً: اس کے بعد احسان کے طور پر بغیر فدیہ لیے یا فدیہ لے کر بھی قیدی کو چھوڑ سکتے ہو۔

جنگی حکمت عملی کے تحت لڑائی میں فتح و شکست کا فیصلہ ہونے سے پہلے قیدی بنانے کی ممانعت ہے کیونکہ عین لڑائی کے دوراں قیدی بنانا شروع کیا جائے تو درج ذیل نقصانات کا اندیشہ ہوتا ہے:

الف: اگر جنگ کے دوراں قیدی بنانا جائز ہو جائے تو لشکر کی طاقت کا ایک حصہ قیدی بنانے پر صرف ہو جائے گا اس طرح طاقت کا توازن بگڑ سکتا ہے۔
ب: قیدی بننے کا خطرہ قتل سے کم ہے اس لیے دشمن کو اس سے نفسیاتی طور پر فائدہ مل جاتا ہے۔
ج: یہ بات حربی حکمت عملی کے بھی منافی ہے کہ دشمن قتل کرے اور ادھر قتل کی جگہ قیدی بنایا جائے۔
د: دوران جنگ قیدی بنانے پر پابندی اس لیے بھی ضروری ہے کہ لوگ فدیہ حاصل کرنے یا غلام بنانے کے لالچ میں اصل مقصد کو فراموش نہ کریں۔
ھ: اسلامی حربی قوانین کے تحت حکم یہ ہے کہ دوران جنگ دشمن کو قتل کرو، قیدی نہ بناؤ اور دشمن کی طاقت کچلنے کے بعد بچے کھچے لوگوں کو اسیر بناؤ، قتل نہ کرو۔ اس طرح جنگ میں مقاتل کو قتل نہ کرنا اور جنگ کے بعد اسیر کو قتل کر دینا دونوں جرم ہیں۔
و: قیدی کے بارے میں چار صورتیں ہیں۔ ان میں سے ایک صورت ممنوع ہے۔ باقی صورتوں میں امام کو اختیار ہے جس صورت کو چاہے اختیار کرے۔ وہ صورتیں یہ ہیں: قتل، فدیہ لے کر چھوڑنا، فدیہ کے بغیر چھوڑنا یا غلام بنانا۔ ان تین صورتوں میں سے ایک صورت امام کو اختیار کرنے کا حق ہے۔ قتل کرنا ممنوع ہے۔

۶۔ حَتّٰی تَضَعَ الۡحَرۡبُ اَوۡزَارَهَا: اس جملے کا تعلق فَضَرۡبَ الرِّقَابِ سے معلوم ہوتا ہے۔ ترتیب کلام اس طرح ہے: دشمن کی گردنیں مارو لڑائی تھم جانے تک۔ جب تم دشمن کو کچل چکو تو قیدی بنا لو۔ اس کے بعد احسان رکھ کر یا فدیہ لے کر چھوڑ دو۔

چنانچہ ائمہ اہل البیت علیہم السلام سے روایت ہے:

> اگر لڑائی کے دوران کسی کو پکڑ لیا جائے تو اسے قتل کیا جائے گا اور اگر لڑائی تھم جانے کے بعد پکڑ لیا گیا ہے تو امام کو اختیار ہے فدیہ لے کر چھوڑ دیں، بغیر فدیہ کے چھوڑ دیں یا غلام بنائے۔

واضح رہے کہ سورہ محمدؐ، سورہ انفال سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ سورہ محمدؐ میں صاف لفظوں میں یہ حکم آ گیا ہوا تھا کہ دشمن کو اچھی طرح سے شکست دینے سے پہلے قیدی نہ بناؤ۔ اس کے باوجود جنگ بدر میں کچھ لوگ لڑائی کے دوران مشرکوں کو قیدی بنانے میں مصروف ہو گئے۔ اس لیے سورہ انفال کی آیات ۶۷۔۶۹ میں حالت قتال میں قیدی بنانے پر سرزنش کی گئی ہے۔

۷۔ وَ لَوۡ یَشَآءُ اللّٰہُ لَانۡتَصَرَ مِنۡہُمۡ: اگر اللہ چاہتا تو ایک آفت کے ذریعے انہیں تباہ کر سکتا تھا لیکن اللہ انہیں مسلمانوں کے ہاتھوں نابود کرنا چاہتا ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ کافروں کے ساتھ جنگ کے حکم سے لوگوں کے ایمان کا حال ظاہر ہو جاتا ہے کہ کون قلباً مؤمن ہے اور کون قلبی ایمان سے محروم ہے۔

چنانچہ مختلف جنگوں میں لوگوں کا ایمانی حال ظاہر ہوتا رہا۔

۸۔ وَالَّذِیۡنَ قُتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ: راہ خدا میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے والوں کے دیگر تمام اعمال قبول ہوں گے۔ ان کا کوئی عمل اکارت نہ ہوگا۔ بعض نیک اعمال ایسے ہیں جن کی بجا آوری سے خود عمل کے ثواب کے علاوہ دیگر اعمال پر بھی مثبت اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ شہادت ان میں سرفہرست ہے۔ چونکہ بعض عمل سے عمل کرنے والے میں خوبی بیشتر ہو جاتی ہے۔ عمل کرنے والے میں خوبی بڑھنے سے اس کے تمام اعمال کی خوبی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

۹۔ سَیَہۡدِیۡہِمۡ وَ یُصۡلِحُ بَالَہُمۡ: ان شہیدوں کی جنت کی طرف رہنمائی کی جائے گی اور آخرت مین ان کے حال بہتر ہوں گے۔ آخرت میں حالت کی بہتری میں بہت بڑی کامیابی ہے۔

۱۰۔ وَ یُدۡخِلُہُمُ الۡجَنَّۃَ عَرَّفَہَا لَہُمۡ: جس جنت کی انہیں پہلے سے خوشخبری دے دی گئی ہوگی اس میں انہیں داخل کیا جائے گا۔

فضائل: ابن عباس روایت کرتے ہیں:

والذین قتلوا فی سبیل اللّٰہ۔ ھم و اللّٰہ حمزۃ بن عبد المطلب سید الشھداء و جعفر الطیار۔[۱]	راہ خدا میں قتل ہونے والوں سے مراد قسم بخدا حمزہ بن عبد المطلب، سید الشہداء اور جعفر طیار ہیں۔

غلامی اور اسلام: سوال کیا جاتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہوا کہ انسانی حقوق کا علمدار اسلام جو ایک خراش کے لیے بھی تاوان مقرر کرتا اور احترام آدمیت کے بارے میں کامل ترین قوانین رکھتا ہے، پیٹھ پیچھے کسی عیب کے ذکر اور سائل کو جھڑکی تک دینے کی اجازت نہیں دیتا، احسان کر کے جتانا ایک قسم کی اذیت ہے لہٰذا احسان جتانے کی اجازت نہیں دیتا:

قَوۡلٌ مَّعۡرُوۡفٌ وَّ مَغۡفِرَۃٌ خَیۡرٌ مِّنۡ صَدَقَۃٍ یَّتۡبَعُہَاۤ اَذًی ...[۲]	نرم کلامی اور درگزر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے بعد (خیرات لینے والے کو) ایذا دی جائے جائے۔
یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُبۡطِلُوۡا صَدَقٰتِکُمۡ بِالۡمَنِّ وَ الۡاَذٰی ...[۳]	اے ایمان والو! اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور ایذا دے کر برباد نہ کرو۔

اس اسلام نے کس طرح ایک انسان کو ایک مال کی طرح کسی اور انسان کی ملکیت میں دینا قبول کیا؟ کیا انسان کو مال قرار دینا خود انسان کی اہانت نہیں ہے؟

کیا مغربی دنیا نے انسانی قدروں کو مسلمانوں سے پہلے پہچان لیا اور ۱۸۹۰ء میں بروکسل کانفرنس میں انسان کو غلام بنانا ممنوع قرار دیا؟

---

[۱] شواھد التنزیل ذیل آیت۔ [۲] بقرہ:۲۶۳ [۳] بقرہ:۲۶۴

جواب یہ ہے کہ اسلام آزاد انسان کی غلامی کو سرے قبول نہیں کرتا۔ اسلامی دستور میں یہ بات پوری وضاحت کے ساتھ بیان ہوئی ہے کہ آزاد انسان کو کسی صورت میں غلام نہیں بنایا جا سکتا۔ صرف ایک صورت ہے جس کی تین صورتوں میں سے ایک صورت میں غلام بنایا جا سکتا ہے۔ آزاد انسان کو نہیں، حملہ آور کو۔ جسے فقہی اصطلاح میں کافر حربی کہتے ہیں۔ وہ بھی ہر جگہ سے نہیں، صرف میدان جنگ سے پکڑا گیا ہو یعنی جنگی قیدی کو صرف ایک صورت میں غلام بنایا جاتا ہے۔ وہ صورت یہ ہے:

> جب حملہ آور کافروں کو میدان جنگ میں پکڑ لیا جاتا ہے تو اسلامی سربراہ (امام) کو اختیار ہے کہ وہ ان جنگی قیدیوں کے ساتھ تین صورتوں میں سے ایک صورت اختیار کریں۔ ایک یہ کہ انہیں فدیہ کے مقابلے میں آزاد کیا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ فدیے کے بغیر آزاد کیا جائے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ انہیں غلام بنایا جائے۔

چونکہ جنگی قیدی کا قتل جائز نہیں ہے۔ معاوضہ اور بلا معاوضہ آزاد کرنا حربی تقاضوں کے خلاف ہے تو ان قیدیوں کو زندان میں بند رکھنے کا بھی اسلامی قانون میں رواج نہیں ہے۔ لہٰذا ان قیدیوں کو محفوظ رکھنے کی ایک صورت یہ ہے کہ انہیں دیگر انسانوں کے اختیار میں دیا جائے یعنی غلام بنایا جائے۔ چونکہ کافر لوگ نے تو مسلمان قیدیوں کو غلام بنانا ہے، مسلمانوں کے لیے ممکن نہیں ہے کہ انہیں غلام نہ بنائیں۔

اسلام نے آزاد انسان کو غلام بنانے کی دیگر تمام صورتوں کو ممنوع قرار دیا ہے جب کہ غیر اسلامی معاشروں میں طاقت کے بل بوتے پر آزاد پرامن لوگوں کو غلام بنانے کا رواج عام تھا۔ چنانچہ طاقتور حکومتیں، افریقی ممالک پر حملہ کر کے ہزاروں افراد کو قیدی بنا کر لاتیں اور ایشیا اور یورپ کے بازاروں میں فروخت کر دیتیں۔

مغربی دنیا نے آزاد پرامن لوگوں کو غلام بنانے کی اس وحشیانہ صورت کو سنہ ۱۸۹۰ء میں ممنوع قرار دیا ہے جب کہ اسلام نے روز اول سے اس صورت کو قبول نہیں کیا ہے۔ یعنی آزاد پُرامن انسان کو غلام بنانا اسلام میں ہرگز جائز نہیں ہے۔ لہٰذا اسلام صرف اس حملہ آور کافر کو جو میدان جنگ میں پکڑا گیا ہے اس صورت میں غلام بناتا ہے کہ نہ اسے معاوضہ کے ساتھ آزاد کیا جا سکتا ہے، نہ بلا معاوضہ۔ حربی اعتبار سے کوئی قانون اجازت نہیں دیتا کہ دشمن کو اس کی طاقت واپس کی جائے۔ اگر حالات اجازت دیں تو امام اس شخص کو معاوضہ کے ساتھ یا بلا معاوضہ آزاد کر سکتے ہیں۔

اسلامی قانون کے مطابق میدان جنگ میں کوئی کافر حالت کفر میں قیدی ہو جائے، وہ غلام ہو سکتا ہے۔ قید میں آنے کے بعد اگر وہ اسلام قبول کر لے تو بھی وہ غلام رہتا ہے۔ اگر کلمہ کہنے سے آزاد ہونا ہوتا تو کلمہ پڑھ کر آزادی حاصل نہ کرنے والا کوئی نہ ہوتا لہٰذا اگر کوئی کافر قیدی بنانے سے پہلے اسلام قبول کرتا ہے تو وہ غلام نہیں بن سکتا۔ اگر قیدی ہونے کے بعد اسلام قبول کرے تو بھی وہ غلام رہتا ہے۔

اسلامی قوانین میں غلام کو وہ تمام انسانی حقوق حاصل ہیں جو دیگر انسانوں کو حاصل ہیں۔ حدیث

نبوی ہے:

اَلۡبِسُوۡھُمۡ مِمَّا تَلۡبَسُوۡنَ وَ اَطۡعِمُوۡھُمۡ مِمَّا تَاۡکُلُوۡنَ۔[1] جو تم پہنتے ہو وہ انہیں پہناؤ۔ جو تم کھاتے ہو وہ انہیں کھلاؤ۔

غلام آزاد کرنے کی ترغیب: اس حربی ضرورت کے تحت غلامی میں آنے کے بعد اسلام نے غلاموں کو آزاد کرنے کے لیے اپنے دستور میں متعدد مواقع فراہم کیے ہیں:

i۔ غلام اگر اذیت میں ہے تو بیت المال سے اس کی قیمت ادا کر کے اس کو آزاد کرنا اسلامی حکومت کے فرائض میں شامل ہے۔

ii۔ خود غلام اپنے مالک کے ساتھ معاملہ کر سکتا ہے کہ ایک معین رقم کی ادائیگی پر اسے آزادی مل جائے۔ اس کو مکاتبہ کہتے ہیں۔

iii۔ ایک غلام میں دو افراد شریک ہیں۔ ایک نے اپنا حصہ آزاد کر دیا تو اس پر واجب ہے اپنے شریک کا حصہ بھی خرید کر پورا غلام آزاد کرے۔

iv۔ اگر مالک اپنی کنیز کے ساتھ شادی کرے اور اولاد پیدا ہو جائے تو اس کنیز کا فروخت کرنا جائز نہیں ہے اور وہ اپنی اولاد کے حصۂ میراث میں آ کر آزاد ہو جائے گی۔

v۔ مالک اگر اپنے غلام پر ناقابل تحمل تشدد کرتا ہے تو یہ غلام از خود آزاد ہو جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام انسان کو اس معنی میں غلام نہیں بناتا جس معنی میں باقی دنیا انسان کو غلام بناتی ہے۔

vi۔ اسلامی فقہی ابواب میں ایسے بہت موارد ہیں جہاں کفارے اور دیگر صورتوں میں غلام آزاد کرنا لازمی ہے۔

vii۔ اگر کوئی شخص اپنے باپ، ماں، داداؤں، بیٹے، چچا، پھوپھی، ماموں، بھائی، بہن، بھتیجا، بھانجی کا مالک بن جائے تو یہ سب فوراً آزاد ہو جاتے ہیں۔

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تَنۡصُرُوا اللّٰہَ یَنۡصُرۡکُمۡ وَ یُثَبِّتۡ اَقۡدَامَکُمۡ ۷

۷۔ اے ایمان والو! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں ثابت قدم رکھے گا۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنۡ تَنۡصُرُوا اللّٰہَ: راہ خدا میں جہاد کو اللہ کی نصرت قرار دیا ہے ورنہ خود اللہ کسی کی نصرت کا محتاج

---

[1] مستدرك الوسائل ۳: ۲۵۶

نہیں ہے۔ اس کے باوجود اللہ لوگوں سے نصرت طلب فرماتا ہے جو دراصل خود لوگوں پر اللہ کی مرحمت ہے کہ اللہ اپنی نصرت کا موقع فراہم کر کے اپنی بے پایان رحمتوں سے نوازنا چاہتا ہے۔

اسی لیے مکلّف بنانے کے مقام پر اللہ پہل نہیں کرتا بلکہ بندے کا پہل کرنا لازمی ہوتا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں فرمایا: پہلے تم اللہ کی مدد کرو اور اپنے میں اللہ کی نصرت کی اہلیت پیدا کرو تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور مدد کی نوعیت بھی یہ نہ ہو گی کہ اللہ خود دشمنوں کو نابود کر دے گا بلکہ نصرت کی نوعیت یہ ہو گی یہ کام بھی خود بندوں سے لیا جائے گا یعنی انہیں ثابت قدمی دے کر۔ اللہ چاہے تو خود دشمنوں کو نابود کر سکتا ہے مگر اللہ اپنے بندوں کو آزمائش کے ذریعے مرتبہ دینا چاہتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی بندوں سے مدد کی طلب، اللہ کی طرف سے بلا طلب مدد ہے۔

وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَتَعۡسًا لَّہُمۡ وَ اَضَلَّ اَعۡمَالَہُمۡ ﴿۸﴾

۸۔ اور جنہوں نے کفر اختیار کیا ہے ان کے لیے ہلاکت ہے اور (اللہ نے) ان کے اعمال کو برباد کر دیا ہے۔

ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ کَرِہُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاَحۡبَطَ اَعۡمَالَہُمۡ ﴿۹﴾

۹۔ یہ اس لیے ہے کہ انہوں نے اسے ناپسند کیا جسے اللہ نے نازل کیا پس اللہ نے ان کے اعمال حبط کر دیے۔

تشریح کلمات

تعساً: (ت ع س) اصل میں تعس کے معنی لغزش کھا کر گرنا پھر اُٹھ نہ سکنا کے ہیں۔ اسی سے ہلاکت کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَتَعۡسًا لَّہُمۡ: مومنوں کو ثابت قدمی عنایت فرمانے کے مقابلے میں کافروں کو اللہ تعالیٰ شکست کی بدترین صورت حال سے دوچار کر دے گا۔ وہ ہے چہرے کے بل گرنا۔ جب تک نہایت بے بسی نہ ہو انسان چہرے کو زمین پر لگنے نہیں دیتا اور اپنے جسم کا ہر حصہ اپنے چہرے کو بچانے کے لیے ڈھال بنا دیتا ہے۔

۲۔ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ کَرِہُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ: کافروں کی نابودی کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے ہر اس

بات سے کراہت کی اور اسے ناپسند کیا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی تھی خواہ اس کا تعلق اصول عقائد سے ہو یا شریعت و احکام سے۔

واضح رہے مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ کا دائرہ قرآن سے وسیع تر ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا زندگی کے تمام شعبوں کے لیے موجود اسلامی شریعت پر ایمان لانا اور اس پر عمل کرنا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ پر ایمان اور عدم کراہت ہے۔

۳۔ فَاَحۡبَطَ اَعۡمَالَہُمۡ: مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ سے کراہت کی بنیاد پر ان کافروں کی بنائی ہوئی تمام سازشوں کو اللہ تعالیٰ نے غیر مؤثر بنا دیا۔ حبط عمل یہ ہے کہ جو کوشش اور سعی جس مقصد کے لیے انجام دی گئی ہے وہ اکارت اور بے نتیجہ رہے۔

اہم نکات

۱۔ جو سازش مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ کے مقابلے میں کی جائے وہ ناکام ہوگی۔

اَفَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ؕ دَمَّرَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ ۫ وَ لِلۡکٰفِرِیۡنَ اَمۡثَالُہَا ﴿۱۰﴾

۱۰۔ کیا یہ لوگ زمین میں چلتے پھرتے نہیں ہیں کہ وہ دیکھ لیتے کہ ان سے پہلے والوں کا کیا انجام ہوا؟ اللہ نے ان پر تباہی ڈالی اور کفار کا انجام بھی اسی قسم کا ہوگا۔

تشریح کلمات

دَمَّرَ: (د م ر) تدمیر۔ تباہ کر دینے کے معنوں میں ہے۔ جب اس کی متعلقہ چیزوں کو اہل، اولاد، مال و املاک کو نابود کر دیا گیا۔

تفسیر آیات

۱۔ اَفَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ: سیر فی الارض سے مراد گزشتہ اقوام کی سرنوشت کا مطالعہ اور اس سے عبرت حاصل کرنا ہے۔ قرآن متعدد مقامات پر اقوام کے انجام کا مطالعہ کرنے کی دعوت دیتا ہے تاکہ منکرین کے انجام کا انہیں علم ہو جائے۔

۲۔ وَ لِلۡکٰفِرِیۡنَ اَمۡثَالُہَا: رسول اللہ ﷺ کے معاصر کافروں کا انجام اور عاقبت گزشتہ اقوام سے مختلف نہ ہوگی:

سُنَّۃَ اللّٰہِ الَّتِیۡ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلُ ۚ اللہ کے دستور کے مطابق جو پہلے سے رائج ہے اور آپ

وَ لَنۡ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبۡدِیۡلًا ۝ [۱] — اللہ کے دستور میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے۔

ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ مَوۡلَی الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا — ۱۱۔ یہ اس لیے ہے کہ مومنین کا کارساز اللہ ہے

ع ۵ وَ اَنَّ الۡکٰفِرِیۡنَ لَا مَوۡلٰی لَہُمۡ ۝۱۱ — اور کفار کا کوئی کارساز نہیں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ ذٰلِکَ: ان کی ہلاکت کی وجہ یہ ہے کہ یہ کافر اللہ تعالیٰ کی ولایت سے خارج ہو کر بے حس بتوں کی ولایت میں چلے گئے ہیں۔ ان بے حس بتوں سے ان کافروں کو تحفظ ملنا نہیں ہے۔ کون ہے جو انہیں انجام بد سے تحفظ دے۔

۲۔ بِاَنَّ اللّٰہَ مَوۡلَی: اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا مولا اور مالک ہے۔

اللہ تعالیٰ تدبیر امور حیات کے اعتبار سے تمام انسانوں کا مالک و مدبر اور مولا ہے لیکن امور خیر و سعادت کی رہنمائی اور حق کی ہدایت و توفیق دینے کے اعتبار سے صرف مومنین کا مولا، مالک و مدبر ہے۔ چونکہ مومنین ہی اللہ کی اس ولایت میں داخل ہیں لہٰذا اللہ مومنین کی نصرت فرمائے گا اور کافروں کو اپنے حال پر چھوڑ دے گا۔

فضائل: ابن عباس راوی ہیں:

بِاَنَّ اللّٰہَ مَوۡلَی الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یعنی ولی علی و حمزۃ و جعفر و الحسن و الحسین و ولی محمد صلی اللّٰہ علیہ والہ وسلم ینصرھم بالغلبۃ علی عدوھم۔ [۲]

بِاَنَّ اللّٰہَ مَوۡلَی الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا سے مراد لیا ہے کہ اللہ علی، حمزہ، جعفر، حسن اور حسین کا ولی ہے اور اللہ ولی ہے محمد ﷺ کا جو ان کے دشمن کے خلاف ان کی مدد کرے گا۔

جنگ احد میں ابوسفیان کا نعرہ تھا: نحن لنا العزی و لا عزی لکم ہمارے لیے عزی (ایک بت کا نام) ہے تمہارے لیے کوئی عزی نہیں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس کے جواب میں کہو: اللّٰہ مولانا و لا مولی لکم: اللہ ہمارا مولا ہے تمہارا کوئی مولا نہیں۔ [۳]

اس سورہ مبارکہ کی ہر آیت کی تلاوت کے موقع پر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا منقول فرمان یاد رکھنا چاہیے کہ سورہ محمد کی ایک آیت ہمارے بارے میں ہے اور ایک آیت ہمارے دشمنوں کے بارے میں ہے۔

---

[۱] ۴۸ فتح: ۲۳ [۲] شواھد التنزیل ذیل آیت [۳] بحار الانوار ۳۰: ۲۳۔ صحیح بخاری غزوہ احد

اِنَّ اللّٰہَ یُدۡخِلُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ ؕ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یَتَمَتَّعُوۡنَ وَ یَاۡکُلُوۡنَ کَمَا تَاۡکُلُ الۡاَنۡعَامُ وَ النَّارُ مَثۡوًی لَّہُمۡ ﴿۱۲﴾	۱۲۔ اللہ ایمان لانے والوں اور صالح اعمال بجا لانے والوں کو یقیناً ایسی جنتوں میں داخل فرمائے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور جو لوگ کافر ہو گئے وہ لطف اٹھاتے ہیں اور کھاتے ہیں تو جانوروں کی طرح کھاتے ہیں اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ اللّٰہَ یُدۡخِلُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا: اہل ایمان کے اللہ کی ولایت و حمایت میں ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنین کو جنت میں داخل کر دیتا ہے۔ آیت کی صراحت میں یہ بات بھی موجود ہے کہ اللہ ان مومنین کو جنت میں داخل فرمائے گا جو ایمان کے ساتھ عمل صالح بھی بجا لاتے ہیں۔

۲۔ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا: اور اس کے مقابلے کافر لوگ ایمان رکھتے ہیں نہ عمل صالح بلکہ وہ دنیا کی زندگی کے عیش و نوش میں مگن رہتے ہیں۔

۳۔ وَ یَاۡکُلُوۡنَ کَمَا تَاۡکُلُ الۡاَنۡعَامُ: جس طرح حیوانات صرف کھانے میں مگن رہتے ہیں۔ کفار چونکہ زندگی کے اصل مقصد سے عاری ہوتے ہیں اس لیے کھانا ہی ان کا مقصود زندگی ہے۔ بقول سعدی انسان زندہ رہنے کے لیے کھاتا ہے جبکہ جانور کھانے کے لیے زندہ رہتے ہیں۔ نہ جانوروں کو یہ سوچ بوجھ حاصل ہے کہ یہ رزق کہاں سے آتا ہے، کون ان کا رازق ہے۔ کھانے کی طلب کو غریزہ کہتے ہیں۔ یہ انسان اور حیوان دونوں میں موجود ہے اور ضامنِ بقا ہے۔

فرق یہ ہے کہ انسان ایک معقول مقصد کے لیے کھاتا ہے جب کہ حیوان کا مقصد کھانا ہی ہوتا ہے۔ کافر کھانے کو ہی مقصد قرار دیتے ہیں جو حیوانی خاصیت ہے۔

آیت کا محل کلام یہ نہیں ہے کہ کھانے کا کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ جیسا کہ بعض سادہ فہم لوگوں نے خیال کیا ہے کہ اس سے ضمناً کھڑے ہو کر کھانے کی ممانعت کا بھی اثبات ہوتا ہے چونکہ جانور کھڑے ہو کر کھاتے ہیں۔ آیت سے ہرگز کھڑے ہو کر کھانے کی ممانعت کا اثبات نہیں ہوتا چونکہ آیت کا محل کلام کھانے کا مقصد بتانا ہے، نہ کہ کھانے کا طریقہ بیان کرنا ہے۔

۴۔ وَ النَّارُ مَثۡوًی لَّہُمۡ: آتش جہنم ان کی محل اقامت ہو گی جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے جس طرح مومن نہروں والی جنت میں ہمیشہ رہیں گے۔

اہم نکات

۱۔ مقصد حیات ہی وہ نقطہ ہے جہاں سے انسان اور جانور میں امتیاز ہوتا ہے۔

وَكَاَيِّنۡ مِّنۡ قَرۡيَةٍ هِىَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنۡ قَرۡيَتِكَ الَّتِىۡۤ اَخۡرَجَتۡكَ ۚ اَهۡلَكۡنٰهُمۡ فَلَا نَاصِرَ لَهُمۡ ﴿۱۳﴾

۱۳۔اور بہت سی ایسی بستیاں جو آپ کی اس بستی سے کہیں زیادہ طاقتور تھیں جس (کے رہنے والوں) نے آپ کو نکالا ہے ہم نے انہیں ہلاک کر ڈالا، پس ان کا کوئی مددگار نہ تھا۔

تفسیر آیات

جس بستی کے رہنے والوں نے آپ کو وہاں سے نکالا ہے (یعنی مکہ سے) اس سے زیادہ طاقتور لوگوں کو ہم نے تباہ کر دیا ہے۔ یہ بات اپنے رسول ﷺ کی دل جوئی اور کافروں کو ان کی بے بسی پر آگاہ کرنے کے لیے فرمایا ورنہ اللہ کے لیے طاقتور اور ضعیف یکساں ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ ضعیف کا تباہ کرنا آسان ہو اور طاقتور کو تباہ کرنا آسان نہ ہو۔ اللہ کے لیے دونوں برابر ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ سورہ محمد ہجرت کے بعد قریبی زمانے میں نازل ہوا ہے۔

اَفَمَنۡ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّهٖ كَمَنۡ زُيِّنَ لَهٗ سُوۡٓءُ عَمَلِهٖ وَاتَّبَعُوۡۤا اَهۡوَآءَهُمۡ ﴿۱۴﴾

۱۴۔ کیا جو شخص اپنے پروردگار کی طرف سے واضح دلیل پر ہو اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس کے لیے اس کا برا عمل خوشنما بنا دیا گیا ہو اور جنہوں نے اپنی خواہشات کی پیروی کی ہو؟

تفسیر آیات

۱۔ اَفَمَنۡ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّهٖ: اپنے رب کی طرف سے واضح دلیل رکھنے والی ذات رسول اکرم ﷺ کی ہے چونکہ قرآن نے ہمیشہ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّهٖ انبیاء علیہم السلام کے لیے فرمایا ہے اور آسمانی کتاب کو قرآن بَيِّنَةٍ کہتا ہے۔

اَمۡ اٰتَيۡنٰهُمۡ كِتٰبًا فَهُمۡ عَلٰى بَيِّنَتٍ مِّنۡهُ ...۔[۱] یا ہم نے انہیں کوئی کتاب دی ہے جس کی بنا پر یہ کوئی دلیل رکھتے ہوں؟

---

[۱] ۳۵ فاطر: ۴۰

بیان یہ کرنا مقصود ہے: کیا وہ ہستی جسے اللہ نے اپنی رسالت کی حقانیت پر واضح دلیل و برہان عنایت کیا ہے ان مشرکین کی طرح ہو سکتی ہے جو اپنے اعمال کی برائیوں تک سے واقف نہیں ہیں، انہیں اپنے برے اعمال خوشنما لگتے ہیں اور عقل و خرد کی جگہ خواہشات کی پیروی کرتے ہیں۔ یہ دونوں ایک جیسے نہیں ہیں بلکہ جس کے پاس بَیِّنَۃٍ ہے وہ کامیاب ہوگا اور مشرکین تباہ ہو جائیں گے۔

فضائل: عبد اللہ بن عباس روایت کرتے ہیں:

اَفَمَنۡ کَانَ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنۡ رَّبِّہٖ علي دين من ربه نزلت في رسول الله صلى الله عليه و آله و سلم و علي كانا على شهادة ان لا اله الا الله وحده لا شريك له۔[1]

اَفَمَنۡ کَانَ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنۡ رَّبِّہٖ سے مراد علی دین من ربه ہے۔ یہ آیت رسول اللہ ﷺ اور علی کے بارے میں نازل ہوئی ہے چونکہ دونوں ان لا اله الا الله وحده لا شريك له کی گواہی قائم ہیں۔

مَثَلُ الۡجَنَّۃِ الَّتِیۡ وُعِدَ الۡمُتَّقُوۡنَ ؕ فِیۡہَاۤ اَنۡہٰرٌ مِّنۡ مَّآءٍ غَیۡرِ اٰسِنٍ ۚ وَ اَنۡہٰرٌ مِّنۡ لَّبَنٍ لَّمۡ یَتَغَیَّرۡ طَعۡمُہٗ ۚ وَ اَنۡہٰرٌ مِّنۡ خَمۡرٍ لَّذَّۃٍ لِّلشّٰرِبِیۡنَ ۬ۚ وَ اَنۡہٰرٌ مِّنۡ عَسَلٍ مُّصَفًّی ؕ وَ لَہُمۡ فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ الثَّمَرٰتِ وَ مَغۡفِرَۃٌ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ ؕ کَمَنۡ ہُوَ خَالِدٌ فِی النَّارِ وَ سُقُوۡا مَآءً حَمِیۡمًا فَقَطَّعَ اَمۡعَآءَہُمۡ ﴿۱۵﴾

۱۵۔ جس جنت کا پرہیزگاروں سے وعدہ کیا گیا ہے اس کی مثال یوں ہے کہ اس میں ایسے پانی کی نہریں ہیں جو (کبھی) بدبودار نہ ہوگا اور ایسے دودھ کی نہریں ہیں جس کا ذائقہ نہیں بدلے گا اور ایسی شراب کی نہریں ہیں جو پینے والوں کے لیے لذت بخش ہوگی اور خالص شہد کی نہریں (بھی) ہیں اور اس میں ان کے لیے ہر قسم کے میوے ہیں اور ان کے رب کی طرف سے مغفرت ہے، کیا یہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو ہمیشہ جہنم میں رہے گا اور جنہیں کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا جو ان کی آنتوں کو کاٹ کر رکھ دے گا۔

تشریح کلمات

اٰسِنٍ: (ا س ن) آسن الماءُ پانی کا سخت بدبودار ہونا۔

---

[1] شواهد التنزیل ذیل آیت

امعاء: (م ع ی) المعی: آنت

تفسیر آیات

۱۔ مَثَلُ الۡجَنَّۃِ الَّتِیۡ وُعِدَ الۡمُتَّقُوۡنَ: جس جنت کا اہل تقویٰ سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اگر مَثَل کو بمعنی صفت لیتے ہیں تو اس کی صفت یہ ہے اور مَثَل کو اپنے معنوں میں لیتے ہیں کہ تو معنی یہ ہوں گے: خود جنت تو ناقابل وصف و بیان ہے البتہ اہل دنیا کے اذہان کے لیے مثال پیش کی جا سکتی ہے:

فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَّاۤ اُخۡفِیَ لَہُمۡ مِّنۡ قُرَّۃِ اَعۡیُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ۝[1]

اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ ان کے اعمال کے صلے میں ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا کیا کیا سامان پردہ غیب میں موجود ہے۔

۲۔ فِیۡہَاۤ اَنۡہٰرٌ مِّنۡ مَّآءٍ غَیۡرِ اٰسِنٍ: جنت میں نہریں ہوں گی مگر ان کی نوعیت دنیا کی نہروں اور دنیا کے پانیوں کی طرح نہ ہو گی۔ مختلف نباتات مل جانے کی وجہ سے دنیا کے پانی کی خاصیت اور بو بدل جاتی ہے۔ جنت کا پانی دنیا کے پانی سے مختلف ہو گا۔ یہ پانی ناقابل تغیر و تبدل ہو گا۔

۳۔ وَ اَنۡہٰرٌ مِّنۡ لَّبَنٍ: جنت میں دودھ کی نہریں ہوں گی۔ ان نہروں کا دودھ دنیا کے دودھ کی طرح نہ ہو گا جو جانوروں کے تھنوں سے نکالا جاتا ہے۔ زمین سے پھوٹنے والا دودھ ہو گا۔ لَّمۡ یَتَغَیَّرۡ طَعۡمُہٗ اس کا مزہ بھی ناقابل تغیر ہو گا۔

۴۔ وَ اَنۡہٰرٌ مِّنۡ خَمۡرٍ: شراب کی بھی نہریں ہوں گی اس شراب میں صرف لذت ہو گی دیگر منفی خاصیتیں نہیں ہوں گی یعنی تلخ بدبودار اور نشہ آور نہیں ہو گی۔

۵۔ وَ اَنۡہٰرٌ مِّنۡ عَسَلٍ مُّصَفًّی: صاف و شفاف شہد کی نہریں۔ اس شہد میں کسی قسم کی ملاوٹ نہیں ہو گی۔ جیسے اس میں موم، چھتے کے ٹکڑے، مکھیاں وغیرہ نہیں ہوں گی۔

۶۔ وَ لَہُمۡ فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ الثَّمَرٰتِ: کُلِّ الثَّمَرٰتِ تمام وہ میوے جو انسانی تصور میں ہیں وہاں فراہم ہوں گے۔

یہ ان نعمتوں کو سمجھانے کے لیے ایک مثال ہے ورنہ وہاں کی نعمتوں کی لذت، صفائی وغیرہ دنیا والوں کے لیے قابل بیان و ادراک نہیں ہے۔

۷۔ وَ مَغۡفِرَۃٌ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ: اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت اور درگزر کی وجہ سے گناہوں کی آلودگیوں سے پاک ہو چکے ہوں گے۔ اس مغفرت کی وجہ سے جنت کی زندگی بے داغ ہو گی جو اپنی جگہ ایک بہت بڑی نعمت ہے۔

---

[1] ۳۲ سجدہ: ۱۷

۸۔ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ: کیا وہ شخص جسے اس قسم کی جنت میں داخل کیا جائے گا ان لوگوں کی طرح ہوسکتا ہے جو الی الابد جہنم میں رہیں گے۔ جنت والوں کو ہر قسم کی نعمتیں میسر ہوں گی۔ اس کے مقابلے میں جہنم والوں کو کھولتا پانی پلایا جائے گا اور تشنگی ختم کرنے کی جگہ آنتوں تک کو پارہ کر دے گا۔

اہم نکات

۱۔ قرآن جنت کی نعمتوں کی مثال پیش کرتا ہے، خود نعمتوں کا ذکر نہیں کرتا۔

۲۔ چونکہ مومن کے لیے جنت میں ناقابل وصف و بیان نعمتیں ہوں گی۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ حَتّٰٓى اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا ۟ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ﴿۱۶﴾

۱۶۔ ان میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو آپ کو سنتے ہیں لیکن جب آپ کے پاس سے نکل جاتے ہیں تو جنہیں علم دیا گیا ہے ان سے پوچھتے ہیں: اس نے ابھی کیا کہا؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے اور وہ اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ: ما انزل اللّٰہ کو ناپسند کرنے والے لوگوں میں سے کچھ منافقین ایسے بھی ہیں جو آپ کی مجلس یا جمعہ کی نماز میں آپ کا خطبہ سن رہے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ مشرکین مکہ کی طرح نہیں ہیں جو اپنا کفر ظاہر کرتے تھے اور آپ کو سنتے ہی نہیں تھے۔

۲۔ حَتّٰٓى اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ: جب آپ کے محضر سے نکلتے اور آزاد فضا میں آتے ہیں۔ مجلس رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے جو ان کے لیے بارگراں تھی نکل آتے ہیں،

۳۔ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا: تو اہل علم سے پوچھتے ہیں: ابھی کیا کہ رہے تھے؟ یعنی یہ منافقین جب مجلس رسولؐ سے باہر آتے تو اہل علم سے پوچھتے تھے: ابھی ابھی رسول کیا کہہ رہے تھے؟ جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہمیشہ غیر مبہم، واضح لفظوں میں مطالب بیان کرتے تھے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا یہ فرمان مشہور ہے:

انا افصح العرب و العجم۔[1] میں عرب اور عجم میں سب سے زیادہ فصیح ہوں۔

نیز ارشاد فرمایا: وَ اُعْطِيْتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ...[2] یعنی آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم قلیل الفاظ میں کثیر مطالب بیان فرماتے

---

[1] عوالی اللآلی ۴: ۱۲۰ [2] من لا یحضرہ الفقیہ ۱: ۲۴۰

تھے۔ اس کے باوجود وہ کلام رسول ﷺ کو نہیں سمجھ رہے تھے۔ چونکہ وہ کلام رسولؐ سے استفادہ کے لیے نہیں آتے تھے اس لیے مجلس رسولؐ میں بیٹھ کر اپنی دنیا میں گم رہتے تھے۔ جب اثنائے کلام میں منافقین کا ذکر آتا تو گھبرا کر اہل علم سے پوچھتے تھے۔ اہل علم کی طرف رجوع کرنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ سمجھنا چاہتے تھے منافقین کے بارے میں کیا کہا؟ ایسا نہیں ہے کہ وہ از راہ تمسخر کہہ رہے ہوں جیسا کہ اکثر مفسرین نے لکھا ہے۔ چونکہ تمسخر کے لیے اہل علم کی طرف رجوع نہ کرتے تھے بلکہ آپس میں تمسخر کرتے تھے۔ چنانچہ سورہ توبۃ آیت ۱۲۴ میں ان منافقوں کا یہ قول مذکور ہے۔

وَاِذَامَاۤ اُنۡزِلَتۡ سُوۡرَۃٌ فَمِنۡہُمۡ مَّنۡ یَّقُوۡلُ اَیُّکُمۡ زَادَتۡہُ ہٰذِہٖۤ اِیۡمَانًا ....

اور جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو ان میں سے کچھ لوگ (از راہ تمسخر) کہتے ہیں: اس سورہ نے تم میں سے کس کے ایمان میں اضافہ کیا ہے؟

غیر شیعہ مصادر میں آیا ہے کہ ابن عباس نے کہا ہے کہ سوال مجھ سے ہوتا تھا۔ اس صورت میں حضرت ابن عباس کو ان لوگوں کا علم ہوا ہوگا جن کے خلاف یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

شیعہ مصادر میں آیا ہے: اصبغ بن نباتۃ راوی ہیں حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

فانا کنا عند رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم فیخبرنا بالوحی فاعیہ ویفوتہم فاذا خرجنا قالوا: مَاذَا قَالَ اٰنِفًا۔[1]

ہم رسول اللہؐ کی خدمت میں ہوتے تھے اور آپ ہمیں وحی کی باتیں سناتے تھے جنہیں میں سمجھ لیتا تھا دوسرے رہ جاتے۔ جب ہم باہر نکلتے تو پوچھتے تھے ابھی رسولؐ کیا کہہ رہے تھے۔

اور یہ بات شیعہ سنی مصادر میں متعدد طرق سے وارد ہے کہ آیت وَّتَعِیَہَاۤ اُذُنٌ وَّاعِیَۃٌ ....[2] اور سمجھدار کان ہی اسے محفوظ کر لیتا ہے، حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ ملاحظہ ہو الکوثر فی تفسیر القرآن سورۃ الجاثیہ۔

۴۔ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ طَبَعَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ: یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اپنی گمراہی پر ڈٹ جانے اور ہدایت قبول نہ کرنے کی وجہ سے اللہ نے اپنے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ ایسا ہونے سے ان کے دلوں پر مہر لگ جاتی ہے اور اللہ ابتداءً ایسا نہیں کرتا بلکہ وَاتَّبَعُوۡۤا اَہۡوَآءَہُمۡ خواہشات کی پیروی کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان سے ہاتھ اٹھا لیتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ منافق کا ذہن کلام حق سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔

۲۔ منافقین اپنی مشکلات کے لیے اہل علم کی طرف رجوع کرتے تھے، ہدایت کے لیے نہیں۔

---

[1] بحار الانوار ۴۰: ۱۳۷	[2] ۶۹ حاقۃ: ۱۲

وَالَّذِیۡنَ اهۡتَدَوۡا زَادَهُمۡ هُدًی وَّ اٰتٰهُمۡ تَقۡوٰىهُمۡ ﴿۱۷﴾

۱۷۔ اور جنہوں نے ہدایت حاصل کی اللہ نے ان کی ہدایت میں اضافہ فرمایا اور انہیں ان کا تقویٰ عطا فرمایا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَالَّذِیۡنَ اهۡتَدَوۡا زَادَهُمۡ هُدًی: جن لوگوں نے ہدایت کی راہ اختیار کی ہے ان میں مزید ہدایت کی صلاحیت آ جاتی ہے چونکہ ہدایت قبول کرنے سے دل شفاف اور ذہن صاف ہو جاتا ہے۔

۲۔ وَّ اٰتٰهُمۡ تَقۡوٰىهُمۡ: انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بچاؤ کی سمجھ عنایت فرمائی۔ اس طرح ان کے ایمان و ہدایت میں اضافے کے ساتھ ان کے تقویٰ اور پرہیزگاری میں اضافہ ہوا۔

فَهَلۡ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنۡ تَاۡتِیَهُمۡ بَغۡتَةً ۚ فَقَدۡ جَآءَ اَشۡرَاطُهَا ۚ فَاَنّٰی لَهُمۡ اِذَا جَآءَتۡهُمۡ ذِكۡرٰىهُمۡ ﴿۱۸﴾

۱۸۔ کیا یہ لوگ بس قیامت ہی کے منتظر ہیں کہ انہیں اچانک آ لے؟ پس اس کی علامات تو آ چکی ہیں، لہٰذا جب قیامت آ چکے گی تو اس وقت انہیں نصیحت کہاں مفید ہو گی؟

تشریح کلمات

الاشراط: (ش ر ط) شرط کی جمع۔ علامت کے معنوں میں ہے۔ شرط اس چیز کو کہتے ہیں جس پر کوئی کام موقوف ہو۔ جب شرط موجود ہوتی ہے تو یہ علامت ہو جاتی ہے مشروط کے وجود میں آنے کی۔

تفسیر آیات

۱۔ فَهَلۡ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَّا السَّاعَةَ: حق سمجھانے کے لیے جن دلائل و معجزات کی ضرورت تھی وہ سب بیان ہو چکے۔ اب یہ لوگ ایمان لانے کے لیے قیامت کے منتظر ہیں کہ قیامت اچانک ان کے سر پر آ جائے تو ایمان لائیں گے؟

۲۔ فَقَدۡ جَآءَ اَشۡرَاطُهَا: قیامت کی علامات تو آ چکی ہیں۔ اس کے بعد خود قیامت کا آنا بھی نزدیک ہے۔ قیامت کی علامات میں سے اہم علامت نبی آخر الزمان ﷺ کی آمد ہے جن کے بعد قیامت تک کسی اور نبی نے نہیں آنا ہے اور ایک علامت شق القمر ہے: اِقۡتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانۡشَقَّ الۡقَمَرُ۔[1]

---

[1] ۵۴ قمر: ۱۔ قیامت قریب آ گئی اور چاند شق ہو گیا۔

۳۔ فَاَنّٰی لَهُمۡ : جب قیامت آچکے گی تو ان کے لیے نصیحت کا موقع کہاں باقی رہے گا۔ یعنی انی لھم ذِکۡرٰىهُمۡ اذا جاء تھم۔ چونکہ قیامت دار جزا ہے یہاں نصیحت کا وقت نہیں ہے۔

فَاعۡلَمۡ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسۡتَغۡفِرۡ لِذَنۡۢبِكَ وَلِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ مُتَقَلَّبَكُمۡ وَمَثۡوٰىكُمۡ ﴿۱۹﴾ ع

۱۹۔ پس جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اپنے گناہ کی معافی مانگو اور مومنین و مومنات کے لیے بھی اور اللہ تمہاری آمد و رفت اور ٹھکانے کو جانتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَاعۡلَمۡ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ: جب امر واقع یہ ہے جو ذکر ہوا تو اے رسول ﷺ! آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کو واحد معبود تسلیم کیا جائے۔ اس کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کیا جائے۔

۲۔ وَاسۡتَغۡفِرۡ لِذَنۡۢبِكَ وَلِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ: اپنے اور مومنین کے قصور کے لیے معافی مانگو۔ اللہ کی بندگی کرنے کے بعد یہ سمجھے کہ شان الٰہی، عظمت خالق، اس کی نعمتوں اور احسانات کے مقابلے میں یہ عبادت، یہ بندگی حق ادا نہیں کرتی اور یہ سمجھے میں قصور وار ہوں۔ اے اللہ! مجھے معاف فرما تیری بندگی کا حق ادا نہ کر سکا۔ بندگی یہ نہیں ہے کہ اپنی عبادت پر فخر کرے اور یہ سمجھے میں بندگی کا حق ادا کر رہا ہوں۔ یہ بندگی نہیں، خود بینی ہے۔ امیر المؤمنین علیہ السلام سے مروی ہے:

سَيِّئَةٌ تَسُوءُكَ خَيۡرٌ عِنۡدَ اللّٰهِ مِنۡ حَسَنَةٍ تُعۡجِبُكَ۔[۱]

وہ گناہ جو خود تجھے برا لگے اللہ کے نزدیک اس نیکی سے بہتر ہے جو تجھے خود پسندی میں مبتلا کرے۔

حدیث میں ہے:

الِاسۡتِغۡفَارُ وَ قَوۡلُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ خَيۡرُ الۡعِبَادَةِ قَالَ اللّٰهُ الۡعَزِيۡزُ الۡجَبَّارُ فَاعۡلَمۡ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسۡتَغۡفِرۡ لِذَنۡۢبِكَ۔[۲]

استغفار اور کلمہ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ بہترین عبادت ہے۔ اللّٰهُ الۡعَزِيۡزُ الۡجَبَّارُ نے فرمایا ہے: پس جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اپنے گناہ کی معافی مانگو۔

چنانچہ کسی نبی یا امام نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں نے بندگی کا حق ادا کر دیا ہے۔ سب نے اپنے قصور کا اعتراف کیا ہے جو آداب بندگی کی روح ہے۔ لہٰذا یہ تصور درست نہیں ہے کہ استغفار صرف گناہ کے لیے ہے۔ استغفار تشکیل سیرت کے لیے بھی ہے۔

اہم نکات

۱۔ استغفار ایک عبادت اور آداب و روح بندگی ہے۔

[۱] نہج البلاغۃ حکمت: ۴۶ [۲] اصول کافی۔ ۲: ۵۰۵

وَ يَقُوۡلُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَوۡ لَا نُزِّلَتۡ سُوۡرَۃٌ ۚ فَاِذَاۤ اُنۡزِلَتۡ سُوۡرَۃٌ مُّحۡكَمَۃٌ وَّ ذُكِرَ فِيۡهَا الۡقِتَالُ ۙ رَاَيۡتَ الَّذِيۡنَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ يَّنۡظُرُوۡنَ اِلَيۡكَ نَظَرَ الۡمَغۡشِىِّ عَلَيۡهِ مِنَ الۡمَوۡتِ ؕ فَاَوۡلٰى لَهُمۡ ﴿۲۰﴾	۲۰۔ اور جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ کہتے ہیں: کوئی (نئی) سورت نازل کیوں نہیں ہوئی؟ (جس میں جہاد کا ذکر ہو) اور جب محکم بیان والی سورت نازل ہو اور اس میں قتال کا ذکر آ جائے تو آپ دیکھتے ہیں کہ جن کے دلوں میں بیماری ہے وہ آپ کی طرف اس طرح دیکھتے ہیں جیسے موت کی بے ہوشی طاری ہو گئی ہو، پس ان کے لیے تباہی ہو۔

تشریح کلمات

فَاَوۡلٰى لَهُمۡ: (ا و ل) فَاَوۡلٰى لَهُمۡ میں اولیٰ کلمۂ تہدید و تخویف ہے اور جو ہلاکت کے قریب پہنچ چکا ہو اسے تنبیہ کرنے کے لیے آتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ يَقُوۡلُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا: اہل ایمان کی تو یہ خواہش رہتی تھی کہ وحی کا سلسلہ بلا توقف جاری رہے۔ تازہ کلام سننے کا موقع ملے گا، کوئی نیا حکم آئے گا، اس کی تعمیل کی سعادت نصیب ہو گی۔ ایمان تازہ ہو گا۔

۲۔ لیکن دوسرے مریض دل لوگوں کا یہ حال ہے کہ کوئی نئی آیت واضح اور غیر مبہم حکم خدا لے کر نازل ہوتی ہے، اگر اس میں قتال و جہاد کا ذکر ہے تو ان پر موت کی سی غشی طاری ہو جاتی ہے۔ مُّحۡكَمَۃٌ سے مراد وہ آیت ہو سکتی ہے جو غیر مبہم اور پوری وضاحت کے ساتھ حکم کا بیان لے کر نازل ہو۔

۳۔ رَاَيۡتَ الَّذِيۡنَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ: مریض دل کی تعبیر قرآن مجید میں ان لوگوں کے لیے استعمال ہوئی ہے جو سچے دل سے مومن بھی نہیں ہیں اور منافق بھی نہیں ہیں۔ مومن اور منافق کے درمیان ہیں انہیں مریض دل کہا گیا ہے۔ چنانچہ سورہ انفال آیت ۴۹ میں فرمایا:

اِذۡ يَقُوۡلُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَ الَّذِيۡنَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ غَرَّ هٰۤؤُلَاۤءِ دِيۡنُهُمۡ ...	جب (ادھر) منافقین اور جن کے دلوں میں بیماری تھی، کہ رہے تھے: انہیں تو ان کے دین نے دھوکہ دے رکھا ہے۔

یہاں منافق اور مریض دل لوگوں کا ذکر ہے۔

اسی طرح سورہ احزاب آیت ۱۲ میں فرمایا:

وَ اِذۡ یَقُوۡلُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَ الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰہُ وَ رَسُوۡلُہٗۤ اِلَّا غُرُوۡرًا ۝

اور جب منافقین اور دلوں میں بیماری رکھنے والے کہہ رہے تھے: اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے جو وعدہ کیا تھا وہ فریب کے سوا کچھ نہ تھا۔

نیز فرمایا:

لَئِنۡ لَّمۡ یَنۡتَہِ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَ الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ وَّ الۡمُرۡجِفُوۡنَ فِی الۡمَدِیۡنَۃِ لَنُغۡرِیَنَّکَ بِہِمۡ ۔۔۔[1]

اگر منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے اور جو مدینہ میں افواہیں پھیلاتے ہیں اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو ہم آپ کو ان کے خلاف اٹھائیں گے

ان تمام آیات میں مریض دل لوگوں کا ذکر منافقوں کے ساتھ ہوا ہے اور جہاد کے بارے میں مریض دل والوں کا ذکر آتا ہے جہاں ایمان کا صحیح امتحان ہوتا ہے۔ سورہ مدثر آیت ۳۱ میں فرمایا:

وَّ لِیَقُوۡلَ الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ وَّ الۡکٰفِرُوۡنَ مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰہُ بِہٰذَا مَثَلًا ۔۔۔

اور جن کے دلوں میں بیماری ہے نیز کفار یہی کہیں: اس بیان سے اللہ کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟

اس آیت میں مریض دل والوں اور کفار کا ذکر ہوا ہے۔

لہٰذا ان سب آیتوں سے معلوم ہوا کہ مریض دل والے نہ منافق لوگ ہیں، نہ کافر لوگ بلکہ ایمان، کفر اور نفاق میں ایک چوتھی قسم کے لوگ ہیں۔

۴۔ فَاَوۡلٰی لَہُمۡ: تباہی ہو ان مریض دل لوگوں کی۔ اولیٰ لھم کی ترکیب کے بارے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں: قاربه ما يهلكه اسے تباہ کرنے والی بات اس پر آ گرے۔ جوھری نے بھی کہا ہے: اولیٰ لك تہدید کے موقع پر کہا جاتا ہے۔

چنانچہ سورہ قیامۃ آیت ۳۴۔۳۵ میں ابوجہل کے لیے یہ لفظ استعمال ہوا ہے:

اَوۡلٰی لَکَ فَاَوۡلٰی ۝ ثُمَّ اَوۡلٰی لَکَ فَاَوۡلٰی ۝

تیرے لیے تباہی پر تباہی ہے۔ پھر تیرے لیے تباہی پر تباہی ہے۔

کہتے ہیں دراصل یہ لفظ ولیٰ یلی سے ماخوذ ہے جو قرب کے معنوں میں ہے۔ یعنی تمہاری تباہی نزدیک ہے۔

اہم نکات

۱۔ منافق کا نفاق اور مریض دل لوگوں کا ضمیر میدان جنگ میں فاش ہوا کرتا تھا۔

طَاعَۃٌ وَّ قَوۡلٌ مَّعۡرُوۡفٌ ۟ فَاِذَا

۲۱۔ ان کی اطاعت اور پسندیدہ گفتار (کا حال معلوم

---

[1] ۳۳ احزاب: ۶۰

عَزَمَ الۡاَمۡرُ ۟ فَلَوۡ صَدَقُوا اللّٰہَ لَکَانَ خَیۡرًا لَّہُمۡ ﴿۲۱﴾

ہے) مگر جب معاملہ حتمی ہو جاتا ہے تو اس وقت (بھی) اگر وہ اللہ کے ساتھ سچے رہتے تو ان کے لیے بہتر ہوتا۔

تفسیر آیات

۱۔ طَاعَۃٌ وَّ قَوۡلٌ مَّعۡرُوۡفٌ: ان کی زبان پر تو اطاعت کا وعدہ اور بہتر گفتگو ہے۔ یعنی قتال و جہاد کا حتمی حکم آنے سے پہلے کی بات ہے کہ وہ پوری چرب زبانی کے ساتھ اطاعت و فرماں برداری کا اظہار کرتے ہیں اور اپنی وفاداری کے اظہار کے لیے بڑھ چڑھ کر بولتے ہیں۔

۲۔ فَاِذَا عَزَمَ الۡاَمۡرُ: جب فیصلہ جہاد حتمی ہو جاتا ہے تو یہ لوگ جہاد سے منہ پھیر لیتے، اپنے قول وقرار کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ اصل میں فاذا عزم الامر خالفوا ہے۔

۳۔ فَلَوۡ صَدَقُوا اللّٰہَ لَکَانَ خَیۡرًا لَّہُمۡ: اگر وہ اپنے قول وقرار اور وعدہ اطاعت کو سچا کر کے دکھا دیتے اور صدق دل سے جہاد میں شرکت کر لیتے تو اس میں ان کے لیے بہتری تھی۔

جو تفسیر ہم نے اختیار کی ہے وہ آیت کے سباق و سیاق کے مطابق ہے۔ دیگر تفاسیر میں ان دو آیتوں کی مختلف اور متعدد تفسیریں ہیں۔

فَہَلۡ عَسَیۡتُمۡ اِنۡ تَوَلَّیۡتُمۡ اَنۡ تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ وَ تُقَطِّعُوۡۤا اَرۡحَامَکُمۡ ﴿۲۲﴾

۲۲۔ پھر اگر تم حکمران بن جاؤ تو تم سے توقع کی جا سکتی ہے کہ تم زمین میں فساد برپا کرو گے اور اپنے رشتوں کو توڑ ڈالو گے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَہَلۡ عَسَیۡتُمۡ اِنۡ تَوَلَّیۡتُمۡ: جب تمہارے ایمان کا یہ حال اور حکم عدولی کا یہ عالم ہے تو سے فساد فی الارض اور قطع رحمی کے سوا کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ دوسری تفسیر یہ کی جاتی ہے کہ تم کبھی برسر اقتدار آئے تو تم سے فساد فی الارض اور قطع رحمی کے علاوہ کیا توقع رکھی جا سکتی ہے۔ بعض نے تَوَلَّیۡتُمۡ کے معنی منہ پھیرنے اور بعض نے برسر اقتدار آنے کے کیے ہیں۔

تَوَلَّیۡتُمۡ: التولی ولایت و حکومت کے معنوں میں زیادہ قرین سیاق ہے چونکہ حکمرانوں سے فساد فی الارض کا ارتکاب ہوا کرتا ہے اور اپنی کرسی و اقتدار کے لیے قریبی ترین رشتہ داروں کا بھی خون کرتے ہیں۔

چنانچہ چشم جہاں نے دیکھ لیا جب حکومت بنی امیہ کے ہاتھ آئی تو انہوں نے نہ کسی چھوٹے پر رحم کیا، نہ بڑے پر، نہ صلہ رحمی کا خیال رکھا۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے نشاندہی فرمائی کہ فساد پھیلانے اور قطع رحمی کرنے والے کون ہیں:

هم هذا الحی من قریش اخذ الله علیهم ان ولوا الناس ان لا یفسدوا فی الارض ولا یقطعوا ارحامهم۔[1]

یہ مفسدین قریش کا ایک قبیلہ ہے۔ ان سے اللہ نے عہد لیا ہے کہ اگر وہ لوگوں کے حاکم بن جائیں تو زمین پر فساد نہ پھیلائیں اور قطع رحمی نہ کریں۔

دیگر متعدد روایات میں اس قبیلے کی نشاندہی کی گئی ہے۔

رأی رسول الله بنی امیة ینزون علی منبره نزو القردة فساء ه فما استجمع ضاحکاً حتی مات۔

رسول اللہ (ﷺ) نے خواب میں دیکھا کہ آپ کے منبر پر بنی امیہ اس طرح چھل کود کر رہے تھے جس طرح بندر اچھل کود کرتے ہیں۔ آپ پر یہ بات اتنی دشوار گزری کہ اس کے بعد تا حیات آپ نے تبسم نہیں فرمایا۔

اس مضمون کی روایات کے راوی ہیں: سهل بن سعد، سعید بن المسیب، یعلی بن مرة، ابن عمر۔

حضرت عائشه نے مروان بن حکم سے فرمایا:

سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول لابیك وجدك انکم الشجرة الملعونة فی القرآن۔[2]

میں نے رسول اللہ ﷺ کو تیرے باپ اور تیرے دادا کے بارے میں یہ کہتے سنا ہے تم وہ شجرہ ملعونہ ہو جو قرآن میں مذکور ہے۔

واضح رہے کہ مروان کو رسول اللہ ﷺ نے مدینہ سے شہر بدر کیا تھا۔ زمانے کی ستم ظریفی دیکھیے یہی مروان بعد میں حضرت زہرا علیہا السلام کی جاگیر فدک کا مالک بن جاتا ہے۔ بعد میں تو یہی لوگ منبر رسول ﷺ کے مالک بن گئے۔

رأیت الدهر یرفع کل وغد
و یخفض کل ذی شیم شریفه[3]

میں نے دیکھا ہے کہ زمانہ ہر نالائق کو بلند
کرتا اور ہر شریف صفت کو گراتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ سچ فرمایا صادق آل محمد علیہ السلام نے کہ سورہ محمد کی ایک آیت ہماری شان میں اور ایک آیت ہمارے دشمنوں کے بارے میں ہے۔

---

[1] تفسیر قرطبی وغیرہ [2] روح المعانی، الدرالمنثور ذیل آیت ۶۰، سورہ بنی اسرائیل
[3] ابن الرومی۔ شرح نهج البلاغة ۳: ۳۴۷

اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ لَعَنَہُمُ اللّٰہُ فَاَصَمَّہُمۡ وَ اَعۡمٰۤی اَبۡصَارَہُمۡ ﴿۲۳﴾	۲۳۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے لہٰذا انہیں بہرا کر دیا اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ لَعَنَہُمُ اللّٰہُ: یہ فساد فی الارض اور قطع رحمی کرنے والے ہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے اپنی رحمت سے دور کیا ہے۔ رحمت خدا کے حصول کے ذرائع ان پر مسدود کر دیے۔ حق کی آواز سن سکتے ہیں نہ صراط مستقیم دیکھ سکتے ہیں۔ اگر کسی کے پاس قوت سماعت نہیں ہے تو منزل تک پہنچنے کے لیے قوت بصارت سے مدد لی جا سکتی ہے۔ اسی طرح اگر قوت بصارت نہیں ہے تو قوت سماعت سے مدد لی جا سکتی ہے۔ اگر کسی کے پاس دونوں چیزیں نہ ہوں تو اس کا منزل تک پہنچنا ممکن نہیں ہوتا۔

آلوسی نے تفسیر روح المعانی میں اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے:

واستدل بها علی جواز لعن یزید علیه من الله ما یستحق۔	اس آیت سے یزید پر لعنت کے جواز پر استدلال کیا گیا ہے۔

پھر لکھتے ہیں:

> برزنجی نے الاشاعة میں اور هیثمی نے الصواعق میں لکھا ہے کہ امام احمد سے ان کے بیٹے عبد اللّٰه نے لعن یزید کے بارے میں پوچھا تو امام احمد نے کہا: اس شخص پر لعنت کیسے نہ کی جائے جس پر اللہ نے اپنی کتاب میں لعنت کی ہے۔ عبد اللّٰه نے کہا: میں نے قرآن پڑھا ہے مگر اس میں یزید پر لعنت میں نے نہیں دیکھی۔ امام احمد نے کہا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَہَلۡ عَسَیۡتُمۡ اِنۡ تَوَلَّیۡتُمۡ اَنۡ تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ وَ تُقَطِّعُوۡۤا اَرۡحَامَکُمۡ۔ یزید نے جو کچھ کیا ہے اس سے بڑھ کر فساد اور قطع رحمی کیا ہو سکتی ہے؟

پھر لکھتے ہیں:

> علماء کی ایک جماعت نے یزید پر کفر اور اس پر لعنت کی صراحت کی ہے۔ ان میں الحافظ ناصر السنة ابن الجوزی قابل ذکر ہیں۔ ان سے پہلے قاضی ابو یعلی نے یہی موقف اختیار کیا ہے۔ علامہ تفتازانی نے کہا ہے: ہم اس کے بارے میں، اس کے ایمان کے بارے میں کوئی تردد نہیں کرتے ہیں۔ اللہ کی لعنت ہو اس پر، اس کے انصار و اعوان پر۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے بھی اس پر لعنت کی تصریح کی ہے۔

آگے لکھتے ہیں:

تاریخ ابن الوردی اور کتاب الوافی بالوفیات میں آیا ہے کہ جب اسیران کربلا عراق سے یزید کے پاس شام پہنچ گئے تو یزید باہر نکل آیا تو جیرون کی پہاڑی پر حضرت علی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے بچوں اور خواتین کو اور شہداء کے سروں کو نیزوں پر اُٹھائے ہوئے دیکھا تو اس وقت کوے کے بولنے کی آواز آئی تو یزید نے کہا:

نعب الغراب فقلت قل او لا تقل	فقد اقتضیت من الرسول دیونی

کوا بولا۔ میں نے کہا تم بولو یا نہ بولو	میں نے رسول سے اپنا قرض چکا لیا ہے

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بدر کے دن اس کی جد عتبہ، اس کے ماموں عتبہ کے بیٹے وغیرہ کو قتل کیا تو اس قتل کا بدلہ میں نے لے لیا ہے۔ یہ صریح کفر ہے۔ اگر یہ روایت صحیح ہے تو وہ کافر ہے۔ اسی طرح عبد اللّٰہ الزبعری کے زمان جاہلیت کے اشعار کو شاہد مثال بنانے سے بھی اس کا کفر ثابت ہوتا ہے۔ لیت اشیاخی....[1]

واضح رہے عبد اللّٰہ الزبعری کے اشعار میں یہ شعر ہے:

لعبت هاشم بالملك فلا	خبر جاء ولا وحی نزل

بنی ہاشم نے حکومت کرنے کے لیے ایک کھیل کھیلا ہے	نہ کوئی خبر آئی نہ ہی کوئی وحی نازل ہوئی ہے۔

اس کے علاوہ یزید بن معاویہ نے مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو تاراج کر کے ہزاروں افراد کو شہید کیا جن میں سات سو مہاجر و انصار کے قاریان قرآن شامل تھے۔[2]

ابن تیمیہ کے شاگرد رشید ابن کثیر البدایۃ و النہایۃ ۸: ۲۲۱ میں لکھتے ہیں:

ولدت الف امرأة من اهل المدینة بعد وقعة الحرة من غیر زوج۔	واقعۂ حرہ کے بعد اہل مدینہ کی ایک ہزار عورتوں نے ناجائز بچے جنے بغیر شوہر کے۔

چونکہ یزید کے حکم سے شامی لشکر کے لیے مدینہ تین دن تک حلال قرار دیا گیا تھا۔

یہ واقعہ حرہ کے نام سے مشہور ہے لیکن با این ہمہ بہت سے لوگ اپنی جماعت سے وابستہ لوگوں کے اس سیاہ ترین کارنامے کو ذکر کرنے سے احتراز کرتے ہیں۔ اس کی جگہ وہ یزید کی حمایت کرنے میں خفت محسوس نہیں کرتے بلکہ پوری جسارت کے ساتھ یہ کہتے ہیں: قتل الحسین بسیف جدہ۔ حسین اپنے نانا کی تلوار سے مارا گیا۔

یزید نانا کی تلوار کا وارث بن گیا۔ نانا کے دین کو سید شباب اهل الجنة سے خطرہ لاحق ہوا۔

[1] روح المعانی ۳: ۲۲۸ [2] الصواعق المحرقۃ: ۲۲۲

حسین منی و انا من حسین کی جگہ یزید حامی دین مصطفٰی بن گیا اور حسین باغی!!! فیا للّٰہ ما احدث الدھر۔ انہی لوگوں پر یہ آیت صادق آتی ہے:

اُولٰٓئِكَ الَّذِیۡنَ لَعَنَہُمُ اللّٰہُ فَاَصَمَّہُمۡ وَ اَعۡمٰۤی اَبۡصَارَہُمۡ ○ — یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے لہٰذا انہیں بہرا کر دیا اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا۔

اگر ان میں حق کی آواز سننے اور مشاہدۂ حق کی تھوڑی سی بھی صلاحیت ہوتی تو حسین علیہ السلام روشنی اور یزید (لع) جیسی تاریکی میں امتیاز کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آتی اور حدیث حسین منی و انا من حسین کے مقابلے میں لعن اللّٰہ الراکب و القائد و السائق[1] کا سمجھنا دشوار نہ تھا۔

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ اَمۡ عَلٰی قُلُوۡبٍ اَقۡفَالُہَا ﴿۲۴﴾

۲۴۔ کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے یا (ان کے) دلوں پر تالے لگ گئے ہیں؟

تفسیر آیات

یہ لوگ اپنی بینش درست کرنے کے لیے قرآن میں تدبر نہیں کرتے۔ قرآن میں تدبر سے انسان میں روشنی اور حق و ناحق میں تمیز کرنے کی صلاحیت آ جاتی ہے لکنھم حفظوا حروفہ و ضیعوا حدودہ۔ مگر ان لوگوں نے حروف قرآن کو تو حفظ کر لیا مگر حدود قرآن کو ضائع کر دیا۔

ابو بکر عتیق بن محمد سور آبادی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> قفل سے مراد بے معرفت اور غفلت ہے۔ اللہ نے قرآن میں ایسے دلوں کو دس برے ناموں سے یاد کیا ہے: غمرت، غفلت، غطاء، غشوت، قسوت، مرض، ختم، طبع، رین اور قفل۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ ارۡتَدُّوۡا عَلٰۤی اَدۡبَارِہِمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَیَّنَ لَہُمُ الۡہُدَی ۙ الشَّیۡطٰنُ سَوَّلَ لَہُمۡ ؕ وَ اَمۡلٰی لَہُمۡ ﴿۲۵﴾

۲۵۔ جو لوگ اپنی پیٹھ پر الٹے پھر گئے بعد اس کے کہ ان پر ہدایت واضح ہو چکی تھی، شیطان نے انہیں فریب دیا ہے اور ڈھیل دے رکھی ہے۔

تشریح کلمات

سَوَّلَ: (س و ل) کسی چیز کے قبح کو خوشنما بنا کر پیش کرنے کے معنوں میں ہے۔ قبیح کو خوشنما بنا کر

---

[1] شرح نہج البلاغۃ ابن ابی الحدید ۱۵: ۱۷۵

پیش کرنا فریب ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ ارۡتَدُّوۡا عَلٰۤی اَدۡبَارِہِمۡ : انہی منافقین کا ذکر ہے کہ ان کے لیے ہدایت کے تمام مواقع میسر اور حق کی طرف جانے کی ساری راہوں کی واضح نشاندہی ہونے کے باوجود وہ الٹے پیٹھ پھر گئے۔ ایمان کا اظہار کر کے اپنی نجی محفلوں میں کفر کا اظہار کرنا ایک قسم کا مرتد ہونا ہے۔

۲۔ اَلشَّیۡطٰنُ سَوَّلَ لَہُمۡ : ان کے پیچھے اصل محرک شیطان ہے جو دو حربوں سے انہیں گمراہ کرتا ہے: اچھائی اور برائی میں تمیز ختم کر کے، برائی کو بھی خوشنما اور لمبی لمبی آرزوں کا فریفتہ بنا کر۔ بعض مفسرین کے نزدیک املی مہلت دینے کے معنوں میں لیا جائے بہتر ہے۔ اس صورت میں مہلت اور ڈھیل دینے والا خود شیطان ہے۔ وہ لمبی آرزوؤں کے ذریعے گناہ کے ارتکاب کی مدت کو طول دیتا ہے۔

ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ قَالُوۡا لِلَّذِیۡنَ کَرِہُوۡا مَا نَزَّلَ اللّٰہُ سَنُطِیۡعُکُمۡ فِیۡ بَعۡضِ الۡاَمۡرِ ۚ وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ اِسۡرَارَہُمۡ ﴿۲۶﴾

۲۶۔ یہ اس لیے ہوا کہ انہوں نے اللہ کی طرف سے نازل کردہ (کتاب) کو ناپسند کرنے والوں سے (خفیہ طور پر) کہا: بعض معاملات میں عنقریب ہم تمہاری پیروی کریں گے اور اللہ ان کی پوشیدہ باتیں جانتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ : ان کے مرتد ہونے کی صورت کا بیان ہے کہ یہ منافقین ان لوگوں کے ساتھ معاہدہ کرتے ہیں جو اسلام کے خلاف صف بستہ ہیں یعنی یہود و مشرکین۔ یہ منافقین کافروں کے ساتھ فِیۡ بَعۡضِ الۡاَمۡرِ تعاون کرنے کا عہد کرتے ہیں جو اسلام کے خلاف سازش ہے۔ اس میں وہ ان کے ساتھ ہوں گے۔ باقی ان کی راہیں جدا ہوں گی۔

کَرِہُوۡا مَا نَزَّلَ اللّٰہُ : یہود اور مشرکین دونوں ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ منافقین خود بھی اس میں شامل ہیں جیسا کہ صادقین علیہما السلام کی روایت میں ہے۔

۲۔ وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ اِسۡرَارَہُمۡ : ان کے خفیہ معاہدوں کو اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ اسلام دشمن طاقتوں کے ساتھ اسلام کے خلاف کیا خفیہ معاہدے کر رہے ہیں۔

فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ﴿۲۷﴾

۲۷۔ پس اس وقت (ان کا کیا حال ہوگا) جب فرشتے ان کی جان نکالیں گے اور ان کے چہروں اور سرینوں پر ضربیں لگا رہے ہوں گے۔

تفسیر آیات

ا۔ فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ: حالت نزع میں ہی ان منافقوں پر عذاب شروع ہو جاتا ہے چونکہ موت جب سامنے آ جاتی ہے تو دنیا کی زندگی ختم اور آخرت کی زندگی شروع ہو جاتی ہے اور یہ بات موت واقع ہونے سے پہلے اور موت سامنے آنے کے بعد شروع ہوتی ہے۔ اگر کافر اور منافق ہے تو عذاب اور اگر مومن ہے تو جنت کی بشارت مل جاتی ہے:

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝[1]

جن کی روحیں فرشتے پاکیزہ حالت میں قبض کرتے ہیں (اور انہیں) کہتے ہیں: تم پر سلام ہو! اپنے (نیک) اعمال کی جزا میں جنت میں داخل ہو جاؤ۔

اہم نکات

ا۔ موت کے وقت انسان کو اس کی ابدی قسمت کا فیصلہ سنا دیا جاتا ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَكَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ﴿۲۸﴾ ع

۲۸۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے اس بات کی پیروی کی جو اللہ کو ناراض کرتی ہے اور اللہ کی خوشنودی سے بیزاری اختیار کرتے ہیں لہٰذا اللہ نے ان کے اعمال حبط کر دیے،

تفسیر آیات

ا۔ ذٰلِكَ: موت کے وقت ہی ان پر عذاب شروع ہونا اس لیے ہے کہ ان کے کردار میں دو باتیں نمایاں تھیں: جن باتوں سے اللہ تعالیٰ غضبناک ہوتا ہے ان کی پیروی کرنا اور جن باتوں کو اللہ پسند فرماتا ہے ان سے پرہیز کرنا۔ یعنی غضب و رضایت الٰہی کے خلاف کام کرتے رہے اس لیے وہ غضب الٰہی کے مستحق اور رضایت الٰہی سے محروم ہو گئے۔

---

[1] ۱۶ نحل: ۳۲

۲۔ فَاَحۡبَطَ اَعۡمَالَہُمۡ : ان کے پاس کوئی اچھا عمل نہ تھا۔ اگر کسی وجہ سے کوئی اچھا عمل سرزد ہو جاتا تو وہ بھی حبط ہو گیا۔ ممکن ہے حبط عمل سے مراد یہ ہو کہ اسلام کے خلاف ان کا ہر عمل اور ہر سازش ناکام ہو گئی۔

اَمۡ حَسِبَ الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ اَنۡ لَّنۡ یُّخۡرِجَ اللّٰہُ اَضۡغَانَہُمۡ ﴿۲۹﴾

۲۹۔ جن کے دلوں میں بیماری ہے کیا انہوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ اللہ ان کے کینوں کو ہرگز ظاہر نہیں کرے گا؟

تشریح کلمات

اضغان: (ض غ ن) ضغن کی جمع۔ شدید کینہ

تفسیر آیات

۱۔ اَمۡ حَسِبَ: منافقین، اسلام کے خلاف سازشیں ترتیب دے کر اپنے کینہ و عداوت کو تسکین دینے کی کوشش کر کے یہ خیال کرتے تھے یہ باتیں صیغہ راز میں رہیں گی۔ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کو اس عداوت اور کینے سے ہم آگاہ نہیں ہونے دیں گے۔ منافقوں کے اس ذہنی چیلنج کا قرآن جواب دیتا ہے۔

اس آیت میں منافقوں کو بھی مریض دل کہا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مریض دل لوگ اور منافقین کا انجام ایک ہے۔

اہم نکات

۱۔ منافقین کا کینہ مومنوں پر فاش ہوتا رہا ہے۔

وَلَوۡ نَشَآءُ لَاَرَیۡنٰکَہُمۡ فَلَعَرَفۡتَہُمۡ بِسِیۡمٰہُمۡ ؕ وَلَتَعۡرِفَنَّہُمۡ فِیۡ لَحۡنِ الۡقَوۡلِ ؕ وَاللّٰہُ یَعۡلَمُ اَعۡمَالَکُمۡ ﴿۳۰﴾

۳۰۔ اور اگر ہم چاہتے تو ہم آپ کو ان کی نشاندہی کر دیتے پھر آپ انہیں ان کی شکلوں سے پہچان لیتے اور آپ انداز کلام سے ہی انہیں ضرور پہچان لیں گے اور اللہ تمہارے اعمال سے واقف ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَوۡ نَشَآءُ لَاَرَیۡنٰکَہُمۡ : اگر ہم چاہتے تو ہم ان منافقین کی نشاندہی آپ کو کر دیتے۔ اس ترکیب کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ایسا نہیں چاہا۔ جیسے فرمایا: وَلَوۡ شَآءَ لَہَدٰىکُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ ...[1] اگر اللہ چاہتا تو تم

[1] ۱۶ نحل: ۹

سب کی ہدایت کر دیتا مگر اللہ نے ایسا نہیں چاہا کہ سب کی بالجبر ہدایت ہو جائے۔

۲۔ فَلَعَرَفۡتَہُمۡ بِسِیۡمٰہُمۡ : اگر ہم اس طرح نشاندہی کرتے تو آپ ان منافقین کو ان کی شکلوں سے پہچان لیتے لیکن ہم نے اس طرح واضح نشاندہی بھی نہیں کی اور اس معاملے کو آپ کے لیے مبہم بھی نہیں رکھا۔ ان کی پہچان اللہ کی طرف سے آنے کی جگہ خود ان منافقوں کی طرف سے آنا زیادہ مناسب ہے۔

۳۔ وَلَتَعۡرِفَنَّہُمۡ فِیۡ لَحۡنِ الۡقَوۡلِ: آپ ان منافقوں کے انداز کلام سے ضرور پہچان لیں گے۔ اب یہ منافقین اپنے عمل اور کلام کے لب و لہجے سے اپنے آپ کو فاش کریں گے۔

لَحۡنِ الۡقَوۡلِ: ان کا انداز کلام اس طرح ہو گا کہ جب حق و باطل کا معرکہ آئے گا تو کھل کر حق کا ساتھ نہیں دیں گے اور اس میں لیت ولعل سے کام لیں گے۔ جس مشن سے وابستگی کا اظہار کیا ہے اس سے مخلص نہیں ہوں گے۔ اس مشن میں فانی شخصیات سے عداوت کریں گے۔

چنانچہ جو ہستی ایمان و نفاق کی کسوٹی قرار پائے، اس سے محبت ایمان اور اس سے عداوت نفاق کی علامت بن جائے تو اس سے معلوم ہوتا ہے اس ہستی کا وجود ایمان و اسلام سے عبارت ہے۔ اس کے وجود میں ایمان و اسلام سے ہٹ کر اپنا ذاتی شائبہ نہیں ہے کہ کہا جا سکے اس سے عداوت کا تعلق اس کے ذاتی ایسے عمل سے ہے جو اسلام سے متعلق نہیں ہے۔

یہ ہستی مولائے متقیان امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی عداوت نفاق کی علامت قرار پائی ہے۔ اس سے معلوم ہوا علی علیہ السلام کی ذات یا ان کے کسی کردار میں کوئی ایسا گوشہ نہیں ہے جو اسلام و ایمان سے ہٹ کر ہو۔ ذیل میں ہم ان روایات کا ذکر کرتے ہیں جو اس موضوع سے متعلق ہیں۔

۱۔ مولائے متقیان حضرت علی علیہ السلام خود اس حدیث کے راوی ہیں فرمایا:

والذی فلق الحبة وبرأ النسمة انه لعهد النبی صلی الله علیه وسلم الی ان لا یحبنی الا مؤمن ولا یبغضنی الا منافق۔[1]	قسم ہے اس ذات کی جس نے دانے کو شگافتہ کیا انسان کو پیدا کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے بارے میں عہد لیا ہے کہ صرف مومن مجھ سے محبت کرے گا اور صرف منافق مجھ سے بغض رکھے گا۔

۲۔ حضرت ام سلمہؓ راوی ہیں:

سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول لعلی: لا یبغضك مؤمن ولا یحبك منافق۔[2]	میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ سے سنا ہے کہ آپ علی سے فرما رہے تھے: مومن تجھ سے بغض نہیں رکھے گا اور منافق تجھ سے محبت نہیں کرے گا۔

---

[1] صحیح مسلم ۱: ۶۰۔ سنن ترمذی ۲: ۲۱۵۔ سنن نسائی ۲: ۲۷۰۔ سنن ابن ماجہ ص ۱۲

[2] سنن ترمذی ۲: ۲۱۴۔ مسند احمد ۲: ۲۹۲

دوسری روایت میں ام سلمہؓ فرماتی ہیں:

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و (الہ) و سلم لا یحب علیا منافق و لا یبغض علیا مؤمن۔[۱]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: علی سے کوئی منافق محبت نہیں کرے گا اور کوئی مومن علی سے بغض نہیں رکھے گا۔

۳۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام جابر بن عبد اللّٰہؓ سے روایت فرماتے ہیں انہوں نے کہا:

واللّٰہ ما کنا نعرف منافقاً علی عھد رسول ﷺ الا ببغضھم علیا۔[۲]

قسم بخدا! ہم عہد رسول ﷺ میں منافقین کو بغض علی سے پہچانتے تھے۔

۴۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کہتے ہیں:

کنا لا نعرف المنافقین الا بتکذیبھم اللّٰہ و رسولہ و التخلف عن الصلوات و البغض لعلی بن ابی طالب رضی اللّٰہ عنہ۔[۳]

ہم منافقین کو صرف اللہ اور اس کے رسول کی تکذیب، ترک نماز اور علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ساتھ بغض سے پہچانتے تھے۔

۵۔ حضرت ابوسعید الخدریؓ کہتے ہیں:

انا کنا لنعرف المنافقین ببغضھم علی بن ابی طالب۔[۴]

ہم علی کے ساتھ بغض سے منافقین کو پہچانا کرتے تھے۔

حضرت ابو سعید خدری کی روایت اس آیت وَلَتَعۡرِفَنَّهُمۡ فِیۡ لَحۡنِ الۡقَوۡلِ کے ذیل میں ہے کہ لَحۡنِ الۡقَوۡلِ سے مراد بغض علی ہے۔

۶۔ حضرت جابر بن عبد اللہ انصاریؓ کہتے ہیں:

ما کنا نعرف المنافقین الا ببغضھم علیا رضی اللّٰہ عنہ۔[۵]

ہم منافقین کو صرف بغض علیؓ سے پہچانتے تھے۔

۷۔ ابو الدرداء۔ ترمذی کہتے ہیں:

کان ابو الدرداء یقول: ما کنا نعرف المنافقین معشر الانصار الا ببغضھم علی بن ابی طالب۔[۶]

ابو الدرداء کہتے ہیں: علی بن ابی طالب کے ساتھ بغض سے ہی ہم انصار کے لوگ منافقین کو پہچان لیتے تھے۔

---

[۱] المحاسن و المساوی بیھقی صفحہ ۴۱۔ فتح الباری ۷: ۵۷
[۲] المعجم الاوسط للطبرانی ۵: ۸۹
[۳] المستدرک للحاکم ۳: ۱۲۹۔ تلخیص المستدرک للذھبی ۳: ۱۲۹
[۴] سنن ترمذی ۲: ۲۱۶۔ تاریخ بغداد ۱۳: ۱۵۳۔ حلیۃ الاولیاء ۶: ۲۹۴
[۵] المعجم الاوسط طبرانی ۳: ۷۶۔ الاستیعاب ۲: ۴۶۴
[۶] تذکرۃ خواص الامۃ ص ۳۱ طبع بیروت

۸۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں:

ما کنانعرف المنافقین علی عهد رسولؐ الا ببغضهم علی ابن ابی طالب۔[1]	ہم عہد رسولؐ میں منافقین کو صرف علی کے ساتھ بغض سے پہچان لیتے تھے۔

۹۔ حضرت عمران بن الحصینؓ کہتے ہیں:

قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم لا یبغضه الا منافق۔[2]	رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ان (علی علیہ السلام) سے صرف منافق ہی بغض رکھتا ہے۔

عمران کی دوسری روایت میں آیا ہے:

ان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و آله وسلم قال لعلی: لا یحبك الا مؤمن ولا یبغضك الامنافق۔[3]	رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے علیؑ سے فرمایا: مؤمن ہی تجھ سے محبت کرے گا اور منافق ہی تجھ سے بغض رکھے گا۔

۱۰۔ حضرت عبد اللّٰه بن حنطب کہتے ہیں:

قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یا ایها الناس اوصیکم بحب اخی و ابن عمی علی بن ابی طالب فانه لا یحبه الا مؤمن ولا یبغضه الا منافق۔[4]	رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لوگو! میں تمہیں اپنے بھائی اور چچا کے بیٹے بیٹا علی بن ابی طالب کے ساتھ محبت کرنے کی نصیحت کرتا ہوں چونکہ علی سے صرف مؤمن محبت کرتا اور منافق ہی علی سے بغض رکھتا ہے۔

۱۱۔ حضرت یعلی بن مرّہ ثقفی کہتے ہیں:

سمعت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وآله وسلم یقول: لا یحبك الا مؤمن ولا یبغضك الا منافق۔[5]	میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے: (اے علی!) تجھ سے صرف مؤمن محبت کرے گا اور صرف منافق تجھ سے بغض رکھے گا۔

ابن ابی الحدید اپنے استاد ابو القاسم بلخی سے نقل کرتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں:

قد اتفقت الاخبار الصحیحه التی لاریب عند المحدثین فیها ان النبی قال لعلی لا یحبك الا مؤمن ولا یبغضك الا منافق۔[6]	ایسی صحیح روایات کا، جن میں محدثین کو کسی قسم کا شک نہیں ہے، اس بات میں اتفاق ہے کہ رسول اللہؐ نے علیؑ سے فرمایا ہے: تجھ سے مؤمن ہی محبت کرے گا اور تجھ سے صرف منافق بغض رکھے گا۔

[1] روح المعانی ۲: ۱۷ طبع مصر [2] مشکل الآثار طحاوی ۱: ۴۸ طبع حیدر آباد دکن
[3] المعجمه الاوسط طبرانی ۳: ۸۹ [4] تاریخ دمشق ۴۲: ۲۷۹ [5] تاریخ دمشق ۴۲: ۲۷۰
[6] شرح نهج البلاغة ۴: ۸۳

وَ لَنَبۡلُوَنَّکُمۡ حَتّٰی نَعۡلَمَ الۡمُجٰہِدِیۡنَ مِنۡکُمۡ وَ الصّٰبِرِیۡنَ ۙ وَ نَبۡلُوَا۠ اَخۡبَارَکُمۡ ﴿۳۱﴾

۳۱۔ اور ہم تمہیں ضرور آزمائش میں ڈالیں گے یہاں تک کہ ہم تم میں سے جہاد کرنے والوں اور صبر کرنے والوں کی شناخت کر لیں اور تمہارے حالات جانچ لیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ لَنَبۡلُوَنَّکُمۡ: تمہارے زبانی اظہار پر اکتفا نہیں کیا جائے گا بلکہ تمہیں جہاد و قتال کا حکم دے کر آزما لیا جائے گا:

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَ ہُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ ؁[1]

کیا لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ وہ صرف اتنا کہنے سے چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور وہ آزمائے نہیں جائیں گے۔

۲۔ حَتّٰی نَعۡلَمَ الۡمُجٰہِدِیۡنَ مِنۡکُمۡ: تاکہ علم الٰہی مرحلہ عینیت اور مرحلۂ عمل میں آ جائے کہ تم میں سے مجاہدین کون ہیں۔ چونکہ عمل کے مرحلے میں آنے کے بعد انسان مجاہد بنتا ہے، قبل از عمل صرف علم خدا سے مجاہد نہیں بن جاتا۔ میدان جہاد میں بھیجے جانے کے بعد عملی میدان میں تمہارے جہاد اور صبر کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

۳۔ وَ نَبۡلُوَا۠ اَخۡبَارَکُمۡ: اور یہ آزمائش بھی ہو گی تمہارے باطن کی کیا خبریں ہیں۔ امتحان سے تمہارا اعمال تمہارے باطن کی خبریں فاش کریں گے کہ اگر تمہارا باطن اچھا ہے تو اچھے اعمال بجا لائے جائیں گے، باطن برا ہے تو برے اعمال سامنے آ جائیں گے۔

اہم نکات

۱۔ انسان کا کردار اس کے ایمان کا آئینہ ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ صَدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ شَآقُّوا الرَّسُوۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَیَّنَ لَہُمُ الۡہُدٰی ۙ لَنۡ یَّضُرُّوا اللّٰہَ شَیۡئًا ؕ وَ سَیُحۡبِطُ اَعۡمَالَہُمۡ ﴿۳۲﴾

۳۲۔ یقیناً جنہوں نے ان پر ہدایت ظاہر ہونے کے بعد کفر کیا اور (لوگوں کو) راہ خدا سے روکا اور رسول کی مخالفت کی وہ اللہ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے اور اللہ عنقریب ان کے اعمال حبط کر دے گا۔

---

[1] ۲۹ عنکبوت: ۲

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا: کفر سے مراد ممکن ہے کفر ظاہری ہو۔ اس صورت میں ان میں مشرکین اور یہود و نصاریٰ مراد ہو سکتے ہیں اور ممکن ہے کفر سے مراد منافقین کا چھپایا ہوا کفر ہو۔ اس صورت میں اس آیت سے مراد منافقین ہی ہو سکتے ہیں چونکہ سلسلۂ کلام منافقین کے بارے میں جاری ہے۔

۲۔ وَ صَدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ: مشرکین، یہود اور منافقین سب کی یہ کوشش رہی ہے کہ اللہ تک رسائی کا راستہ، جس کا تعین اسلام کرتا ہے، بند کیا جائے تا کہ کوئی بشر اس راستے پر چلنے نہ پائے۔

۳۔ وَ شَآقُّوا الرَّسُوۡلَ: اور رسول ﷺ کی مخالفت بھی ان کا شیوہ ہے۔ آیت کا یہ جملہ قرینہ بن سکتا ہے کہ یہ آیت منافقین کے بارے میں ہے۔ چونکہ مشرکین اور یہود کے لیے لفظ کَفَرُوۡا وَ صَدُّوۡا میں مخالفت رسولؐ شامل ہے لیکن منافقین کے نفاق کی علامات بیشتر مخالفت رسولؐ میں نمایاں ہوتی رہی ہیں۔

۴۔ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَیَّنَ لَہُمُ الۡہُدٰی: ان سب کے لیے یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ ہدایت کا یہی راستہ ہے۔ رسول کریم ﷺ کی ہر نشست و برخاست سے روزانہ حقائق کی روشنیاں پھوٹتی رہتی تھیں۔

۵۔ وَ سَیُحۡبِطُ اَعۡمَالَہُمۡ: اَعۡمَالَہُمۡ سے مراد ان کی سازشیں ہیں جو وہ اسلام کے خلاف کرتے رہے۔ وہ سب ناکام ہو جائیں گی۔ اس میں کفر و نفاق کی شکست اور اسلام کی فتح کی نوید ہے۔

اہم نکات

۱۔ حق واضح ہونے کے بعد حق کی مخالفت کرنے والے ہمیشہ خوار ہوتے ہیں۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَ لَا تُبۡطِلُوۡۤا اَعۡمَالَکُمۡ ﴿۳۳﴾	۳۳۔ اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو ضائع نہ کرو۔

تفسیر آیات

اس آیت کی دو تشریحات ہو سکتی ہیں: ایک یہ کہ یہ آیت حیات رسول ﷺ سے مربوط ہے کہ رسول اللہ ﷺ کسی شخص معین کو کوئی حکم دیں اور وہ نہ مانے تو اس کے اعمال حبط ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ سورہ حجرات آیت ۲ میں فرمایا:

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَرۡفَعُوۡۤا اَصۡوَاتَکُمۡ فَوۡقَ صَوۡتِ النَّبِیِّ وَ لَا تَجۡہَرُوۡا لَہٗ	اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی کی آواز سے بلند نہ کرو اور نبی کے ساتھ اونچی آواز سے بات نہ کرو

بِالۡقَوۡلِ كَجَهۡرِ بَعۡضِكُمۡ لِبَعۡضٍ اَنۡ تَحۡبَطَ اَعۡمَالُكُمۡ وَاَنۡتُمۡ لَا تَشۡعُرُوۡنَ۝

جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے اونچی آواز میں بات کرتے ہو کہیں تمہارے اعمال حبط ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

چنانچہ سیاق آیت حکم جہاد کے بارے میں ہے تاہم اطلاق آیت میں خدا و رسول کا ہر حکم شامل ہے کہ تعیینی طور پر یعنی کسی شخص کو معین کر کے حکم صادر فرمائیں اور وہ نہ مانے تو اس کے اعمال حبط ہو جائیں گے۔ واضح رہے تعیینی طور پر نہ ہو، ایک کلی حکم ہو جو کسی بھی مکلّف پر تطبیق ہوتا ہو، وہ اس پر عمل نہیں کرتا تو اس کے اعمال حبط نہیں ہوں گے بلکہ صرف اسی حکم کی نافرمانی کا گناہ ہو گا۔

دوسری تشریح یہ ہو سکتی ہے: کسی عمل کو اس طرح بجا نہ لائے جس طرح خدا و رسول ﷺ نے حکم دیا ہے تو عمل حبط ہو جائے گا جسے فقہی تعبیر میں باطل کہتے ہیں۔

البتہ بعض نافرمانیاں ایسی بھی ہیں جن سے اعمال حبط ہو جاتے ہیں۔ جیسے ریاکاری، صدقہ دینے کے بعد جتانے اور اذیت دینے سے عمل باطل ہو جاتا ہے۔

لہٰذا اگر ہم آیت کی تخصیص حکم جہاد کے بارے میں کرتے ہیں تو ان لوگوں کے اعمال حبط ہو جاتے ہیں جنہیں رسول اللہ ﷺ نے جہاد کے لیے روانہ کیا تھا اور وہ نافرمانی کر کے نہ گئے ہوں یا راستے سے واپس آ گئے ہوں۔

اگر حکم تعیینی مراد لیتے ہیں تو اس کے اعمال حبط ہو جائیں گے جسے سول اللہ ﷺ نے بلایا ہو اور وہ نہ آیا ہو۔ نہ آنے کی وجہ کھانا کھانا ہو یا کوئی اور ہو۔

اہم نکات

۱۔ خدا اور رسول کا حکم نہ ماننے سے ایمان چلا جاتا ہے۔ ایمان کے جانے کی صورت میں تمام اعمال حبط ہو جاتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوۡا وَهُمۡ كُفَّارٌ فَلَنۡ يَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَهُمۡ ۝۳۴

۳۴۔ یقیناً جنہوں نے کفر کیا اور راہ خدا سے روکا پھر کفر کی حالت میں مر گئے تو اللہ انہیں ہرگز نہیں بخشے گا۔

تفسیر آیات

جو لوگ کفر اختیار کرنے کے ساتھ راہ خدا میں رکاوٹیں بھی ڈالتے رہے اور پھر حالت کفر میں مر گئے ان کے لیے کبھی بھی مغفرت کی گنجائش نہیں ہے چونکہ موت آنے کے بعد توبہ کے دروازے بند ہو جاتے

ہیں اور دار التکلیف کا دورانیہ ختم ہو جاتا ہے۔ مرنے کے بعد مجرم کے جرم ترک کرنے کی نوبت نہیں آتی، اب مجرم ختم ہو گیا، جرم نہیں۔

فَلَا تَهِنُوۡا وَ تَدۡعُوۡۤا اِلَی السَّلۡمِ ٭ۖ وَ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ ٭ۖ وَ اللّٰهُ مَعَكُمۡ وَ لَنۡ يَّتِرَكُمۡ اَعۡمَالَكُمۡ ﴿۳۵﴾

۳۵۔ تم ہمت نہ ہارو اور نہ ہی صلح کی دعوت دو جب کہ تم ہی غالب ہو اور اللہ تمہارے ساتھ ہے اور وہ ہرگز تمہارے اعمال ضائع نہیں کرے گا۔

تفسیر آیات

۱۔ فَلَا تَهِنُوۡا: تم ہمت نہ ہارو۔ مسلمانوں کی صفوں میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو جہاد کو ایک عذاب سمجھتے تھے۔ جیسا کہ اس سورۃ المبارکہ کی آیت ۲۰ میں ان لوگوں کا ذکر آیا: جب محکم بیان والی سورت نازل ہو اور اس میں قتال کا ذکر آ جائے تو آپ دیکھتے ہیں جن کے دلوں میں بیماری ہے وہ آپ کی طرف اس طرح دیکھتے ہیں جیسے موت کی بیہوشی طاری ہو گئی ہو۔

۲۔ وَ تَدۡعُوۡۤا اِلَی السَّلۡمِ: اور ہمت ہارنے کی وجہ سے صلح کی دعوت نہ دو چونکہ صلح کا حکم فریق مخالف کے عزائم سے مربوط ہے۔ فریق مخالف اگر واقعی صلح کے لیے آمادہ ہے تو صلح قبول کرنے کا حکم ہے:

وَ اِنۡ جَنَحُوۡا لِلسَّلۡمِ فَاجۡنَحۡ لَهَا ...[1] اور (اے رسول) اگر وہ صلح و آشتی کی طرف مائل ہو جائیں تو آپ بھی مائل ہو جائیے۔

اور اگر فریق مخالف صلح کی آڑ میں مسلمانوں کو دھوکہ دینا چاہتا ہے تو اس صلح کو ٹھکرا دینا چاہیے:

وَ اِنۡ يُّرِيۡدُوۡۤا اَنۡ يَّخۡدَعُوۡكَ فَاِنَّ حَسۡبَكَ اللّٰهُ ...[2] اور اگر وہ آپ کو دھوکہ دینا چاہیں تو آپ کے لیے یقیناً اللہ کافی ہے۔

۳۔ وَ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ: تم ہی غالب اور سربلند ہو۔ تم عقیدہ و ایمان کے اعتبار سے، تصور حیات کے اعتبار سے، قوت و طاقت کے اعتبار سے، منطق اور دلیل کے اعتبار سے، ہر اعتبار سے تم سربلند ہو۔

۴۔ وَ اللّٰهُ مَعَكُمۡ: چونکہ اللہ کی نصرت تمہارے ساتھ ہے۔ اللہ کی نصرت پر ایمان رکھنے کی صورت میں سربلندی، فتح و نصرت یقینی ہے۔

۵۔ وَ لَنۡ يَّتِرَكُمۡ اَعۡمَالَكُمۡ: اور راہ جہاد میں تمہاری کوششیں بارآور اور نتیجہ خیز ثابت ہوں گی اور کوئی قدم رائیگاں نہیں جائے گا۔ اس آیت میں کامیابی کی تین تعبیروں میں خوشخبری ہے: اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ، وَ اللّٰهُ مَعَكُمۡ اور لَنۡ يَّتِرَكُمۡ اَعۡمَالَكُمۡ۔

---

[1] ۸ انفال: ۶۱ [2] ۸ انفال: ۶۲

اہم نکات

۱۔ اللہ کے وعدے پر ایمان رکھنے والے مجاہد ہمیشہ فاتح رہے ہیں۔

اِنَّمَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا لَعِبٌ وَّ لَہۡوٌ ؕ وَ اِنۡ تُؤۡمِنُوۡا وَ تَتَّقُوۡا یُؤۡتِکُمۡ اُجُوۡرَکُمۡ وَ لَا یَسۡـَٔلۡکُمۡ اَمۡوَالَکُمۡ ﴿۳۶﴾

۳۶۔ بے شک دنیاوی زندگی تو بس کھیل اور فضول ہے اور اگر تم ایمان لے آؤ اور تقویٰ اختیار کرو تو اللہ تمہارا اجر تمہیں دے گا اور تم سے تمہارا مال طلب نہیں کرے گا۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّمَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا لَعِبٌ وَّ لَہۡوٌ: دنیا کی وہ زندگی جو دین کے مقابلے میں اختیار کی جاتی ہے ایک کھیل ہے۔ لعب کھیل اس کام کو کہتے ہیں جس میں مصروف شخص باقی خواہشات کی طرح اس وقت تک لطف اندوز ہوتا ہے جب تک وہ اس میں مصروف ہے۔ اس کے بعد اس پر ایسے کوئی مثبت اثرات مترتب نہیں ہوتے جو خود کھلاڑی اور معاشرے کے لیے فائدہ مند ہوں۔

لَہۡوٌ یعنی اہم چیز سے روگردانی کا موجب بننے والا عمل ہے۔ لھو اس غیر اہم کام کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے اہم کام سے غافل ہو جائے۔ یعنی تم جہاد چھوڑ کر دنیا میں مشغول ہوتے ہو تو یہ ایک کھیل اور لھو ہے۔

۲۔ وَ اِنۡ تُؤۡمِنُوۡا وَ تَتَّقُوۡا: اس کے مقابلے میں اگر تم ایمان اور تقویٰ کی بنیاد پر زندگی گزارتے تو اس کے دائمی اثرات ہیں۔

۳۔ یُؤۡتِکُمۡ اُجُوۡرَکُمۡ: وہ دائمی اثرات، اجر و ثواب ہیں جو دائمی، ابدی، تمہاری ہمیشہ رہنے والی زندگی کے لیے ہیں۔

۴۔ وَ لَا یَسۡـَٔلۡکُمۡ اَمۡوَالَکُمۡ: ایمان اور تقویٰ کی طرف آنے میں اس بات کا بھی کوئی خوف نہیں ہے کہ تم سے مالی فائدہ اٹھایا جائے اور تمہیں مالی نقصان اٹھانا پڑے گا۔ ایمان اور تقویٰ اختیار کرنے کی ہدایت پر کوئی مالی اجرت نہیں مانگی جاتی:

وَ مَاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ مِنۡ اَجۡرٍ ۚ اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۞ [1]

اور اس کام پر میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا میرا اجر تو صرف رب العالمین پر ہے۔

---

[1] ۲۶ شعراء: ۱۰۹

اِنۡ یَّسۡـَٔلۡكُمُوۡهَا فَیُحۡفِكُمۡ تَبۡخَلُوۡا وَ یُخۡرِجۡ اَضۡغَانَكُمۡ ﴿۳۷﴾

۳۷۔ اگر (تمہارے رسول) تم لوگوں سے مال کا مطالبہ کریں اور پھر تم سے اصرار کریں تو تم بخل کرنے لگو گے اور وہ (بخل) تمہارے کینے نکال باہر کرے گا۔

تشریح کلمات

فَیُحۡفِكُمۡ: (ح ف و) الاحفاء کسی چیز کی طلب میں اصرار سے کام لینا۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنۡ یَّسۡـَٔلۡكُمُوۡهَا: اگر تم سے مالی معاوضے کا مطالبہ کیا جاتا اور یہ معاوضہ زکوۃ کی طرح واجب ہونے کی صورت میں اس کی ادائیگی پر اصرار بھی ہوتا تو تم اس کی ادائیگی میں بخل سے کام لیتے اور عدم ادائیگی کی وجہ سے نزاع اور مخاصمت کی نوبت آ جاتی۔ مفسرین نے یہاں یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ اَمۡوَالَكُمۡ سے مراد جمیع اموالکم ہے جب کہ جمیع اموال کا سوال ہو نہیں سکتا۔ بعض اموال کی نفی نہیں ہو سکتی چونکہ بعض اموال کا سوال ہے زکوۃ، خمس وغیرہ کی صورت میں۔ لہٰذا اجر رسالت میں کسی مالی معاوضے کا مطالبہ نہیں ہوا۔

۲۔ وَ یُخۡرِجۡ اَضۡغَانَكُمۡ: پھر تمہارے دلوں میں جو کینہ پوشیدہ ہے وہ نکل کر باہر آ جاتا اور تم بری طرح فاش ہو جاتے لیکن یہ لوگ اسی تعبیر سے فاش ہو گئے۔ جیسا کہ فرمایا ہے:

اَمۡ حَسِبَ الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ اَنۡ لَّنۡ یُّخۡرِجَ اللّٰهُ اَضۡغَانَهُمۡ ۝

جن کے دلوں میں بیماری ہے کیا انہوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ اللہ ان کے کینوں کو ہرگز ظاہر نہیں کرے گا؟

هٰۤاَنۡتُمۡ هٰۤؤُلَآءِ تُدۡعَوۡنَ لِتُنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنۡكُمۡ مَّنۡ یَّبۡخَلُ ۚ وَ مَنۡ یَّبۡخَلۡ فَاِنَّمَا یَبۡخَلُ عَنۡ نَّفۡسِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ الۡغَنِیُّ وَ اَنۡتُمُ الۡفُقَرَآءُ ۚ وَ اِنۡ تَتَوَلَّوۡا یَسۡتَبۡدِلۡ

۳۸۔ آگاہ رہو! تم ہی وہ لوگ ہو جنہیں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی دعوت دی جاتی ہے تو تم میں سے بعض بخل کرتے ہیں اور جو بخل کرتا ہے تو وہ خود اپنے آپ سے بخل کرتا ہے اور اللہ تو بے نیاز ہے اور محتاج تم ہی ہو اور اگر تم

قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ ۙ ثُمَّ لَا یَکُوۡنُوۡۤا اَمۡثَالَکُمۡ ﴿۳۸﴾　　نے منہ پھیر لیا تو اللہ تمہارے بدلے اور لوگوں کو لے آئے گا پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ هٰۤاَنۡتُمۡ هٰۤؤُلَآءِ: تم وہی لوگ ہو کہ جنہیں راہ خدا میں خرچ کرنے کے لیے کہا جاتا ہے تو بخل سے کام لیتے ہیں۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان آیات کے مخاطبین منافق اور مریض دل مسلمان ہیں۔ قرآن مریض دل مسلمانوں اور منافقین کو یکجا ذکر کرتا ہے۔

۲۔ تُدۡعَوۡنَ لِتُنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ: اجرت اور معاوضہ کے طور پر نہیں، راہ خدا میں خرچ کے لیے کہا جاتا ہے تو تم بخل سے کام لیتے ہو یعنی مال کا ایک حصہ، جو خود تمہارے مفاد میں ہے، زکوۃ میں فقط نظام کے لیے تم سے طلب کیا جاتا ہے تو تم اس سے بخل کرتے ہو۔

۳۔ وَ مَنۡ یَّبۡخَلۡ: اس جگہ بخل کا منفی اثر خود بخیل پر مترتب ہوتا ہے، سبیل اللہ متاثر نہیں ہوتا۔

۴۔ وَ اللّٰهُ الۡغَنِیُّ: چونکہ اللہ تمہارے اموال سے بے نیاز ہے، راہ خدا میں خرچ کر کے اس کے ثواب کے خود تم محتاج ہو۔ تم نے اپنی احتیاج کو پورا نہیں کیا۔

۵۔ وَ اِنۡ تَتَوَلَّوۡا یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ: اگر تُدۡعَوۡنَ پر عطف مانا جائے تو اس جملے کا مفہوم یہ ہو گا: اگر تم نے مال خرچ نہ کیا، بخل سے کام لیا تو اللہ تمہاری جگہ اور لوگوں کو اس کار خیر کے لیے سامنے لائے گا۔ وہ تمہاری طرح بخل نہیں کریں گے۔

اور اگر وَ اِنۡ تُؤۡمِنُوۡا وَ تَتَّقُوۡا پر عطف مانا جائے تو اس جملے کا مفہوم یہ بنے گا: اگر تم ایمان نہ لائے اور تقویٰ اختیار نہ کیا تو ہم تمہاری جگہ اور لوگوں کو لے آئیں گے۔ وہ تمہاری طرح منافق اور مریض دل نہ ہوں گے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے:

ان تتولوا یا معشر العرب یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ یعنی الموالی۔[1]　　اے اہل عرب! اگر تم نے روگردانی کی تو تمہاری جگہ اور لوگوں کو لائے گا یعنی غیر عرب کو۔

مجمع البیان میں اس روایت کو حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی طرف نسبت دی گئی ہے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

قال: قد و اللّٰہ ابدل بھم خیراً منھم الموالی۔[2]　　قسم بخدا ان سے بہتر میں بدل دیا گیا ہے وہ غیر عرب ہیں۔

---

[1] بحار ۲۲: ۵۲　　[2] بحار ۲۲: ۵۳

سُورَةُ الْفَتْحِ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس سورہ کا نام ابتداء میں مذکور آیت اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًا سے ماخوذ ہے۔

زمان نزول: اس سورۃ المبارکہ کا زمان نزول بالاتفاق سنہ ۶ ہجری ہے۔ صلح حدیبیہ کے بعد راستے میں نازل ہوئی ہے اس لیے یہ سورۃ مدنی ہے اور ہر وہ سورۃ جو ہجرت کے بعد نازل ہوئی ہے، مدنی شمار ہوتی ہے خواہ خود مدینہ میں نازل نہ ہوئی ہو۔

فتح مبین سے مراد صلح حدیبیہ ہے۔ جسے سطحی سوچ والے شکست سمجھ رہے تھے اسے اللہ تعالیٰ نہ صرف فتح فرماتا ہے بلکہ فتح مبین نمایاں فتح فرمایا ہے۔ اس صلح کے بعد امن قائم ہوتا ہے اور امن کی فضا میں اسلام کا پیغام ہر سو پھیلنا شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ دو سال بعد چودہ سو کا لشکر دس ہزار کی تعداد میں مکہ میں فاتحانہ داخل ہو جاتا ہے۔

مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب آیت اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًا نازل ہوئی تو فرمایا:

ولقد انزلت الی آیۃ ھی احب الیّ من الدنیا کلھا۔[1]	میری طرف ایک آیت نازل ہوئی ہے جو میرے لیے پوری دنیا سے زیادہ پسندیدہ ہے۔

۶ ہجری ذوالقعدہ کے مہینے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ہزار چار سو افراد کی معیت میں بقصد عمرہ مدینے سے مکے کی طرف روانہ ہوئے۔

اس سے پہلے آپ نے اصحاب کو وہ خواب بھی سنایا تھا جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا کہ آپ اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ تشریف لے جاتے اور عمرہ بجا لاتے ہیں۔

ادھر قریش والوں کو یہ پریشانی لاحق ہوئی کہ ایک طرف تو ذوالقعدہ جیسے حرمت کے مہینے میں عمرہ یا

[1] مجمع البیان

حج سے روکنے کا کسی کو حق نہیں ہے، دوسری طرف اگر مسلمانوں کا اتنا بڑا قافلہ مکے میں داخل ہو گیا تو اس سے قریش کا سارا رعب ختم ہو جائے گا۔

ادھر مسلمانوں کا غیر مسلح قافلہ حدیبیہ پہنچ گیا اور قریش کے ساتھ ایلچیوں کا تبادلہ شروع ہوا۔ حضور ﷺ نے حضرت عثمان کو قریش کے پاس پیغام دے کر بھیجا کہ ہم جنگ کے لیے نہیں آئے ہیں بلکہ بیت اللہ کی زیارت کے لیے احرام باندھ کر قربانی کے اونٹوں کے ساتھ آئے ہیں۔ اسی دوران خبر اڑی کہ حضرت عثمان کو قتل کر دیا گیا ہے۔ اس سے جنگ کا خطرہ لاحق ہو گیا جب کہ مسلمان جنگ کے لیے تیار ہو کر نہیں آئے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے سب اصحاب کو جمع کیا اور جنگ سے فرار نہ ہونے پر سب سے بیعت لی جو بیعت رضوان کے نام سے مشہور ہے اور جنگ حنین میں بھاگنے والوں کو حضرت ابن عباس اسی بیعت کا حوالہ دے کر بلاتے تھے۔

بعد میں حضرت عثمان کے قتل کی خبر غلط نکلی۔ قریش نے صلح پر آمادگی ظاہر کی چونکہ وہ نہ تو حرمت کے مہینے میں جنگ لڑ سکتے تھے، نہ مکہ میں عمرہ کے لیے داخل ہونے کی اجازت دے سکتے تھے اس لیے قریش والوں کے لیے صلح ناگزیر ہو گئی تھی۔

اللہ اور رسول ﷺ کی بھی یہی منشا تھی کہ صلح کو قریش کے لیے ناگزیر بنا دیا جائے۔

طویل بحث کے بعد درج ذیل شرائط پر حضرت علی علیہ السلام کے دست مبارک سے صلح نامہ کی تحریر کیا جانے لگا۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا لکھو: بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ تو قریش کے نمائندہ سھیل بن عمرو نے کہا: ہم اس عبارت کو نہیں جانتے۔ لکھو بسمك اللّٰھم تو حضورؐ نے فرمایا: لکھو: بسمك اللّٰھم۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا: لکھو یہ وہ صلح نامہ ہے جو محمد رسول اللہ۔ تو سھیل بن عمرو نے کہا: ہم اگر آپ کو اللہ کا رسول مانتے تو آپ سے جنگ نہ کرتے۔ رسول اللہ ﷺ نے لفظ رسول اللہ کو مٹانے کے لیے کہا تو حضرت علی علیہ السلام نے عرض کیا: میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے خود اپنے ہاتھوں سے مٹایا۔ پھر فرمایا: یا علی! آپ کے ساتھ بھی اسی قسم کا واقعہ پیش آنے والا ہے۔

چنانچہ جنگ صفین میں جب معاویہ کے ساتھ صلح نامہ لکھنے کی نوبت آئی اور لکھا گیا کہ یہ وہ صلح نامہ ہے جو امیر المومنین اور.... تو معاویہ کے نمائندے نے کہا: اگر ہم آپ کو امیر المومنین مانتے تو آپ کے ساتھ جنگ نہ کرتے۔ چنانچہ لفظ امیر المومنین مٹا دیا گیا۔ صدق رسول اللہ ﷺ۔

صلح نامے کا مضمون یہ تھا:

i۔ دس سال تک جنگ بند رہے گی۔

ii۔ قریش کا جو شخص بھاگ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس جائے گا اسے واپس کرنا ہو گا اور رسول

اللہ ﷺ کے ساتھیوں میں سے جو شخص قریش کے پاس جائے گا اسے واپس نہیں کیا جائے گا۔

iii۔ قبائل میں سے کوئی قبیلہ قریش کا حلیف بن کر اس معاہدے میں شامل ہوسکتا ہے۔

iv۔ محمد ﷺ اس سال بغیر عمرہ کے واپس جائیں گے، آیندہ سال عمرہ کے لیے آسکیں گے، مکہ میں صرف تین دن قیام کریں گے اور غیر مسلح آئیں گے۔

مسلمان ان شرائط کو اپنی شکست تصور کر کے مضطرب تھے۔ حضرت عمر کو تو رسول کی رسالت پر شک گزرا اور خود رسول اللہ ﷺ کے منہ پر معترضانہ سوال اٹھایا۔ رسول خدا ﷺ کی طرف سے یہ جواب ملتا ہے:

یا ابن الخطاب! انی رسول اللّٰہ لن یضیعنی ابداً۔	اے ابن خطاب! میں اللہ کا رسول ہوں۔ اللہ مجھے کبھی ناکام نہیں کرے گا۔

اس جواب کے باوجود وہ فرجع وھو متغیظ غم و غصے کی حالت میں پلٹے:[1]

یہ سوال بھی اٹھایا گیا کہ اس خواب کا کیا مطلب ہے جو رسول اللہ ﷺ نے دیکھا ہے۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد جب رسول اللہ ﷺ مدینہ کی طرف روانہ ہوئے تو یہ سورت نازل ہوئی۔

[1] تفسیر طبری ۲۶: ۴۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	بنام خدائے رحمن رحیم
اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًا ۙ﴿۱﴾	۱۔ (اے رسول) ہم نے آپ کو فتح دی، ایک نمایاں فتح۔
لِّیَغۡفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡۢبِکَ وَ مَا تَاَخَّرَ وَ یُتِمَّ نِعۡمَتَہٗ عَلَیۡکَ وَ یَہۡدِیَکَ صِرَاطًا مُّسۡتَقِیۡمًا ۙ﴿۲﴾	۲۔ تاکہ اللہ آپ کی (تحریک کی) اگلی اور پچھلی خامیوں کو دور فرمائے اور آپ پر اپنی نعمت پوری کرے اور آپ کو سیدھے راستے کی رہنمائی فرمائے۔
وَّ یَنۡصُرَکَ اللّٰہُ نَصۡرًا عَزِیۡزًا ﴿۳﴾	۳۔ اور اللہ آپ کو ایسی نصرت عنایت فرمائے جو بڑی غالب آنے والی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًا: اس فتح سے کیا فتح مکہ مراد ہے یا صلح حدیبیہ یا کوئی اور فتح، مفسرین میں اختلاف ہے۔ بعض مفسرین اس سے فتح مکہ مراد لیتے ہیں لیکن ہمارے نزدیک فتح مبین سے مراد یہی صلح ہے جس سے فتح مکہ بھی ممکن ہوئی۔

اس صلح میں فتح مبین کا نکتہ دس سالہ جنگ بندی میں مضمر ہے۔ وہ قریش جنہوں نے ایک سال پہلے جنگ احزاب کی صورت میں مسلمانوں کے خلاف ایک بڑی جنگ لڑی، جس نے مسلمانوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اس صلح میں اسلامی ریاست کے وجود کا اعتراف کیا گیا اور دیگر عرب قبائل کے لیے بھی یہ موقع فراہم کر دیا گیا کہ ان دونوں طاقتوں میں سے جس کے چاہیں حلیف بن سکتے ہیں۔

جنگ بندی اور اسلامی ریاست کے اعتراف کی وجہ سے ذیلی فوائد حاصل ہوئے:

i۔ قریش کی طرف سے امن حاصل ہونے سے اسلامی ریاست کو دیگر مخالف طاقتوں پر توجہ مرکوز کرنے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ صلح کے تین ماہ بعد خیبر فتح ہو گیا اور دیگر یہودی علاقے اسلام کے زیر تسلط آ گئے۔

ii۔ امن قائم ہونے اور اسلام کو ایک ریاست کے طور پر تسلیم کیے جانے کی وجہ سے اسلام کو پھلنے پھلنے کا موقع مل گیا۔ امن کی فضا میں اسلامی پیغام پہنچانا اور لوگوں کے لیے اس کا سمجھنا ممکن ہو گیا۔ امن کی وجہ سے مدینہ کی طرف عرب وفود کا آنا شروع ہو گیا اور جن علاقوں سے خطرات تھے ان کی طرف فوجی دستے روانہ کرنا ممکن ہوا۔ چنانچہ دو سالوں میں ۱۴۰۰ کا لشکر دس ہزار کی تعداد میں مکہ میں داخل ہو گیا۔

iii۔ مسلمانوں کو عمرہ اور بیت اللہ کی زیارت کا حق مل گیا۔ اس طرح اسلام مشرکین کی نظر میں بھی ایک تسلیم شدہ مذہب کے طور پر ابھرا۔

iv۔ اس جنگ بندی اور امن کی فضا میں اسلامی قوانین کا نفاذ، اسلامی معاشرے کا قیام اور اسلامی تہذیب وتمدن کی بنیادیں مستحکم کرنے کا موقع میسر آ گیا۔

v۔ اس صلح کے بعد منافقین کی کمر ٹوٹ گئی جو اس خیال میں خوش تھے کہ یہ لشکر موت کے منہ میں جا رہا ہے۔

اس طرح اس صلح سے اسلام کو مادی، معنوی، سیاسی، حربی اور نظریاتی فوائد حاصل ہوئے۔ درحقیقت صلح حدیبیہ کے دن ہی مکہ فتح ہو گیا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے فتح مبین قرار دیا۔

۲۔ لِّيَغۡفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ: رسول اللہ ﷺ کو اس فتح مبین سے نوازنے کے چند ایک علل و اسباب کا ذکر فرمایا: ان میں سب سے پہلا سبب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے گزشتہ اور آیندہ ذنوب کی مغفرت ہو جائے۔

یہاں دو سوال اہم ہیں: پہلا سوال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ معصوم عن الذنوب ہیں۔ یہاں ذنوب کی مغفرت کا کیا مطلب ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ فتح مبین اور ذنوب کی مغفرت میں کیا ربط ہے؟

مذکورہ سوالوں کے چند ایک جواب دے گئے ہیں ان میں سے صرف بعض جوابات کا ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

i۔ ذنب یعنی گناہ سے مراد وہ باتیں ہیں جنہیں رسول اللہ ﷺ خود اپنی نظر میں کوتاہی اور تقصیر سمجھتے تھے اگرچہ وہ فی الواقع گناہ یا تقصیر نہ تھیں لیکن یہ جواب درست نہیں ہے چونکہ اگر فی الواقع گناہ یا تقصیر نہیں ہے تو اللہ کی طرف سے معاف کرنے کا کوئی مطلب نہیں بنتا۔

ii۔ یغفر کا مطلب یہ ہے کہ اللہ گناہ کی نوبت ہی نہیں آنے دیتا چونکہ غفر ستر، پردہ حائل ہونے کے معنوں میں ہے لہٰذا معصوم کے لیے غفر ستر کے معنوں میں ہوگا کہ گناہ اور معصوم کے درمیان ستر حائل ہوگا اور غیر معصوم کے لیے گناہ اور عذاب کے درمیان ستر حائل ہونے کو مغفرت کہتے ہیں لیکن یہ جواب درست نہیں چونکہ یہ بات معصوم کے لیے ہمیشہ موجود ہے۔ اس کا فتح مبین کے ساتھ ربط نہیں بنتا۔

iii۔ ذنب سے مراد وہ ہے جسے مشرکین گناہ سمجھتے تھے کہ محمدؐ نے ہمارے درمیان پھوٹ ڈال دی۔ ہمارے آباء و اجداد کا مذہب چھوڑ کر نیا مذہب نکالا وغیرہ۔ فتح مبین کی وجہ سے اس مزعومہ گناہ کا اللہ نے ازالہ کیا۔ یہ جواب حضرت امام رضا علیہ السلام سے مروی ہے۔

iv۔ ذنب سے مراد وہ پریشانی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ کو اپنی کامیابی کے بارے میں لاحق تھی۔ فتح مبین سے یہ پریشانی دور ہوگئی۔

اس جواب میں کمزوری یہ ہے کہ ذنب (گناہ) کہہ کر پریشانی مراد لی گئی جو بعید ہے۔

v۔ گناہ سے مراد وہ کوتاہی اور قصور ہے جو آپ کی اسلامی تحریک میں وقتاً فوقتاً سرزد ہوتی رہی۔ یہ قصور منافقین، مریض دل اور ضعیف الایمان لوگوں کی طرف سے سرزد ہوتے رہے۔ ان لوگوں کی وجہ سے اسلامی تحریک کو ہمیشہ مشکلات درپیش رہی ہے۔ فتح مبین کی وجہ سے ان کوتاہیوں کی تلافی ہوگئی اور آیندہ اس قسم کی کوتاہیوں سے اسلامی تحریک کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

اس جواب پر یہ سوال آتا ہے کہ کوتاہی آپ کی تحریک کی ہے اور نسبت دی گئی خود آپؐ کی طرف؟

جواب یہ ہے کہ قرآن مجید میں اس قسم کے خطابات زیادہ ہیں۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

نَزَلَ الْقُرآنُ بِاِیَّاكِ اَعْنِی وَ اسْمَعِی یَا جَارَۃُ۔[1] قرآن، بات کسی سے، سمجھانا کسی کو مقصود ہے (سر دلبران در حدیث دیگران) پر نازل ہوا ہے۔

چنانچہ قرآن میں ہے:

لَئِنۡ اَشۡرَکۡتَ لَیَحۡبَطَنَّ عَمَلُکَ ...[2] اگر تم نے شرک کیا تو تمہارا عمل ضرور حبط ہو جائے گا۔

اس توجیہ سے اتمام نعمت، صراط مستقیم کی ہدایت اور نصرت کے وعدوں کے ساتھ ربط بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ان کوتاہیوں کے دور ہونے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ پر نعمت پوری ہونے، راہ راست کی رہنمائی اور فتح و نصرت کی راہ ہموار ہوگئی۔

---

[1] الکافی۔ ۲: ۶۳۰ [2] ۳۹ زمر: ۶۵

اس توجیہ سے معاف اور فتح مبین میں ربط بھی واضح ہو گیا۔

اقول: مع ذلك كله يبدو ان هناك سراً غامضا لم يكشف بعد فالاحسن للانسان ان يعترف بعجزه عن تفسير هذه الآية۔

۳۔ وَيُتِمَّ نِعۡمَتَهٗ عَلَيۡكَ: اس فتح مبین سے آپ ﷺ کو ہم نے اس لیے نوازا ہے تا کہ آپؐ پر اللہ کی نعمت پوری ہو جائے۔ کفر و شرک پر اسلام کا غلبہ ہونے سے زمین پر اللہ کی شریعت کا نفاذ ہو گا جس میں دین و دنیا دونوں کی نعمتوں کی فراوانی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے لیے خصوصی نعمت یہ ہے کہ آپؐ کے مبارک ہاتھوں سے قیامت تک کے لیے دین توحید کو دوام حاصل ہو گیا۔

۴۔ وَيَهۡدِيَكَ صِرَاطًا مُّسۡتَقِيۡمًا: دین توحید کے غلبے، پائیداری اور دشمن کی نابودی کے لیے کامیابی کی راہوں کی رہنمائی ہو گی۔

۵۔ وَّيَنۡصُرَكَ اللّٰهُ نَصۡرًا عَزِيۡزًا: یہ فتح مبین اس لیے عنایت ہوئی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ایسی نصرت عنایت فرمائے جو ہر سرکش پر غالب آنے والی ہو۔

چنانچہ اس فتح مبین کے بعد مکہ فتح ہوا اور جزیرۃ العرب کفر و شرک سے پاک ہو گیا۔ روئے زمین پر اسلام ایک فاتح طاقت کی صورت میں ابھرا اور کبھی بھی اسلام کسی سرکش کے مقابلے میں شکست سے دوچار نہیں ہوا۔

اگر کہیں شکست سے دوچار ہوئے ہوں، مسلمان شکست کھا گئے، اسلام نہیں۔ یہ مسلمان اسلام کی نمائندگی نہیں کرتے تھے:

وَاَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ○[1] تم ہی غالب رہو گے بشرطیکہ تم مومن ہو۔

ہر صورت میں نہیں، بلکہ مومن ہونے کی صورت میں۔

اہم نکات

۱۔ کبھی صلح میں وہ فتح و نصرت حاصل ہوتی ہے جو جنگ میں نہیں ہوتی۔

۲۔ صلح و قیام کے رموز ہر شخص نہیں سمجھ سکتا۔

هُوَ الَّذِيۡۤ اَنۡزَلَ السَّكِيۡنَةَ فِيۡ قُلُوۡبِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ لِيَزۡدَادُوۡۤا اِيۡمَانًا مَّعَ اِيۡمَانِهِمۡ ؕ وَلِلّٰهِ جُنُوۡدُ

۴۔ وہی اللہ ہے جس نے مومنین کے دلوں پر سکون نازل کیا تا کہ ان کے ایمان کے ساتھ مزید ایمان کا اضافہ کرے اور آسمانوں اور زمین

---

[1] ۳۱ آل عمران: ۱۳۹

السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا ۙ﴿۴﴾

کے لشکر سب اللہ ہی کے ہیں اور اللہ خوب جاننے والا، حکمت والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔اس صلح کے بعد لشکر اسلام میں اکثر لوگ کبیدہ خاطر تھے۔ اس صلح کو اپنی شکست تصور کرتے تھے۔ دلوں میں سوالات پیدا ہونے لگ گئے تھے کہ اس خواب کا کیا مطلب جو رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا تھا کہ ہم مسجد حرام میں داخل ہو رہے ہیں اور اب واپس جا رہے ہیں۔ پھر صلح کی بعض شقوں کو اکثر مسلمان اہانت آمیز سمجھے تھے۔ اس طرح ایک اضطراب برپا تھا۔

لیکن اللہ نے سورہ فتح کے ذریعے ان مومنین کے دلوں میں سکون و اطمینان نازل فرمایا کہ یہ صلح ایک فتح مبین ہے۔ اس صلح کے ذریعے جو فتح حاصل ہوئی ہے وہ پے در پے ہونے والی فتوحات کے لیے پیش خیمہ ہے۔

۲۔ لِیَزۡدَادُوۡۤا اِیۡمَانًا مَّعَ اِیۡمَانِہِمۡ: مومنین کے دلوں میں سکون و اطمینان نازل کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ایمان میں اضافہ ہو جائے چونکہ سکون و اطمینان کی وجہ سے شکوک وشبہات کا، جو ایمان کو کمزور کرنے کا باعث ہیں، ازالہ ہو گیا۔ جس کی وجہ سے ایمان کو فروغ حاصل ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت برحق ہے۔ صلح کا فیصلہ صائب اور حکم خدا کے مطابق تھا۔

واضح رہے ایمان میں اضافہ ہو سکتا ہے اور کمزوری بھی آ سکتی ہے چونکہ ایمان اس علم کا نام ہے جس پر عمل ہوتا ہے اور علم اور عمل دونوں میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے اور کمزوری بھی آ سکتی ہے۔

۳۔ وَ لِلّٰہِ جُنُوۡدُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ: آسمانوں اور زمین میں موجود ساری طاقتیں اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ وہ کسی کمزوری کی وجہ سے صلح کا حکم نہیں دیتا۔ وہ چاہے تو لمحے میں مشرکین کو نابود کر سکتا ہے۔

۴۔ وَ کَانَ اللّٰہُ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا: یہ صلح اللہ تعالیٰ کے علم اور حکمت کی بنیاد پر ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہاں طاقت استعمال کرنی چاہیے اور کہاں صلح سے کام لینا چاہیے۔

اہم نکات

۱۔ دلوں میں ایمان موجود ہو تو اس میں اضافہ بھی ہوتا ہے۔

۲۔ اللہ اپنی طاقت (جنود) کے ذریعے نہیں، مومنین کے جہاد کے ذریعے دین کو پائیداری عنایت فرماتا ہے۔

لِّیُدۡخِلَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَ الۡمُؤۡمِنٰتِ

۵۔ تاکہ اللہ مومنین اور مومنات کو ایسی جنتوں میں

جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا وَ یُکَفِّرَ عَنۡہُمۡ سَیِّاٰتِہِمۡ ؕ وَ کَانَ ذٰلِکَ عِنۡدَ اللّٰہِ فَوۡزًا عَظِیۡمًا ۙ﴿۵﴾

داخل کرے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور تاکہ ان کے گناہوں کو ان سے دور کر دے اور اللہ کے نزدیک یہ بڑی کامیابی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ لِّیُدۡخِلَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ: اللہ تعالیٰ نے مومنین کے دلوں میں سکون و اطمینان اتارا تاکہ ان کے ایمان میں اضافہ ہو، داخل جنت ہوں اور گناہوں کا کفارہ ہو۔ چونکہ ایمان سے جنت کے حقدار بن جاتے اور گناہ دھل جاتے ہیں۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں اس جملے کا تعلق اِنَّا فَتَحۡنَا سے ہے۔ یعنی اللہ نے فتح مبین سے نوازا تاکہ مومنین جنت میں داخل ہوں۔ یہ تفسیر بھی بعد از امکان نہیں ہے۔

۲۔ وَ کَانَ ذٰلِکَ عِنۡدَ اللّٰہِ فَوۡزًا عَظِیۡمًا: گناہوں سے پاک ہو کر ہمیشہ کی زندگی کے لیے جنت میں داخل ہونے سے زیادہ عظیم کامیابی قابل تصور نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ رسول اللہ ﷺ کی سیرت صدق دل سے قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے سے سے ایمان میں اضافہ اور جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔

وَّ یُعَذِّبَ الۡمُنٰفِقِیۡنَ وَ الۡمُنٰفِقٰتِ وَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ وَ الۡمُشۡرِکٰتِ الظَّآنِّیۡنَ بِاللّٰہِ ظَنَّ السَّوۡءِ ؕ عَلَیۡہِمۡ دَآئِرَۃُ السَّوۡءِ ۚ وَ غَضِبَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ وَ لَعَنَہُمۡ وَ اَعَدَّ لَہُمۡ جَہَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتۡ مَصِیۡرًا ﴿۶﴾

۶۔ اور (اس لیے بھی کہ) منافق مردوں اور منافق عورتوں کو اور مشرک مردوں اور مشرکہ عورتوں کو جو اللہ کے بارے میں بدگمانی کرتے ہیں عذاب میں مبتلا کرے، یہ لوگ گردش بد کا شکار ہو گئے اور ان پر اللہ نے غضب کیا اور ان پر لعنت کی اور ان کے لیے جہنم آمادہ کر رکھی ہے جو بہت برا انجام ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَّ یُعَذِّبَ الۡمُنٰفِقِیۡنَ: مومنین کے دلوں میں سکون نازل ہونے سے دوسری بات یہ سامنے آتی

ہے کہ اسلامی تحریک کی کامیابی سے منافقین اور مشرکین شکست اور ناکامی کی ذلت و خواری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ مومنین میں عدم سکون اور اضطراب کی صورت میں منافقین کو اپنی سازش بروئے کار لانے کا موقع ملتا تھا۔

۲۔ الظَّآنِّیۡنَ بِاللّٰہِ ظَنَّ السَّوۡءِ: یہ منافقین اللہ کے بارے میں بدگمانی کرتے تھے کہ اللہ اپنے رسول ﷺ کو اس سفر میں دشمنوں سے نہیں بچائے گا اور مسلمان اس خطرناک سفر سے واپس نہیں آ سکیں گے۔ چنانچہ مسلمانوں کی فاتحانہ واپسی منافقین کے لیے دنیا میں عذاب ثابت ہوئی۔

۳۔ عَلَیۡہِمۡ دَآئِرَۃُ السَّوۡءِ: منافقین خود گردش بد کا شکار ہو گئے۔ یہ منافقین اور مشرکین کے خلاف ایک بددعا ہے کہ جس سازش کے تحت وہ مسلمانوں کو گردش بد کا شکار کرنا چاہتے تھے وہ خود اس میں مبتلا ہو جائیں۔

۴۔ وَ غَضِبَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ: اور وہ اللہ کے غضب اور لعنت یعنی رحمت سے دوری میں مبتلا ہو گئے جو ان کے لیے نہایت بری گردش ہے۔

اہم نکات

۱۔ مومنین کا ایمان، منافق اور مشرک کے لیے ایک عذاب ہے۔

۲۔ ایمانی طاقت ہی دشمنوں کی سازشوں کا بہترین مقابلہ ہے۔

وَ لِلّٰہِ جُنُوۡدُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ عَزِیۡزًا حَکِیۡمًا ﴿۷﴾

۷۔ اور آسمانوں اور زمین کے لشکر اللہ کے ہیں اور اللہ بڑا غالب آنے والا، حکمت والا ہے۔

یہ منافقین و مشرکین اس اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں جس کے پاس پوری کائنات کی طاقت ہے۔

اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ شَاہِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیۡرًا ۙ﴿۸﴾

۸۔ ہم نے آپ کو گواہی دینے والا، بشارت دینے والا اور تنبیہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے،

لِّتُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ وَ تُعَزِّرُوۡہُ وَ تُوَقِّرُوۡہُ ؕ وَ تُسَبِّحُوۡہُ بُکۡرَۃً وَّ اَصِیۡلًا ﴿۹﴾

۹۔ تاکہ تم (مسلمان) اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اس کی مدد کرو، اس کی تعظیم کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرو۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ شَاہِدًا: رسول اللہ ﷺ کو قرآن میں متعدد مقامات پر شاھد کہا ہے۔ یہ گواہی بندوں کے اعمال سے متعلق ہے۔ دنیا میں وہ ان اعمال کے مطابق بشارات اور نذارت (تنبیہ) کی ذمے داری

اٹھائیں گے آخرت میں ان کے اعمال کی گواہی دیں گے۔

رسول اللہ ﷺ کے شاهد ہونے کے بارے میں سورہ بقرہ آیت ۱۴۳ اور سورہ نساء آیت ۴۱ ملاحظہ فرمائیں۔

۲۔ لِّتُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ: ہم نے آپ کو شاهد اور بشارت دینے والا بنا کر اس لیے مبعوث کیا ہے تاکہ اے لوگو! تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ۔ یعنی رسول کی رسالت کا مقصد لوگوں کو ایمان کی نعمت سے بہرہ ور کرنا اور انہیں گمراہی سے نجات دلانا ہے۔

۳۔ وَ تُعَزِّرُوۡہُ: نیز جو دین اس رسول نے پیش کیا ہے اس کی راہ میں جہاد کر کے اللہ کی نصرت کرنا ہے: اِنۡ تَنۡصُرُوا اللّٰہَ یَنۡصُرۡکُمۡ ... [1] اگر تم اللہ کی مدد کرو تو اللہ تمہاری مدد کرے گا۔

۴۔ وَ تُوَقِّرُوۡہُ ؕ وَ تُسَبِّحُوۡہُ: اللہ کی تعظیم و تسبیح بھی غرض رسالت ہے۔ اللہ کی بندگی کرنا جس طرح غرض خلقت ہے اسی طرح غرض رسالت بھی یہی ہے۔ بعض مفسرین تُعَزِّرُوۡہُ اور تُوَقِّرُوۡہُ کی ضمیروں کا مرجع رسول اللہ ﷺ کو قرار دیتے ہیں اور تُسَبِّحُوۡہُ کی ضمیر کا مرجع اللہ کو لیکن ایک ہی کلام میں ضمیروں کا مرجع مختلف ہونا بغیر کسی قرینہ کے درست نہیں ہے بلکہ تُسَبِّحُوۡہُ قرینہ بن سکتا ہے کہ تینوں ضمیریں اللہ کی طرف ہیں۔

اہم نکات

۱۔ رسول اللہ ﷺ کو اس لیے مبعوث فرمایا کہ یہ نادان انسان اللہ کی عبودیت کی منزل پر فائز ہو جائے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰہَ ؕ یَدُ اللّٰہِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡہِمۡ ۚ فَمَنۡ نَّکَثَ فَاِنَّمَا یَنۡکُثُ عَلٰی نَفۡسِہٖ ۚ وَ مَنۡ اَوۡفٰی بِمَا عٰہَدَ عَلَیۡہُ اللّٰہَ فَسَیُؤۡتِیۡہِ اَجۡرًا عَظِیۡمًا ﴿۱۰﴾ ع

۱۰۔ تحقیق جو لوگ آپ کی بیعت کر رہے ہیں وہ یقیناً اللہ کی بیعت کر رہے ہیں، اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ کے اوپر ہے، پس جو عہد شکنی کرتا ہے وہ اپنے ساتھ عہد شکنی کرتا ہے اور جو اس عہد کو پورا کرے جو اس نے اللہ کے ساتھ کر رکھا ہے تو اللہ عنقریب اسے اجر عظیم دے گا۔

تفسیر آیات

حدیبیہ کے مقام پر لشکر اسلام اور قریش میں وفود کا تبادلہ ہوتا رہا۔ آخری روز رسول اللہ ﷺ کی طرف سے حضرت عثمان کو قریش کی طرف بھیجا گیا۔ ان کی واپسی میں تاخیر کی وجہ سے یہ خبر اڑی کہ عثمان کو

---

[1] ۴۷ محمد: ۷

قریش نے قتل کر دیا ہے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب سے اس بات پر بیعت لی کہ آیندہ میدان جنگ سے فرار نہیں ہوں گے۔

۱۔ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کو اللہ کے ہاتھ پر بیعت قرار دیا چونکہ یہ ہاتھ اللہ کے رسول کا ہاتھ ہے۔ قرآن میں متعدد مقامات پر عمل رسول کو عمل خدا قرار دیا:

وَ مَا رَمَیۡتَ اِذۡ رَمَیۡتَ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی ....[1]	اور (اے رسول) جب آپ کنکریاں پھینک رہے تھے اس وقت آپ نے نہیں بلکہ اللہ نے کنکریاں پھینکی تھیں۔
مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہَ ....[2]	جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

اس بات کی پوری وضاحت کے لیے رسولؐ کے ہاتھ کو اللہ کا ہاتھ قرار دیا کہ بعد میں اگر کوئی اس بیعت کو توڑتا اور جنگ سے پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتا ہے تو اس نے اللہ سے بیعت کو توڑا ہے۔

۲۔ یَدُ اللّٰہِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡہِمۡ: مزید وضاحت فرمائی کہ ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا۔ یعنی وہ فی الواقع اللہ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے۔ یہاں ید رسول ﷺ کو ید اللہ فرمایا جو رسول ﷺ کی عظمت کی نشانی ہے اور ساتھ بیعت کی بھی عظمت بیان کرنا مقصود ہے کہ اس بیعت کا توڑنا کس قدر عظیم جرم ہوگا۔

۳۔ فَمَنۡ نَّکَثَ فَاِنَّمَا یَنۡکُثُ عَلٰی نَفۡسِہٖ: جو بیعت اللہ کے ہاتھ پر ہوئی ہے اس کا توڑنا ایک بہت بڑا جرم ہوگا جس کا وبال بیعت توڑنے والے ہی کی ذات پر ہوگا۔ چنانچہ جنگ حنین میں حضرت ابن عباس اس بیعت کا حوالہ دے کر بھاگنے والوں کو بلاتے تھے۔ حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

ان فی النار لمدینۃ یقال لھا الحصینۃ، أ فلا تسألونی ما فیھا؟ فقیل لہ ما فیھا یا امیر المومنین؟ قال: فیھا أیدی الناکثین۔[3]	آتش جہنم میں ایک شہر ہے جس کو الحصینۃ کہتے ہیں۔ کیا تم مجھ سے نہیں پوچھتے اس شہر میں کیا ہے؟ کہا گیا: یا امیر المومنین اس میں کیا ہے؟ فرمایا: بیعت توڑنے والوں کا ہاتھ۔

۴۔ وَ مَنۡ اَوۡفٰی بِمَا عٰہَدَ عَلَیۡہُ اللّٰہَ: جو اس عہد کو پورا کرے گا اور موت کا خطرہ سامنے ہونے کے باوجود میدانِ جنگ نہیں چھوڑے گا اسے اجر عظیم ملے گا۔

عَلَیۡہُ اللّٰہَ قاعدۃً علیہِ اللّٰہ ہونا چاہیے۔ عَلَیۡہُ اللّٰہَ پڑھنے کی کیا وجہ ہے؟ بعض کہتے ہیں علیہ میں

---

[1] ۸ انفال: ۱۷ [2] ۴ نساء: ۸۰ [3] بحار الانوار ۲: ۱۰۷

ھاء کی جگہ اصل میں ھُو تھا۔ لہٰذا اس کا اصلی اعراب باقی رکھا گیا ہے۔ دوسری توجیہ یہ بیان کی گی ہے کہ جب علیہ کے بعد متحرک حرف آ جائے تو علیہِ بالکسر پڑھنا چاہیے لیکن علیہ کے بعد ساکن حرف آ جائے تو پیش اور زیر دونوں طریقے سے پڑھنا صحیح ہے۔[1]

اہم نکات

۱۔ عمل رسولؐ خود اللہ کا عمل ہے۔

۲۔ رسولؐ کے ساتھ عہد شکنی، اللہ کے ساتھ عہد شکنی ہے۔

سَیَقُوۡلُ لَکَ الۡمُخَلَّفُوۡنَ مِنَ الۡاَعۡرَابِ شَغَلَتۡنَاۤ اَمۡوَالُنَا وَ اَهۡلُوۡنَا فَاسۡتَغۡفِرۡ لَنَا ۚ یَقُوۡلُوۡنَ بِاَلۡسِنَتِهِمۡ مَّا لَیۡسَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ ؕ قُلۡ فَمَنۡ یَّمۡلِکُ لَکُمۡ مِّنَ اللّٰهِ شَیۡـًٔا اِنۡ اَرَادَ بِکُمۡ ضَرًّا اَوۡ اَرَادَ بِکُمۡ نَفۡعًا ؕ بَلۡ کَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرًا ﴿۱۱﴾

۱۱۔ صحرانشین جو پیچھے رہ گئے ہیں وہ جلد ہی آپ سے کہیں گے: ہمیں ہمارے اموال اور اہل و عیال نے مشغول رکھا لہٰذا ہمارے لیے مغفرت طلب کیجیے، یہ اپنی زبانوں سے وہ بات کرتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے، کہد یجیے: اگر اللہ تمہیں ضرر پہنچانے کا ارادہ کر لے یا فائدہ پہنچانا چاہے تو کون ہے جو اس کے سامنے تمہارے لیے کچھ اختیار رکھتا ہو؟ بلکہ اللہ تو تمہارے اعمال سے خوب باخبر ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ سَیَقُوۡلُ لَکَ الۡمُخَلَّفُوۡنَ مِنَ الۡاَعۡرَابِ: مدینے کے اطراف میں رہنے والے صحرانشینوں کا ذکر ہے جنہیں رسول اللہ ﷺ نے عمرہ کے لیے ساتھ چلنے کا حکم دیا تھا لیکن ان لوگوں نے ساتھ نہ چلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ لوگ اسلم، مزینہ، جھینہ اور اشجع وغیرہ قبائل کے تھے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ یہ سفر موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔

اپنا عذر پیش کرنے کے لیے ان صحرانشینوں کے آنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو آگاہ کیا کہ وہ کیا کہنے والے ہیں اور حقیقت کیا ہے۔

---

[1] اعراب القرآن محی الدین درویش

۲۔ شَغَلَتۡنَاۤ اَمۡوَالُنَا وَ اَهۡلُوۡنَا: وہ عذر پیش کریں گے اپنے مال مویشی اور اہل و عیال کے تحفظ کی وجہ سے ہمارا آپ کے ساتھ جانا ممکن نہ ہوا۔

۳۔ یَقُوۡلُوۡنَ بِاَلۡسِنَتِہِمۡ مَّا لَیۡسَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ: یہ لوگ حقیقت واقع کے خلاف بات کر رہے ہیں۔ آپ کے ساتھ نہ جانے کا اصل محرک جو ان کے دلوں تھا، کچھ اور ہے۔

۴۔ قُلۡ فَمَنۡ یَّمۡلِکُ لَکُمۡ مِّنَ اللّٰہِ شَیۡـًٔا: وہ آپ کے ساتھ نہ جا کر اپنے آپ کو خطرے سے بچا رہے تھے۔ آپ ان سے کہد یجیے: اللہ کے فیصلے کو کون ٹال سکتا ہے اگر وہ تمہیں ضرر پہنچانا چاہے۔

بَلۡ ظَنَنۡتُمۡ اَنۡ لَّنۡ یَّنۡقَلِبَ الرَّسُوۡلُ وَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ اِلٰۤی اَہۡلِیۡہِمۡ اَبَدًا وَّ زُیِّنَ ذٰلِکَ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ وَ ظَنَنۡتُمۡ ظَنَّ السَّوۡءِ ۚۖ وَ کُنۡتُمۡ قَوۡمًۢا بُوۡرًا ﴿۱۲﴾

وَ مَنۡ لَّمۡ یُؤۡمِنۡۢ بِاللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ فَاِنَّاۤ اَعۡتَدۡنَا لِلۡکٰفِرِیۡنَ سَعِیۡرًا ﴿۱۳﴾

۱۲۔ بلکہ تم یہ گمان کرتے تھے کہ پیغمبر اور مومنین اپنے اہل و عیال میں کبھی بھی لوٹ کر نہیں آئیں گے اور یہ بات تمہارے دلوں میں خوشنما بنا دی گئی اور تم نے برا گمان کر رکھا تھا اور تم ہلاک ہونے والی قوم ہو۔

۱۳۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول پر ایمان نہ لائے ہم نے (ایسے) کفار کے لیے دہکتی آگ تیار کر رکھی ہے۔

تشریح کلمات

بوراً: (ب و ر) البوار کے معنی کسی چیز کے زیادہ مندا پڑنے کے ہیں۔ اسی سے ہلاکت کے معنوں میں استعمال ہونے لگا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ بَلۡ ظَنَنۡتُمۡ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نہ جانے کی وجہ وہ نہ تھی جو تم کہہ رہے ہو بلکہ تمہارا یہ خیال تھا کہ رسول اور ان کے ساتھی جس موت کے منہ میں جا رہے ہیں اس سے سلامتی کے ساتھ ہرگز واپس نہیں آسکیں گے۔ اَبَدًا کا لفظ بتاتا ہے کہ اس جگہ ظن، یقین کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی انہیں یقین تھا کہ یہ ہرگز واپس نہیں آسکیں گے۔

۲۔ وَّ زُیِّنَ ذٰلِکَ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ: یہ خیال انہیں بہت بھلا لگ رہا تھا۔ یعنی لشکر اسلام کی تباہی کا تصور انہیں بھلا لگ رہا تھا کہ کتنا اچھا فیصلہ تھا ہمارا کہ اس تباہی سے ہم نے اپنے آپ کو بچا لیا۔

جن کے دلوں میں لشکر اسلام کی تباہی کا تصور شیریں ہو وہ مسلمان کیسے ہو سکتے ہیں؟

۳۔ وَ ظَنَنۡتُمۡ ظَنَّ السَّوۡءِ: بدترین خیال کیا جو تمہارے عدم ایمان بلکہ عداوت کا مظہر ہے۔

۴۔ وَ کُنۡتُمۡ قَوۡمًۢا بُوۡرًا: اور تم خود ہلاکت پذیر قوم ہو۔ اس سوچ نے خود تمہیں ہلاکت میں ڈال دیا ہے۔

۵۔ وَ مَنۡ لَّمۡ یُؤۡمِنۡۢ بِاللّٰہِ: اس آیت میں اشارہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی عدم اطاعت کفر ہے اور ان لوگوں کو بھی کافر قرار دیا ہے جو آزمائش کے وقت اپنے دین پر جان و مال کو ترجیح دیں۔ یہ لوگ کافر کے حکم میں ہیں۔ دنیا میں اگرچہ انہیں مسلمانوں کی صفوں سے نہیں نکالا جاتا البتہ آخرت میں یہ کافروں کے ساتھ محشور ہوں گے، اگر توبہ نہ کریں۔

وَ لِلّٰہِ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ یَغۡفِرُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ﴿۱۴﴾

۱۴۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی صرف اللہ کے لیے ہے، وہ جسے چاہے بخش دیتا ہے اور جسے چاہے عذاب دیتا ہے اور اللہ بڑا معاف کرنے والا، مہربان ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ لِلّٰہِ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ: کل کائنات اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ وہ اپنی حکیمانہ مشیت کے مطابق مغفرت اور عذاب کا فیصلہ کرتا ہے۔

اس آیت میں یَغۡفِرُ کا ذکر پہلے، یُعَذِّبُ کا ذکر بعد میں ہے چونکہ اللہ تعالیٰ نے رحمت کو اپنے پر واجب گردانا ہے۔ کَتَبَ رَبُّکُمۡ عَلٰی نَفۡسِہِ الرَّحۡمَۃَ ....[1] لہٰذا رحمت و مغفرت اللہ کی ربوبیت کا تقاضا ہے۔ جب کہ عذاب دنیا اللہ کی عدالت کا تقاضا ہے۔ مقام ربوبیت، مقام عدالت پر مقدم ہے لہٰذا رحمت کا اہل نہ ہونے کی صورت میں، عذاب کی صورت میں عدالت کی نوبت آتی ہے۔

۲۔ وَ کَانَ اللّٰہُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا: قابل توجہ یہ ہے کہ یہاں یَغۡفِرُ اور غَفُوۡرًا کے لفظوں میں دو مغفرتوں کے درمیان ایک بار عذاب کا ذکر آیا ہے اور رَّحِیۡمًا کے ذکر کے ساتھ مزید تاکید ہوئی کہ دو مغفرتوں اور رحمت کے درمیان ایک بار عذاب کا ذکر آیا ہے۔

اہم نکات

۱۔ کائنات پر حاکیت کے باوجود اللہ تعالیٰ رحمت اور مغفرت کو ترجیح دیتا ہے۔

---

[1] ۶ انعام: ۵۴

سَیَقُوۡلُ الۡمُخَلَّفُوۡنَ اِذَا انۡطَلَقۡتُمۡ اِلٰی مَغَانِمَ لِتَاۡخُذُوۡہَا ذَرُوۡنَا نَتَّبِعۡکُمۡ ۚ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّبَدِّلُوۡا کَلٰمَ اللّٰہِ ؕ قُلۡ لَّنۡ تَتَّبِعُوۡنَا کَذٰلِکُمۡ قَالَ اللّٰہُ مِنۡ قَبۡلُ ۚ فَسَیَقُوۡلُوۡنَ بَلۡ تَحۡسُدُوۡنَنَا ؕ بَلۡ کَانُوۡا لَا یَفۡقَہُوۡنَ اِلَّا قَلِیۡلًا ﴿۱۵﴾

۱۵۔ جب تم غنیمتیں لینے چلو گے تو پیچھے رہ جانے والے جلد ہی کہنے لگیں گے: ہمیں بھی اجازت دیجیے کہ آپ کے ساتھ چلیں، وہ اللہ کے کلام کو بدلنا چاہتے ہیں، کہدیجیے: اللہ نے پہلے ہی فرمایا تھا کہ تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں جاؤ گے، پھر وہ کہیں گے: نہیں بلکہ تم ہم سے حسد کرتے ہو، (دراصل) یہ لوگ بہت ہی کم سمجھتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ سَیَقُوۡلُ الۡمُخَلَّفُوۡنَ: ایک ایسا واقعہ آنے والا ہے کہ حدیبیہ کے سفر میں آپ کے ساتھ نہ جانے والے، مسلمانوں کو آسان فتوحات کی طرف جاتے دیکھ کر ساتھ چلنے کی خواہش کریں گے تاکہ ان جنگوں میں ہاتھ لگنے والی غنیمتوں میں شریک ہو سکیں۔

چنانچہ چند ماہ بعد جنگ خیبر کے موقع پر ان لوگوں نے دیکھا اب تو خطرے کے بغیر آسانی سے فتوحات شروع ہو گئی ہیں اور اموال غنیمت وافر مقدار میں حاصل ہونے کے امکانات بھی روشن ہو گئے ہیں لہٰذا ہم بھی ساتھ چلتے ہیں لیکن رسول اللہ ﷺ کو پہلے ہی حکم دیا گیا تھا کہ انہیں ساتھ نہیں لے جانا۔ صرف ان لوگوں کو ساتھ لے جانا ہے جنہوں نے خطرات کے دنوں میں جہاد میں حصہ لیا یعنی حدیبیہ میں شریک رہے ہیں۔

۲۔ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّبَدِّلُوۡا کَلٰمَ اللّٰہِ: وہ اللہ کے اس کلام کو بدلنا چاہتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ آیندہ جنگ میں صرف حدیبیہ والے شرکت کریں گے یا اس وعدے کو جھٹلانا چاہتے ہیں کہ خیبر کے غنائم حدیبیہ والوں کو ملیں گے:

وَعَدَکُمُ اللّٰہُ مَغَانِمَ کَثِیۡرَۃً تَاۡخُذُوۡنَہَا فَعَجَّلَ لَکُمۡ ہٰذِہٖ ...[1]

اللہ نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ کیا ہے جنہیں تم حاصل کرو گے۔

۳۔ قُلۡ لَّنۡ تَتَّبِعُوۡنَا: تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں چلو گے۔ ساتھ چلنے سے منع فرمایا۔

۴۔ کَذٰلِکُمۡ قَالَ اللّٰہُ مِنۡ قَبۡلُ: ان صحرا نشینوں کی خیبر کی جنگ میں شرکت پر آمادگی سے پہلے اللہ نے بتا دیا کہ یہ شرکت نہیں کریں گے۔ یعنی حدیبیہ سے واپسی کے وقت بتا دیا تھا۔

۵۔ فَسَیَقُوۡلُوۡنَ بَلۡ تَحۡسُدُوۡنَنَا: وہ یہ موقف اختیار کریں گے کہ شرکت سے جو منع کیا جا رہا ہے

---

[1] ۴۸ فتح: ۲۰

یہ حکم خدا نہیں ہے بلکہ از روئے حسد خود اپنی طرف سے منع کر رہے ہیں۔

۶۔ بَلۡ کَانُوۡا لَا یَفۡقَہُوۡنَ اِلَّا قَلِیۡلًا: وہ اپنی نافہمی اور کم عقلی کی بنیاد پر یہ بات کر رہے ہیں کہ اللہ کا رسول اپنی طرف سے منع کر رہے ہیں۔ وہ اس بات کے سمجھنے سے قاصر ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کرتے۔

اہم نکات

۱۔ رسول اللہ ﷺ کو موقع پرستوں نے تکلیف پہنچائی ہے۔

قُلۡ لِّلۡمُخَلَّفِیۡنَ مِنَ الۡاَعۡرَابِ سَتُدۡعَوۡنَ اِلٰی قَوۡمٍ اُولِیۡ بَاۡسٍ شَدِیۡدٍ تُقَاتِلُوۡنَہُمۡ اَوۡ یُسۡلِمُوۡنَ ۚ فَاِنۡ تُطِیۡعُوۡا یُؤۡتِکُمُ اللّٰہُ اَجۡرًا حَسَنًا ۚ وَ اِنۡ تَتَوَلَّوۡا کَمَا تَوَلَّیۡتُمۡ مِّنۡ قَبۡلُ یُعَذِّبۡکُمۡ عَذَابًا اَلِیۡمًا ﴿۱۶﴾

۱۶۔ آپ پیچھے رہ جانے والے صحرا نشینوں سے کہہ دیجیے: تم عنقریب ایک جنگجو قوم کے مقابلے کے لیے بلائے جاؤ گے، تم یا تو ان سے لڑو گے یا وہ اسلام قبول کریں گے پس اگر تم نے اطاعت کی تو اللہ تمہیں بہتر اجر دے گا اور اگر تم نے منہ پھیر لیا جیسا کہ تم نے پہلے منہ پھیرا تھا تو وہ تمہیں شدید دردناک عذاب دے گا۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ لِّلۡمُخَلَّفِیۡنَ مِنَ الۡاَعۡرَابِ سَتُدۡعَوۡنَ: اس جنگجو قوم سے مراد یقیناً وہ لوگ ہیں جن سے رسول اللہ ﷺ نے خود جنگ لڑی ہے۔ چنانچہ آپؐ نے ہوازن و ثقیف کے خلاف حنین میں جنگ لڑی ہے اور بنی مصطلق کے خلاف بھی۔

لہٰذا یہ کہنا کہ اس سے رسول ﷺ کے بعد لڑی جانے والی جنگیں مراد ہیں، درست نہیں ہے۔

جیسا کہ زمخشری کا دعویٰ ہے:

فانهم لم يدعوا الى الحرب فی ايام رسول اللّٰه۔

بعد از رسول جنگیں اس لیے مراد ہیں چونکہ رسول اللہؐ کے ایام میں انہیں جنگ میں شرکت کی دعوت نہیں دی گئی۔

ابو حیان اندلسی البحر المحیط میں اس کا جواب دیتے ہیں:

وھذالیس بصحیح فقد حضر کثیر منھم مع جعفر فی موتہ و حضروا حرب ھوازن مع رسول اللّٰہ و حضروا معہ فی سفرۃ تبوک۔

یہ بات صحیح نہیں ہے چونکہ ان لوگوں میں سے بہت لوگوں نے جنگ موتہ میں جعفر کے ہمراہ اور جنگ ہوازن میں رسول اللہؐ کے ہمراہ اور سفر تبوک میں بھی حضورؐ کے ہمراہ جنگوں میں شرکت کی ہے۔

ثانیاً اگر اس سے بعد از رسولؐ کی جنگیں مراد لی جائیں تو اس سے جنگ میں شرکت کی دعوت دینے والوں کی امامت ثابت نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے بخت نصر کافر کے بارے میں فرمایا:

بَعَثۡنَا عَلَیۡکُمۡ عِبَادًا لَّنَاۤ اُولِیۡ بَاۡسٍ شَدِیۡدٍ ...[1]

ہم نے اپنے زبردست طاقتور جنگجو بندوں کو تم پر مسلط کیا۔

یہاں لفظ بَعَثۡنَا (ہم نے بھیجا) سے بخت نصر کا ایمان ثابت نہیں ہوتا تو سَتُدۡعَوۡنَ سے امامت کیسے ثابت ہو گی۔

ان باتوں کی وجہ سے بہت سے مفسرین نے بھی یہی موقف اختیار کیا ہے کہ اس سے زمان رسولؐ ہی کی جنگیں مراد ہو سکتی ہیں اور طبری نے اپنی تفسیر میں کوئی موقف اختیار ہی نہیں کیا۔ اسی لیے تفہیم القرآن تو سرے سے اس بات کے متعرض نہیں ہوئے۔ چونکہ لوگوں نے بعد از رسولؐ جنگ میں شرکت کی دعوت دینے والوں کی امامت کا ثبوت اس دعوت جنگ پر استوار کیا ہے۔

اور لَّنۡ تَخۡرُجُوۡا مَعِیَ ...[2] اور لَّنۡ تَتَّبِعُوۡنَا مشروط ہے نفاق اور مخالفت کے ساتھ۔ جب نفاق مخالفت ختم ہو جائے تو جہاد واجب ہو جاتا ہے۔

ثانیاً یہ بات صرف جنگ خیبر کے لیے مختص تھی۔ اس پر دلیل دیگر جنگوں میں ان لوگوں کی شرکت ہے۔ اسی لیے روح المعانی کے مؤلف نے کہا ہے:

والانصاف ان الآیہ لا تکاد تصح دلیلا علی امامۃ الصدیق رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ الا ان صح غیر مرفوع فی کون المراد بالقوم بنی حنیفۃ و نحوھم و دون ذلك خرط القتاۃ۔

انصاف یہ ہے کہ آیت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی امامت کے لیے دلیل نہیں بنتی مگر یہ کہ یہ بات صحیح ثابت ہو جائے کہ قوم سے مراد بنی حنیفہ ہیں اور یہ ثابت کرنا مشکل ہے۔

۲۔ تُقَاتِلُوۡنَہُمۡ اَوۡ یُسۡلِمُوۡنَ: اس جملے سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ یہ جنگ مشرکین کے خلاف ہو گی جن کے لیے جنگ یا اسلام ہے۔ اہل کتاب کے لیے تو تیسری صورت جزیہ موجود ہے۔

۳۔ فَاِنۡ تُطِیۡعُوۡا: اگر تم نے اطاعت کی تو اچھا ثواب ملے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں

---

[1] ۱۷ بنی اسرائیل: ۵ [2] ۹ توبۃ: ۸۳

سے آئندہ اطاعت کی توقع تھی۔

اہم نکات

۱۔ اس آیت کی پیشگوئی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پر بڑی دلیل ہے۔

لَیۡسَ عَلَی الۡاَعۡمٰی حَرَجٌ وَّ لَا عَلَی الۡاَعۡرَجِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلَی الۡمَرِیۡضِ حَرَجٌ ؕ وَ مَنۡ یُّطِعِ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ یُدۡخِلۡہُ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ ۚ وَ مَنۡ یَّتَوَلَّ یُعَذِّبۡہُ عَذَابًا اَلِیۡمًا ﴿۱۷﴾

۱۷۔ (جہاد میں شرکت نہ کرنے میں) اندھے پر کوئی حرج نہیں اور نہ ہی لنگڑے پر کوئی مواخذہ ہے اور نہ ہی بیمار پر کوئی حرج ہے، جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے اللہ اسے ایسی ہی جنتوں میں داخل فرمائے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور جو منہ موڑ لے گا اللہ اسے شدید دردناک عذاب دے گا۔

تفسیر آیات

۱۔ اسلامی قوانین کی اہم ترین اصل کی طرف تفصیلی اشارہ ہے جس کا اجمالی بیان متعدد آیات میں بیان ہوا ہے کہ جس حکم پر عمل کرنے میں معمول سے زیادہ مشقت لازم آتی ہو وہ حکم اٹھ جاتا ہے یعنی اس حکم کی تعمیل لازم نہیں رہتی:

وَ مَا جَعَلَ عَلَیۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ مِنۡ حَرَجٍ ...[1]

اور دین کے معاملے میں تمہیں کسی مشکل سے دوچار نہیں کیا۔

۲۔ وَ مَنۡ یُّطِعِ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ: مذکورہ معذور لوگ اپنے بساط کے مطابق اللہ اور رسول کی اطاعت کرنے سے جنت کی ابدی زندگی کے مستحق ہوں گے۔

اہم نکات

۱۔ اسلام کے متحرک قوانین میں ایک قانون نفی حرج ہے یعنی مشقت کی صورت میں حکم اٹھ جاتا ہے۔

لَقَدۡ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اِذۡ یُبَایِعُوۡنَکَ تَحۡتَ الشَّجَرَۃِ فَعَلِمَ مَا

۱۸۔ بتحقیق اللہ ان مومنین سے راضی ہو گیا جو درخت کے نیچے آپ کی بیعت کر رہے تھے، پس جو

---

[1] ۲۲ حج: ۷۸

فِيۡ قُلُوۡبِهِمۡ فَاَنۡزَلَ السَّكِيۡنَةَ عَلَيۡهِمۡ وَاَثَابَهُمۡ فَتۡحًا قَرِيۡبًا ۙ﴿۱۸﴾ وَّمَغَانِمَ كَثِيۡرَةً يَّاۡخُذُوۡنَهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيۡزًا حَكِيۡمًا ﴿۱۹﴾	ان کے دلوں میں تھا وہ اللہ کو معلوم ہو گیا، لہٰذا اللہ نے ان پر سکون نازل کیا اور انہیں قریبی فتح عنایت فرمائی۔ ۱۹۔ اور وہ بہت سی غنیمتیں بھی حاصل کریں گے اور اللہ بڑا غالب آنے والا، حکمت والا ہے۔

تفسیر آیات

حدیبیہ میں جب یہ خبر اڑی کہ حضرت عثمان کو اہل مکہ نے قتل کر دیا ہے۔ اس صورت میں مکہ والوں نے حرمت کے مہینے میں جنگ کی ہے۔ مسلمانوں کو بھی جنگ کے لیے تیاری کرنی چاہیے۔ چنانچہ ایک درخت کے نیچے مسلمانوں سے اس بات پر بیعت لی گئی کہ جنگ سے فرار نہیں ہوں گے۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ یہ بیعت، موت کی بیعت تھی۔

۱۔ لَقَدۡ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ: ان بیعت کرنے والوں کے قلب میں جو جذبہ ایثار و قربانی موجزن تھا اس بنا پر اللہ نے اپنی رضایت کا اعلان فرمایا:

وَ رِضۡوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكۡبَرُ ...[۱] اور اللہ کی طرف سے خوشنودی تو ان سب سے بڑھ کر ہے،

۲۔ فَعَلِمَ مَا فِيۡ قُلُوۡبِهِمۡ: چونکہ اصحاب بیعت اس وقت صادق الایمان، رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے وفادار اور خلوص کے اعلیٰ درجہ پر فائز تھے اس لیے وہ اللہ کی رضایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے جس سے بالاتر کوئی کامیابی نہیں۔

۳۔ فَاَنۡزَلَ السَّكِيۡنَةَ عَلَيۡهِمۡ: اس خطرناک صورت حال میں ایک ایسا سکون و اطمینان حاصل تھا کہ لشکر والوں میں سے ہر ایک کے پاس میں صرف ایک تلوار اور احرام کا لباس ہے اور دشمن صرف ۱۳ میل کے فاصلے پر ہے۔ اپنا وطن جہاں سے کمک آ سکتی ہے ڈھائی سو میل دور ہے۔

ابن عباس سے روایت ہے کہ سکون ان لوگوں پر نازل ہوا جن کے بارے میں اللہ کو علم تھا کہ وہ وفاداری کریں گے۔[۲]

۴۔ وَاَثَابَهُمۡ فَتۡحًا قَرِيۡبًا: قریبی فتح سے مراد فتح خیبر ہے جو صلح حدیبیہ کے چند ماہ بعد واقع ہوئی۔

۵۔ وَّمَغَانِمَ كَثِيۡرَةً: کثیر مقدار میں غنیمت سے مراد خیبر کی غنیمت ہے چونکہ خیبر کی غنیمت وافر مقدار میں تھی اور یہ غنیمت صرف حدیبیہ میں حاضر لوگوں کے لیے مخصوص تھی۔ بعض ازواج رسولؐ نے فرمایا تھا

[۱] ۹ توبہ: ۷۲ [۲] الدر المنثور ۶: ۷۴

کہ خیبر کی فتح کے بعد ہم نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا۔

یہ بات درست ہے اللہ کی طرف سے سند خوشنودی عطا ہونے کے بعد اگر کوئی شخص ان سے ناراض ہو یا ان پر زبان طعن دراز کرے تو اس کا مقابلہ ان سے نہیں بلکہ اللہ سے ہے۔

البتہ یہ بات ذہن میں رہے یہ بیعت جنگ سے فرار نہ ہونے کا ایک عہد تھی۔ اگر بعد میں کسی نے عہد شکنی کی تو اس سے انکشاف ہوتا ہے کہ وہ شروع سے رضایت الٰہی حاصل کرنے والوں کی اس صف میں شامل ہی نہ تھا۔ چنانچہ بیعت رضوان کے ذکر میں آیت ۱۰ میں فرمایا:

فَمَنۡ نَّکَثَ فَاِنَّمَا یَنۡکُثُ عَلٰی نَفۡسِہٖ ....　　**پس جو عہد شکنی کرتا ہے وہ اپنے ساتھ عہد شکنی کرتا ہے۔**

چنانچہ جنگ حنین میں حضرت ابن عباس کو فرار ہونے والوں کو بیعت رضوان کا حوالہ دے کر بلانا پڑا۔ متعدد روایات سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ حدیبیہ میں منافقین بھی موجود تھے۔ چنانچہ رسولؐ کے فیصلے پر اعتراض کرنے والوں میں رئیس منافقین عبد اللہ بن ابی کا ذکر آتا ہے[1] نیز ابوالغادیۃ بھی بیعت رضوان میں حاضر تھا جس نے جنگ صفین میں حضرت عمارؓ کو قتل کیا اور جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث ثابت ہے:

عمار تقتلہ الفئۃ الباغیۃ۔[2]　　عمار کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔

اور قاتل عمار کے بارے میں یہ حدیث بھی صحیح السند ہے:

قاتل عمار و سالبہ فی النار۔[3]　　عمار کا قاتل اور اس کا سامان (حرب) لوٹنے والا آتش میں ہو گا۔

اس بیعت کے وقت اللہ تعالیٰ کو ان کے مستقبل کی خبر تھی تو فرمایا: فَمَنۡ نَّکَثَ فَاِنَّمَا یَنۡکُثُ عَلٰی نَفۡسِہٖ۔

لہٰذا یہ کہنا نہایت ناانصافی ہے کہ کیا اللہ کو خبر نہ تھی کہ ان بے وفاؤں کو پروانہ خوشنودی عطا کیا!!

جس درخت کے نیچے بیعت رضوان ہوئی تھی لوگ اس کے پاس جا کر نمازیں پڑھنے لگے تو حضرت عمر نے اس درخت کو کٹوا دیا۔[4] البتہ یہ روایات بھی ہیں کہ بیعت رضوان کے کئی سال بعد اصحاب نے اس درخت کو تلاش کیا مگر وہ اسے پہچان نہ سکے۔

اہم نکات

۱۔ بیعت رضوان میں شرکت کرنے اور اس بیعت کو نہ توڑنے والوں پر اللہ راضی ہے۔ ہمیں ان پر راضی ہونا اور اس فضیلت کو یاد رکھنا ہو گا۔

---

[1] روح المعانی ذیل آیۃ لَقَدۡ صَدَقَ اللّٰہُ رَسُوۡلَہُ الرُّءۡیَا بِالۡحَقِّ ....　[2] الاحتجاج ۱: ۱۸۱
[3] سلسلۃ الادیث الصحیحۃ۔ ۵: ۱۸ طبع ریاض۔ الجمل ص ۱۰۳　[4] طبقات ابن سعد

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ۚ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۲۰﴾

۲۰۔ اللہ نے تم سے بہت سی غنیموں کا وعدہ فرمایا ہے جنہیں تم حاصل کرو گے پس یہ (فتح) تو اللہ نے تمہیں فوری عنایت کی ہے، اس نے لوگوں کے ہاتھ تم سے روک دیے تاکہ یہ مومنین کے لیے ایک نشانی ہو اور تمہیں راہ راست کی ہدایت دے۔

وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴿۲۱﴾

۲۱۔ اور دیگر (غنیمتیں) بھی جن پر تم قادر نہ تھے، وہ اللہ کے احاطہ قدرت میں آگئیں اور اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً: جن وافر غنیموں کا وعدہ کیا ہے وہ دیگر جنگوں کی غنیمتیں ہیں جو آیندہ سالوں میں ملنے والی ہیں۔

۲۔ فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ: یہ کون سی غنیمت تھی جو اللہ نے انہیں فوری عنایت کی؟ بعض کہتے ہیں اس غنیمت سے مراد صلح حدیبیہ ہے جسے فتح مبین قرار دیا ہے اور بعض کہتے ہیں فتح خیبر مراد ہے۔ حدیبیہ کے بعد فوری حاصل ہونے کی وجہ سے اسے فوری غنیمت کہا ہے۔

۳۔ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ: جو لوگ خیبر کے یہودیوں کی مدد کے لیے آنا چاہتے تھے، جیسے بنی اسد اور غطفان، ان کے دلوں میں خوف ڈالا گیا وہ واپس چلے گئے یا ان یہودیوں کی طرف اشارہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کے حدیبیہ اور خیبر کے لیے نکلنے کے وقت مدینہ پر حملہ کرنا چاہتے تھے۔

۴۔ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ: یہ فوری ملنے والی غنیمت آپ کی رسالت کی حقانیت پر ایک شاہد اور معجزہ ہو جائے کہ جیسے قرآن نے خبر دی سچ ثابت ہو گئی۔

۵۔ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا: یہ غنیمت، یہ فتوحات سب اس لیے ہیں تاکہ تم منزل تک پہنچنے کی راہ راست پا سکو۔

۶۔ وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا: اس کے علاوہ دیگر غنیمتیں بھی تمہارے ہاتھ لگنے والی ہیں جو اس وقت تمہاری دست رس میں نہیں ہیں۔ یہ بھی ایک پیشگوئی اور غیبی خبر ہے۔

غیبی خبریں: اس سورہ مبارکہ میں چند ایک غیبی خبریں ہیں جو بعد میں سچ ثابت ہوئیں:

i۔ حدیبیہ میں شرکت نہ کرنے والے صحرا نشین من گھڑت معذرتیں پیش کرنے والے ہیں: سَيَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ....

ii۔ حدیبیہ میں شرکت نہ کرنے والے آیندہ آسان فتوحات میں شرکت کی خواہش کرنے والے ہیں۔

iii۔ حدیبیہ میں شرکت نہ کرنے والے آیندہ ایک جنگجو قوم سے نبرد آزمائی کے لیے بلائے جائیں گے: قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ....

iv۔ فتح خیبر کی خبر دی گئی: وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا۔

v۔ بہت سی وافر غنیموں کے ہاتھ لگنے کی خبر اور وعدہ: وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً....

vi۔ فتح مکہ کی طرف واضح اشارہ: وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا....

vii۔ مسجد الحرام میں داخل ہونے کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا خواب سچا ہونے کی خبر دی گئی۔

وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۲۲﴾

۲۲۔ اور اگر کفار تم سے جنگ کرتے تو پیٹھ دکھا کر فرار کرتے، پھر وہ نہ کوئی کارساز پاتے اور نہ مددگار۔

تفسیر آیات

اگر اہل مکہ مسلمانوں سے صلح نہ کرتے اور جنگ کرتے تو وہ شکست کھا کر بھاگ جاتے اور دیگر قبائل میں سے کوئی ان کی مدد کے لیے نہ آتا۔

سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚۖ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾

۲۳۔ اللہ کے دستور کے مطابق جو پہلے سے رائج ہے اور آپ اللہ کے دستور میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے۔

تفسیر آیات

یہ اللہ کا دستور اور قانون ہے جو تمام امتوں کے لیے رائج اور نافذ ہے۔

ا۔ اگر جنگ کافروں اور مسلمانوں میں ہو رہی ہو تو اس صورت میں اللہ کی طرف سے فتح کی کوئی

ضمانت نہیں ہے، مسلمانوں کی مادی و روحانی طاقت پر موقوف ہے۔

۲۔ اگر جنگ کفر و اسلام کے درمیان ہو رہی ہے اور مسلمانوں سے کوئی جنگی خیانت سرزد نہ ہوئی ہو تو اس صورت میں اللہ کی طرف سے فتح و نصرت کی ضمانت ہے۔ چنانچہ بدر میں مسلمانوں سے کوئی جنگی خیانت سرزد نہ ہوئی تو اسلام کے ایک بے سروسامان چھوٹے سے لشکر کو کفر کی بڑی طاقت پر فتح دی گئی۔ اس جگہ اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ کے تحت یہ اٹل فیصلہ ہے:

کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغۡلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِیۡ ...۔[1] اللہ نے لکھ دیا ہے: میں اور میرے رسول ہی غالب آ کر رہیں گے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ تعالیٰ کا تکوینی قانون اٹل ناقابل تبدیل ہے: وَ لَنۡ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبۡدِیۡلًا۔

وَ ہُوَ الَّذِیۡ کَفَّ اَیۡدِیَہُمۡ عَنۡکُمۡ وَ اَیۡدِیَکُمۡ عَنۡہُمۡ بِبَطۡنِ مَکَّۃَ مِنۡۢ بَعۡدِ اَنۡ اَظۡفَرَکُمۡ عَلَیۡہِمۡ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرًا ﴿۲۴﴾

۲۴۔ اور وہ وہی ہے جس نے کفار پر تم کو فتحیاب کرنے کے بعد وادی مکہ میں ان کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے روک دیے اور اللہ تمہارے اعمال پر خوب نظر رکھتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ ہُوَ الَّذِیۡ کَفَّ اَیۡدِیَہُمۡ عَنۡکُمۡ: اللہ ہی نے تمہیں آپس میں ایک دوسرے پر حملہ کرنے سے روک دیا۔ چنانچہ کافروں کا ہاتھ تمہارے خوف سے روک دیا کہ ان کے دل میں رعب ڈال دیا اور تمہارے ہاتھ ان سے روک دیے کہ حکم الٰہی کے تحت جنگ نہ کرنے کا تمہیں حکم دیا۔ بطن مکۃ سے مراد حدیبیہ ہے جو مکہ کی حدود میں ہی ہے۔

۲۔ مِنۡۢ بَعۡدِ اَنۡ اَظۡفَرَکُمۡ عَلَیۡہِمۡ: اس صلح کے بعد جنگ کی نوبت نہ آنے دی جو تمہاری فتح و ظفر پر مشتمل صلح تھی۔ اس صلح کو اللہ نے فتح مبین قرار دیا ہے اور ظفر کے معنی فتح کے ہی ہیں خواہ طاقت کے ذریعے ہو یا صلح کے ذریعے۔ کما قیل۔

اہم نکات

۱۔ جنگ اور امن و صلح اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق رونما ہوتی ہیں۔

---

[1] ۵۸ مجادلۃ: ۲۱

هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ؕ وَلَوْ لَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَ نِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَـُٔوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۲۵﴾

۲۵۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر کیا اور تمہیں مسجد الحرام سے روکا اور قربانیوں کو بھی اپنی جگہ (قربان گاہ) تک پہنچنے سے روک دیا اوراگر (مکہ میں) ایسے مومن مرد اور مومنہ عورتیں نہ ہوتیں جنہیں تم نہیں جانتے تھے (اور یہ خطرہ نہ ہوتا) کہ کہیں تم انہیں روند ڈالو اور بے خبری میں ان کی وجہ سے تمہیں بھی ضرر پہنچ جائے (تو اذن جہاد مل جاتا) تاکہ اللہ جسے چاہے اپنی رحمت میں داخل کرے، اگر (کافر اور مسلمان) الگ الگ ہو جاتے تو ان میں سے جو لوگ کافر ہیں انہیں ہم دردناک عذاب دیتے۔

تشریح کلمات

مَعْكُوْفًا: (ع ك ف) عكفته على كذا: کسی چیز پر روک رکھنا۔
تَطَـُٔوْهُمْ: (و ط ء) وطی الشیٔ: کسی چیز کے پامال ہونے کے معنوں میں ہے۔
مَّعَرَّةٌ: (ع ر ر) العَرُّ و العُرُّ: خارش کی بیماری کو کہتے ہیں اسی سے ہر قسم کی مضرّت پر بولا جاتا ہے۔
تَزَيَّلُوْا: (ز ی ل) تزیلوا: متفرق ہو گئے۔

تفسیر آیات

۱۔ هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: مکہ کے کافروں نے ایک تو کفر اختیار کیا اور دوسرا جرم یہ کہ تمہیں مسجد الحرام میں داخل ہونے سے روک دیا۔

۲۔ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ: اور قربانی کو بھی مکہ میں ذبح کرنے سے روک دیا۔ حج میں قربانی منیٰ اور عمرہ میں قربانی مکہ میں ذبح کی جاتی ہے۔[1]

ان جرائم کے تحت کافروں پر جنگ مسلط کر کے انہیں نابود کرنا چاہیے تھا لیکن اللہ نے ایسا نہیں کیا۔ اس کی وجہ اگلے جملے میں بیان ہوئی ہے:

---

[1] التبیان۔ ذیل آیت

۳۔ وَلَوۡلَا رِجَالٌ مُّؤۡمِنُوۡنَ: اگر مکہ میں اہل ایمان مرد اور عورتیں نہ ہوتیں جنہیں تم نہیں جانتے اور لاعلمی میں ان مومنین اور مومنات کے قتل ہو جانے کا خطرہ نہ ہوتا،

۴۔ فَتُصِیۡبَکُمۡ مِّنۡہُمۡ مَّعَرَّۃٌۢ بِغَیۡرِ عِلۡمٍ: بے خبری میں ان مسلمانوں کا قتل تمہارے ہاتھوں ہونے سے تم پر عیب و عار کا طعنہ لاحق ہونے کا خطرہ نہ ہوتا تو ہم یہ جنگ نہ روکتے۔

۵۔ لِیُدۡخِلَ اللّٰہُ فِیۡ رَحۡمَتِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ: یہ جنگ اس لیے روکی تاکہ مکہ کے مسلمان امن و اطمینان کے ساتھ رحمت خدا میں داخل ہو جائیں یعنی اسلام پر عمل پیرا ہو جائیں جو باعث رحمت خدا ہے۔ مَنۡ یَّشَآءُ اس لیے فرمایا مکہ کے مسلمانوں میں سے جو رحمت خدا کے اہل اور مشیت الٰہی کے معیار پر اترتے ہیں انہیں رحمت الٰہی میں داخل کیا جائے گا۔

۶۔ لَوۡ تَزَیَّلُوۡا لَعَذَّبۡنَا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا: اگر مکہ میں کافر او مسلمان الگ الگ ہوتے تو ہم کافروں پر جنگ مسلط کر کے ان کو قتل اور اسیری کی صورت میں عذاب دیتے۔

اہم نکات

۱۔ اگر کفار کے ساتھ جنگ ناگزیر نہ ہو تو اس جنگ کو ترک کیا جاتا ہے جس میں کفار کے ساتھ مسلمان بھی قتل ہو جاتے ہوں۔

اِذۡ جَعَلَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فِیۡ قُلُوۡبِہِمُ الۡحَمِیَّۃَ حَمِیَّۃَ الۡجَاہِلِیَّۃِ فَاَنۡزَلَ اللّٰہُ سَکِیۡنَتَہٗ عَلٰی رَسُوۡلِہٖ وَ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَ اَلۡزَمَہُمۡ کَلِمَۃَ التَّقۡوٰی وَ کَانُوۡۤا اَحَقَّ بِہَا وَ اَہۡلَہَا ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمًا ﴿۲۶﴾ ع

۲۶۔ جب کفار نے اپنے دلوں میں تعصب رکھا تعصب بھی جاہلیت کا تو اللہ نے اپنے رسول اور مومنین پر اپنا سکون نازل فرمایا اور انہیں تقویٰ کے اصول پر ثابت رکھا اور وہ اس کے زیادہ مستحق اور اہل تھے اور اللہ ہر چیز کا خوب علم رکھتا ہے۔

تشریح کلمات

حَمِیَّۃَ: (ح م ی) انسان کی قوت غضبیہ جب جوش میں آ جائے اور حد سے بڑھ جائے تو اسے حمیۃ کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اِذۡ جَعَلَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فِیۡ قُلُوۡبِہِمُ الۡحَمِیَّۃَ: جب کافر اپنے جاہلانہ تعصب کی باتیں کر رہے تھے کہ محمدؐ نے ہمارے باپ دادا کو قتل کیا ہے، آج وہ مکہ میں ہمارے گھر امن کے ساتھ آنا چاہتے ہیں، یہ ہماری حمیت و غیرت کے لیے قابل تحمل نہیں ہے۔ اہل مکہ کی ایسی جاہلانہ تعصب کی باتوں پر ہم انہیں جنگ کے عذاب میں مبتلا کر دیتے لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا بلکہ

۲۔ فَاَنۡزَلَ اللّٰہُ سَکِیۡنَتَہٗ عَلٰی رَسُوۡلِہٖ: اپنے رسول اور مومنوں پر اپنا سکون و اطمینان نازل کیا اور کسی قسم کے اضطراب اور تعصب میں آئے بغیر انہوں نے فتح و نصرت کی منزل کو پا لیا۔

۳۔ وَ اَلۡزَمَہُمۡ کَلِمَۃَ التَّقۡوٰی: اور رسول اور مومنین کو کَلِمَۃَ التَّقۡوٰی پر قائم رکھا کَلِمَۃَ التَّقۡوٰی کی ایک تفسیر امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک روایت میں ایمان ہے۔ اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہوں گے: انہیں ایمان پر قائم رکھا۔ دوسری روایت میں کلمہ سے مراد لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہے۔ یعنی انہیں توحید پر قائم رکھا۔

چونکہ یہ اضطراب کا مقام تھا اس لیے بعض حضرات کو رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رسالت پر شک گزرنا شروع ہو گیا تھا۔ اللہ نے اپنے خاص بندوں کے دلوں سے اضطراب ختم کیا، ان کے دلوں میں سکون نازل کیا اور انہیں ایمان یا توحید پر قائم رکھا۔

۴۔ وَ کَانُوۡۤا اَحَقَّ بِہَا وَ اَہۡلَہَا: یہ مومنین کَلِمَۃَ التَّقۡوٰی پر ثابت قدم رکھے جانے کے اہل اور حقدار تھے چونکہ ان میں اس عنایت الٰہی کو حاصل کرنے کی پوری استعداد موجود تھی۔

اہم نکات

۱۔ مومنین، دشمن کے بھڑکانے سے جوش میں نہیں آتے۔

۲۔ جاہلی تعصب کے مقابلے میں سکون قلب اور حق پر ثبات مومن کا شیوہ ہے۔

لَقَدۡ صَدَقَ اللّٰہُ رَسُوۡلَہُ الرُّءۡیَا بِالۡحَقِّ ۚ لَتَدۡخُلُنَّ الۡمَسۡجِدَ الۡحَرَامَ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ اٰمِنِیۡنَ ۙ مُحَلِّقِیۡنَ رُءُوۡسَکُمۡ وَ مُقَصِّرِیۡنَ ۙ لَا تَخَافُوۡنَ ؕ فَعَلِمَ مَا لَمۡ تَعۡلَمُوۡا فَجَعَلَ مِنۡ دُوۡنِ ذٰلِکَ فَتۡحًا	۲۷۔ بتحقیق اللہ نے اپنے رسول کے حق پر مبنی خواب کو سچا ثابت کیا کہ اللہ نے چاہا تو تم لوگ اپنے سر تراش کر اور بال کتروا کر امن کے ساتھ بلا خوف مسجد الحرام میں ضرور داخل ہو گے، پس اسے وہ بات معلوم تھی جو تم نہیں جانتے تھے، پس اس نے اس کے علاوہ بھی ایک نزدیکی فتح

قَرِيبًا ﴿٢٧﴾ ممکن بنا دی۔

تفسیر آیات

۱۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حدیبیہ کے لیے نکلنے سے پہلے خواب دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اپنے اصحاب کے ہمراہ امن و سلامتی کے ساتھ سر منڈوا کر اور بال کٹوا کر مکہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنا خواب لوگوں کو بتا دیا تو لوگ بہت خوش ہوئے اور یہ خیال کیا کہ اسی سفر میں اسی سال مکہ میں داخل ہونے والے ہیں چونکہ رسول خدا کا خواب سچا ہوتا ہے۔

جب حدیبیہ سے عمرہ کیے بغیر واپس ہو گئے تو کچھ لوگوں نے اعتراض کے لہجے میں باتیں شروع کر دیں: نہ ہم نے سر منڈوایا، نہ بال کٹوائے، نہ مسجد الحرام میں داخل ہوئے۔ یہ باتیں عبد اللّٰہ بن ابی، عبد اللّٰہ بن نفیل اور رفاعہ بن حارث نے کیں۔ حضرت عمر کے بارے میں بھی روایت ہے کہ انہوں نے بھی ایسی باتیں کیں۔ صاحب روح المعانی فرماتے ہیں:

علی طریق الاستکشاف لیزداد یقینہ۔[1] حضرت عمر نے ایسی باتیں حقیقت کے انکشاف کے طور پر کیں تاکہ اپنے یقین میں اضافہ ہو جائے۔

ان اعتراضات کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا خواب سچا ہے اور جیسا کہ خواب میں بیان کیا گیا ہے امن و سلامتی کے ساتھ سر منڈا کر، بال کٹوا کر، مسجد الحرام میں داخل ہو گے۔

۲۔ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ: اس تعبیر کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ فیصلہ مشروط ہے مشیت کے ساتھ۔ اگر مشیت نہ ہو تو یہ واقعہ وقوع پذیر نہ ہو گا بلکہ یہ بیان کرنے کے لیے ہے کہ اللہ کی مشیت ہر فیصلے پر حاکم ہے۔ جیسے فرمایا:

سَنُقۡرِئُکَ فَلَا تَنۡسٰۤی ۙ﴿﴾ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ ...[2] (عنقریب) ہم آپ کو پڑھائیں گے پھر آپ نہیں بھولیں گے، مگر جو اللہ چاہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو اللہ چاہے وہ رسول بھول جائیں گے بلکہ یہ بتانے کے لیے کہ رسول کے نہ بھولنے کا فیصلہ اگرچہ اللہ کا ہے مگر درحقیقت ان پر بھی اللہ کی مشیت حاکم ہے اور قدرت خدا سے خارج نہیں ہیں۔

اسی طرح اس آیت میں ہے کہ مسجد الحرام میں داخل ہونے کی پیشینگوئی ایک اٹل فیصلہ ہے تاہم اس پر بھی مشیت الٰہی حاکم ہے۔ قدرت خدا سے خارج نہیں ہے۔

۳۔ فَعَلِمَ مَا لَمۡ تَعۡلَمُوۡا: وہ بات جو معلوم تھی۔ صلح حدیبیہ میں جو مصلحتیں مضمر تھیں یا مسجد الحرام میں داخل ہونے میں تاخیر میں جو حکمتیں پوشیدہ ہیں۔

---

[1] روح المعانی ذیل آیہ [2] ۸۷ اعلیٰ: ۶۔۷

۴۔ فَجَعَلَ مِنۡ دُوۡنِ ذٰلِکَ فَتۡحًا قَرِیۡبًا: اسی علم کی بنا پر مسجد حرام میں داخل ہونے سے پہلے صلح حدیبیہ کی قریبی فتح سے تم کو نوازا ہے۔ اسی صلح سے تو امن و سکون کے ساتھ مسجد حرام میں داخل ہو سکتے ہو۔ یہ بات اللہ کے علم میں تھی کہ فتح مکہ کے لیے صلح حدیبیہ ضروری تھی۔ چنانچہ چشم جہاں نے دیکھ لیا چودہ سو کا یہ لشکر اس صلح کے نتیجے میں دس ہزار کی تعداد میں طاقت، امن اور سکون کے ساتھ مکہ میں داخل ہوا۔

اہم نکات

۱۔ انبیاء علیہم السلام کے خواب وحی کی طرح سچے ہوتے ہیں۔

۲۔ صلح حدیبیہ فتح مبین اور فتح قریب تھی۔

هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ ؕ وَکَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیۡدًا ﴿۲۸﴾

۲۸۔ وہ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ اسے ہر دین پر غالب کر دے اور گواہی دینے کے لیے اللہ ہی کافی ہے۔

اس آیت کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ توبہ آیت ۳۳

مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِیۡنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیۡنَهُمۡ تَرٰىهُمۡ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبۡتَغُوۡنَ فَضۡلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضۡوَانًا ۫ سِیۡمَاهُمۡ فِیۡ وُجُوۡهِهِمۡ مِّنۡ اَثَرِ السُّجُوۡدِ ؕ ذٰلِکَ مَثَلُهُمۡ فِی التَّوۡرٰىةِ ۚۖۛ وَمَثَلُهُمۡ فِی الۡاِنۡجِیۡلِ ۚ۟ۛ کَزَرۡعٍ اَخۡرَجَ شَطۡـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسۡتَغۡلَظَ فَاسۡتَوٰی عَلٰی سُوۡقِهٖ یُعۡجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیۡظَ بِهِمُ

۲۹۔ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت گیر اور آپس میں مہربان ہیں، آپ انہیں رکوع، سجود میں دیکھتے ہیں، وہ اللہ کی طرف سے فضل اور خوشنودی کے طلبگار ہیں سجدوں کے اثرات سے ان کے چہروں پر نشان پڑے ہوئے ہیں، ان کے یہی اوصاف توریت میں بھی ہیں اور انجیل میں بھی ان کے یہی اوصاف ہیں، جیسے ایک کھیتی جس نے (زمین سے) اپنی سوئی نکالی پھر اسے مضبوط کیا اور وہ موٹی ہو گئی پھر اپنے تنے پر سیدھی کھڑی ہو گئی اور کسانوں کو خوش

معانقۃ ۱۵

الۡکُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنۡہُمۡ مَّغۡفِرَۃً وَّ اَجۡرًا عَظِیۡمًا ﴿۲۹﴾ ع

کرنے لگی تاکہ اس طرح کفار کا جی جلائے، ان میں سے جو لوگ ایمان لائے اور اعمال صالح بجا لائے ان سے اللہ نے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے۔

تشریح کلمات

سِیۡمَا: (س و م) السیماء: علامت کے معنوں میں ہے۔

شَطۡـَٔہٗ: (ش ط ء) شطأ الزرع: کھیتی کی سوئی جو زمین سے نکل کر دونوں جانب پھیل جاتی ہے۔

فَاٰزَرَہٗ: (ا ز ر) الازر کے معنی قوت شدیدہ کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ: محمد ﷺ وہ رسول ہیں جو دین حق کے ساتھ مبعوث ہوئے ہیں۔ جس کے دین کو ابدیت اور دوام حاصل ہوگا اور یہ تمام ادیان پر غالب آئے گا۔

۲۔ وَ الَّذِیۡنَ مَعَہٗۤ: جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہیں۔ ایمان میں، تصدیق میں، اسلامی احکام کی تطبیق اور اس دستور کو عالم انسانیت کے لیے پیش کرنے میں۔ اس راہ میں جہاد کرنے اور مشقتیں برداشت کرنے اور دشمنوں کی طرف سے ظلم سہنے میں۔ رسول ﷺ اور ان کی معیت میں جو لوگ ہیں ان کے پانچ اہم اوصاف ایسے بیان ہوئے ہیں جن کی مثال دوسری آسمانی کتابوں میں بھی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے ہم عصر مسلمانوں میں سے جن ہستیوں میں یہ اوصاف موجود ہوں ان کے لیے یہ بہت بڑی فضیلت ہے۔ یہ ایسی فضیلت ہے جس کے لیے خود اللہ نے اجر عظیم کا وعدہ فرمایا ہے۔

یہ وعدہ ان لوگوں کے لیے ہے جو رسول ﷺ کی معیت کے مقام پر فائز ہوں۔ معیت اور صحبت میں فرق ہے۔ صحبت ایک جگہ ساتھ پائے جانے کو کہتے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام اپنے زندان کے دو غیر مسلم ساتھیوں کو یٰصَاحِبَیِ السِّجۡنِ اے میرے زندان کے ساتھیو کہا ہے۔ یہاں حضرت یوسف علیہ السلام انہیں صَاحِبَی میرے ساتھیو کہہ کر اپنی طرف نسبت دی ہے۔ اگرچہ وہ زندان میں رسول کے ساتھ اپنے اختیار سے نہیں تھے اس لیے صَاحِبَی کو کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ یہاں فضیلت کی بات نہیں ہو رہی بلکہ صَاحِبَی صادق آنے کی بات ہے۔ لہٰذا صحبت ایک جگہ ساتھ پائے جانے کو کہتے ہیں۔ چنانچہ ان ربی یصاحبنی نہیں کہتے بلکہ ان معی ربی، اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا کہتے ہیں چونکہ اللہ ہر قدم پر ساتھ ہے۔

وَطَآئِفَۃٌ مِّنَ الَّذِیۡنَ مَعَکَ ...۱ آپ کے ساتھ ایک جماعت بھی (تہجد کے لیے) کھڑی رہتی ہے۔ یہاں مَعَکَ کا لفظ اس لیے استعمال ہوا کہ ایک عمل میں ساتھ ہیں۔ اگر صرف وجود میں ساتھ ہوتے تو مَعَکَ کا لفظ استعمال نہ ہوتا۔

قابل توجہ یہ ہے کہ سورہ توبۃ آیت ۴۰ میں فرمایا: اِذۡ یَقُوۡلُ لِصَاحِبِہٖ لَا تَحۡزَنۡ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا ...۔ اس میں ساتھی کے لیے صَاحِبِہٖ اور اللہ کے لیے مَعَنَا کہا ہے یعنی رسول اللہ ﷺ کو ایک ساتھی کی صحبت اور اللہ کی معیت حاصل تھی۔

کن لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کی معیت حاصل ہے؟ ذیل میں ان کے اوصاف بیان ہوئے ہیں:

i۔ اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ: رسول اللہ ﷺ کی معیت میں رہنے والوں کی ایک اہم صفت یہ ہے کہ وہ کفار پر سخت گیر ہوں۔ دوسری آیت میں اس سخت گیری کی تشریح ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِہٖ صَفًّا کَاَنَّہُمۡ بُنۡیَانٌ مَّرۡصُوۡصٌ ۝ ۲	اللہ یقیناً ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی راہ میں صف بستہ ہوکر اس طرح لڑتے ہیں گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

لہٰذا وہ لوگ جو ہر میدان میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نہیں رہے اور جنہوں نے میدان جنگ میں ایک کافر کو بھی نہیں مارا مَعَہٗۤ اور اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ کے مصداق نہیں بن سکتے۔

ii۔ رُحَمَآءُ بَیۡنَہُمۡ: آپس میں مہربان ہیں۔ لہٰذا جو لوگ آپس میں نہایت تند مزاجی سے پیش آتے ہوں وہ اس آیت کے مصداق نہیں ہیں۔ اس کے مصداق وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں فرمایا:

ثُمَّ کَانَ مِنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ تَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ وَ تَوَاصَوۡا بِالۡمَرۡحَمَۃِ ۝ ۳	پھر یہ شخص ان لوگوں میں شامل ہوا جو ایمان لائے اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر کرنے کی نصیحت کی اور شفقت کرنے کی تلقین کی۔

iii۔ تَرٰىہُمۡ رُکَّعًا سُجَّدًا: آپ انہیں رکوع سجدہ کی حالت میں پائیں گے یعنی وہ کثرت سے نماز پڑھ رہے ہوں گے۔ چونکہ یہ دونوں الفاظ رُکَّعًا سُجَّدًا کثرت کے لیے استعمال ہوتے ہیں لہٰذا معمول کی نماز پڑھنے اور عبادت کرنے والے اس آیت میں شامل نہ ہوں گے۔ آیت میں وہ لوگ شامل ہیں جن کے بارے میں فرمایا:

وَ لَا تَطۡرُدِ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ رَبَّہُمۡ بِالۡغَدٰوۃِ وَ الۡعَشِیِّ یُرِیۡدُوۡنَ وَجۡہَہٗ ...۴	اور جو لوگ صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں اور اس کی خوشنودی چاہتے ہیں انہیں اپنے سے دور نہ کریں۔

iv۔ یَّبۡتَغُوۡنَ فَضۡلًا مِّنَ اللّٰہِ وَ رِضۡوَانًا: وہ اللہ کے فضل اور خوشنودی کے طالب ہوں گے۔ ان کا ہر

۱ ۷۳ مزمل: ۲۰ ۲ ۶۱ صف: ۴ ۳ ۹۰ بلد: ۱۷ ۴ ۶ انعام: ۵۲

عمل فضل اور خوشنودی خدا کے حصول کے لیے ہو گا دیگر اغراض کے لیے نہ ہو گا۔ یہ بھی ایک کڑی شرط ہے جو کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔

۷۔ سِیۡمَاهُمۡ فِیۡ وُجُوۡهِهِمۡ مِّنۡ اَثَرِ السُّجُوۡدِ: ان کے چہروں پر سجدوں کے آثار نمایاں ہیں جو کثرت سجود او عبادت کے آثار ہیں۔

تفسیر الکشاف میں ہے:

> دوعلی ہیں: علی بن الحسین زین العابدین اور علی بن عبد اللّٰہ بن عباس۔ ابو الاملاك ان دونوں کو ذو الثفنات کہتے ہیں چونکہ کثرت سجود کی وجہ سے مقامات سجدہ پر ایسے گٹے پڑے تھے جیسے اونٹ کے ٹیکنے کی جگہوں پر ہوتے ہیں۔

عبادت کے آثار بھی سب چہروں پر نہیں ہوتے۔ اس لیے مفسرین کو اَثَرِ السُّجُوۡدِ کی لمبی تاویلیں کرنا پڑیں۔ ملاحظہ ہو روح المعانی ذیل آیہ۔

۳۔ ذٰلِكَ مَثَلُهُمۡ فِی التَّوۡرٰىةِ: یہ ان ہستیوں کے اوصاف ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی معیت میں ہیں۔ یہ ایسے اوصاف ہیں جو ضرب المثل کی طرح آسمانی کتابوں میں مشہور ہیں۔

۴۔ كَزَرۡعٍ اَخۡرَجَ شَطۡـَٔهٗ: رسول ﷺ اور ان کے ساتھی اس کھیتی کی طرح ہیں جس نے ابتدائی مرحلے میں اپنی کونپل نکالی جو نہایت نازک ہوتی ہے۔ ممکن ہے مزرعۂ اسلام کے ابتدائی دور کی طرف اشارہ ہو جس میں اسلام کی کونپل کے اپنے وجود کا اظہار ہے اور ایک ایک کونپل کی حفاظت ہوتی رہی۔ اس دور میں حفاظت کرنے میں سب سے زیادہ حصہ حضرت ابو طالب علیہ السلام کا ہے۔

۵۔ فَاٰزَرَهٗ: اس کونپل کو تقویت پہنچائی یعنی کھیتی نے اس کونپل کو تقویت پہنچائی۔ التبیان میں فرمایا آزرہ کا فاعل شطا ہے یعنی کونپل نے کھیتی کو تقویت پہنچائی مگر ظاہراً فاعل زرع ہے چونکہ فَاسۡتَغۡلَظَ اور فَاسۡتَوٰی عَلٰی سُوۡقِهٖ کونپل کی تقویت سے متعلق ہے۔

۶۔ فَاسۡتَغۡلَظَ: اب نازک مرحلے سے گزر کر درشتی اور مضبوطی کے مرحلے میں آ گئی۔

۷۔ فَاسۡتَوٰی عَلٰی سُوۡقِهٖ: پھر اپنے تنے پر کھڑی ہو گئی۔ اب اسلام اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ دشمن سے اپنے آپ کو بچانے اور مقابلے کی پوزیشن میں آ گیا۔ اب اسلام ناقابل تسخیر ہو گیا۔

۸۔ یُعۡجِبُ الزُّرَّاعَ: اب یہ کھیت کاشت کرنے والوں کی پسند کا ہو گیا ہے۔ کھیت مطلوبہ شکل میں آ گیا اور ہری بھرا ہو گیا ہے۔ کاشت کرنے والی ذات رسول اللہ ﷺ کی ہے اور یہ کھیت اب اللہ اور رسول کی پسند کا ہو گیا:

وَلَسَوۡفَ یُعۡطِیۡکَ رَبُّکَ فَتَرۡضٰی ۝ [1] اور عنقریب آپ کا رب آپ کو اتنا عطا فرمائے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔

صاحب روح المعانی اس جگہ ایک قابل توجہ بات کرتے ہیں:

جب زرع سے نبی علیہ الصلوۃ والسلام مراد لیے جائیں تو علی کرم اللہ وجہہ کا اس کونپل کو قوت دینے میں دیگر خلفاء کی نسبت زیادہ حصہ ہے۔ شاید رسولؐ کے دشمن کافروں کے قتل میں رسولؐ کے دست و بازو بن کر علی کی جسمانی کمک کاری دیگر خلفاء کی کمک کاری سے زیادہ ہے۔ اس کے باوجود مسئلہ تفضیل میں اہل سنت کے محققین کا موقف مخدوش نہیں ہوتا۔ کما لا یخفی علی النبیه النبیل۔

اقول بل خفی علی کثیر من الذین زلّت اقدامهم عن سواء السبیل۔ چونکہ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ علی علیہ السلام کا کونپل کو قوت دینے اور دشمنان اسلام کو قتل کرنے میں دوسروں سے زیادہ حصہ ہے تو علی علیہ السلام پر غیظ اور ناخوش ہونے والے کا ایمان مخدوش ہو جاتا ہے۔

اس جگہ مرحوم پیر نصیر الدین گولڑہ شریف کے ایک شعر کا ذکر خارج از مناسب نہیں ہوگا:

دے کے بستر کر دیا تھا فیصلہ ہجرت کی شب
عقل کا اندھا ابھی ترتیب کے چکر میں ہے

۹۔ لِیَغِیۡظَ بِہِمُ الۡکُفَّارَ: تاکہ ان کے ذریعے کفار جلیں یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھیوں سے کفار غم و غصے میں جلتے رہیں کہ ان کی وجہ سے یہ کھیت ہرا بھرا کیوں ہے۔

واضح رہے اگر کسی شخص کی وجہ سے اس ہرے کھیت کی ہریالی یا فصل کو نقصان پہنچا ہو، اس وجہ سے کوئی اس پر ناراض ہو جائے تو یہ اس کے ایمان کی علامت ہے۔ ہاں! اگر کوئی شخص اس کھیت کے ہرے ہونے پر ناخوش ہے تو یہ کفر کی علامت ہے۔

---
[1] ۹۳ ضحیٰ: ۵

سُورَةُ الحُجرات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس سورۃ المبارکہ کا نام آیت اِنَّ الَّذِیۡنَ یُنَادُوۡنَکَ مِنۡ وَّرَآءِ الۡحُجُرٰتِ سے ماخوذ ہے۔

یہ سورۃ مدنی ہے۔ نزول سورۃ کے وقت مدینہ میں اسلامی معاشرہ کی تشکیل کے ابتدائی مراحل طے ہو رہے تھے۔ ایک غیر مہذب قوم کو آداب معاشرہ کی تعلیم دی جا رہی ہے:

۱۔ اس میں سب سے پہلے مقام رسالت اور احترام رسول کی اہمیت کا ذکر ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی آواز پر اپنی آواز بلند کرنے سے تمام نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں۔

۲۔ رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے آگے نہ بڑھنے،

۳۔ رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو عام لوگوں کی طرح نہ پکارنے،

۴۔ فاسق کی خبر بلا تحقیق قبول نہ کرنے تاکہ غلط خبروں کی وجہ سے معاشرے میں فساد نہ پھیلے، اور

۵۔ احترام آدمیت کہ کسی کا وقار مجروح کرنا جرم ہے، کے دروس ہیں وغیرہ۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بنام خدائے رحمن رحیم

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُقَدِّمُوۡا بَیۡنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ①

۱۔ اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو اور اللہ سے ڈرو، یقیناً اللہ خوب سننے والا، جاننے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا: قانون سازی اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کی اہم ترین شق ہے۔ اس میں مداخلت اللہ کی حاکمیت اعلیٰ میں مداخلت ہے:

اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ ...[1]		اقتدار تو صرف اللہ کا ہے۔

لہٰذا اللہ کی بندگی اسی میں ہے: حکم اللہ اور رسول کا ہو اور بندہ اس کی اتباع کرے۔

رسول ﷺ اللہ کی طرف سے قانون لانے والے ہیں لہٰذا رسول کے حکم سے آگے بڑھنے کا مطلب مداخلت فی الدین ہے۔

اللہ اور رسول سے آگے بڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ حکم خدا اور رسول کو پیچھے کیا جائے اور اپنا فیصلہ آگے کیا جائے۔

اس لیے جب تک کوئی حکم، قرآن و حدیث سے ثابت نہ ہو اسے اللہ اور رسول کی طرف نسبت دینا جائز نہیں ہے، نہ ہی اپنی طرف سے حکم بنانا جائز ہے۔

اثبات احکام کے بارے میں شیعہ امامیہ کا موقف نہایت مضبوط ہے۔ وہ اس طرح ہے:

i۔ کسی حکم کو ثابت کرنے کے لیے دلیل چاہیے اور دلیل صرف اور صرف یقین اور قطع ہے۔ جب تک کسی حکم پر یقین نہ ہو کہ یہ اللہ و رسول کی طرف سے ہے وہ ثابت نہیں ہوتا۔ یقین حاصل کرنے کے مصادر نصِ قرآن، سنت متواترہ اور اسلامی مسلمات و ثوابت ہیں۔

ii۔ اگر کسی حکم کو ثابت کرنے کے لیے یقینی دلیل نہیں ہے تو اس غیر یقینی دلیل کے دلیل ہونے پر یقین ہونا چاہیے۔ یعنی نص قرآن اور سنت متواترہ یہ کہے یہ دلیل ہے۔ جیسے خبر عادل، جس کے دلیل ہونے پر یقین ہے۔ بات یہاں بھی یقین پر منتہی ہوتی ہے۔

اگر کسی بات کے دلیل ہونے پر یقین حاصل نہ ہو تو شیعہ امامیہ کے نزدیک وہ دلیل نہیں ہے۔ جیسے قیاس، استحسان، مصالح، مرسلہ وغیرہ۔

۳۔ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ: اللہ کی حاکمیت اعلیٰ میں مداخلت کرنے کا نتیجہ نہایت سنگین ہوگا۔ اس لیے حکم فرمایا کہ اس سنگینی سے بچو۔

اہم نکات

۱۔ حکم خدا پر اپنی رائے مقدم کرنا اللہ کی حاکمیت اعلیٰ میں مداخلت ہے۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَرۡفَعُوۡۤا	۲۔ اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی کی آواز سے
اَصۡوَاتَکُمۡ فَوۡقَ صَوۡتِ النَّبِیِّ	بلند نہ کرو اور نبی کے ساتھ اونچی آواز سے بات
وَ لَا تَجۡہَرُوۡا لَہٗ بِالۡقَوۡلِ کَجَہۡرِ	نہ کرو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے

[1] ۱۲ یوسف: ۴۰

بَعۡضِکُمۡ لِبَعۡضٍ اَنۡ تَحۡبَطَ	اونچی آواز میں بات کرتے ہو کہیں تمہارے
اَعۡمَالُکُمۡ وَ اَنۡتُمۡ لَا تَشۡعُرُوۡنَ ۝۲	اعمال حبط ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

تفسیر آیات

ا۔ لَا تَرۡفَعُوۡۤا اَصۡوَاتَکُمۡ فَوۡقَ صَوۡتِ النَّبِیِّ: یہ صرف آداب کا حصہ ہی نہیں بلکہ ایک طرز عمل ہے جس کا سرا رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر ایمان کی نوعیت سے ملتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں بیٹھنے والوں کو گفتگو کے بارے میں دو باتوں کی تنبیہ کی ہے: پہلی بات یہ ہے کہ رسول ﷺ کی آواز سے اپنی آواز اونچی نہ کرو۔ دوسری بات یہ ہے کہ رسول ﷺ سے باتیں کرتے ہوئے اونچی آواز میں بات نہ کرو۔ ایک رفع الصوت منع ہے اور دوسرے جہر قول کی ممانعت ہے۔

ا۔ رفع الصوت کی صورت یہ ہوگی کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں سے گفتگو فرما رہے ہیں، اس وقت رسول اللہؐ کی آواز سے دیگر لوگوں کی آواز اونچی ہو۔ اس طرح آواز بلند کی جائے کہ رسول ﷺ کی آواز دب جائے۔

۲۔ اَنۡ تَحۡبَطَ اَعۡمَالُکُمۡ: اس میں مقام رسالت کے ساتھ بے اعتنائی ہے اور اگر بے اعتنائی کا شائبہ اس کے دل میں نہ ہوتا تو اللہ کے رسول کی آواز پر اپنی آواز اونچی نہ کرتا۔ یہ عمل اس کے ایمان کی نوعیت کا قہری نتیجہ ہے تبھی تو اس کے سارے اعمال برباد ہو جاتے ہیں۔

واضح رہے گناہ سے اعمال حبط نہیں ہوتے، ایمان مخدوش ہونے سے اعمال حبط ہوتے ہیں۔

۳۔ جہر قول کی صورت یہ ہوگی کہ نبی ﷺ کی محفل میں بیٹھ کر جب آپ سے کوئی بات کرے تو معمول سے زیادہ بلند آواز میں بات کرے۔ اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ رسول خدا ﷺ پر اس کا ایمان مخدوش ہے ورنہ رسولؐ کی شخصیت کا اس کی آواز پر اثر ہوتا اور اونچا ہو کر نہیں، دب کر بات کرتا۔

لہٰذا رسولؐ کی محفل میں رفع صوت اور جهر قول دونوں کا تعلق اس شخص کے ایمان کی نوعیت سے ہے۔

ذٰلِکَ بِاَنَّہُمُ اتَّبَعُوۡا مَاۤ اَسۡخَطَ اللّٰہَ وَ کَرِہُوۡا رِضۡوَانَہٗ فَاَحۡبَطَ اَعۡمَالَہُمۡ ؀ ۱	یہ اس لیے کہ انہوں نے اس بات کی پیروی کی جو اللہ کو ناراض کرتی ہے اور اللہ کی خوشنودی سے بیزاری اختیار کرتے ہیں لہٰذا اللہ نے ان کے اعمال حبط کر دیے.

بعض مفسرین آواز اونچی کرنے کو رسول اللہ ﷺ کو اذیت سے مشروط کرتے ہیں حالانکہ اذیت رسول ﷺ کا مسئلہ اپنی جگہ مسلم ہے:

---

۱ ۴۷ محمد: ۲۸

وَالَّذِیۡنَ یُؤۡذُوۡنَ رَسُوۡلَ اللّٰہِ لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ۝ [۱]		اور جو لوگ اللہ کے رسول کو اذیت دیتے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

اس آیت کا اطلاق بتاتا ہے کہ یہ اذیت کے عنوان کے تحت نہیں ہے بلکہ یہ عمل خود ایمان کی نوعیت سے مربوط ہے۔

بعض ایسے حالات بھی رونما ہوئے کہ رسول اللہ ﷺ کے وصال سے کچھ دیر پہلے آپؐ کی مجلس میں لوگوں نے اس قدر شور مچایا کہ رسول اللہ ﷺ کو یہ کہنا پڑا:

قوموا عنی فما ینبغی لنبی ان یکون عندہ ھذا التنازع۔ [۲]		اٹھ جاؤ میرے پاس سے۔ کسی نبی کے لیے مناسب نہیں ہے کہ اس کے پاس اس قسم کا نزاع برپا ہو۔

اہم نکات

۱۔ انسان کا عمل اس کے ایمان کا آئینہ ہے۔

۲۔ مقام رسولؐ کے احترام کی نوعیت سے ایمان کی نوعیت کا تعین ہوتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَغُضُّوۡنَ اَصۡوَاتَہُمۡ عِنۡدَ رَسُوۡلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ امۡتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوۡبَہُمۡ لِلتَّقۡوٰی ؕ لَہُمۡ مَّغۡفِرَۃٌ وَّ اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ ۝ ۳		۳۔ جو لوگ اللہ کے رسول کے سامنے دھیمی آواز میں بات کرتے ہیں بلاشبہ یہی وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ نے تقویٰ کے لیے آزما لیے ہیں ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ یَغُضُّوۡنَ اَصۡوَاتَہُمۡ: جو لوگ رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں دھیمی آواز سے بات کرتے ہیں ان کے قلب و شعور پر رسول اللہ ﷺ کی عظمت اور شوکت حاکم ہے جو ایمان بالرسول کی علامت اور ایمان باللہ کا نتیجہ ہے۔

۲۔ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ امۡتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوۡبَہُمۡ: یہ اہل ایمان وہ لوگ ہیں جن کے دلوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی آزمائشوں میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اس آزمائش کا تعلق تقویٰ سے ہے۔ تقویٰ وقایۃ سے، بچنے کے معنی میں ہے۔ پس یہ ایمان سے مالا مال دل، اپنے دل کو ایمان کے منافی تمام باتوں سے بچانے کے سلسلے میں ہر آزمائش میں کامیاب رہا ہے۔

۱؎ ۹ توبۃ: ۶۱		۲؎ صحیح بخاری و صحیح مسلم

۳۔ لَهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ وَّاَجۡرٌ عَظِيۡمٌ : لہٰذا ان کے اعمال حبط نہیں، قبول ہوں گے۔ قبول اعمال کے دو نتائج ہیں: ایک مغفرت، دوسرا اجر عظیم ہے۔

جس طرح حیات رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں آپؐ کی مجلس میں شور مچانا جائز نہیں ہے، بعد از وصال قبر مطہر کے نزدیک شور مچانا خلاف ادب ہے۔ چنانچہ اصول کافی میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے: جب حضرت عائشہ نے حضرت امام حسن علیہ السلام کو قبر رسول کے جوار میں دفن کرنے سے روکا تو اس وقت آوازیں بلند ہوئیں۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے آیہ لَا تَرۡفَعُوۡۤا اَصۡوَاتَكُمۡ سے استدلال فرمایا۔ قبر رسول کے پاس شور مچانا جائز نہیں ہے۔[1]

اہم نکات

۱۔ جس دل نے تقویٰ کا امتحان دیا ہو، زبان اور آواز اس کے ایمان کی گواہی دیتی ہیں۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ يُنَادُوۡنَكَ مِنۡ وَّرَآءِ الۡحُجُرٰتِ اَكۡثَرُهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ ۝

۴۔ جو لوگ آپ کو حجروں کے پیچھے سے پکارتے ہیں بلا شبہ ان میں سے اکثر عقل نہیں رکھتے۔

وَلَوۡ اَنَّهُمۡ صَبَرُوۡا حَتّٰى تَخۡرُجَ اِلَيۡهِمۡ لَكَانَ خَيۡرًا لَّهُمۡ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ۝

۵۔ اور اگر یہ لوگ صبر کرتے یہاں تک کہ آپ ان کی طرف نکل آتے تو ان کے لیے بہتر تھا اور اللہ بڑا مغفرت کرنے والا خوب رحم کرنے والا ہے۔

تشریح کلمات

الۡحُجُرٰتِ: (ح ج ر) حجرہ کی جمع۔ کمروں کو کہتے ہیں۔ اس سے مراد ازواج رسولؐ کے مکانات ہیں جو مسجد کے گرد تھے۔

تفسیر آیات

روایات میں آیا ہے کہ یہ حرکت بنی غنیم کے لوگوں سے سرزد ہوئی۔ ان کے ستر افراد پر مشتمل وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملنے کے لیے آیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ لوگوں کی دسترس میں ہوتے تھے سوائے تھوڑے اوقات کے جنہیں آپؐ اپنی نجی زندگی یا آرام کے لیے مختص رکھتے تھے۔ یہ لوگ اسی وقت پہنچ جاتے

---

[1] الکافی ۱: ۳۰۳ ح ۳

ہیں اور حجرات کے باہر سے آواز دیتے ہیں: یامحمد! یامحمد! اخرج الینا۔ اے محمد! اے محمد! باہر نکلیں۔
روایات کے مطابق اس قسم کے متعدد واقعات ہوئے جنہیں رسول خدا ﷺ اپنے حلم و برد باری کے تحت متحمل فرماتے تھے لیکن اس بار اللہ تعالیٰ نے اس ناشائستہ حرکت کی سرزنش کرتے ہوئے آداب سکھائے کہ آپ ﷺ کو اس طرح پکارا نہ کریں بلکہ صبر کریں تاکہ خود ملاقات کے لیے باہر تشریف لائیں۔
۲۔ اَكۡثَرُهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ: ممکن ہے ''اکثر'' اس لیے فرمایا ہو کہ ان میں ایک بھی عاقل اور مہذب ہے تو وہ لَا يَعۡقِلُوۡنَ میں شامل نہ ہو۔ لَا يَعۡقِلُوۡنَ عقل و تہذیب سے کام نہیں لیتے جو سمجھدار انسان کا عمل ہوتا ہے اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ کس درجے کے انسان سے بات ہو رہی ہے۔

اہم نکات

۱۔ تہذیب و آداب کا تعلق عقل سے ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ جَآءَكُمۡ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوۡۤا اَنۡ تُصِيۡبُوۡا قَوۡمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصۡبِحُوۡا عَلٰى مَا فَعَلۡتُمۡ نٰدِمِيۡنَ ۝

۶۔ اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تم تحقیق کر لیا کرو، کہیں نادانی میں تم کسی قوم کو نقصان پہنچا دو پھر تمہیں اپنے کیے پر نادم ہونا پڑے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنۡ جَآءَكُمۡ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ: فاسق، فسق سے ہے جو چوہے کے اپنے بل سے نکلنے اور پھل کے اپنے چھلکے سے نکلنے کو کہتے ہیں اور مسلمان جو شرعی حدود سے نکلتا ہے اسے فاسق کہتے ہیں۔
شان نزول کے بارے میں اکثر مفسرین مورخین کا اتفاق ہے کہ یہ آیت ولید بن عقبہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ واقعہ یہ ہے:

> رسول اللہ ﷺ نے ولید بن عقبہ کو قبیلہ بنی مصطلق سے زکوۃ وصول کرنے کے لیے بھیجا۔ یہ ان کے نزدیک پہنچ کر خوف کے مارے واپس آ گیا (کیونکہ زمان جاہلیت میں ولید اور بنی مصطلق کے درمیان دشمنی تھی۔) ولید نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا: وہ زکوۃ دینے سے انکار کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ رنجیدہ ہوئے اور ان کے ساتھ جنگ کرنے کا ارادہ کر لیا اور بنی مصطلق سے فرمایا:
> لتنتھن او لا بعثن الیکم رجلا کنفسی تم باز آ جاؤ ورنہ میں ایسے فرد کو تمہاری

یقاتل مقاتلتکم و یسبی ذراریکم۔ ثم ضرب یدہ علی کتف علی رضی اللّٰہ عنہ۔[۱]

طرف روانہ کروں گا جو میرے نفس کی طرح ہے جو تمہارے لڑنے والوں سے لڑے گا اور تمہارے بچوں کو قیدی بنائے گا۔ یہ کہہ کر حضرت علی علیہ السلام کے کاندھوں پر ہاتھ رکھا۔

اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی اور حکم دیا کہ فاسق کی خبر کا اعتبار نہ کرو۔ حقیقت حال کی چھان بین کرو۔

ولید بن عقبہ حضرت عثمان کا مادری بھائی ہے۔ اس نے فتح مکہ کے بعد ایمان کا اظہار کیا۔ سعد بن ابی وقاص کے بعد اسے عثمان نے کوفے کا گورنر بنایا۔ اس دوران اس نے ایک دفعہ صبح کی نماز نشے کی حالت میں چار رکعت پڑھا دی اور لوگوں سے کہا: مزید اضافہ کروں؟ اور محراب میں شراب کی قے کی۔ لوگوں نے اسے کنکریاں مار کر مسجد سے بھگا دیا۔ شراب نوشی ثابت ہونے پر اس پر حد جاری کر دی گئی۔[۲]

ولید کو قرآن مجید میں دو جگہ فاسق کہا گیا ہے: ایک اس آیت میں اور دوسری جگہ سورہ سجدہ آیت ۱۸ میں:

اَفَمَنۡ کَانَ مُؤۡمِنًا کَمَنۡ کَانَ فَاسِقًا ؕ لَا یَسۡتَوٗنَ ۞ بھلا جو مومن ہو وہ فاسق کی طرح ہو سکتا ہے؟ یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔

واحدی، ابن اسحاق، ابن جریر، ابن عدی، ابن مردویہ، خطیب، ابن عساکر، عطاء بن یسار، ابن ابی حاتم، سدی اور عبد بن ابی لیلی وغیرہ نے متعدد طرق سے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ ولید نے علی بن ابی طالب (علیہ السلام) سے کہا:

میں آپ سے بہتر نیزہ زن، بولنے میں زباں دراز اور لشکر میں زیادہ نمایاں ہوں۔

علی علیہ السلام نے فرمایا:

اسکت فانما انت فاسق۔ خاموش ہو جا، تو تو بس فاسق ہے۔

اس پر یہ آیت نازل ہوئی: اَفَمَنۡ کَانَ مُؤۡمِنًا کَمَنۡ کَانَ فَاسِقًا ؕ لَا یَسۡتَوٗنَ ۔[۳]

اس واقعہ نے عصر رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم میں شہرت حاصل کی۔ چنانچہ حسان بن ثابت نے اس موقع پر شعر بھی کہا ہے:

انزل اللّٰہ والکتاب عزیز — فی علی و فی الولید قرآنا
فتبوأ الولید من ذاك فسقاً — وعلی مبوأ ایمانا
لیس من کان مؤمنا عرف اللّٰہ — کمن کان فاسقا خواناً
سوف یجزی الولید خزیا و ناراً — و علی لا شك یجزی جنانا[۴]

[۱] الکشاف ذیل آیہ [۲] الکامل سن ۳۰ ہجری کے حالات و دیگر کتب تاریخ و سیرت
[۳] الدر المنثور ۵: ۱۷۷ [۴] بحار ۳۸: ۲۳۵

ابن عبد البر نے الاستیعاب میں کہا ہے:

میرے علم کے مطابق اہل علم میں اس بات پر کوئی اختلاف نہیں کہ آیہ اِنۡ جَآءَکُمۡ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ... ولید بن عقبۃ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

اگرچہ صاحب التحریر و التنویر کو اس حقیقت پر روشنی کی کمی لاحق ہوئی اور ولید کی صف میں بیٹھ گئے۔ اس کا دفاع کرتے ہوئے کہا: وکان ذا خلق و مروءۃ۔[1] اور وہ اخلاق اور مروت کا حامل تھا۔

روح المعانی میں اس آیت کے ذیل لکھا ہے:

اس آیت سے استدلال کیا گیا ہے کہ اصحاب رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے بعض غیر عادل بھی ہیں چونکہ سبب نزول میں ولید بن عقبہ یقیناً داخل ہے اور بالاتفاق صحابی بھی ہے۔ لہٰذا اس آیت سے وہ قول رد ہو جاتا ہے جو کہتے ہیں: تمام اصحاب عادل ہیں۔ کسی روایت اور شہادت میں ان کی عدالت ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس مسئلے میں یہ ایک قول ہے۔ علمائے سلف و خلف میں سے اکثر نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے: اصحاب، غیر اصحاب کی طرح ہیں۔ لہٰذا روایت اور شہادت میں اصحاب کی عدالت ثابت کرنا ضروری ہے مگر وہ حضرات جن کی عدالت یقینی ہے۔ جیسے شیخین۔

تیسرا قول یہ ہے: قتل عثمان رضی اللہ عنہ تک سب عادل ہیں۔ قتل عثمان کے بارے میں اصحاب کی عدالت کے بارے میں تحقیق ہونی چاہیے چونکہ قتل عثمان کے بعد فتنہ واقع ہو گیا اور کچھ اصحاب نے اس فتنے سے پرہیز کیا ہے۔

چوتھا قول یہ ہے: تمام اصحاب عادل ہیں سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے علی کرم اللہ وجہ سے جنگ کی ہے۔ چونکہ امام حق سے خروج اختیار کرنے والے فاسق ہو جاتے ہیں۔ معتزلہ نے یہ قول اختیار کیا ہے....ا نتھی

ہم نے اس سورہ مبارکہ کی آیت ایک کے ذیل میں لکھا ہے کہ حکم شرعی کو ثابت کرنے کے لیے یقینی دلیل ہونی چاہیے یا ایسی دلیل ہونی چاہیے جس کے دلیل ہونے کا یقین ہو۔ خبر فاسق، کسی خبر کی دلیل نہیں بن سکتی۔

اصول فقہ میں ایک بحث ہے کہ صفت کا مفہوم نہیں ہوتا۔ یعنی اگر کسی حکم کو صفت کے ساتھ بیان کیا جائے تو اس صفت کے نہ ہونے سے حکم کے نہ ہونے کا انکشاف نہیں ہوتا۔ مثلاً کہا جائے: عالم گھر میں آ جائے تو کھانا کھلاؤ، اس کا مفہوم نہیں بنتا۔ کیا غیر عالم گھر میں آ جائے تو کھانا کھلانا لازم نہیں ہے؟ بلکہ اس جملے سے عالم کو کھانا کھلانے کا حکم ثابت ہوتا ہے۔ غیر عالم کا حکم اس جملے میں نہیں ہے۔ نہ کھلانے کا حکم ہے،

---

[1] التحریر و التنویر ۲۶: ۱۹۲

نہ ہی نہ کھلانے کا حکم ہے۔ دوسری دلیل سے اس کا حکم تلاش کرنا ہوگا۔

اہم نکات

۱۔ فاسق، خواہ صحابی کیوں نہ ہو، معاشرے میں کسی امر کی ذمہ داری کا اہل نہیں ہے۔

وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ فِیۡکُمۡ رَسُوۡلَ اللّٰہِ ؕ لَوۡ یُطِیۡعُکُمۡ فِیۡ کَثِیۡرٍ مِّنَ الۡاَمۡرِ لَعَنِتُّمۡ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ حَبَّبَ اِلَیۡکُمُ الۡاِیۡمَانَ وَ زَیَّنَہٗ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ وَ کَرَّہَ اِلَیۡکُمُ الۡکُفۡرَ وَ الۡفُسُوۡقَ وَ الۡعِصۡیَانَ ؕ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الرّٰشِدُوۡنَ ۙ﴿۷﴾

۷۔ اور تمہیں علم ہونا چاہیے کہ اللہ کے رسول تمہارے درمیان موجود ہیں، اگر بہت سے معاملات میں وہ تمہاری بات مان لیں تو تم خود مشکل میں پڑ جاؤ گے لیکن اللہ تعالیٰ نے ایمان کو تمہارے لیے محبوب بنا دیا اور اسے تمہارے دلوں میں مزین فرمایا اور کفر اور فسق اور نافرمانی کو تمہارے نزدیک ناپسندیدہ بنا دیا، یہی لوگ راہ راست پر ہیں،

فَضۡلًا مِّنَ اللّٰہِ وَ نِعۡمَۃً ؕ وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ ﴿۸﴾

۸۔ اللہ کی طرف سے فضل اور نعمت کے طور پر اور اللہ خوب جاننے والا، حکمت والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ فِیۡکُمۡ رَسُوۡلَ اللّٰہِ: ایک تنبیہی اور اعتراض کے لہجے میں فرمایا: تمہیں اس بات کا علم اور اتنا شعور ہونا چاہیے کہ اللہ کے رسولؐ تمہارے درمیان ہیں۔ تم اللہ کے رسولؐ سے ایسی توقع رکھتے ہو جیسی ایک عام آدمی سے۔ عام آدمی لوگوں کی باتوں میں آتے ہیں۔

یہ سرزنش اس بات پر کی گئی کہ کچھ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے یہ اصرار کیا تھا کہ ولید بن عقبہ کی بات مان لینا چاہیے اور بنی مصطلق پر حملہ کر دینا چاہیے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ان کی بات نہیں مان رہے تھے۔

۲۔ لَوۡ یُطِیۡعُکُمۡ فِیۡ کَثِیۡرٍ مِّنَ الۡاَمۡرِ لَعَنِتُّمۡ: اگر اللہ کے رسولؐ تمہاری اطاعت کریں تو تم مشکل یا ہلاکت میں پڑ جاؤ گے۔ اطاعت تو اعلیٰ کی ہوتی ہے۔ یہاں رسولؐ کے لیے اطاعت اس لیے استعمال ہوا کہ جس پر اطاعت لازم ہوتی ہے وہ اپنی سوچ نہیں سوچتا۔ رسولؐ اگر تمہاری بات مان لیں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ رسول اپنی سوچ نہ سوچیں اور تمہاری بات مان لیں۔

اس جملے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کچھ اصحاب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اپنی خام رائے پر

چلانا چاہتے تھے جو رسول اللہ ﷺ کی شان میں ایک قسم کی گستاخی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ لوگ صائب مشورہ دینے والے نہ تھے۔ ایسی بات پر اصرار کر رہے تھے جس میں مسلمانوں کی ہلاکت ہے۔ تیسری بات یہ بھی سامنے آتی ہے خود رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ایسے لوگ موجود تھے جو ولید بن عقبہ جیسے آدمی کے حامی تھے اور خود رسول اللہ ﷺ سے اختلاف کر رہے تھے تو رسول اللہ ﷺ کے بعد کیا ممکن نہیں ہے؟

۳۔ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ: لیکن کچھ لوگ ایسے بھی درمیان میں ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے ساتھ آزمایا ہے۔ وہ رسولؐ سے ایسی توقع نہیں رکھتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے حسن نیت کی وجہ سے اللہ نے ان کے دلوں میں ایمان کو محبوب اور وَزَيَّنَهٗ خوشنما بنا دیا اس لیے ایمان کے منافی عمل ان سے سرزد نہیں ہوتا۔ وہ اس گروہ کے علاوہ باقی اصحاب رسولؐ تھے۔

۴۔ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ: اور تین باتوں کو ان کے لیے ناپسندیدہ بنا دیا: کفر، فسوق اور عصیان و نافرمانی۔ ان تین لفظوں سے ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ جو لوگ رسول ﷺ کو اپنا مطیع بنانا چاہتے تھے وہ ایمان کے درجے پر فائز نہ تھے۔ وہ فسق کو ترجیح دیتے تھے۔ اس لیے ولید بن عقبہ جیسے ایک فاسق کی حمایت کر رہے تھے اور عصیان پسند لوگ تھے۔ رسولؐ کی فرماں برداری کی جگہ نافرمانی کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ فسق سے مراد روایت کے مطابق جھوٹ ہے۔

لیکن ان لوگوں میں ایمان محبوب اور کفر و فسوق و عصیان مکروہ ہے۔

۵۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ: یہ لوگ، جنہیں لفظ لٰكِنَّ کے ساتھ استثنا کیا ہے راہ راست پر ہیں۔ وہ آپ ﷺ کی اطاعت کرتے ہیں، آپ کو اپنے زیر اثر لانا نہیں چاہتے بلکہ وہ آپ کے زیر اثر رہتے ہیں۔

۶۔ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً: یہ ان لوگوں پر اللہ کا فضل اور نعمت ہے کہ انہیں اللہ نے ایمان سے نوازا اور دیگر بری صفات سے بچایا ہے۔

اہم نکات

۱۔ رسولؐ کی اطاعت ایمان دوستی ہے۔ اور رسول ﷺ کو اپنے زیر اثر لانے کی کوشش کفر، فسوق اور عصیان ہے۔

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى

۹۔ اور اگر مومنین کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرا دو، پھر اگر ان دونوں میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے

اَمۡرِ اللّٰہِ ۚ فَاِنۡ فَآءَتۡ فَاَصۡلِحُوۡا بَیۡنَہُمَا بِالۡعَدۡلِ وَ اَقۡسِطُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُقۡسِطِیۡنَ ۟﴿۹﴾

حکم کی طرف لوٹ آئے، پھر اگر وہ لوٹ آئے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کرو، یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِنۡ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ: اگر دو گروہوں میں تصادم ہو جائے اور تصادم کے وقت دونوں گروہ مومن ہوں۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا لڑائی شروع ہونے کے بعد دونوں مومن رہ گئے ہوں۔ ہو سکتا ہے دونوں مومن نہ رہیں یا ایک مومن نہ رہے۔

۲۔ فَاَصۡلِحُوۡا بَیۡنَہُمَا: خطاب ان لوگوں سے ہے جو اس لڑائی میں فریق نہیں ہیں۔ ان پر فرض ہے وہ اس لڑائی میں تماشا بین نہ بنیں بلکہ لڑائی بن بند کرا کر آپس میں مصالحت کی کوشش کریں اور وجہ نزاع معلوم کر کے، فریقین کا موقف سمجھ کر مصالحت کی کوشش کریں۔ اس صورت میں ان کی ذمہ داری مصالحت ہے۔ ان دونوں متصادم فریقوں کی کمک کرنا یا ایک کا ساتھ دینا نہیں ہے۔

۳۔ فَاِنۡۢ بَغَتۡ اِحۡدٰىہُمَا عَلَی الۡاُخۡرٰی: اگر ان دونوں میں سے ایک گروہ مصالحت کے لیے آمادہ نہ ہو اور مصالحت کی کوششیں ناکام ہو جائیں تو ان دونوں میں باغی گروہ کی تشخیص دینا بھی ایک فریضہ ہے۔ باغی کی تشخیص کے بعد اس کے خلاف لڑنا بھی فرض ہے چونکہ یہ باغی مفسد ہے اور جو فریق حق پر ہے اس کا ساتھ دیں۔

باغی کے خلاف لڑنے کا چونکہ اللہ نے حکم دیا ہے لہٰذا اس کے خلاف لڑنا جہاد فی سبیل اللہ ہے بلکہ اس جہاد کو بعض فقہاء نے جہاد سے بھی افضل قرار دیا ہے۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام اور حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

... وَ الۡقِتَالُ قِتَالَانِ قِتَالُ الۡفِئَۃِ الۡکَافِرَۃِ حَتّٰی یُسۡلِمُوا وَ قِتَالُ الۡفِئَۃِ الۡبَاغِیَۃِ حَتّٰی یَفِیئُوا۔[۱]

قتال کی دو قسمیں ہیں: کافر گروہ کے خلاف قتال اسلام قبول کرنے تک۔ باغی گروہ کے خلاف قتال بغاوت چھوڑنے تک۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے جب آپ کے پاس علی علیہ السلام سے لڑنے والوں کا ذکر ہوا:

اِنَّہُمۡ اَعۡظَمُ جُرۡمًا مِمَّنۡ حَارَبَ رَسُوۡلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قِیۡلَ لَہُ وَ

یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لڑنے والوں سے زیادہ مجرم ہیں عرض ہوا فرزند رسولؐ یہ کیسے؟ فرمایا: کیونکہ

---

[۱] الوسائل ۱۵: ۲۸

كَيْفَ ذٰلِكَ يَا ابْنَ رَسُولِ اللّٰهِ قَالَ: لِاَنَّ اُولٰئِكَ كَانُوا جَاهِلِيَّةً وَ هٰؤُلَاءِ قَرَءُوا الْقُرْآنَ وَ عَرَفُوا فَضْلَ اَهْلِ الْفَضْلِ فَاَتَوْا مَا اَتَوْا بَعْدَ الْبَصِيرَةِ۔[1]

وہ لوگ جاہلیت میں تھے مگر ان لوگوں نے قرآن پڑھا ہے۔ اہل فضل کے فضل کو پہچانا اس کے بعد جو کچھ کیا وہ بصیرت کے باوجود کیا۔

جنگ صفین میں باغیوں کے خلاف جنگ میں حضرت عمار یاسر بھی شریک تھے جن کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے پیشگوئی فرمائی:

ويح عمار تقتله الفئة الباغية.[2] ہائے عمار! جسے باغی گروہ قتل کرے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی یہ حدیث بھی مشہور ہے فرمایا:

قاتل عمار و سالبه في النار۔[3] عمار کا قاتل اور اسے لوٹنے والا آتش میں ہیں۔

لیکن نص صریح رسولؐ کے مقابلے میں یہ رائے قائم کرنا سنت رسولؐ کے خلاف کس قدر جسارت ہے جو کہتے ہیں: عمار کے قاتل ابوالعادیة سے اجتہادی غلطی ہوگئی جس کا اسے ایک ثواب ملے گا۔ گویا ان کے ہاں ثواب سے مراد آتش ہے یا آتش سے مراد ثواب ہے۔ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ۔

واضح رہے قاتل عمار، ابو العاویة بدری ہے، بیعت رضوان میں شامل تھا اور حدیث قاتل عمار و سالبه فی النار کے صحیح السند ہونے کے بارے میں ملاحظہ ہو البانی کی کتاب سلسلة الاحاديث الصحيحة ۵: ۱۸، طبع ریاض۔

۴۔ فَاِنۡ فَآءَتۡ فَاَصۡلِحُوۡا بَیۡنَہُمَا: اگر یہ دونوں گروہ قتال اور بغاوت سے باز آ جائیں تو ان کے درمیان عدل و انصاف کے ساتھ صلح کرا دو۔ جس نے زیادتی کی ہے اسے سزا دو، تاوان، دیت وغیر کی شکل میں۔

۵۔ وَ اَقۡسِطُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُقۡسِطِیۡنَ: قسط و عدل ایسی چیز ہے جس پر تمام احکام شریعت قائم و استوار ہیں۔ جہاں جس حکم سے عدل و انصاف نہیں ملتا وہ حکم سرے سے اٹھ جاتا ہے اور عدل کو مقدم کیا جاتا ہے۔ ملکیت کا حق اسلام نے دیا ہے اگر اس ملکیت سے کسی اور کے ساتھ ناانصافی نہیں ہوتی ہے۔ آپ اپنی زمین پر درخت لگا سکتے ہیں۔ اگر یہ درخت کسی کے لیے باعث ضرر ہے تو آپ اس درخت کے مالک نہیں رہ سکتے۔

اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ اِخۡوَۃٌ فَاَصۡلِحُوۡا ۱۰۔ مومنین تو بس آپس میں بھائی بھائی ہیں، لہٰذا

---

[1] مستدرك الوسائل ۱۱: ٦٦ [2] صحيح مسلم ج ۴ ص ۲۳۶ باب ۱۸ باب لا تقوم الساعة حتى يمر الرجل۔ صحيح بخاری باب ٦٣ باب التعاون في بناء المسجد

[3] المستدرك على الصحيحين ۳: ۴۳۷ ذكر مناقب عمار بن ياسر ح ۵٦٦۱۔

بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿١٠﴾

تم لوگ اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کرا دو اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ: ایمان کا رشتہ ایک آفاقی رشتہ ہے۔ اس آفاقی رشتہ اخوت سے منسلک ہونے سے ایک عالمی برادری قائم ہو جاتی ہے۔ اگر مسلمان اس عالمی برادری سے فائدہ اٹھاتے تو کرۂ ارض کی تقدیر کچھ اور ہوتی۔ یہ عالم گیریت (universalism) کا اسلامی تصور ہے جو ایمان پر قائم ہے۔

اسلامی اخوت کا تصور وہ نہیں ہے جسے دوسرے لوگ بھی عالمی برادری وغیرہ کے نام سے یاد کرتے ہیں بلکہ یہاں اخوت کا صحیح معنوں میں مطلب دو انسانوں کے درمیان موجود مضبوط و نزدیک ترین رشتہ ہے۔ یہ صرف ایک تعبیر یا لفظی تعارف نہیں ہے بلکہ یہ رشتہ ایک حقیقت ہے۔ حدیث میں ہے:

... لِاَنَّ الْمُؤْمِنُ اَخُ الْمُؤْمِنِ لِاَبِیهِ وَ اُمِّهِ...[۱]

چونکہ مومن دوسرے مؤمن کا ماں باپ دونوں طرف سے بھائی ہے۔

اس حقیقت پر بہت سے آثار و نتائج مترتب ہوتے ہیں اور مومن بھائی کے ذمے دوسرے مومن بھائی کے وہ حقوق ہیں جنہیں ائمہ علیہم السلام بیان کرنے سے اس لیے تأمل کرتے تھے کہ ان حقوق کا علم ہو جانے کے بعد کہیں ادا نہ ہوں تو ذمہ داری آ جاتی ہے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی روایت ہے:

مَا عُبِدَ اللّٰهُ بِشَیْءٍ اَفْضَلَ مِنْ اَدَاءِ حَقِّ الْمُؤْمِنِ۔[۲]

مومن کا حق ادا کرنے سے بہتر کسی اور چیز سے اللہ کی بندگی نہیں کی گئی۔

متعدد روایات میں مومن برادر کے حقوق کا ذکر ہوا ہے۔ ان میں سے چند ایک کا ذکر کرتے ہیں:

i۔ اسے بھوکا نہ رکھنا۔

ii۔ اسے لباس کی ضرورت ہو تو لباس فراہم کرنا۔

iii۔ اس کی پریشانی دور کرنا۔

iv۔ اس کا قرض ادا کرنا۔

v۔ فوت ہونے کی صورت میں اس کے بال بچوں کی سرپرستی کرنا۔[۳]

vi۔ ظالم کے خلاف اس کی مدد کرنا۔

vii۔ اس کے غائب ہونے کی صورت میں مسلمانوں میں تقسیم ہونے والی چیزیں اس کی طرف

---

۱ مستدرك الوسائل ۸۵: ۲۳۱ ۲ الکافی ۲: ۱۷۰ ۳ الکافی ۲: ۱۶۹

سے وصول کرنا۔

viii۔ اس کی مدد نہ چھوڑنا۔

ix۔ اس کے لیے اف نہ کرنا۔[1]

x۔ مریض ہو تو عیادت کرنا۔

xi۔ اس کی دعوت قبول کرنا۔

xii۔ اسے چھینک آنے کی صورت میں دعا دینا۔[2]

xiii۔ اس کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دینا۔[3]

iv۔ بیٹھنے کے لیے اسے جگہ دینا۔

xv۔ وہ آپ سے بات کر رہا ہو تو اس کی طرف توجہ دینا۔

xvi۔ جب اٹھ کر جانا چاہے، خدا حافظی کرنا۔[4]

xvii۔ اگر آپ کے پاس خادم ہو، اس کے پاس نہ ہو تو اپنا خادم اس کی خدمت گزاری کے لیے بھیجنا۔[5]

۲۔ وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ: مصالحت کی ذمہ داری نبھاتے ہوئے تقویٰ کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ کسی فریق کی حق تلفی نہ ہو۔ نہ کسی فریق کی جانبداری ہو۔ عدل و انصاف کے علاوہ دیگر امور کا اس میں دخل نہ ہو۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا یَسۡخَرۡ قَوۡمٌ مِّنۡ قَوۡمٍ عَسٰۤی اَنۡ یَّکُوۡنُوۡا خَیۡرًا مِّنۡہُمۡ وَ لَا نِسَآءٌ مِّنۡ نِّسَآءٍ عَسٰۤی اَنۡ یَّکُنَّ خَیۡرًا مِّنۡہُنَّ ۚ وَ لَا تَلۡمِزُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ وَ لَا تَنَابَزُوۡا بِالۡاَلۡقَابِ ؕ بِئۡسَ الِاسۡمُ الۡفُسُوۡقُ بَعۡدَ الۡاِیۡمَانِ ۚ وَ مَنۡ لَّمۡ یَتُبۡ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۱۱﴾	۱۱۔ اے ایمان والو! کوئی قوم کسی قوم سے تمسخر نہ کرے، ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ ان سے بہتر ہوں اور نہ ہی عورتیں عورتوں کا (مذاق اڑائیں) ممکن ہے کہ یہ ان سے بہتر ہوں اور آپس میں ایک دوسرے پر عیب نہ لگایا کرو اور ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد نہ کیا کرو، ایمان لانے کے بعد برا نام لینا نامناسب ہے اور جو لوگ باز نہیں آتے پس وہی لوگ ظالم ہیں۔

---

[1] الکافی ۲: ۱۷۱　[2] الکافی ۲: ۶۵۴　[3] مستدرک الوسائل ۷: ۲۱۲　[4] مستدرک الوسائل ۸: ۳۲۰　[5] مستدرک الوسائل ۹: ۴۸

تشریح کلمات

تَلۡمِزُوۡا: (ل م ز) لمز کے معنی کسی کی غیبت اور عیب چینی کرنے کے ہیں۔

تَنَابَزُوۡا: (ن ب ز) نبز کے معنی کسی کو برے نام سے پکارنے کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا یَسۡخَرۡ قَوۡمٌ: مومنین کے درمیان ایمان کا ایک مضبوط رشتہ قائم ہونے کے بیان کے بعد ایک دوسرے کے حقوق و آداب کا بیان ہے۔ قرآن ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کی بات کر رہا ہے جس میں ہر قوم، نسل اور فرد کو احترام حاصل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کو تخلیق اور تقنین دونوں میں عزت و تکریم سے نوازا ہے۔ تخلیق میں اسے اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ [1] اور وَّصَوَّرَکُمۡ فَاَحۡسَنَ صُوَرَکُمۡ [2] کی بہترین شکل و صورت میں بنایا۔ تقنین میں احترام آدمیت اور ہتک عزت کے بارے میں اسلامی تعلیمات میں ایک مفصل اور جامع قانون بنایا، جس کے تحت ہر وہ عمل اور بات جس سے کسی مسلمان کا وقار مجروح ہوتا ہو حرام اور جرم قرار پایا۔

اس سلسلے میں کتاب و سنت میں مذکور قوانین سے ایک جامع ''قانون ہتک عزت'' مرتب ہوتا ہے جو مغربی ''قانون ہتک عزت'' سے بہت مختلف ہے۔ اسلامی ''قانون ہتک عزت'' میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ جس بات سے مومن کا وقار مجروح کیا وہ بات واقعیت پر مبنی تھی یا نہیں۔ اگر واقعیت پر مبنی ہے پھر بھی ہتک عزت ہے جسے غیبت کہتے ہیں۔ اگر واقعیت پر مبنی نہیں ہے یہ بھی ہتک عزت ہے جسے بہتان کہتے ہیں۔

لہٰذا ایک دوسرے کی عیب جوئی، دل آزاری، بدگمانی اور الزام تراشی سے ایک تو انسان کی عزت نفس مجروح ہوتی ہے جو عند اللہ جرم ہے۔ ثانیاً اس سے دلوں میں کدورتیں اور کینے وجود میں آتے ہیں جن سے فتنے رونما ہوتے ہیں اور جرم سے کئی اور جرائم جنم لیتے ہیں اور معاشرہ آلودہ ہو جاتا ہے۔

کسی کا مذاق اڑانا نہایت غیر مہذب، غیر اخلاقی کام ہے۔ مذاق اڑانے والا انسانی قدروں کا مالک نہیں ہے۔ وہ تکبر اور خود بینی کا شکار ہے۔ اسی بنا پر وہ دوسرے کی تحقیر و تذلیل کرتا ہے۔ اس میں وہ لذت محسوس کرتا ہے۔

۲۔ عَسٰۤی اَنۡ یَّکُوۡنُوۡا خَیۡرًا مِّنۡهُمۡ: ممکن ہے کہ اس مذاق اڑانے والے سے وہ لوگ بہتر ہوں جن کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ یعنی الٰہی قدریں اس مذاق اڑانے والے کی قدروں سے مختلف ہو سکتی ہے۔ مذاق اڑانے والے اپنے آپ کو بہتر سمجھتے ہوں اور اللہ کے نزدیک وہ بہتر ہوں جن کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔

---

[1] ۹۵ تین: ۴ [2] ۴۰ غافر: ۶۴

۳۔ وَلَا نِسَآءٌ مِّنۡ نِّسَآءٍ: نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں۔ ہو سکتا ہے واقع میں کمتر انسان بہتر انسان کا مذاق اڑا رہا ہو جو خود مذاق اڑانے والے کی اپنی توہین ہے۔

۴۔ وَلَا تَلۡمِزُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ: عیب گوئی اور عیب جوئی ایک ایسی بدخوصفت ہے جو اعلیٰ نفسیات کے مالک انسان سے صادر نہیں ہوتی۔ اعلیٰ قدروں کا مالک انسان اپنے میں موجود خامیوں کو دور کرنے کے درپے ہوتا ہے۔ پست صفت انسان دوسروں میں موجود خامیوں کا کھوج لگانے میں مصروف ہوتا ہے۔

اَنۡفُسَکُمۡ: اول تو یہ خود اپنا عیب فاش کر رہا ہے لہٰذا فی الواقع یہ خود اپنی عیب گوئی کر رہا ہے۔ ثانیاً کہ جس انسان کا عیب یہ شخص فاش کر رہا ہے وہ انسان خود اس کے اپنے نفس کے برابر ہے۔ اس پر اپنے نفس کے برابر حقوق ہیں۔ جیسے وَلَا تَقۡتُلُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ [۱] فرمایا اپنے آپ کو قتل نہ کریں کہ دوسروں کا قتل کرنا اپنا قتل قرار دیا ہے۔

۵۔ وَلَا تَنَابَزُوۡا بِالۡاَلۡقَابِ: برے القاب کے ساتھ لوگوں کو یاد نہ کیا کرو۔ بُرا لقب یہ ہے کہ وہ نام جو اس کا نہیں ہے اور ناپسند بھی ہے جیسے اے فاسق، اے اندھے لنگڑا وغیرہ جو کسی ایسے عیب کو ظاہر کرتا ہو جو خود اس میں ہے یا اس کے خاندان میں ہے یا اس کے علاقے میں ہے یا کسی ایسے لقب سے یاد کیا جائے جس میں اس کی تذلیل ہو۔ جیسے: اے بے وقوف۔

یہ سب احترام آدمیت اور انسانی وقار کے منافی ہے جو عند اللہ بڑا جرم ہے۔

۶۔ بِئۡسَ الِاسۡمُ الۡفُسُوۡقُ بَعۡدَ الۡاِیۡمَانِ: ایمان لانے کے بعد برے نام سے یاد کرنا بہت برا قدم ہے۔ یعنی ایمان کے دائرے میں آنے کے بعد ایک تو مومن کا خود اپنا مقام بلند ہو جاتا ہے۔ ثانیاً برادر مومن کی عزت وقار سے مربوط حقوق دیگر مومنین کے ذمے عائد ہوتے ہیں۔ لہٰذا ایمان کے بعد سابقہ مذہب کے نام سے پکارنا بھی مومن کی تذلیل ہے۔ جیسے اے یہودی کی اولاد کہنا وغیرہ۔

روایت ہے کہ حضرت عائشہ نے حضرت صفیہ بنت حی بن اخطب سے کہا تھا: اے دو یہودیوں کی یہودی بیٹی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[۲]

۷۔ وَمَنۡ لَّمۡ یَتُبۡ: اگر اس صفت بد کو ترک نہ کریں اور اسے جاری رکھیں تو ان لوگوں نے اپنے آپ کو نقصان پہنچایا اور ظلم بہ نفس کے مرتکب ہو گئے۔

اہم نکات

۱۔ محترم انسان احترام آدمیت کا خیال رکھتا ہے۔

۲۔ دوسروں کی عیب جوئی کرنے والا خود اپنا عیب ظاہر کرتا ہے۔

---

[۱] ۴ نساء: ۲۹ [۲] مجمع البیان ذیل آیت

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾	۱۲۔ اے ایمان والو! بہت سے گمانوں سے بچو، بعض گمان یقیناً گناہ ہیں اور تجسس بھی نہ کیا کرو اور تم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کی غیبت نہ کرے، کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے؟ اس سے تو تم نفرت کرتے ہو اور اللہ سے ڈرو، اللہ یقیناً بڑا توبہ قبول کرنے والا، مہربان ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اجۡتَنِبُوۡا کَثِیۡرًا مِّنَ الظَّنِّ: سند اور دلیل کے بغیر کسی قسم کا موقف اختیار کرنا درست نہیں ہے۔ ظن و گمان کسی بھی موقف کی سند اور دلیل نہیں ہیں البتہ کسی ظن کو شریعت نے بطور دلیل تسلیم کیا ہے اس پر عمل کرنا ہوتا ہے۔ جیسے دو عادل گواہ کی گواہی، ایک عادل کی روایت، فقیہ جامع الشرائط کا فتویٰ وغیرہ۔

رہے وہ ظن و گمان جو لوگوں کے کردار اور ان کے نجی معاملات سے مربوط ہیں تو ایسے ظن و گمان بعض اوقات حقیقت تک رسائی کا ذریعہ نہیں بنتے۔ لہٰذا ظن و گمان پر عمل کرنے سے اجتناب کرنے کا حکم ہے۔ کَثِیۡرًا مِّنَ الظَّنِّ اس لیے فرمایا ہوگا کہ لوگوں کے درمیان بدگمانیاں زیادہ ہوا کرتی ہیں۔

مومن کے دوسرے کے بارے میں ظن و گمان کے دو اہم مواقع ہیں:

i۔ سوء ظن اور ii۔ حسن ظن۔ ان دونوں میں سوء ظن یعنی بدگمانی سے اجتناب کرنے کا حکم ہے جب کہ حسن ظن کو اپنانے کا حکم ہے۔

سوء ظن: اپنے برادر مومن کے بارے میں بدگمانی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ اسلام کی انسان ساز تعلیمات نے سختی سے بدگمانی سے منع فرمایا ہے۔ حدیث نبوی ہے:

اِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّهُ اَكْذَبُ الْحَدِيثِ۔[1]	تم ظن سے بچا کرو کیونکہ یہ سب سے زیادہ جھوٹی بات کرنے والا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

مُجَالَسَةُ الْاَشْرَارِ تُورِثُ سُوءَ الظَّنِّ	برے لوگوں کی ہمنشینی اچھے لوگوں سے بدگمانی کا

---

[1] مستدرک الوسائل ۹: ۱۴۷

بِالْاَخْیَارِ.... [1] سبب بنتی ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

اِذَا اتَّھَمَ الْمُؤْمِنُ اَخَاہُ انْمَاثَ الْاِیمَانُ مِنْ قَلْبِہِ کَمَا یَنْمَاثُ الْمِلْحُ فِی الْمَاءِ۔ [2] جب مومن اپنے برادر مومن پر بدگمانی کر کے تہمت لگاتا ہے تو ایمان اس کے دل میں اس طرح پگھل جاتا ہے جس طرح نمک پانی میں پگھلتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

ضَعْ اَمْرَ اَخِیکَ عَلَی اَحْسَنِہِ حَتّٰی یَاْتِیَکَ مَا یَغْلِبُکَ مِنْہُ وَ لَا تَظُنَّنَّ بِکَلِمَۃٍ خَرَجَتْ مِنْ اَخِیکَ سُوءً اَوَ اَنْتَ تَجِدُ لَھَا فِی الْخَیْرِ مَحْمِلًا۔ [3] اپنے بھائی کے معاملے کو بہتر صورت پر حمل کرو اس بہتری کے خلاف دلیل آنے تک۔ اپنے بھائی کے منہ سے نکلے ہوئے جملے کے بارے میں اس وقت تک بدگمانی نہ کرو جب تک اس کے لیے بہتر صورت پر محمول کرنا ممکن ہو۔

حسن ظن: اپنے برادر مومن کے بارے میں ہمیشہ حسن ظن رکھنا اسلامی تعلیمات میں نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ دوسروں کے بارے میں حسن ظن رکھنا اپنے باطن کی پاکیزگی کی علامت ہے۔ حسن ظن، اچھی سوچ اور اچھی خصلت کا مالک ہونے کی علامت ہے۔ حدیث نبوی ہے:

اَحْسِنُوا ظُنُونَکُمْ بِاِخْوَانِکُمْ تَغْتَنِمُوا بِھَا صَفَاءَ الْقَلْبِ وَ نَمَاءَ الطَّبْعِ.... [4] اپنے بھائیوں کے بارے میں حسن ظن رکھو تو دلوں کی صفائی اور طبیعت میں نمو آجاتی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

حُسْنُ الظَّنِّ مِنْ اَفْضَلِ السَّجَایَا وَ اَجْزَلِ الْعَطَایَا.... [5] حسن ظن افضل ترین خصلت ہے اور وافر ترین عنایت ہے۔

۲۔ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ: بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ یعنی بدگمانی پر اثرات مترتب کرنا اور اس بدگمانی کی بنیاد پر کسی مومن پر الزام عائد کرنا گناہ ہے۔ مثلاً ایک شخص آپ کے جانی دشمن کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کر رہا ہے۔ اس پر یہ گمان کرنا گناہ ہے کہ وہ آپ کے خلاف باتیں سن رہا ہے۔

۳۔ وَّلَا تَجَسَّسُوْا: اور دوسروں کے راز جاننے کی کوشش نہ کرو۔ دوسروں کے عیوب جاننے اور ان کے نجی معاملات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی شرعاً ممانعت ہے۔ انسان کے نجی معاملات پر جب

---

[1] مستدرک الوسائل۔ ۸: ۳۲۸ [2] الکافی۔ ۲: ۳۶۱ [3] الکافی۔ ۲/۳۶۲ [4] مستدرک الوسائل ۹: ۱۴۵
[5] مستدرک الوسائل ۱۱: ۲۵۲

پردہ پڑا ہوا ہے، اس پردے کو چاک کرنے کی کوشش جرم ہے کیونکہ اس تجسس سے لوگوں کا راز فاش اور وقار مجروح ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود ستار العیوب ہے۔ اپنے بندوں کو بھی یہ حکم دیتا ہے کہ لوگوں کی پردہ پوشی کرو، راز فاش نہ کرو اور لوگوں کی نجی زندگی میں مداخلت نہ کرو۔

البتہ اگر کوئی راز کسی شخص یا ایک خاندان کے نجی معاملے سے مخصوص نہ ہو بلکہ اس کا تعلق پورے معاشرے یا اسلامی ریاست کے لیے خطرے سے مربوط ہو تو اس صورت میں دشمنوں کے عزائم کا تجسس لازمی ہے۔

لوگوں کے نجی راز ٹٹولنے کے ناجائز اور حرام ہونے پر اس آیت کے ساتھ احادیث بھی کثرت سے موجود ہیں۔ حدیث نبوی ہے:

مَنِ اطَّلَعَ فِي بَيْتِ جَارِهِ فَنَظَرَ اِلَى عَوْرَةِ رَجُلٍ اَوْ شَعْرِ امْرَاَةٍ اَوْ شَيْءٍ مِنْ جَسَدِهَا كَانَ حَقِيقاً عَلَى اللّٰهِ اَنْ يُدْخِلَهُ النَّارَ مَعَ الْمُنَافِقِينَ الَّذِينَ كَانُوا يَبْحَثُونَ عَوْرَاتِ الْمُسْلِمِينَ فِي الدُّنْيَا... [1]

کوئی اگر اپنے ہمسایہ کے گھر جھانکتا ہے اور کسی مرد کے راز یا عورت کے بالوں یا اس کے جسم کے کسی حصے پر نظر پڑتی ہے تو اللہ اسے جہنم میں داخل کر سکتا ہے ان منافقوں کے ساتھ جو دنیا میں مسلمانوں کے راز ٹٹولتے تھے۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

من تتبع عورات الناس كشف الله عورته۔ [2]

جو شخص لوگوں کے راز ٹٹولتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا راز فاش کرے گا۔

۴۔ وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا: تم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کی غیبت نہ کرے۔ حدیث نبوی میں غیبت کی یہ تعریف آئی ہے:

هل تدرون ما الغيبة فقالوا الله و رسوله اعلم. قال ذكرك اخاك بما يكره۔ [3]

کیا تم جانتے ہو غیبت کیا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا: غیبت یہ ہے کہ تو اپنے بھائی کا ایسی باتوں کے ساتھ ذکر کرے جو اسے ناگوار گزریں۔

یعنی غیبت یہ ہے کہ انسان کسی دوسرے مومن بھائی کے کسی ایسے راز کو فاش کرے یا عیب کا ذکر کرے جس کا ذکر کرنا اسے پسند نہیں ہے۔

غیبت سے انسان کا وقار مجروح ہوتا ہے۔ ہر شخص کی زندگی میں ناہمواریاں پیش آتی ہیں۔ ان ناہمواریوں میں لغزشیں سرزد ہوتی ہیں جن سے دوسرے لوگ واقف نہیں ہوتے صرف اپنا مہربان رب واقف

---

[1] مستدرك الوسائل ۱۴: ۲۱۸ [2] غرر الحکم حکمت: ۹۶۵۷ [3] بحار ۷۲: ۲۲۲

ہے۔ رب کی مہربانی ہے کہ وہ خود ستار العیوب ہے، اپنے بندوں سے بھی فرمایا ہے کہ وہ بھی دوسروں کے عیوب فاش نہ کریں۔

مروی ہے کہ حضرت ابوذرؓ نے پوچھا: یا رسول اللہؐ! غیبت کیا ہے؟ فرمایا:

ذکرك اخاك بما یکرهه۔ قلت یا رسول اللّٰہ فان کان فیه ذاك الذی یذکر به. قال اعلم اذا ذکرته بما هو فیه فقد اغتبته، و اذا ذکرته بما لیس فیه فقد بهته...[1]

غیبت یہ ہے کہ تو اپنے بھائی کا ایسی بات کے ساتھ ذکر کرے جو اس کو ناگوار گزرے۔ عرض کیا: اگر وہ بات اس میں موجود ہو تو بھی؟ فرمایا اگر وہ بات موجود ہو تو یہ غیبت ہے اگر وہ بات اس میں موجود نہیں ہے تو یہ بہتان ہے۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ جو عیب و نقص انسان میں موجود ہے اس کا ذکر کرنا غیبت ہے۔ اگر وہ نقص یا گناہ جو اس سے سرزد ہوا ہے وہ دوسروں کو معلوم نہیں ہے آپ نے بیان کیا ہے تو آپ نے اس کا راز فاش کیا ہے جس سے اس کا وقار مجروح ہوا۔ اگر وہ نقص ایسا ہے جو راز نہیں ہے جیسے لنگڑا، اندھا، بہرا ہے تو ان عیوب کا ذکر اس مومن کی توہین اور تذلیل ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے یہ حدیث روایت ہے:

لِلّٰہِ عَزَّ وَ جَلَّ فِي بِلَادِہٖ خَمْسُ حُرَمٍ حُرْمَۃُ رَسُولِ اللّٰہِؐ وَ حُرْمَۃُ آلِ رَسُولِ اللّٰہِؐ وَ حُرْمَۃُ کِتَابِ اللّٰہِ عَزَّ وَ جَلَّ وَ حُرْمَۃُ کَعْبَۃِ اللّٰہِ وَ حُرْمَۃُ الْمُؤْمِنِ۔[2]

اللہ کے لیے زمین میں پانچ حرمتیں ہیں: رسول اللہؐ کی حرمت، آل رسول کی حرمت، کتاب اللہ کی حرمت، کعبہ کی حرمت اور مومن کی حرمت۔

حدیث نبوی ہے:

اَلْمُؤْمِنُ حَرَامٌ کُلُّہٗ عِرْضُہٗ وَ مَالُہٗ وَ دَمُہٗ۔[3]

فرمایا: مومن کو پوری حرمت حاصل ہے اس کے آبرو، مال اور خون سب کو حرمت حاصل ہے۔

۵۔ اَیُحِبُّ اَحَدُکُمۡ اَنۡ یَّاۡکُلَ لَحۡمَ اَخِیۡہِ مَیۡتًا: غیبت اس حد تک گناہ کبیرہ اور اہانت مومن ہے جس طرح اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا۔ اس میں دو باتیں مشترک ہیں:

مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا اس فوت شدہ شخص کی انتہائی اہانت ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مردہ اپنا دفاع اور صفائی پیش نہیں کر سکتا ہے۔ اسی طرح وہ غائب شخص جس کی غیبت ہو رہی ہے وہ بھی اپنی صفائی پیش نہیں کر سکتا۔

۶۔ فَکَرِہۡتُمُوۡہُ: مردے کا گوشت کھانے سے تو تم نفرت کرتے ہو چونکہ یہ بات تمہارے محسوسات

---

[1] الامالی للطوسی ص ۵۳۷ [2] الکافی ۸: ۱۰۷ [3] مستدرك الوسائل ۹: ۱۳۶

میں ہے لیکن انسانی قدروں کو تم محسوس نہیں کرتے اور قدروں کی پامالی سے نفرت نہیں کرتے۔

درج ذیل مقامات پر غیبت حرام نہیں ہے:

i۔ ایک شخص علی الاعلان فسق و فجور کرتا ہے۔ لہٰذا جو شخص خود سے فاش ہے اس کی حرمت نہیں ہوتی۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

اِذَا جَاهَرَ الْفَاسِقُ بِفِسْقِهٖ فَلَا حُرْمَةَ لَهٗ وَ لَا غِيْبَةَ۔[1]

جب فاسق اپنے فسق کا کھلے بندوں ارتکاب کرے تو نہ تو اس کی حرمت ہے، نہ اس کی غیبت کرنا حرام ہے۔

ii۔ ظالم: مظلوم کے لیے جائز ہے کہ اپنی مظلومیت کو بیان کرتے ہوئے ظالم کی برائی کرے۔

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ...[2]

اللہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کوئی (کسی کی) برملا برائی کرے، مگر یہ کہ مظلوم واقع ہوا ہو۔

iii۔ مشورہ: مثلاً اگر کوئی رشتہ دینے یا لینے یا کسی اور معاملے میں آپ سے مشورہ طلب کرے تو اس صورت میں ان عیوب و نقائص کا ذکر جائز ہے تا کہ وہ دھوکے میں نہ پڑے۔

حدیث میں ہے:

المستشار مُوتَمَنٌ...۔[3]

جس سے مشورہ طلب کیا جائے وہ امین ہے۔

iv۔ گواہی میں جرح کا حق ہے کہ گواہ کے عادل نہ ہونے پر عدالت کے منافی امور کا ذکر جائز ہے تا کہ حقوق ضائع نہ ہو جائیں۔

v۔ راوی پر جرح کرتے ہوئے اس کے ثقہ نہ ہونے پر دلیل دینے کے لیے ثقہ ہونے کے منافی امور کا ذکر جائز ہے تا کہ احکام و حدود معطل نہ ہوں۔

غیبت گناہ کبیرہ: حضرت ابوذرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا:

يَا اَبَا ذَرٍّ اِيَّاكَ وَ الْغِيبَةَ فَاِنَّ الْغِيبَةَ اَشَدُّ مِنَ الزِّنَا۔ قُلْتُ: وَ لِمَ ذَاكَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ؟ قَالَ: لِاَنَّ الرَّجُلَ يَزْنِي فَيَتُوبُ اِلَى اللّٰهِ فَيَتُوبُ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ الْغِيبَةُ لَا تُغْفَرُ حَتّٰى يَغْفِرَهَا صَاحِبُهَا...۔[4]

اے ابوذر! غیبت سے بچو چونکہ غیبت زنا سے بدتر ہے۔ میں نے عرض کیا: وہ کیسے یا رسول اللہ؟ فرمایا: آدمی زنا کرتا ہے پھر توبہ کرتا ہے۔ اللہ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے اور غیبت کی بخشش نہیں ہے جب تک وہ شخص معاف نہ کرے جس کی غیبت ہوئی ہے۔

اہم نکات

۱۔ مومن کی عزت و آبرو کو وہی تحفظ حاصل ہے جو کعبة اللّٰہ کو ہے۔

---

[1] وسائل الشیعة ۱۲: ۲۸۹ [2] ۴ نساء: ۱۴۸ [3] وسائل الشیعة ۱۲: ۴۳ [4] الوسائل الشیعة ۱۲: ۲۸۰

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقۡنٰکُمۡ مِّنۡ ذَکَرٍ وَّ اُنۡثٰی وَ جَعَلۡنٰکُمۡ شُعُوۡبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوۡا ؕ اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ اَتۡقٰکُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیۡمٌ خَبِیۡرٌ ﴿۱۳﴾

۱۳۔ اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا پھر تمہیں قومیں اور قبیلے بنا دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، تم میں سب سے زیادہ معزز اللہ کے نزدیک یقیناً وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے، اللہ یقیناً خوب جاننے والا، باخبر ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّا خَلَقۡنٰکُمۡ مِّنۡ ذَکَرٍ وَّ اُنۡثٰی: اللہ تعالیٰ نے انسان کی نسلی افزائش کے لیے مرد و زن کی آمیزش کا طریقہ اختیار فرمایا چونکہ دو انسانوں کی مشارکت کی وجہ سے آنے والی نسل میں امتیاز آ جاتا ہے کہ یہ فرزند نہ ماں ہے، نہ باپ بلکہ اولاد ہے جو دوسروں سے مختلف ہے۔ رنگ، شکل، چال، طبیعت و مزاج، ترجیحات اور لیاقت و ذہانت، خلق و خو اور خصلتوں میں بھی ہر ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ یہ اختلاف ایک دوسرے کے تعاون اور باہمی تبادل مفادات کے لیے ہے ورنہ اگر ان میں کسی بات میں بھی اختلاف نہ ہوتا تو کوئی کسی کے کام نہ آتا اور کلوننگ کے ذریعے پیدا ہونے والی نسل اس امتیازی حیثیت کی حامل نہ ہوتی۔ اس طرح فرد فرد کو شناخت نہ ملتی۔

۲۔ وَ جَعَلۡنٰکُمۡ شُعُوۡبًا وَّ قَبَآئِلَ: پھر اللہ تعالیٰ نے اجتماعی امتیاز کے لیے قوموں اور قبائل میں تقسیم کیا۔ یہ تقسیم ایک دوسرے پر فخر جتلانے کے لیے نہیں بلکہ ایک دوسرے کی شناخت کے لیے ہے۔

۳۔ اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ اَتۡقٰکُمۡ: اللہ کے نزدیک انسان کی قدر و قیمت رنگ و نسل سے نہیں اخلاق و کردار سے بنتی ہے، کیونکہ رنگ و نسل میں انسان کے عمل اور کردار کا دخل نہیں ہے۔ جو چیز انسان کے دائرہ اختیار میں ہو اس کے مطابق انسان کی قدر بڑھتی گھٹتی ہے۔ وہ میزان تقویٰ ہے جس سے انسان کی قیمت بنتی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

اَحَبُّکُمْ اِلَی اللّٰهِ اَکْثَرُکُمْ لَهٗ ذِکْرًا وَ اَکْرَمُکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقَاکُمْ وَ اَنْجَاکُمْ مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَشَدُّکُمْ لَهٗ خَوْفًا...[1]

اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ محبوب وہ جو اللہ کا زیادہ ذکر کرتا ہے اور سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے اور تم میں عذاب سے بچنے والا ہونے میں بہتر وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ اللہ کا خوف رکھتا ہے۔

---
[1] مستدرک الوسائل ۱۱: ۱۷۵

اہم نکات

۱۔ اگر مخلوقات میں امتیازات نہ ہوتے تو معاشرے کا نظم درہم برہم ہو جاتا۔

۲۔ تقویٰ سے اللہ کے نزدیک انسان کی قیمت بنتی ہے۔

قَالَتِ الۡاَعۡرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلۡ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا وَ لٰکِنۡ قُوۡلُوۡۤا اَسۡلَمۡنَا وَ لَمَّا یَدۡخُلِ الۡاِیۡمَانُ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ ؕ وَ اِنۡ تُطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ لَا یَلِتۡکُمۡ مِّنۡ اَعۡمَالِکُمۡ شَیۡئًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۴﴾

۱۴۔ بدوی لوگ کہتے ہیں: ہم ایمان لائے ہیں کہدیجیے: تم ایمان نہیں لائے بلکہ تم یوں کہو: ہم اسلام لائے ہیں اور ایمان تو ابھی تک تمہارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو تو وہ تمہارے اعمال میں سے کچھ کمی نہیں کرے گا، یقیناً اللہ بڑا بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

تشریح کلمات

یَلِتۡکُمۡ: (ل ی ت) اللیت۔ نقص کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

بعض بدویوں کا ذکر ہے جو اسلام کو ایک طاقت بنتے دیکھ کر مسلمان ہوئے تھے۔ یہاں ایمان کا ذکر اسلام کے مقابلے میں ہوا ہے اس لیے یہاں اسلام اور ایمان میں فرق ہے۔ اسلام کا تعلق زبان کے ذریعے اظہار سے ہے اور ایمان کا تعلق دل اور عقیدہ سے ہے۔ ایمان اور اسلام کے اپنے اپنے اثرات ہیں۔ اسلام یعنی زبان پر کلمہ اسلام جاری کر کے اسلام کے دائرے میں داخل ہونے کی صورت میں اس کا مال و جان محفوظ ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ مناکحہ اور وراثت کا قانون بھی نافذ ہوتا ہے۔

ایمان: دل سے عقیدہ قائم کرنے کی صورت میں اس کے اعمال قبول ہوتے اور اعمال کا ثواب ملتا ہے۔ لہٰذا ہر مومن مسلمان ہوتا ہے لیکن ہر مسلمان کا مؤمن ہونا ضروری نہیں ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

اِنَّ الۡاِسۡلَامَ قَبۡلَ الۡاِیۡمَانِ وَ عَلَیۡہِ یَتَوَارَثُوۡنَ وَ یَتَنَاکَحُوۡنَ وَ الۡاِیۡمَانُ

اسلام، ایمان سے پہلے ہوتا ہے۔ اسلام کے تحت باہمی وارث اور نکاح جائز ہوتا ہے جب کہ ایمان

عَلَیۡہِ یُثَابُون... [1] سے ثواب کا مستحق بن جاتا ہے۔

۲۔ وَ لَمَّا یَدۡخُلِ الۡاِیۡمَانُ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ: ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ اس سے معلوم ہوا ایمان کی جگہ دل ہے۔ ایمان دلوں میں ہوا کرتا ہے۔ صرف زبان پر اظہار سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے سامنے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ اب اسلام کے خلاف قیام نہیں کیا جائے گا لیکن یہ منزل ابھی باقی ہے کہ دل بھی ہتھیار ڈال دے۔

جہاں اسلام، ایمان کے مقابلے استعمال نہ ہوا ہو وہاں اسلام اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کرنے کے معنوں میں ہے جو ایمان کے بعد کا ایک اعلیٰ درجہ ہے۔ جیسے وَلَا تَمُوۡتُنَّ اِلَّا وَ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ۔ [2]

۳۔ وَ اِنۡ تُطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ: ظاہری اسلامی طاقت سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرنے والے اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر دل سے ایمان لے آئیں اور اللہ اور رسولؐ کی دی ہوئی تعلیمات پر عمل پیرا ہوں تو انہیں محض اس لیے کم ثواب نہیں ملے گا کہ شروع میں یہ لوگ دل سے ایمان نہیں لائے۔ ایمان کا مرحلہ آنے پر ثواب بھی ملنا شروع ہو جائے گا۔

۴۔ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ: ابتداء میں صرف زبان پر ظاہری اسلام جاری کرنے کی اس کوتاہی کو اللہ معاف کرے گا چونکہ ایمان آنے کے بعد سابقہ سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ اسلام کو تعلیمات کے تناظر میں نہیں، طاقت کے تناظر میں دیکھنے والے ظاہری مسلمان ہیں، مومن نہیں ہیں۔

اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ ثُمَّ لَمۡ یَرۡتَابُوۡا وَ جٰہَدُوۡا بِاَمۡوَالِہِمۡ وَ اَنۡفُسِہِمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الصّٰدِقُوۡنَ ﴿۱۵﴾	۱۵۔ مومن تو بس وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائیں پھر شک نہ کریں اور اللہ کی راہ میں اپنے اموال اور اپنی جانوں سے جہاد کریں، یہی لوگ (دعوائے ایمان میں) سچے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ: ایمان کی جامع تعریف آ گئی کہ جب اللہ اور رسولؐ پر تعلیمات اور حق کی بنیاد پر ایمان لائیں اور ایمان بھی ایسا جس میں کسی مرحلے میں تزلزل نہ آئے۔ اس یقین کے ساتھ دل میں ایمان

---

[1] الکافی ۱: ۱۷۳　　[2] ۳ آل عمران: ۱۰۲ (ترجمہ) جان نہ دینا مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔

اتر گیا ہو کہ بعد میں کسی آزمائش کے موقع پر اس ایمان میں تزلزل نہ آئے جیسے صلح حدیبیہ کی آزمائش تھی جس میں کچھ مسلمانوں کے دل متزلزل ہو گئے تھے۔

چونکہ حقیقت کے انکشاف کے بعد اگر اس میں شک گزرے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت کا انکشاف نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا مومن وہ ہے جو ثُمَّ لَمۡ یَرۡتَابُوۡا کی منزل پر فائز ہو۔

۲۔ وَ جٰهَدُوۡا بِاَمۡوَالِهِمۡ وَ اَنۡفُسِهِمۡ: ایمان کی پختگی کی دوسری علامت جہاد ہے۔ مال خرچ کرنے سے نہ کترائے اور جہاد بالنفس میں جانی خطرے کو اعتنا میں نہ لائے تو مومن ہے۔ اگر مال خرچ کرنے میں بخل سے کام لے اور میدان جہاد سے جان بچانے کی کوشش میں فرار ہو جائے تو مومن کی سچی تعریف اس پر صادق نہیں آئے گی۔

۳۔ اُولٰٓئِکَ هُمُ الصّٰدِقُوۡنَ: مذکورہ امور میں پورا اترنے والے اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہیں۔

فضائل: عطاء، ابن عباس سے روایت کرتے ہیں:

اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا رسول اللہ کی تصدیق کرنے اور ایمان کے بعد شک نہ کرنے والے علی، حمزۃ، عبد المطلب اور جعفر طیار ہیں۔[1]

اہم نکات

۱۔ ایمان کی تعریف میں، شک نہ کرنا اور جہاد سے پیچھے نہ ہٹنا شامل ہے: ثُمَّ لَمۡ یَرۡتَابُوۡا....

۲۔ دعوائے ایمان میں کچھ صادقین ہیں: اُولٰٓئِکَ هُمُ الصّٰدِقُوۡنَ۔

قُلۡ اَتُعَلِّمُوۡنَ اللّٰهَ بِدِیۡنِکُمۡ ؕ وَ اللّٰهُ یَعۡلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ وَ اللّٰهُ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۱۶﴾

۱۶۔ کہدیجیے: کیا تم اللہ کو اپنی دینداری کی اطلاع دینا چاہتے ہو؟ جب کہ اللہ تو آسمانوں اور زمین میں موجود ہر چیز سے واقف ہے اور اللہ ہر شے کا خوب علم رکھتا ہے۔

تفسیر آیات

ان بدؤں نے جب اصرار کیا، نہیں! ہم سچے دل سے ایمان لا چکے ہیں تو اللہ نے ان کی رد میں فرمایا: تم اپنی ایمانداری کی اللہ کو خبر دیتے ہو جس کے احاطہ علم سے کائنات میں کوئی شے خارج نہیں ہے۔

مزید اس بات کو واضح فرمایا کہ ابھی تک تمہاری دلوں میں ایمان داخل نہیں ہوا۔

---

[1] حسکانی شواھد التنزیل ذیل آیت

يَمُنُّوۡنَ عَلَيۡكَ اَنۡ اَسۡلَمُوۡا ؕ قُلۡ لَّا تَمُنُّوۡا عَلَیَّ اِسۡلَامَكُمۡ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيۡكُمۡ اَنۡ هَدٰٮكُمۡ لِلۡاِيۡمَانِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۱۷﴾	۱۷۔ یہ لوگ آپ پر احسان جتاتے ہیں کہ انہوں نے اسلام قبول کیا، کہدیجیے: مجھ پر اپنے مسلمان ہونے کا احسان نہ جتاؤ بلکہ اگر تم سچے ہو تو اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت دی۔

تشریح کلمات

يَمُنُّوۡنَ: (م ن ن) المنة بھاری احسان کے معنی میں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ يَمُنُّوۡنَ عَلَيۡكَ اَنۡ اَسۡلَمُوۡا: لوگ آپ پر احسان جتاتے ہیں کہ ہم نے اسلام قبول کر کے آپ پر احسان کیا ہے۔ جب کہ ظاہری اسلام قبول کرنے سے دنیوی فائدہ خود انہیں مل رہا ہے۔

۲۔ قُلۡ لَّا تَمُنُّوۡا عَلَیَّ اِسۡلَامَكُمۡ: اسلامی طاقت دیکھ کر ہتھیار ڈالنا کسی پر احسان نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جس سے اسلام کے تحفظ میں آ کر تم نے اپنے مفادات حاصل کیے ہیں، کسی پر احسان نہیں کیا۔

۳۔ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيۡكُمۡ اَنۡ هَدٰٮكُمۡ لِلۡاِيۡمَانِ: احسان تو اللہ نے تم پر کیا ہے کہ تمہارے ایمان لانے کے لیے راستہ ہموار کیا ہے۔ اب تم اس قابل ہو گئے ہو کہ آیندہ ایمان کی منزل پر قدم رکھ سکو۔ اسلام میں دنیوی مفادات ہی نہیں بلکہ دنیا و آخرت دونوں کے مفادات ہیں۔ جس نے تمہیں اس کا راستہ دکھایا ہے اس کا تم پر احسان ہے۔

۴۔ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ: اگر تم دعوائے ایمان میں سچے ہو۔ اس جملے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ابھی تک اپنے دعوائے ایمان میں سچے نہیں ہیں۔ ۳۴۴

اِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ غَيۡبَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۸﴾ ع ۲	۱۸۔ بتحقیق اللہ آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس پر خوب نگاہ رکھنے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اس بات پر اصرار نہ کرو کہ ہم صدق دل سے ایمان لے آئے ہیں۔ تم اس کے سامنے یہ بات

کر رہے ہو جو تمہارے دلوں کا حال خود تم سے بہتر جانتا ہے۔ وہ کائنات کے دلوں میں پوشیدہ رازوں کو جانتا ہے۔

۲۔ وَاللّٰہُ بَصِیۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ: وہ بندوں کی ہر جنبش سے باخبر ہے۔ تمہارے دلوں کی حالت سے بھی بخوبی باخبر ہے کہ اس میں ایمان کا کوئی شائبہ ہے یا نہیں۔

اہم نکات

۱۔ دلوں کا مالک دلوں کا حال بہتر جانتا ہے۔

۲۔ فائدہ اٹھا کر احسان جتانا نادانی ہے۔

سُوۡرَۃُ قٓ

خالی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اس سورہ مبارکہ کا نام قٓ ہے جو شروع میں مذکور ہے۔ یہ سورۃ مکہ میں نازل ہوئی۔

اس سورہ مبارکہ کی آیات کی تعداد بالاتفاق پینتالیس (۴۵) ہے۔ اس سورہ مبارکہ کی فضیلت میں حضرت امام باقر علیہ السلام سے روایت ہے:

قال: مَنْ اَدْمَنَ فِی فَرَائِضِہٖ وَ نَوَافِلِہٖ قِرَاءَۃَ سُورَۃِ قٓ وَسَّعَ اللّٰہُ عَلَیْہِ فِی رِزْقِہٖ وَ اَعْطَاہُ اللّٰہُ کِتَابَہٗ بِیَمِیْنِہٖ وَ حَاسَبَہٗ حِسَاباً یَسِیراً۔ [1]

جو شخص اپنی فرائض اور نوافل نمازوں میں سورۃ قٓ پڑھتا رہے گا اللہ تعالیٰ اس کی روزی میں وسعت اور نامۂ اعمال سیدھے ہاتھ میں دے گا اور اس سے ہلکا حساب لیا جائے گا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بنام خدائے رحمن رحیم

قٓ ۟ۚ وَ الۡقُرۡاٰنِ الۡمَجِیۡدِ ۚ﴿۱﴾

۱۔ قاف، قسم ہے شان والے قرآن کی۔

بَلۡ عَجِبُوۡۤا اَنۡ جَآءَہُمۡ مُّنۡذِرٌ مِّنۡہُمۡ فَقَالَ الۡکٰفِرُوۡنَ ہٰذَا شَیۡءٌ عَجِیۡبٌ ۚ﴿۲﴾

۲۔ بلکہ انہیں اس بات پر تعجب ہوا کہ خود انہی میں سے ایک تنبیہ کرنے والا ان کے پاس آیا تو کفار کہنے لگے: یہ تو ایک عجیب چیز ہے۔

ءَاِذَا مِتۡنَا وَ کُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِکَ رَجۡعٌۢ بَعِیۡدٌ ﴿۳﴾

۳۔ کیا جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے (پھر زندہ کیے جائیں گے؟) یہ واپسی تو بہت بعید بات ہے۔

قَدۡ عَلِمۡنَا مَا تَنۡقُصُ الۡاَرۡضُ مِنۡہُمۡ ۚ وَ عِنۡدَنَا کِتٰبٌ حَفِیۡظٌ ﴿۴﴾

۴۔ زمین ان (کے جسم) میں سے جو کچھ کم کرتی ہے اس کا ہمیں علم ہے اور ہمارے پاس محفوظ رکھنے والی کتاب ہے۔

---

[1] وسائل الشیعۃ ۶: ۱۴۱

تشریح کلمات

عَجِیۡبٌ: (ع ج ب) العجب اور التعجب اس حیرت کو کہتے ہیں جو کسی چیز کا سبب معلوم نہ ہونے کی وجہ سے انسان کو لاحق ہوتی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قٓ ۚ وَ الۡقُرۡاٰنِ الۡمَجِیۡدِ: قسم ہے قرآن مجید کی جو ایک دستور حیات اور ذریعہ نجات ہے۔ رسول اسلام ﷺ کی نبوت کا دائمی اور ابدی معجزہ ہے۔ اس معجزہ کی قسم! جس نے یہ قرآن پیش فرمایا ہے وہ اللہ کا رسول ہے۔ یہاں وَ الۡقُرۡاٰنِ اور بَلۡ عَجِبُوۡۤا کے درمیان ایک جملہ موجود ہے جو سیاق کلام سے سمجھا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے: ہم نے قرآن مجید جیسا معجزہ دے کر ایک رسول کو ان کی طرف مبعوث کیا تو اس پر ایمان نہیں لائے۔ بَلۡ عَجِبُوۡۤا بلکہ وہ اس پر تعجب کرنے لگے کہ ایک شخص جو ہمارا ایک فرد ہے، ہم جیسا ہے، وہ خدا کا نمائندہ بن کر آئے:

مَاۤ اَنۡتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا ...[1] اور تم ہم جیسے بشر کے سوا اور کچھ نہیں ہو۔

منکرین نے ہمیشہ یہی موقف اپنایا کہ انسان اس قابل نہیں ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے پیغام لے کر آئے۔ ان لوگوں نے رسالت کا اسی بنیاد پر انکار کیا کہ بشر، اللہ کا رسول ہو نہیں سکتا۔ غیر بشر رسول نہیں آیا ہے۔

۳۔ فَقَالَ الۡکٰفِرُوۡنَ ہٰذَا شَیۡءٌ عَجِیۡبٌ: کافروں نے ایک تو انسانوں میں سے ایک رسول کے مبعوث ہونے کو قابل تعجب قرار دیا۔ دوسرا اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ جب مر جائیں گے اور خاک ہو جائیں گے پھر ہم دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔ یہ عقل و فہم سے دور کی بات ہے۔

۴۔ قَدۡ عَلِمۡنَا مَا تَنۡقُصُ الۡاَرۡضُ: اللہ کے علم میں ہے کہ زمین انسانی جسم کھاتی اور خاک کے ذرات میں بدل دیتی ہے۔ پھر وہ قیامت تک زمین کے اطراف میں دور دور تک پھیل جاتے ہیں۔ اللہ کے علم میں ہے کہ اس جسم کا کون سا ذرہ کس جگہ ہے۔ اس کے جسم کے ذرات کرہ ارض کی محدودیت میں ہیں، اگر پوری کائنات میں پھیل جاتے تو بھی اس کے ذرات اللہ کی اس کتاب سے پوشیدہ نہیں رہ سکتے جس میں ہر چیز محفوظ ہے۔

وہ ان تمام ذرات کو اس طرح جمع کرے گا جس طرح اس نے دنیا کے اطراف سے ذرات جمع کر کے انسان کو پیدا کیا ہے۔ کسی ملک سے گندم، کسی دریا سے پانی، کسی باغ سے پھل، کسی کھیت سے سبزی لا کر آپ کے دسترخوان پر جمع کی، آپ کو کھلائی، پھر اس سے ایک بوند تیار کی جس سے انسان کی تخلیق عمل میں آ گئی:

---

[1] ۲۶ شعراء: ۱۵۴

كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ...[1] — جس طرح ہم نے خلقت کی ابتدا کی تھی اسے ہم پھر دہرائیں گے۔

كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ۝ [2] — جس نے تمہیں ابتدا میں پیدا کیا ہے اسی طرح پھر پیدا ہو جاؤ گے۔

۵۔ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ: ہمارے پاس ایک ایسی کتاب موجود ہے جو ہر چیز محفوظ رکھنے والی ہے۔ خواہ اس جسم کے ذرات خاک میں منتشر ہو جائیں یا انسان کا جسم زندگی میں ہی تحلیل ہو کر کاربن کی شکل میں کسی درخت کا حصہ بن جائے۔ وہ درخت پھل دے۔ اس پھل کو کوئی کافر کھائے۔ وہ اس کے جسم کا حصہ بن جائے۔ اس قسم کی ہزار کیمیکل تبدیلیاں آ جائیں بالآخر اللہ کی کتاب تکوین میں موجود ہوتے ہیں، معدوم نہیں ہوتے۔ کسی موجود چیز کا حاضر کرنا اللہ کے لیے مشکل نہیں ہے۔ اس کتاب تکوین کو شرعی اصطلاح میں لوح محفوظ کہتے ہیں۔ ام الکتاب بھی کہتے ہیں:

شبہ آکل و ماکول: قدیم فلاسفروں میں انکار قیامت پر ایک اعتراض مشہور ہے کہ مومن انسان کا بدن اگر کافر کھائے تو کھانے والے کو زندہ کیا جائے تو کھایا جانے والا زندہ نہ ہوا۔ اگر کھایا جانے والا زندہ کیا جائے تو کھانے والا زندہ نہ ہوا۔ پھر ایک بدن کا بہ یک وقت ثواب اور عذاب دونوں میں رہنا لازم آتا ہے۔

آج یہ سوال اس طرح پیش ہو سکتا ہے کہ انسان کا پورا جسم زندگی میں ہر چھ سال بعد تحلیل ہو جاتا ہے اور کاربن کی شکل میں درختوں اور سبزیوں کا حصہ بن جاتا ہے۔ درخت سے نکلنے والا پھل یا سبزی کافر کھا لیتا ہے۔ پھر کافر کا جسم بھی ہمیشہ تحلیل ہوتا رہتا ہے۔ ممکن ہے کافر کا تحلیل شدہ کاربن مومن کے جسم کا حصہ بن جائے۔

۳۵۱ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کی کتاب تکوین میں ہر چیز محفوظ ہے۔ انسان کے جس جسم سے جرم سرزد ہوا ہے وہ اس وقت کس شکل میں کہاں ہے۔

احادیث میں ہے: انسان کا جسم بوسیدہ ہو جاتا ہے سوائے اس طینت کے جس سے انسان پہلی مرتبہ خلق ہوا ہے۔ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے میت کے بارے پوچھا گیا: کیا اس کا جسم بوسیدہ ہو جاتا ہے؟ فرمایا:

نَعَمْ، حَتّٰى لَا يَبْقَى لَهُ لَحْمٌ وَ لَا عَظْمٌ اِلَّا طِيْنَتُهُ الَّتِي خُلِقَ مِنْهَا فَاِنَّهَا لَا تَبْلَى تَبْقَى فِي الْقَبْرِ مُسْتَدِيرَةً حَتّٰى — ہاں، یہاں تک کہ قبر میں کوئی گوشت اور ہڈی باقی نہیں رہتی سوائے اس طینت کے جس سے خلق ہوا ہے۔ وہ گول شکل میں باقی رہ جاتی ہے پھر جس طرح پہلے

---

[1] ۲۱ انبیاء: ۱۰۴ [2] ۷ اعراف: ۲۹

يُخْلَقَ مِنْهَا كَمَا خُلِقَ اَوَّلَ مَرَّةٍ۔ خلق ہوا ہے اس طرح دوبارہ اسی طینت سے خلق ہو گا۔

اسی مضمون کے قریب لفظوں میں احادیث صحیح بخاری کتاب تفسیر القرآن اور صحیح مسلم کتاب الفتن میں لفظ طینت کی جگہ عُجْبُ الذَّنْب کے نام سے مذکور ہیں۔ عُجْبُ الذَّنْب کی تشریح حبة خردل "رائی کے دانے کی طرح" بیان کی گئی ہے۔

بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ ۝ ۵۔ بلکہ جب حق ان کے پاس آیا تو انہوں نے اسے جھٹلایا لہٰذا اب وہ ایک الجھن میں مبتلا ہیں۔

تشریح کلمات

مَّرِيْجٍ: (م ر ج) غیر واضح معاملہ

تفسیر آیات

۱۔ بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ: ان کافروں نے رسول ﷺ کے مبعوث ہونے پر تعجب کے اظہار پر اکتفا نہیں کیا بلکہ حق ان کے پاس آنے اور واضح ہونے کے باوجود اس حق کی تکذیب کی۔ تکذیب چونکہ کسی دلیل کی بنیاد پر نہیں تھی اس لیے تکذیب کے بعد اس کی توجیہ میں یہ لوگ الجھن کا شکار ہو گئے۔ کبھی رسول ﷺ کو شاعر کہا، کبھی کہا ساحر، کبھی مجنون۔

اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ۝ ۶۔ کیا ان لوگوں نے اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا کہ ہم نے اسے کس طرح بنایا اور مزین کیا؟ اور اس میں کوئی شگاف بھی نہیں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ: اعادۂ حیات کو ناممکن قرار دینے والے ہماری تخلیقی کرشمہ سازیوں کا مشاہدہ نہیں کرتے؟ اپنے سروں کے اوپر آسمان کی عظمت کا منظر دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی بے پایاں قدرت کا اندازہ کرتے کہ اس ذات کے لیے اعادۂ حیات کس قدر آسان مسئلہ ہے۔

۲۔ وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ: اس آسمان میں کسی قسم کا شگاف موجود نہیں ہے۔ اس کی تخلیق و تنظیم میں کوئی نقص ہے اور نہ ہی اس میں موجود آفات کا زمین کی طرف آنے کا کوئی راستہ ہے۔

کرۂ ارض ایک حفاظتی ڈھال میں محفوظ ہے۔ یہ ڈھال سورج سے آنے والی قاتل شعاعوں اور ہر روز کروڑوں کی تعداد میں آنے والے آسمانی پتھروں (شہاب ثاقب) کو روک لیتی ہے جس کی وجہ سے اہل ارض امن وسکون سے زندگی گزار رہے ہیں۔ لہٰذا آسمان میں کوئی رخنہ ایسا نہیں ہے جہاں سے آفتیں بلا روک ٹوک زمین کی طرف آسکیں۔ البتہ قیامت کے وقت شگاف آ جائے گا، جیسا کہ فرمایا:

وَ اِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتۡ ۝ [1] — اور جب آسمان میں شگاف ڈال دیا جائے گا۔

انسان کی اپنی کرتوتوں کی وجہ سے اوزون میں رخنہ پڑ جاتا ہے تو یہ خود اس ظالم انسان کی اپنی شامت اعمال ہے:

لَخَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ اَکۡبَرُ مِنۡ خَلۡقِ النَّاسِ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ۝ [2] — آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا انسانوں کے خلق کرنے سے زیادہ بڑا کام ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

اہم نکات

۱۔ خالق حیات کے لیے اعادۂ حیات زیادہ آسان ہے:

وَ الۡاَرۡضَ مَدَدۡنٰہَا وَ اَلۡقَیۡنَا فِیۡہَا رَوَاسِیَ وَ اَنۡۢبَتۡنَا فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ زَوۡجٍۭ بَہِیۡجٍ ۝ — ۷۔ اور اس زمین کو ہم نے پھیلایا اور اس میں ہم نے پہاڑ ڈال دیے اور اس میں ہر قسم کے خوشنما جوڑے ہم نے اگائے،

تَبۡصِرَۃً وَّ ذِکۡرٰی لِکُلِّ عَبۡدٍ مُّنِیۡبٍ ۝ — ۸۔ تاکہ (اللہ کی طرف) رجوع کرنے والے ہر بندے کے لیے بینائی و نصیحت (کا ذریعہ) بن جائے۔

تشریح کلمات

بَہِیۡجٍ: (ب ھ ج) خوشنمائی، فرحت وسرور کا ظہور

تفسیر آیات

۱۔ وَ الۡاَرۡضَ مَدَدۡنٰہَا: ہم نے زمین کو پھیلایا، وسعت دی۔ یہ زمین کسی وقت سیال آتش کی شکل میں ایک آتش کدہ تھی۔ اسے سرد کیا، پہاڑوں کے ذریعے اسے ڈولنے سے محفوظ کیا اور خشکی کو اس حد

[1] ۷۷ مرسلات: ۹ [2] ۴۰ غافر: ۵۷

تک پھیلایا کہ اس کی پشت پر انسان کو بسایا جا سکتے۔

۲۔ وَاَنۡۢبَتۡنَا فِیۡهَا مِنۡ کُلِّ زَوۡجٍۭ بَهِیۡجٍ: اور زمین میں ہر قسم کے خوشنما جوڑے اگائے۔ عالم نباتات پر حاکم نظام زوجیت کا ذکر سورہ یٰسٓ آیت ۳۶ میں ہو چکا۔

بَهِیۡجٍ: روئے زمین پر موجود رنگ برنگ کے پھول، خوبصورت و خوش ذائقہ میوے اللہ تعالیٰ کی خلاقیت کی واضح دلیل ہیں اور حیات و اعادۂ حیات کے بے شمار نمونے اس میں موجود ہیں۔

۳۔ تَبۡصِرَۃً وَّ ذِکۡرٰی: ان مظاہر قدرت میں بصیرت اور نصیحت کے مؤثر ترین دروس موجود ہیں۔ غافل دل افراد کے لیے نہیں بلکہ عَبۡدٍ مُّنِیۡبٍ غفلت اور خواہش پرستی کے پردے چاک کر کے اللہ کی طرف رجوع کرنے والوں کے لیے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ زمین میں اعادۂ حیات کے بے شمار دلائل موجود ہیں جنہیں اللہ سے بصیرت حاصل کرنے والے سمجھ سکتے ہیں۔

وَ نَزَّلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَکًا فَاَنۡۢبَتۡنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّ حَبَّ الۡحَصِیۡدِ ۙ﴿۹﴾

۹۔ اور ہم نے آسمان سے بابرکت پانی نازل کیا جس سے ہم نے باغات اور کاٹے جانے والے دانے اگائے۔

وَ النَّخۡلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلۡعٌ نَّضِیۡدٌ ﴿ۙ۱۰﴾

۱۰۔ اور کھجور کے بلند و بالا درخت پیدا کیے جنہیں تہ بہ تہ خوشے لگے ہوتے ہیں۔

رِّزۡقًا لِّلۡعِبَادِ ۙ وَ اَحۡیَیۡنَا بِهٖ بَلۡدَۃً مَّیۡتًا ؕ کَذٰلِکَ الۡخُرُوۡجُ ﴿۱۱﴾

۱۱۔ (یہ) بندوں کی روزی کے لیے ہے اور ہم نے اسی سے مردہ زمین کو زندہ کیا، (مردوں کا قبروں سے) نکلنا بھی اسی طرح ہوگا۔

تشریح کلمات

الۡحَصِیۡدِ: (ح ص د) الحصد و الحصاد کے معنی کھیتی کاٹنے کے ہیں۔

بٰسِقٰتٍ: (ب س ق) لمبی لمبی کھجوریں۔ الباسق کا معنی بلندی میں لمبا چلا جانے والا ہے۔

طَلۡعٌ: (ط ل ع) کھجور کے خوشے۔

نَّضِیۡدٌ: (ن ض د) تہ بہ تہ اوپر نیچے رکھنے کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَنَزَّلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا: پانی ہی کی برکت سے زمین میں زندگی کی چہل پہل، شادابی ہے اور اللہ تعالیٰ کے جمال و کمال کے مظاہر روئے زمین پر پانی کی بدولت نظر آتے ہیں۔

۲۔ فَاَنۡۢبَتۡنَا بِهٖ جَنّٰتٍ: پانی کی برکت کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے باغات کو آباد فرمایا جس سے مختلف خاصیتوں اور ذائقوں پر مشتمل پھل پیدا ہوتے ہیں۔

۳۔ وَّحَبَّ الۡحَصِيۡدِ: اور وہ دانے بھی پیدا ہوتے ہیں جن پر انسانی معیشت کا دار و مدار ہے۔

۴۔ وَالنَّخۡلَ بٰسِقٰتٍ: بلند و بالا کھجور کے درخت بھی اگائے جن پر یکے بالائے دیگر خوشے لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ باغات میں سے خصوصی طور پر کھجور کا ذکر بتاتا ہے کہ کھجور ایک خاص نعمت ہے جسے انسانی صحت کے تقاضے پورے کرنے میں باقی تمام پھلوں پر فوقیت حاصل ہے اور اس درخت کو بلند رکھنے میں بھی حکمت پوشیدہ ہے۔خوشوں کے تہ بہ تہ ہونے کی وجہ سے ایک جگہ سے وافر پھل حاصل کیا جاتا ہے۔

۵۔ رِّزۡقًا لِّلۡعِبَادِ: بندگان کے رزق و معیشت کی خاطر یہ مختلف اور متعدد چیزیں فراہم کی گئی ہیں۔

قابل توجہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو انسان کو روئے زمین پر صرف زندہ رکھنا منظور ہوتا تو اس کے لیے مثلاً گندم کا دانہ کافی تھا لیکن مختلف لذتوں، ذائقوں، خاصیتوں اور رنگوں کے میوہ جات اور دانے پیدا فرمانے سے اللہ تعالیٰ کی صناعیت کے آثار واضح ہونے کے ساتھ اس انسان پر اس کے کرم اور مہر و محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔

۶۔ وَاَحۡيَيۡنَا بِهٖ بَلۡدَةً مَّيۡتًا: اس پانی کے ذریعے مردہ زمین میں جنبش آ جاتی ہے اور اعادۂ حیات کا بھرپور مظاہرہ ہوتا ہے۔

۷۔ كَذٰلِكَ الۡخُرُوۡجُ: مردہ انسانوں کا زمین سے نکلنا اسی طرح ہو گا جس طرح تم آئے دن اعادہ حیات کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہتے ہو کہ سالہا سال سے خشک سالی سے دوچار بنجر علاقوں پر جب پانی پڑتا ہے تو بہت سی مردہ اور بے جان زمینیں سرسبز ہو جاتی ہیں۔ جہاں دور دور تک زندگی کے آثار نظر نہیں آتے تھے وہاں حیات آفرین پانی سے ہر طرف نباتی حیات کی رونق نظر آتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ اعادۂ حیات کا منظر روزانہ دیکھنے کے باوجود عقل کے اندھے اس کے منکر ہیں۔

كَذَّبَتۡ قَبۡلَهُمۡ قَوۡمُ نُوۡحٍ وَّ اَصۡحٰبُ الرَّسِّ وَثَمُوۡدُ ﴿۱۲﴾

۱۲۔ ان سے پہلے نوح کی قوم اور اصحاب الرس اور ثمود نے تکذیب کی ہے۔

وَ عَادٌ وَّ فِرۡعَوۡنُ وَ اِخۡوَانُ لُوۡطٍ ﴿۱۳﴾

۱۳۔ اور عاد اور فرعون اور برادران لوط نے بھی،

وَّ اَصۡحٰبُ الۡاَیۡکَۃِ وَ قَوۡمُ تُبَّعٍ ؕ کُلٌّ کَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِیۡدِ ﴿۱۴﴾

۱۴۔ اور ایکہ والے اور تبع کی قوم نے بھی، سب نے رسولوں کو جھٹلایا تو میرا عذاب (ان پر) لازم ہو گیا۔

تفسیر آیات

۱۔ تکذیب کا یہ عمل پہلی بار نہیں ہوا۔ اس سے پہلے بھی جتنے انبیاء علیہم السلام آئے سب کی تکذیب ہوتی رہی ہے کیونکہ ہر قوم میں مفاد پرست تکذیبی عناصر موجود ہوا کرتے ہیں۔

۲۔ اَصۡحٰبُ الرَّسِّ کے بارے میں تفصیل سورہ فرقان آیت ۳۸ میں ملاحظہ فرمائیں۔

۳۔ وَّ اَصۡحٰبُ الۡاَیۡکَۃِ کے بارے میں تفصیل ملاحظہ ہو سورہ حجر آیت ۷۸، شعراء: ۱۷۶۔

۴۔ قَوۡمُ تُبَّعٍ کے بارے میں تفصیل سورہ دخان آیت ۳۷ میں ملاحظہ فرمائیں۔

۵۔ کُلٌّ کَذَّبَ الرُّسُلَ: اس طرح تمام قوموں نے اپنے اپنے رسول کی رسالت کی تکذیب کی اور سب نے کہا: انسان اور بشر اللہ کا نمائندہ نہیں ہو سکتا اور ساتھ اعادۂ حیات اور قیامت کو بھی جھٹلایا۔ فَحَقَّ وَعِیۡدِ انجام کار یہ ہوا کہ سب کو سزا مل گئی۔

اَفَعَیِیۡنَا بِالۡخَلۡقِ الۡاَوَّلِ ؕ بَلۡ ہُمۡ فِیۡ لَبۡسٍ مِّنۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ﴿۱۵﴾ ع ۱۵/۱۵

۱۵۔ کیا ہم پہلی بار کی تخلیق سے عاجز آ گئے تھے؟ بلکہ یہ لوگ نئی تخلیق کے بارے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اَفَعَیِیۡنَا بِالۡخَلۡقِ الۡاَوَّلِ: خدا کے وجود کا عقیدہ رکھنے اور خدا کو اس کائنات کا خالق ماننے والا یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مخلوقات کو عدم سے وجود میں لایا ہے۔ خلق اول کا مطلب خلق ابداعی ہے کہ کسی سابقہ مثال، مواد اور عناصر کے بغیر ہر چیز کو عدم سے وجود میں لایا۔

۲۔ بَلۡ ہُمۡ فِیۡ لَبۡسٍ مِّنۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ: یہ منکرین نئی تخلیق کے بارے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں جب کہ جدید تخلیق اور اعادۂ حیات، فہم بشر کے مطابق ایجاد حیات سے زیادہ آسان ہے:

وَ ہُوَ الَّذِیۡ یَبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ یُعِیۡدُہٗ　　وہی خلقت کی ابتدا کرتا ہے۔ پھر وہی اس کا اعادہ

وَ ہُوَ اَہۡوَنُ عَلَیۡہِ ...[1] کرتا ہے اور یہ اس کے لیے زیادہ آسان ہے۔

تخلیق کی دو قسمیں ہیں پہلی قسم یہ ہے کہ عدم سے وجود میں لایا جائے۔ اسے خلق ابداعی کہتے ہیں یہ صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے:

بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ...[2] وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔

دوسری قسم کسی شے سے بنانے کو بھی تخلیق کہتے ہیں جیسے:

خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ نُّطۡفَۃٍ ...[3] اس نے انسان کو ایک بوند سے پیدا کیا۔

لہٰذا بعض قرآن پر قلم اٹھانے والوں کا یہ کہنا اشتباہ ہے کہ خلق جدید کہنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عدم سے خلق کرے گا۔ خلق اول کی طرح خلق جدید بھی عدم سے ہے۔[4] جب کہ قرآن مجید نے خلق جدید کو اعادۂ تخلیق بھی کہا ہے:

ثُمَّ یُعِیۡدُہٗ وَ ہُوَ اَہۡوَنُ عَلَیۡہِ ...[5] پھر وہی اس کا اعادہ کرتا ہے اور یہ اس کے لیے زیادہ آسان ہے۔

البتہ اس خلق جدید کے بعد فنا نہیں ہے اور نظام بھی جدید ہوگا جو عالم دنیا سے مختلف ہوگا۔

اہم نکات

۱۔ جو ذات اپنی قدرت کاملہ سے یہ عظیم کائنات عدم سے وجود میں لائی ہے وہ اسے توڑ کر دوبارہ خلق جدید میں بنا سکتی ہے۔

وَ لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ وَ نَعۡلَمُ مَا تُوَسۡوِسُ بِہٖ نَفۡسُہٗ ۚۖ وَ نَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡہِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡدِ ﴿۱۶﴾

۱۶۔ اور تحقیق انسان کو ہم نے پیدا کیا ہے اور ہم ان وسوسوں کو جانتے ہیں جو اس کے نفس کے اندر اٹھتے ہیں کہ ہم رگ گردن سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ: اللہ تعالیٰ نے انسان خلق فرمانے کے بعد اسے اپنی حالت پر نہیں چھوڑا ہے بلکہ اس کی خلقت اور بقا دونوں اللہ تعالیٰ پر موقوف ہیں۔ لہٰذا ایسا ہو نہیں سکتا کہ اس کی بقا اور وجود کی کسی بات پر اللہ تعالیٰ کو براہ راست آگاہی نہ ہو۔ لہٰذا یہ انسان جو دل میں خطور کرتا ہے اللہ اس سے آگاہ ہے۔

---

[1] ۳۰ روم: ۲۷ [2] ۲ بقرہ: ۱۱۷ [3] ۱۶ نحل: ۴ [4] تفسیر التحریر التنویر ذیل آیہ [5] ۳۰ روم: ۲۷

۲۔ وَ نَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡہِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡدِ: اللہ رگ گردن سے زیادہ انسان کے قریب ہے، جس رگ سے انسان کی حیات کی بقا مربوط ہے کیونکہ اسی سے جسم میں خون کی گردش ہوتی اور حیات کو استمرار ملتا ہے جو انسان کے اپنے وجود کے برابر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ انسان سے خود اس کے اپنے وجود سے زیادہ قریب ہے۔ یہ عام لوگوں کے لیے ایک تشبیہ ہے ورنہ اللہ تعالیٰ ہم سے کتنا قریب ہے، وصف و بیان میں نہیں آ سکتا۔

اہم نکات

۱۔ اللہ خود ہمارے وجود سے زیادہ ہم سے نزدیک ہے۔

اِذۡ یَتَلَقَّی الۡمُتَلَقِّیٰنِ عَنِ الۡیَمِیۡنِ وَ عَنِ الشِّمَالِ قَعِیۡدٌ ﴿۱۷﴾

۱۷۔ (انہیں وہ وقت یاد دلا دیں) جس وقت (اعمال کو) وصول کرنے والے دو (فرشتے) اس کی دائیں اور بائیں طرف بیٹھے وصول کرتے رہتے ہیں۔

مَا یَلۡفِظُ مِنۡ قَوۡلٍ اِلَّا لَدَیۡہِ رَقِیۡبٌ عَتِیۡدٌ ﴿۱۸﴾

۱۸۔ (انسان) کوئی بات زبان سے نہیں نکالتا مگر یہ کہ اس کے پاس ایک نگران تیار ہوتا ہے۔

تشریح کلمات

عَتِیۡدٌ: (ع ت د) آمادہ، تیار۔

تفسیر آیات

۱۔ اِذۡ یَتَلَقَّی الۡمُتَلَقِّیٰنِ: انسان کی دائیں اور بائیں جانب دو فرشتے موکل ہیں کہ انسانی اعمال وصول کر کے انہیں حفظ کر رہے ہوں گے۔

تفسیر جوامع الجامع میں حدیث نبوی منقول ہے جس میں فرمایا:

> حسنات لکھنے والا فرشتہ دائیں جانب اور گناہوں کا لکھنے والا فرشتہ بائیں جانب ہوتا ہے۔ دائیں جانب کا فرشتہ بائیں جانب کے فرشتہ پر امیر ہے۔ جب انسان نیکی بجا لاتا ہے تو دائیں والا فرشتہ دس گنا لکھ دیتا ہے، جب انسان گناہ کرتا ہے تو دائیں کا فرشتہ بائیں جانب کے فرشتے کو منع کرتا ہے کہ سات گھنٹے تک نہ لکھو۔ شاید یہ تسبیح پڑھے یا استغفار کرے۔

۲۔ یَلۡفِظُ مِنۡ قَوۡلٍ: اللہ تعالیٰ رگ گردن سے بھی زیادہ انسان کے قریب ہے لیکن اس کے باوجود انسان کے اقوال و اعمال درج اور ثبت کرنے کے لیے فرشتے بھی مامور ہیں۔ درج اور ثبت کی نوعیت کا ہمیں علم نہیں ہے تاہم انہی خاکی ذرات کے ذریعے اقوال و اشکال کو ثبت، محفوظ اور ریکارڈ کرنا انسان کے لیے ممکن ہونا شروع ہوگیا ہے تو اللہ کے فرشتوں کے لیے کون سی دشواری پیش آ سکتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ انسان کا قول و فعل ایک بار وجود میں آنے کے بعد باقی رہتا ہے۔

وَجَآءَتۡ سَكۡرَةُ الۡمَوۡتِ بِالۡحَقِّ ؕ ذٰلِكَ مَا كُنۡتَ مِنۡهُ تَحِيۡدُ ﴿۱۹﴾

۱۹۔ اور موت کی غشی حقیقت بن کر آ گئی یہ وہی چیز ہے جس سے تو بھاگتا تھا۔

تشریح کلمات

تَحِيۡدُ: (ح ی د) پہلوتہی کرنے اور دور بھاگنے کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَجَآءَتۡ سَكۡرَةُ الۡمَوۡتِ: موت کی غشی حق اور حقیقت کو سامنے لے کر آتی ہے۔ یعنی نزع کی حالت میں انسان پر حق منکشف ہو جاتا ہے۔ بِالۡحَقِّ میں باء برائے تعدیہ لیا جائے تو آیت کا ترجمہ یہ ہوگا:: سکرات موت اس حق کو لے کر آیا جس سے تو بھاگتا تھا۔ وہ حق موت کے بعد کی زندگی ہے۔ موت کے وقت نزع کی حالت میں انسان دوسرا عالم دیکھ لیتا ہے اور اس کی روح قبض کرنے پر مامور فرشتے اس کی قسمت کا فیصلہ سنا دیتے ہیں۔ چنانچہ اس آیت میں فرمایا:

الَّذِيۡنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الۡمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيۡنَ ۙ يَقُوۡلُوۡنَ سَلٰمٌ عَلَيۡكُمُ ۙ ادۡخُلُوا الۡجَنَّةَ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ۝ [1]

جن کی روحیں فرشتے پاکیزہ حالت میں قبض کرتے ہیں (اور انہیں) کہتے ہیں: تم پر سلام ہو! اپنے (نیک) اعمال کی جزا میں جنت میں داخل ہو جاؤ۔

۲۔ ذٰلِكَ مَا كُنۡتَ مِنۡهُ تَحِيۡدُ: ذٰلِكَ عالم آخرت کی طرف اشارہ ہوگا۔ یہ وہ عالم آخرت ہے جس سے تو گریزاں تھا اور اس کی تو تکذیب کرتا تھا۔

اس سلسلے میں حضرت ابوبصیر کی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک سبق آموز روایت ہم نے سورہ نحل کی مذکورہ بالا آیت کے ذیل میں نقل کی ہے۔

---

[1] ۱۶ نحل: ۳۲

اہم نکات

۱۔ حالت نزع میں عالم آخرت کا انکشاف ہو جاتا ہے۔
۲۔ حالت نزع میں انسان کو آخرت کی زندگی کا فیصلہ سنا دیا جاتا ہے۔

وَ نُفِخَ فِی الصُّوۡرِ ؕ ذٰلِکَ یَوۡمُ الۡوَعِیۡدِ ﴿۲۰﴾
۲۰۔ اور صور میں پھونک ماری جائے گی، (تو کہا جائے گا) یہ وہی دن ہے جس کا خوف دلایا گیا تھا۔

وَ جَآءَتۡ کُلُّ نَفۡسٍ مَّعَہَا سَآئِقٌ وَّ شَہِیۡدٌ ﴿۲۱﴾
۲۱۔ اور ہر شخص ایک ہانکنے والے (فرشتے) اور ایک گواہی دینے والے (فرشتے) کے ساتھ آئے گا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ نُفِخَ فِی الصُّوۡرِ: یہ دوسرا صور ہو گا جس سے تمام لوگ زندہ ہو جائیں گے۔ اس صور میں پھونکنے کے بعد میدان حشر میں ہر شخص کو اپنی ابدی قسمت کا فیصلہ سننا ہو گا۔

۲۔ ذٰلِکَ یَوۡمُ الۡوَعِیۡدِ: بالعیاں دکھایا جائے گا کہ یہ وہی دن ہے جس کا انبیاء علیہم السلام خوف دلاتے رہے۔

۳۔ وَ جَآءَتۡ کُلُّ نَفۡسٍ: بروز قیامت جب انسان کو قبر سے اٹھایا جائے گا تو دو فرشتے اسے اپنی تحویل میں لے لیں گے۔ ایک کی ذمہ داری ہو گی اسے عدالت کی طرف لے جائے۔ دوسرے کی ذمہ داری یہ ہو گی گواہی دے یا نامۂ اعمال پیش کرے۔

نھج البلاغۃ خطبہ ۸۵ میں آیا ہے:

سَائِقٌ یَسُوقُهَا اِلَی مَحْشَرِهَا وَ شَاهِدٌ یَشْهَدُ عَلَیْهَا بِعَمَلِهَا...
ہنکانے والا اسے محشر تک ہنکا کر لے جائے گا اور گواہ اس کے عملوں کی گواہی دے گا۔

تقریباً یہی عبارت حضرت علی علیہ السلام کتاب اعلام الدین صفحہ ۲۴۸ پر بھی موجود ہے۔ کسی روایت میں اس بات کی طرف اشارہ نہیں ملتا کہ یہ وہی دو فرشتے ہیں جو انسان کی دائیں اور بائیں جانب موکل ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام سے مروی ہے:

الْغِنَی وَ الْفَقْرُ بَعْدَ الْعَرْضِ عَلَی اللّٰهِ۔[1]
فقیری اور امیری کا فیصلہ اللہ کے سامنے پیش ہونے کے بعد ہو گا۔

فضائل: حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ اس آیت میں سَآئِقٌ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہیں اور شَہِیۡدٌ علی بن ابی طالب (علیہ السلام) ہیں۔

---

[1] نھج البلاغۃ۔ کلمات قصار: ۴۵۲

اہم نکات

ا۔ قیامت کے دن انسان اپنے اعمال کی گرفت میں ہوگا۔

لَقَدۡ کُنۡتَ فِیۡ غَفۡلَۃٍ مِّنۡ ہٰذَا فَکَشَفۡنَا عَنۡکَ غِطَآءَکَ فَبَصَرُکَ الۡیَوۡمَ حَدِیۡدٌ ﴿۲۲﴾	۲۲۔ بے شک تو اس چیز سے غافل تھا چنانچہ ہم نے تجھ سے تیرا پردہ ہٹا دیا ہے لہٰذا آج تیری نگاہ بہت تیز ہے۔

تفسیر آیات

ا۔ لَقَدۡ کُنۡتَ فِیۡ غَفۡلَۃٍ مِّنۡ ہٰذَا: تجھ میں دنیا میں بھی سب کچھ دیکھنے کی صلاحیت تھی مگر خواہشات و مفادات اور آرزؤں کے تہ در تہ پردوں نے تجھے اندھیرے میں رکھا تھا۔ جن کی بینائی پر پردہ نہیں پڑا ہوا تھا وہ حق کے جمال سے دنیا میں محظوظ ہوتے رہے، اور اس دن کے خوف سے رات کی تاریکی میں روتے رہے۔ خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام مقام خلت پر فائز ہونے کے باوجود اس دن کے خوف سے یہ دعا کرتے تھے:

وَلَا تُخۡزِنِیۡ یَوۡمَ یُبۡعَثُوۡنَ ۙ[1]	اور مجھے اس روز رسوا نہ کرنا جب لوگ (دوبارہ) اٹھائے جائیں گے۔

۲۔ فَکَشَفۡنَا عَنۡکَ غِطَآءَکَ: تیری بصیرت کی آنکھوں پر سے خواہشات، مفادات اور آرزؤں کا پردہ ہم نے اٹھا دیا۔ آج یوم شہود ہے۔ تمام حقائق کھل کر سامنے آنے کا دن ہے۔

۳۔ فَبَصَرُکَ الۡیَوۡمَ حَدِیۡدٌ: آج تیری نگاہ نہایت تیز ہے۔ تمام حقائق کا مشاہدہ کر سکے گی۔ جو باتیں دنیا میں عقلوں پر پردے پڑے ہوئے ہونے کی وجہ سے تیرے لیے قابل قبول نہ تھی آج وہ حقیقت کے طور پر تیرے مشاہدے میں آ رہی ہے۔

اہم نکات

ا۔ قیامت کے دن پردے اٹھ جانے پر تمام حقائق سامنے آئیں گے۔

وَ قَالَ قَرِیۡنُہٗ ہٰذَا مَا لَدَیَّ عَتِیۡدٌ ﴿۲۳﴾	۲۳۔ اور اس کا ہم نشین (فرشتہ) کہے گا: جو میرے سپرد تھا وہ حاضر ہے۔

---
[1] ۲۶ شعراء: ۸۷

تشریح کلمات

عَتِیۡدٌ: 　　(ع ت د) ضرورت کی چیزوں کو ذخیرہ کر لینا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ قَالَ قَرِیۡنُہٗ: اکثر مفسرین کے نزدیک یہ ہم نشین وہ فرشتہ ہے جو دنیا میں اس کے اعمال ثبت کرنے پر مامور تھا۔ وہ فرشتہ کہے گا: جو نامۂ اعمال میرے سپرد تھا حاضر ہے۔ دیگر مفسرین کا خیال ہے کہ اس ہم نشین سے مراد شیطان ہے چونکہ قرآن میں شیطان کو قرین ہم نشین کہا ہے:

نُقَیِّضۡ لَہٗ شَیۡطٰنًا فَہُوَ لَہٗ قَرِیۡنٌ ۞ [۱]　　ہم اس پر ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں تو وہی اس کا ساتھی ہو جاتا ہے۔

اس صورت میں شیطان کہے گا: یہ وہ شخص ہے جو میرے سپرد تھا۔ آج یہ جہنم کے لیے حاضر ہے۔

اس پر اگلی آیت قرینہ ہو سکتی ہے:

قَالَ قَرِیۡنُہٗ رَبَّنَا مَاۤ اَطۡغَیۡتُہٗ وَ لٰکِنۡ کَانَ فِیۡ ضَلٰلٍۭ بَعِیۡدٍ ۞ [۲]　　اس کا ہم نشین (شیطان) کہے گا: ہمارے پروردگار! میں نے اسے گمراہ نہیں کیا تھا بلکہ یہ خود گمراہی میں دور تک چلا گیا تھا۔

اس آیت میں بھی شیطان کو قرین کہا ہے۔

مگر یہ جملہ مَا لَدَیَّ جو میرے پاس ہے، شیطان کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا چونکہ قیامت کے دن شیطان کے پاس کچھ نہیں ہو گا اور یہ کہنا جہنم شیطان کے پاس ہے درست معلوم نہیں ہوتا۔ اسی طرح مَا لَدَیَّ سے مراد اس انسان کو لینا کہ یہ وہ انسان ہے جو میرے قبضے میں تھا، بعید از فہم ہے۔ لہٰذا قرین سے مراد فرشتہ ہی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ابو بصیر کی ایک روایت ہے جس میں وہ کہتے ہیں: میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا: ھٰذَا مَا لَدَیَّ عَتِیۡدٌ سے کیا مراد ہے؟ فرمایا:

هو الملك الذی یحفظ علیه عمله۔ [۳]　　یہ وہ فرشتہ ہے جو اس کے عمل کو اس کے خلاف حفظ و ثبت کرتا تھا۔

اَلۡقِیَا فِیۡ جَہَنَّمَ کُلَّ کَفَّارٍ عَنِیۡدٍ ﴿۲۴﴾　　۲۴۔ (حکم ہو گا) تم دونوں (فرشتے) ہر عناد رکھنے والے کافر کو جہنم میں ڈال دو۔

---

[۱] ۴۳ زخرف: ۳۶　　[۲] ۵۰ ق: ۲۷　　[۳] بحار الانوار ۵: ۳۲۳

مَّنَّاعٍ لِّلۡخَیۡرِ مُعۡتَدٍ مُّرِیۡبِۣ ﴿۲۵﴾ الَّذِیۡ جَعَلَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ فَاَلۡقِیٰہُ فِی الۡعَذَابِ الشَّدِیۡدِ ﴿۲۶﴾

۲۵۔ خیر کو روکنے والے، حد سے تجاوز کرنے والے، شبہے میں رہنے والے کو۔

۲۶۔ جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو معبود بناتا تھا پس تم دونوں اسے سخت عذاب میں ڈال دو۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلۡقِیَا فِیۡ جَہَنَّمَ: ان دونوں فرشتوں کو جو اعمال ثبت کرنے پر مامور تھے حکم ہوگا: ہر سرکش کافر کو جہنم میں پھینک دو۔

۲۔ مَّنَّاعٍ لِّلۡخَیۡرِ: کارخیر کو روکنے میں پیش پیش۔ مناع صیغہ مبالغہ ہے۔

۳۔ مُعۡتَدٍ مُّرِیۡبِۣ: جرم کے ارتکاب میں یا کارخیر کے روکنے میں حد سے تجاوز کرنے والا ہے۔ اور حق کے بارے میں شک و شبہ اٹھانے والا ہو۔

۴۔ الَّذِیۡ جَعَلَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا: ان تمام جرائم کی اصل جڑ اور بنیاد شرک ہے۔ جو اللہ کے ساتھ غیر اللہ کو بھی معبود بناتا ہے اسے عذاب شدید میں ڈال دو۔

فضیلت: ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اذا کان یوم القیامة یقول اللّٰه تعالیٰ: لی و لعلی: القیافی النار من ابغضکما و ادخلا الجنة من احبکما۔ فذلك قوله تعالی: اَلۡقِیَا فِیۡ جَہَنَّمَ کُلَّ کَفَّارٍ عَنِیۡدٍ۔[1]

جب قیامت کا دن ہو گا تو اللہ تعالیٰ مجھے اور علی کو حکم دے گا جو تم دونوں سے بغض رکھتا تھا اسے جہنم میں اور جو تم دونوں سے محبت رکھتا تھا اسے جنت میں داخل کریں۔

قَالَ قَرِیۡنُہٗ رَبَّنَا مَاۤ اَطۡغَیۡتُہٗ وَ لٰکِنۡ کَانَ فِیۡ ضَلٰلٍۭ بَعِیۡدٍ ﴿۲۷﴾

۲۷۔ اس کا ہم نشین (شیطان) کہے گا: ہمارے پروردگار! میں نے اسے گمراہ نہیں کیا تھا بلکہ یہ خود گمراہی میں دور تک چلا گیا تھا۔

تفسیر آیات

اس کا ہم نشین شیطان کہے گا: میں اس پر جبر نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے تو صرف اسے دعوت دی تھی۔ یہ خود گمراہی کے لیے آمادہ تھا۔ شیطان کہے گا:

---

[1] بحار ۸: ۲۶۶

وَ مَا کَانَ لِیَ عَلَیۡکُمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍ اِلَّاۤ اَنۡ دَعَوۡتُکُمۡ فَاسۡتَجَبۡتُمۡ لِیۡ ۚ فَلَا تَلُوۡمُوۡنِیۡ وَ لُوۡمُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ ....[1]

اور میرا تم پر کوئی زور نہیں چلتا تھا مگر یہ کہ میں نے تمہیں صرف دعوت دی اور تم نے میرا کہنا مان لیا پس اب تم مجھے ملامت نہ کرو بلکہ خود کو ملامت کرو۔

عکرمۃ سے بھی اسی مضمون کی روایت ہے۔ ملاحظہ ہو شواھد التنزیل ذیل آیت۔

قَالَ لَا تَخۡتَصِمُوۡا لَدَیَّ وَ قَدۡ قَدَّمۡتُ اِلَیۡکُمۡ بِالۡوَعِیۡدِ ﴿۲۸﴾

۲۸۔ اللہ فرمائے گا: میرے سامنے جھگڑا نہ کرو اور میں نے تمہیں پہلے ہی برے انجام سے باخبر کر دیا تھا۔

مَا یُبَدَّلُ الۡقَوۡلُ لَدَیَّ وَ مَاۤ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِیۡدِ ﴿۲۹﴾ ع ۱۴

۲۹۔ میرے ہاں بات بدلتی نہیں ہے اور نہ ہی میں اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا ہوں۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالَ لَا تَخۡتَصِمُوۡا لَدَیَّ: ان کافروں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ندا آئے گی: آج میرے سامنے جھگڑنے سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا، نہ ہی ایک دوسرے پر ذمہ داری ڈالنے سے۔

۲۔ وَ قَدۡ قَدَّمۡتُ اِلَیۡکُمۡ بِالۡوَعِیۡدِ: میں نے دنیا کی زندگی میں تمہیں آج کے دن کے بارے میں بتایا تھا لیکن تم نے کفر پر ڈٹ جانے کو ترجیح دی۔

۳۔ مَا یُبَدَّلُ الۡقَوۡلُ لَدَیَّ: میرے اٹل فیصلے میں تبدیلی نہیں آ سکتی، میرا فیصلہ اٹل ہے:

وَ لٰکِنۡ حَقَّ الۡقَوۡلُ مِنِّیۡ لَاَمۡلَـَٔنَّ جَہَنَّمَ مِنَ الۡجِنَّۃِ وَ النَّاسِ اَجۡمَعِیۡنَ ۝ [2]

لیکن میری طرف سے فیصلہ حتمی ہو چکا ہے کہ میں دوزخ کو جنوں اور انسانوں سے ضرور بھر دوں گا۔

۴۔ وَ مَاۤ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِیۡدِ: کافروں کو جہنم میں بھیجنا میرے عدل کا تقاضا ہے۔ اللہ کو کسی پر ظلم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

یَوۡمَ نَقُوۡلُ لِجَہَنَّمَ ہَلِ امۡتَلَاۡتِ وَ تَقُوۡلُ ہَلۡ مِنۡ مَّزِیۡدٍ ﴿۳۰﴾

۳۰۔ جس دن ہم جہنم سے پوچھیں گے: کیا تو بھر گئی ہے؟ اور وہ کہے گی: کیا مزید ہے؟

تفسیر آیات

ایک تفسیر یہ ہے کہ کیا تو بھر گئی ہے کے جواب میں جہنم کہے گی: کیا مزید ہے؟ مجھ میں مزید گنجائش

---

[1] ۱۴ابراھیم: ۲۲ [2] ۳۲ سجدہ: ۱۳

نہیں ہے۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ جہنم کی طرف سے مزید جہنمیوں کا مطالبہ ہو گا۔ جہنم کے ساتھ اللہ کا وعدہ ہے کہ اس کو پر کیا جائے گا: سورہ سجدہ آیت ۱۳۔

جہنم کے ساتھ سوال و جواب ممکن ہے زبان حال کے طور پر ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ عالم آخرت میں ہر چیز شعور رکھتی ہو۔

ممکن ہے یہ سوال تمام جہنمیوں کو جہنم میں ڈالنے سے پہلے ہوا ہو۔ لہٰذا اس پر بحث کی ضرورت نہیں ہے کہ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ کا مطلب یہ بنتا ابھی جہنم پر نہیں ہوئی جبکہ اللہ کا وعدہ ہے: لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ۔

اس جگہ وہ روایت قابل تعجب ہے جو صحیح بخاری، صحیح مسلم، ترمذی، نسائی اور احمد بن حنبل نے انس سے نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لا تزال جهنم يلقى فيها و تقول هل من مزيد حتى يضع رب العزة قدمه... الى آخر

جہنم میں لوگوں کو پھینکا جائے گا۔ جہنم هل من مزید کہے جائے گی یہاں تک کہ اللہ رب العزت اپنا قدم جہنم میں رکھے گا....

یہ عقل سلیم اور صریح قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن فرماتا ہے: لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ کہ جہنم کو جنوں اور انسانوں سے پر کروں گا اور یہ روایت کہتی ہے اللہ اپنے قدم (پاؤں) سے پُر کرے گا۔ دوسری روایت میں رِجْل کا لفظ موجود ہے یعنی اللہ پاؤں رکھے گا۔ اس قسم کا تصور شان الٰہی میں نہایت گستاخی اور اسلامی تصور توحید کے سراسر منافی ہے۔ اعاذنا اللّٰہ من ذلك۔

وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ ﴿۳۱﴾

۳۱۔ اور جنت پرہیزگاروں کے لیے قریب کر دی جائے گی، وہ دور نہ ہوگی۔

تفسیر آیات

یہ نہیں فرمایا: اہل تقویٰ کو جنت کے نزدیک کیا جائے گا بلکہ فرمایا: جنت کو اہل تقویٰ کے نزدیک کیا جائے گا۔ ادھر جنت میں داخل ہونے کا حکم مل گیا اُدھر جنت میں پہنچ گئے۔ عالم آخرت کا نظام کائنات اس دنیا سے یقیناً مختلف ہے۔ اسی دنیا میں بھی آئن سٹائن کے نظریۂ اضافت کے مطابق زمان و مکان ہر جگہ ایک جیسا نہیں ہے۔ چنانچہ جو چیز نور کی رفتار سے سفر کرے اس کے چند منٹ ساکن لوگوں کے صدیوں کے برابر ہوں گے تو قیامت میں زمان و مکان کا وہ تصور نہ ہوگا جو دنیا میں ہے۔

اہم نکات

۱۔ جنت میں جانے کے لیے مسافت طے کرنا نہیں پڑے گی۔

هٰذَا مَا تُوۡعَدُوۡنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيۡظٍ ۝۳۲
مَنۡ خَشِیَ الرَّحۡمٰنَ بِالۡغَيۡبِ وَجَآءَ بِقَلۡبٍ مُّنِيۡبِۣ ۝۳۳

۳۲۔ یہ وہی ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا ہر اس شخص کے لیے جو توبہ کرنے والا، (حدود الٰہی کی) محافظت کرنے والا ہو،
۳۳۔ جو بن دیکھے رحمٰن سے ڈرتا ہو اور مکرر رجوع کرنے والا دل لے کر آیا ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ هٰذَا مَا تُوۡعَدُوۡنَ: یہ وہی جنت ہے جو ہر اَوَّابٍ کی صفت سے متصف لوگوں کے لیے ہے۔ اَوَّابٍ کے معنی عود کرنے، پلٹ کر آنے کے ہیں۔ صیغہ مبالغہ ہے، کثرت سے پلٹ کر آنا والا۔ یعنی جب بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا موقع آیا یہ پلٹ پلٹ کر اللہ کی اطاعت کی طرف آنے والا ہے۔

۲۔ حَفِيۡظٍ: خوب حفاظت کرنے والا۔ حدود اللہ اور فرائض اور اللہ کے ساتھ جو عہد و میثاق ہے اس کی حفاظت کرنے والا ہے۔

۳۔ مَنۡ خَشِیَ الرَّحۡمٰنَ: یہ جنت اس شخص کے لیے ہے جو بن دیکھے رحمٰن کے عدل سے خوف کھانے والا ہے۔

۴۔ وَجَآءَ بِقَلۡبٍ مُّنِيۡبٍ: اور بارگاہ الٰہی میں ایک ایسا قلب پیش کرے جو بار بار اللہ کی طرف رجوع کرنے والا ہے۔ قلب منیب: وہ دل جو ذکر خدا سے معمور ہو۔

الانابة والنوب رجوع الشیء مرة بعد اخری بار بار رجوع کرنے کے معنوں میں ہے۔

اہم نکات

۱۔ اہل جنت کون لوگ ہوں گے، ان کے اوصاف ذہن میں رکھنے چاہئیں۔

اُدۡخُلُوۡهَا بِسَلٰمٍ ؕ ذٰلِكَ يَوۡمُ الۡخُلُوۡدِ ۝۳۴
لَهُمۡ مَّا يَشَآءُوۡنَ فِيۡهَا وَلَدَيۡنَا

۳۴۔ تم اس جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ، وہ ہمیشہ رہنے کا دن ہوگا۔
۳۵۔ وہاں ان کے لیے جو وہ چاہیں گے حاضر

مَزِيدٌ﴿٣٥﴾ ہے اور ہمارے پاس مزید بھی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ ادۡخُلُوۡهَا بِسَلٰمٍ: جنت امن و سلامتی کی جگہ ہے۔ وہاں کسی قسم کی تکلیف کا تصور نہ ہوگا۔

۲۔ ذٰلِكَ يَوۡمُ الۡخُلُوۡدِ: یہ دن حیات جاودانی کا دن ہے۔ یعنی جنت کا یوم دنیا کے یوم کی طرح نہ ہوگا۔ دنیا کے یوم کے لیے زوال و اختتام ہے لیکن جنت کا یوم ابدی ہے جس کے لیے کوئی زوال نہیں ہے۔

۳۔ لَهُمۡ مَّا يَشَآءُوۡنَ فِيۡهَا: جنت میں ان کے لیے ہر وہ چیز موجود ہو گی جو وہ چاہیں گے۔ جنت میں جنتی کا ارادہ براہ راست نافذ ہوگا۔ دنیا میں ہم جس کا ارادہ کرتے ہیں اس کے حصول کے لیے بہت سے علل و اسباب کو عبور کرنا پڑتا ہے تب مراد پاتے ہیں مگر جنت میں صرف چاہنے کی دیر ہے وہ چیز حاضر ہو گی۔

۴۔ وَلَدَيۡنَا مَزِيۡدٌ: جنت کی نعمتیں جنتیوں کی خواہش تک محدود نہیں ہیں جن چیزوں کی وہ خواہش تو کیا تصور بھی نہیں کر سکتے وہ بھی انہیں مل جایا کریں گی۔

وَلَدَيۡنَا مَزِيۡدٌ کا مطلب یہی ہو سکتا ہے: ہمارے پاس خواہش سے مزید بھی ہے۔ یعنی وہ نعمتیں بھی ہیں جنہیں کسی ذہن نے سوچا نہ ہوگا، نہ کسی کے تصور میں آیا ہوگا۔

اہم نکات

۱۔ جنت میں مومن کا ارادہ نافذ ہے۔ جس کا ارادہ نہیں کر پاتا وہ بھی موجود ہے۔

وَكَمۡ اَهۡلَكۡنَا قَبۡلَهُمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ هُمۡ اَشَدُّ مِنۡهُمۡ بَطۡشًا فَنَقَّبُوۡا فِي الۡبِلَادِ ؕ هَلۡ مِنۡ مَّحِيۡصٍ﴿٣٦﴾

۳۶۔ ہم نے ان سے پہلے کتنی ایسی قوموں کو ہلاک کیا جو ان سے قوت میں کہیں زیادہ تھیں، پس وہ شہر بہ شہر پھرے، کیا کوئی جائے فرار ہے؟

تشریح کلمات

قَرۡنٍ: (ق ر ن) جماعت، امت

بَطۡشًا: (ب ط ش) البطش کے معنی کوئی چیز زبردستی لے لینا کے ہیں۔

فَنَقَّبُوۡا: (ن ق ب) گشت کرنے کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَكَمۡ اَهۡلَكۡنَا: کفار مکہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ان کفار سے کہیں زیادہ طاقتور قوموں کو ہم نے ہلاک کیا۔ مکہ والوں کی ان کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔

۲۔ فَنَقَّبُوۡا فِی الۡبِلَادِ: ان لوگوں نے شہروں کو چھان مارا یا شہر بہ شہر پھرے انہیں فتح کرنے کے لیے یا تجارت کے لیے۔ جیسے فرمایا:

لَا یَغُرَّنَّکَ تَقَلُّبُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فِی الۡبِلَادِ ؕ[1]	(اے رسول!) مختلف علاقوں میں کافروں کی آمد و رفت آپ کو کسی دھوکے میں نہ ڈالے۔

۳۔ هَلۡ مِنۡ مَّحِیۡصٍ: کیا اس کی وجہ سے انہیں ہلاکت سے بچنے کا کوئی راستہ ملا؟

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَذِکۡرٰی لِمَنۡ کَانَ لَهٗ قَلۡبٌ اَوۡ اَلۡقَی السَّمۡعَ وَ هُوَ شَهِیۡدٌ ﴿۳۷﴾	۳۷۔ اس میں ہر صاحب دل کے لیے یقیناً عبرت ہے جو کان لگا کر سنے اور (اس کا دل) حاضر رہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَذِکۡرٰی: گزشتہ اقوام کی ہلاکت میں عبرت ہے ان لوگوں کے لیے جو حصول حق کے لیے دو ذریعوں میں سے ایک ذریعہ اختیار کریں۔

الف: لَهٗ قَلۡبٌ: اس کے پاس دل ہو۔ دل محاورہ ہے جس سے عقل و فکر مراد لی جاتی ہے۔ عقل و فکر سے کام لینے والے خود حق و باطل میں تمیز دے سکتے ہیں۔

ب: اَوۡ اَلۡقَی السَّمۡعَ: یا ہادیان برحق سے حق کی باتیں کان لگا کر سنیں تو حق اور باطل میں تمیز دے سکتے ہیں۔ وَ هُوَ شَهِیۡدٌ: شرط یہ ہے کہ قبول حق کے لیے ان کی عقل و فکر میں آمادگی ہو۔ قبول حق کے لیے ضد اور ہٹ دھرمی میں نہ ہو یا ہادیان برحق کی باتیں سنتے وقت ان کا دل حاضر ہو ورنہ صرف آواز کان کے پردوں سے ٹکرانے کی وجہ سے حقائق کا فہم و ادراک ممکن نہیں ہے۔

فضیلت: محمد بن حنفیہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے اپنے بابا علی علیہ السلام کو یہ فرماتے ہوئے:

لِمَنۡ کَانَ لَهٗ قَلۡبٌ سے مراد میرا قلب ہے۔

دوسری سند میں ہے: انا ذلک لَذِکۡرٰی، وہ لَذِکۡرٰی میں ہوں۔

---

[1] ۳ آل عمران: ۱۹۶

سدی، ابن عباس سے روایت کرتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص نے دو بڑی جسامت کی اونٹیاں تحفتاً پیش کیں۔ آپؐ نے اصحاب سے فرمایا: تم میں کوئی شخص ایسا ہے کہ جو دو رکعت نماز پڑھے جس میں دنیا کے کسی معاملے کا خیال نہ ہو اور دنیا کے کسی مفاد کا تصور اس کے ذہن میں نہ آئے؟

علی (علیہ السلام) کھڑے ہوئے اور نماز میں داخل ہوئے۔ سلام پھیرتے ہی جبرئیل نازل ہوئے اور اللہ کا حکم سنایا: یہ ایک اونٹنی علی کو دے دو۔ جس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: علی نے تشہد میں سوچا تھا کہ ان دو اونٹیوں میں سے کس اونٹنی کو لوں؟ جبرئیل نے کہا: سوچا اس طرح ہے کہ ان دونوں میں سے موٹی اونٹنی کو لوں گا اور برائے رضائے خدا صدقہ کر دوں گا۔ لہٰذا یہ تصور ذاتی نہیں ہے، نہ برائے دنیا ہے۔ جس پر رسول اللہ ﷺ نے دونوں اونٹنیاں حضرت علی (علیہ السلام) کو عنایت فرمائیں۔ اس بارے میں یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ما من عبد صلی للّٰہ رکعتین لا یفکر فیھما من امور الدنیا بشیء الا رضی اللّٰہ عنہ و غفرلہ۔

جو شخص اللہ کے لیے دو رکعت نماز پڑھے جس میں کوئی دنیاوی بات ذہن میں نہ لائے تو اللہ اس سے راضی ہو جائے گا اور اسے بخش دے گا۔

اس حدیث کو حافظ السروی نے وکیع، سدی اور عطا سے روایت کیا ہے۔ جیسا کہ مناقب آل ابی طالب ۲: ۲۰ میں ہے۔ ملاحظہ شواھد التنزیل ذیل آیت۔

اہم نکات

۱۔ قلب و سماعت میں آمادگی کے بغیر حق کی بات سمجھ میں نہیں آتی۔

وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَ مَا بَیۡنَہُمَا فِیۡ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ٭ۖ وَّ مَا مَسَّنَا مِنۡ لُّغُوۡبٍ ﴿۳۸﴾

۳۸۔ اور تحقیق ہم نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کو چھ دنوں میں پیدا کیا اور ہمیں کوئی تھکان محسوس نہیں ہوئی۔

تشریح کلمات

لُّغُوۡبٍ: (ل غ ب) بہت زیادہ درماندہ ہونے اور تھک جانے کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

اللہ کو کائنات خلق کرنے کے لیے ایک ارادے کے سوا کچھ کرنا نہیں پڑتا جو تھک جائے، بقول بائبل ساتویں دن آرام کرنا پڑے۔ یہ بات ہمارے لیے ہے کہ ہم کوئی مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں تو علل و اسباب عبور کر کے اس مقصد کو حاصل کر سکتے ہیں۔ بعض کاموں میں علل و اسباب زیادہ اور پیچیدہ ہوتے ہیں تو تھکنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے ایسا نہیں ہے:

اِنَّمَآ اَمۡرُہٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیۡئًا اَنۡ یَّقُوۡلَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ○[۱] — جب وہ کسی چیز کا ارادہ کر لیتا ہے تو بس اس کا امر یہ ہوتا ہے کہ اسے یہ کہے: ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ کائنات کی تخلیق میں اللہ کا صرف ایک ارادہ صرف ہوا ہے۔

فَاصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ وَ سَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ قَبۡلَ طُلُوۡعِ الشَّمۡسِ وَ قَبۡلَ الۡغُرُوۡبِ ﴿۳۹﴾

۳۹۔ جو باتیں یہ کرتے ہیں اس پر آپ صبر کریں اور طلوع آفتاب اور غروب آفتاب سے پہلے اپنے رب کی ثنا کے ساتھ تسبیح کریں۔

وَ مِنَ الَّیۡلِ فَسَبِّحۡہُ وَ اَدۡبَارَ السُّجُوۡدِ ﴿۴۰﴾

۴۰۔ اور رات کے وقت بھی اور سجدوں کے بعد بھی اس کی تسبیح کریں۔

تفسیر آیات

۱۔ فَاصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ: مشرکین آپؐ کے خلاف اور آپؐ کی تکذیب میں جو باتیں کرتے ہیں ان سے آپ کی دل آزاری ضرور ہوتی ہے۔

قَدۡ نَعۡلَمُ اِنَّہٗ لَیَحۡزُنُکَ الَّذِیۡ یَقُوۡلُوۡنَ ...[۲] — ہمیں علم ہے کہ ان کی باتیں یقیناً آپ کے لیے رنج کا باعث ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا:

وَ لَقَدۡ نَعۡلَمُ اَنَّکَ یَضِیۡقُ صَدۡرُکَ بِمَا یَقُوۡلُوۡنَ ○[۳] — اور بتحقیق ہمیں علم ہے کہ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس سے آپ یقیناً دل تنگ ہو رہے ہیں۔

۱۔ ۳۶ یٰس: ۸۲ ۲۔ ۶ انعام: ۳۳ ۳۔ ۱۵ حجر: ۹۷

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے زبانی ضربت سے زخم زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ مقولہ ہے: ضرب اللسان اوجع من ضرب السنان۔ لسانی ضربت، سنانی ضربت سے زیادہ اذیت ناک ہوتی ہے۔

۲۔ وَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ: صبر کی طاقت حاصل کرنے کے ذریعے کا ذکر ہے۔ وہ ذریعہ عبادت ہے۔ عبادت اس کائنات کی طاقت کے سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے ربط کا نام ہے جو دنیا کی ہر طاقت سے بڑی طاقت ہے۔

۳۔ قَبۡلَ طُلُوۡعِ الشَّمۡسِ: آفتاب نکلنے سے پہلے سے مراد نماز صبح ہو سکتی ہے۔

۴۔ وَقَبۡلَ الۡغُرُوۡبِ: سے مراد نماز ظہر و عصر ہو سکتی ہے۔

۵۔ وَمِنَ الَّيۡلِ فَسَبِّحۡهُ: سے مراد مغرب و عشا کی نمازیں ہو سکتی ہیں۔

۶۔ وَاَدۡبَارَ السُّجُوۡدِ: سجدوں کے بعد سے مراد نوافل اور تعقیبات ہو سکتی ہیں۔

احادیث میں ان اوقات سے مراد نماز یومیہ ہونے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

اس آیت کے ذیل میں جو احادیث ہیں ان میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام مروی روایت میں ان اوقات میں ذکر سے مراد یہ ہے:

صبح اور شام کے اوقات میں دس مرتبہ پڑھے: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحۡدَهٗ لَا شَرِيكَ لَهٗ، لَهُ الۡمُلۡكُ وَ لَهُ الۡحَمۡدُ يُحۡيِى وَ يُمِيتُ و يُمِيتُ وَ يُحۡيِى وَ هُوَ حَيٌّ لَا يَمُوتُ بِيَدِهِ الۡخَيۡرُ وَ هُوَ عَلَى كُلِّ شَيۡءٍ قَدِيۡرٌ...۔[1]

وَاَدۡبَارَ السُّجُوۡدِ سجدوں کے بعد کے بارے میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے:

رَكۡعَتَانِ بَعۡدَ الۡمَغۡرِبِ۔[2] مغرب کے بعد کی رکعتیں مراد ہیں۔

حضرت امام رضا علیہ السلام سے روایت میں ہے:

اَرۡبَعُ رَكۡعَاتٍ بَعۡدَ الۡمَغۡرِبِ۔[3] مغرب کے بعد چار رکعتیں مراد ہیں۔

سجدوں سے فارغ ہونے کے بعد تعقیبات پر بھی قابل تطبیق ہے۔ تعقیبات میں افضل ترین ذکر تسبیح فاطمہ الزہرا سلام اللہ علیہا ہے۔

روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت الزہرا سلام اللہ علیہا کو یہ تسبیح تعلیم فرمائی کہ ہر نماز فریضہ کے بعد پڑھے: ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر، ۳۳ مرتبہ الحمد للہ ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ۔[4]

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے:

مَا عُبِدَ اللّٰهُ بِشَيۡءٍ مِنَ التَّحۡمِيدِ اَفۡضَلَ تسبیح فاطمہ (س) سے افضل کسی حمد سے اللہ کی بندگی

---

[1] الکافی ۲: ۵۱۸ [2] الکافی، ج ۳: ۴۴۴ کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ النوافل حدیث ۱۱
[3] تفسیر قمی ۲: ۳۲۷ [4] الکافی ۳: ۳۴۲ باب تعقیب بعد الصلاۃ و دعاء

مِنْ تَسْبِيحِ فَاطِمَةَ علیہا السلام وَ لَوْ كَانَ شَيْءٌ أَفْضَلَ مِنْهُ لَنَحَلَهُ رَسُولُ اللّٰهِ فَاطِمَةَ۔[1]

نہیں ہو سکتی اگر اس سے افضل عبادت ہوتی تو رسول اللہؐ فاطمہ (س) کو عنایت فرماتے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

تَسْبِيحُ فَاطِمَةَ ع فِي كُلِّ يَوْمٍ فِي دُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ صَلَاةِ أَلْفِ رَكْعَةٍ فِي كُلِّ يَوْمٍ۔[2]

ہر روز ہر نماز کے بعد تسبیح فاطمۃ (س) مجھے روزانہ ایک ہزار رکعت نماز سے زیادہ پسند ہے۔

اہم نکات

۱۔ صبر کی قوت حاصل کرنے کا ذریعہ تسبیح و عبادت ہے۔

وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيبٍ ﴿۴۱﴾

۴۱۔ اور کان لگا کر سنو! جس دن منادی قریب سے پکارے گا،

يَّوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ ﴿۴۲﴾

۴۲۔ اس دن لوگ اس چیخ کو حقیقتاً سن لیں گے، وہی (قبروں سے) نکل پڑنے کا دن ہوگا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَاسْتَمِعْ: کان لگا کر سن لیں۔ خطاب اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ہے، بتانا سب کو مقصود ہے۔ یہاں ”سنو“ کا مطلب سننے کے لیے آمادہ رہو۔ کس چیز کے سننے کے لیے؟

۲۔ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ: منادی کی ندا سننے کے لیے آمادہ رہو مِنْ مَّكَانٍ قَرِيبٍ یہ ندا ایسی ہو گی جو بہت قریب سے آئے گی کیونکہ یہ ندا دینے والا دور نہیں، ہر ایک کے پاس موجود ہے۔ خواہ یہ ندا خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو یا اسرافیل کے ذریعے۔

۳۔ يَّوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ: اس ندا کو ہر کوئی سنے گا چونکہ یہ ندا کانوں کے پردے سے ٹکرانے کی آواز نہیں ہے کہ کوئی سنے اور کوئی نہ سنے بلکہ یہ ندائے حیات ہے۔ ہر قابل احیاء موجود کے وجود کی گہرائیوں تک اس ندا نے جانا ہے۔

---

[1] الکافی ۳: ۳۴۳　[2] الکافی ۳: ۳۴۳

۴۔ ذٰلِکَ یَوۡمُ الۡخُرُوۡجِ: چونکہ یہ ندا اس دن سے متعلق ہے جس میں مردے زندہ ہو کر قبروں سے اٹھیں گے۔ آیت کا اشارہ دوسرے صور کی طرف ہے جس سے تمام اموات زندہ ہو جائیں گی۔

اِنَّا نَحۡنُ نُحۡیٖ وَ نُمِیۡتُ وَ اِلَیۡنَا الۡمَصِیۡرُ ﴿۴۳﴾

۴۳۔ یقیناً ہم ہی زندہ کرتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں اور بازگشت بھی ہماری ہی طرف ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّا نَحۡنُ نُحۡیٖ: حیات دینے، حیات سلب کرنے اور دوبارہ اعادہ حیات کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے اور حیات کے سفر میں انتہائی منزل بارگاہ الٰہی ہے۔ وَ اِلَیۡنَا الۡمَصِیۡرُ۔

یَوۡمَ تَشَقَّقُ الۡاَرۡضُ عَنۡہُمۡ سِرَاعًا ؕ ذٰلِکَ حَشۡرٌ عَلَیۡنَا یَسِیۡرٌ ﴿۴۴﴾

۴۴۔ اس دن زمین ان پر سے پھٹ جائے گی تو یہ تیزی سے دوڑیں گے، یہ جمع کر لینا ہمارے لیے آسان ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ جب زمین پھٹ جائے گی تو لوگ بڑی تیزی سے پکارنے والے کو لبیک کہنے کے لیے دوڑیں گے چونکہ وہاں جائے فرار تو ہے نہیں۔

۲۔ ذٰلِکَ حَشۡرٌ عَلَیۡنَا یَسِیۡرٌ: یہ جمع کر لینا ہمارے لیے آسان ہے۔ زمین کے پھٹنے سے زمین میں دفن ذرات اوپر آ جائیں گے۔ ان ذرات کو جمع کر کے اسی ڈھانچے کو دوبارہ بنانا اللہ کے لیے مشکل نہیں ہے۔

نَحۡنُ اَعۡلَمُ بِمَا یَقُوۡلُوۡنَ وَ مَاۤ اَنۡتَ عَلَیۡہِمۡ بِجَبَّارٍ ۟ فَذَکِّرۡ بِالۡقُرۡاٰنِ مَنۡ یَّخَافُ وَعِیۡدِ ﴿۴۵﴾ ع ۳/۱۶

۴۵۔ یہ جو کچھ کہ رہے ہیں اسے ہم سب سے زیادہ جانتے ہیں اور آپ ان پر زبردستی کرنے والے نہیں ہیں، پس آپ اس قرآن کے ذریعے اس شخص کو نصیحت کریں جو ہمارے عذاب کا خوف رکھتا ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ نَحۡنُ اَعۡلَمُ بِمَا یَقُوۡلُوۡنَ: یہ لوگ آپ کی رسالت و امانت کے بارے میں جو باتیں کرتے

ہیں انہیں ہم خوب جانتے ہیں اور انکار آخرت کے بارے میں بھی ان باتوں سے ہم خوب واقف ہیں۔

۲۔ وَمَآ اَنۡتَ عَلَیۡہِمۡ بِجَبَّارٍ: ان کی بدکلامی کے جواب میں آپ ان پر جبر نہیں کر سکتے کہ طاقت کے ذریعے انہیں ایمان لانے پر مجبور کریں۔ ایمان کا تعلق دل سے ہے اور دل جبر کی منطق نہیں سمجھتا۔

۳۔ فَذَکِّرۡ بِالۡقُرۡاٰنِ: آپ کی ذمہ داری یہ ہے کہ قرآن کے ذریعے ان کی نصیحت کریں۔ ان کے وجدان اور ضمیر سے بات کریں۔ نغمہ قرآن سے ان کے دلوں کو بیدار کریں۔ اگر ان کے دلوں میں عذاب کے خوف کا شائبہ ہوگا تو وہ اس نغمے سے بیدار ہو جائیں گے۔

اہم نکات

۱۔ قیامت کے دن ندائے حیات (صور) سے سب زندہ ہو جائیں گے۔

۲۔ حیات دہندہ کے ہاتھ میں سلب حیات اور اعادۂ حیات ہے۔

۳۔ اللہ کو جبر کا ایمان قبول نہیں، دل کا ایمان قبول ہے۔

۴۔ قرآن دلوں سے سرگوشی کرتا ہے اگر اس دل میں حیات کی رمق موجود ہو۔

سُوۡرَةُ الذّٰرِيٰت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس سورۃ المبارکۃ کا نام الذاریات ہے جو شروع میں مذکور وَالذّٰرِیٰتِ ذَرۡوًا سے ماخوذ ہے۔

اس سورہ مبارکہ کی آیات بالاتفاق ۶۰ ہیں۔ یہ سورۃ مکہ میں نازل ہوئی اس لیے سورۃ کے مضامین مشرکین کے عقائد کی رد، اللہ کی توحید، تدبیر جہان اللہ کے ہاتھ میں ہے اور کچھ اہل تقویٰ کی منزلت کے بیان پر مشتمل ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	بنام خدائے رحمن رحیم
وَ الذّٰرِیٰتِ ذَرۡوًا ۙ﴿۱﴾	۱۔ قسم ہے بکھیر کر اڑانے والی (ہواؤں) کی
فَالۡحٰمِلٰتِ وِقۡرًا ۙ﴿۲﴾	۲۔ پھر بوجھ اٹھانے والے (بادلوں) کی،
فَالۡجٰرِیٰتِ یُسۡرًا ۙ﴿۳﴾	۳۔ پھر سبک رفتاری سے چلنے والی (کشتیوں) کی،
فَالۡمُقَسِّمٰتِ اَمۡرًا ﴿۴﴾	۴۔ پھر امور کو تقسیم کرنے والے فرشتوں کی۔

تشریح کلمات

الذّٰرِیٰتِ: (ذ ر و) الذرو اڑنے کے معنوں میں ہے۔ تَذۡرُوۡهُ الرِّیٰحُ [1]۔ ہوائیں اسے اڑاتی ہیں۔

وِقۡرًا: (و ق ر) بوجھ، سنگینی کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

بندے صرف اللہ کی قسم کھا سکتے ہیں مگر اللہ اپنی مخلوقات میں سے جس کی چاہے قسم کھا لیتا ہے۔

---

[1] ۱۸ کہف: ۴۵

۱۔ وَالذّٰرِیٰتِ ذَرۡوًا: قسم ہے اڑانے اور بکھیرنے والے کی۔ روایت کے مطابق اس سے ہوا مراد ہے۔ ہوا کے اڑانے، بکھیرنے سے درختوں اور نباتات کی بارداری ہوتی ہے۔

۲۔ فَالۡحٰمِلٰتِ وِقۡرًا: قسم ہے بوجھ اٹھانے والے بادلوں کی۔ ہوا ہی اوقیانوس سے بخارات اٹھاتی ہے، پھر پراگندہ ہو جاتی ہے۔ بخارات کو بادلوں کی شکل میں اٹھاتی ہے اور براعظموں کی طرف رواں ہو جاتی ہے۔ یہاں دونوں قطبوں سے آنے والی سرد ہواؤں سے ٹکراتی ہے جس سے یہ باد تقسیم ہو جاتے ہیں۔

مجمع البیان میں آیا ہے:

> ابن الکواء نے حضرت امیرالمومنین علیہ السلام سے سوال کیا: وَالذّٰرِیٰتِ ذَرۡوًا کیا ہے؟ فرمایا: ہوا ہے۔ پوچھا: فَالۡحٰمِلٰتِ وِقۡرًا کیا ہے؟ فرمایا: بادل ہے۔ پوچھا: فَالۡجٰرِیٰتِ یُسۡرًا کیا ہے؟ فرمایا: کشتیاں ہیں۔ پوچھا: فَالۡمُقَسِّمٰتِ اَمۡرًا کیا ہے؟ فرمایا فرشتے ہیں۔

فرشتے بہت سے امور پر مامور ہیں۔ قبض روح ملک الموت کے ذمے، صور پھونکنا اسرافیل اور وحی نازل کرنا جبرائیل علیهم السلام کے ذمے ہے۔

اِنَّمَا تُوۡعَدُوۡنَ لَصَادِقٌ ۙ﴿۵﴾	۵۔ جس بات کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ یقیناً سچ ہے۔
وَّ اِنَّ الدِّیۡنَ لَوَاقِعٌ ؕ﴿۶﴾	۶۔ اور جزا (کا دن) ضرور واقع ہوگا۔

تفسیر آیات

انسانی زندگی کی تدبیر سے متعلق چیزوں کی قسم کھانے کے بعد فرمایا: جس روز قیامت کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ سچا وعدہ ہے۔

۲۔ وَّ اِنَّ الدِّیۡنَ لَوَاقِعٌ: اور جزا کا دن واقع ہونا ضروری ہے۔ جو ذات ہوا کے ذریعے لاکھوں ٹن وزنی پانی سے لدے ہوئے بادل اٹھاتی ہے، کسی ناتواں عاجز کی طرف سے نہیں، اسی ذات کی طرف سے یہ اعلان ہے کہ جزا و سزا کا دن آنے والا ہے۔

وَ السَّمَآءِ ذَاتِ الۡحُبُکِ ۙ﴿۷﴾	۷۔ قسم ہے راہوں والے آسمان کی،
اِنَّکُمۡ لَفِیۡ قَوۡلٍ مُّخۡتَلِفٍ ۙ﴿۸﴾	۸۔ تم لوگ یقیناً متضاد باتوں میں پڑے ہوئے ہو۔

تفسیر آیات

حبك راستوں کو بھی کہتے ہیں اور محکم اور مضبوطی کے معنوں میں بھی آیا ہے۔

ا۔ لہٰذا ہو سکتا ہے اس آیت کا یہ ترجمہ ہو: قسم ہے مضبوط و محکم آسمان کی۔ اگر راستے مراد لیے جائیں تو ہمیں یہ بات اس وقت پوری طرح معلوم نہیں ہے۔ آنے والی نسلوں کو بہتر معلوم ہو سکے گا چونکہ آج کے ماہرین فلکیات کے لیے کسی حد تک معلوم ہونا شروع ہو گیا ہے کہ آسمان میں راستے ہیں۔ جیسے فرمایا:

وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا فَوۡقَکُمۡ سَبۡعَ طَرَآئِقَ ....[1] اور بتحقیق ہم نے تمہارے اوپر سات راستے بنائے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

سَلُونِی قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُونِی فَلَاَنَا بِطُرُقِ السَّمَاءِ اَعْلَمُ مِنِّی بِطُرُقِ الْاَرْضِ....[2] مجھے کھو دینے سے پہلے مجھ سے پوچھ لو اور میں زمین کی راہوں سے زیادہ آسمان کے راستوں سے واقف ہوں۔

۲۔ اِنَّکُمۡ لَفِیۡ قَوۡلٍ مُّخۡتَلِفٍ: کبھی کہتے ہو قرآن محمد کی اپنی تصنیف ہے کبھی کہتے ہو یہ داستان پارینہ ہے، کبھی کہتے ہو اسے کوئی اور تعلیم دیتا ہے، کبھی کہتے ہو یہ کاہن ہے، کبھی ساحر، کبھی شاعر، کبھی مجنون کہتے ہو۔ اگر ہمارے رسول میں کسی قسم کی کمزوری پائی جاتی تو تم سب اس کمزوری کو متفقہ طور پر اُٹھاتے۔ مختلف الزامات عائد کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس رسول میں تم کو کوئی کمزوری نہیں ملی ہے۔

یُّؤۡفَکُ عَنۡهُ مَنۡ اُفِکَ ۝ ۹۔ اس (قرآن) سے وہی برگشتہ ہوتا ہے جسے برگشتہ کیا گیا ہو۔

تفسیر آیات

اس قرآن سے وہی برگشتہ ہو گا جسے گمراہ کرنے والوں نے برگشتہ کیا ہے ورنہ وہ اپنی فطری حالت پر ہوتا تو قرآن سے برگشتہ نہ ہوتا۔

قُتِلَ الۡخَرّٰصُوۡنَ ۝ ۱۰۔ بے بنیاد باتیں کرنے والے مارے جائیں،

الَّذِیۡنَ هُمۡ فِیۡ غَمۡرَۃٍ سَاهُوۡنَ ۝ ۱۱۔ جو جہالت کی وجہ سے غفلت میں پڑے ہوئے ہیں،

یَسۡـَٔلُوۡنَ اَیَّانَ یَوۡمُ الدِّیۡنِ ۝ ۱۲۔ وہ پوچھتے ہیں: جزا کا دن کب ہو گا؟

تشریح کلمات

الخراص: (خ ر ص) الکذاب۔ ظن و تخمین پر یقین رکھنے والے۔

---

[1] ۲۳ مومنون: ۱۷ [2] نہج البلاغۃ خ ۱۸۹

غَمۡرَۃٍ: (غ م ر) غمرۃ اس کثیر پانی کو کہتے ہیں جس کی اتھاہ نظر نہ آئے۔ اسی سے یہ جہالت کے لیے ضرب المثل ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قُتِلَ الۡخَرّٰصُوۡنَ: قیامت کے بارے میں ظن وتخمین کو دلیل بنا کر جھوٹ قبول کرنے والے مارے جائیں۔ اس جگہ قُتِلَ لُعِن کے معنوں میں بتایا جاتا ہے یعنی رحمت و حیات سے محروم ہوں یہ لوگ جو چند ایک مفروضوں کی بنیاد پر قیامت کو رد کرتے ہیں کہ ہم جب خاک ہو چکے ہوں گے تو ہم پھر سے کیسے زندہ ہو سکتے ہیں۔

۲۔ الَّذِیۡنَ ہُمۡ فِیۡ غَمۡرَۃٍ سَاہُوۡنَ: جو جہالت کی وجہ سے خواب غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ مجمع البیان میں آیا ہے کہ جہالت کا پہلا مرحلہ سہو، پھر غفلت، پھر غمرۃ ہے۔ اس طرح غَمۡرَۃٍ جہالت کا آخری مرحلہ ہے لیکن آیت کی تعبیر اس بات کی تائید نہیں کرتی۔ آیت کے مطابق غَمۡرَۃٍ کا مرحلہ پہلے اور سہو کا مرحلہ بعد میں ہے کہ وہ تاریکی اور جاہلیت کی وجہ سے سہو اور غفلت کی حالت میں ہیں۔

۳۔ یَسۡـَٔلُوۡنَ اَیَّانَ یَوۡمُ الدِّیۡنِ: بطور استہزاء اور مذاق کہتے ہیں: قیامت کا دن کب ہو گا؟ انہیں جواب بھی اسی لہجے میں دیا گیا:

یَوۡمَ ہُمۡ عَلَی النَّارِ یُفۡتَنُوۡنَ ﴿۱۳﴾　۱۳۔ جس دن یہ لوگ آگ پر تپائے جائیں گے۔

ذُوۡقُوۡا فِتۡنَتَکُمۡ ؕ ہٰذَا الَّذِیۡ کُنۡتُمۡ بِہٖ تَسۡتَعۡجِلُوۡنَ ﴿۱۴﴾　۱۴۔ اپنے فتنے (کا مزہ) چکھو، یہ وہی ہے جس کی تمہیں عجلت تھی۔

تفسیر آیات

۱۔ قیامت کا دن اس وقت آئے گا جب کفار آگ میں تپا دیے جائیں گے۔ فتنہ دراصل سونے کو آگ میں تپا دینے کو کہتے ہیں تاکہ خالص سونا کھوٹ سے جدا ہو جائے۔ بعد میں آزمائش اور امتحان سے دوچار ہونے کے لیے استعمال ہونے لگا۔

۲۔ ذُوۡقُوۡا فِتۡنَتَکُمۡ: ازراہ تمسخر فرمایا: چکھو اپنے تپانے کو یعنی آگ میں تپ جانے کی اذیت کا مزہ چکھو۔

۳۔ ہٰذَا الَّذِیۡ: یہ وہی ہے جس کے بارے میں تم تمسخر کے طور پر کہتے تھے قیامت کب آئے گی۔

اہم نکات

۱۔ دین کے بارے میں ظن و گمان پر عمل کرنے والے ہلاکت میں ہوں گے: قُتِلَ الۡخَرّٰصُوۡنَ۔

۲۔ تاریکی اور جہالت کی وجہ سے لوگ وہم و گمان کو دلیل سمجھتے ہیں۔

اِنَّ الۡمُتَّقِیۡنَ فِیۡ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوۡنٍ ﴿۱۵﴾ اٰخِذِیۡنَ مَاۤ اٰتٰہُمۡ رَبُّہُمۡ ؕ اِنَّہُمۡ کَانُوۡا قَبۡلَ ذٰلِکَ مُحۡسِنِیۡنَ ﴿۱۶﴾

۱۵۔ (اس روز) اہل تقویٰ یقیناً جنتوں اور چشموں میں ہوں گے۔

۱۶۔ ان کے رب نے جو کچھ انہیں دیا ہے اسے وصول کر رہے ہوں گے، وہ یقیناً اس (دن) سے پہلے نیکی کرنے والے تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ الۡمُتَّقِیۡنَ: قیامت کے بعد اہل تقویٰ ایسے بوستان اور متعدد چشموں میں ہوں گے جن کا وصف و بیان ہمارے لیے ناقابل فہم ہے۔

۲۔ اٰخِذِیۡنَ مَاۤ اٰتٰہُمۡ: جنت میں چونکہ مومن کا ارادہ نافذ ہے اور جو چاہے وہ اس کی دسترس میں ہوگا لہٰذا اللہ جو نعمت اہل جنت کو فراہم فرمائے گا وہ صرف وصول کرنا ہوگی۔ اٰخِذِیۡنَ وہ صرف اخذ کر رہے ہوں گے۔

۳۔ اِنَّہُمۡ کَانُوۡا قَبۡلَ ذٰلِکَ مُحۡسِنِیۡنَ: ان نیکیوں کے صلے میں جو وہ اس جنت کی زندگی سے پہلے دنیا میں بجا لاتے رہے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ متقی کو جنت کی نعمتیں صرف وصول کرنی ہوں گی۔

کَانُوۡا قَلِیۡلًا مِّنَ الَّیۡلِ مَا یَہۡجَعُوۡنَ ﴿۱۷﴾

وَ بِالۡاَسۡحَارِ ہُمۡ یَسۡتَغۡفِرُوۡنَ ﴿۱۸﴾

وَ فِیۡۤ اَمۡوَالِہِمۡ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَ الۡمَحۡرُوۡمِ ﴿۱۹﴾

۱۷۔ وہ رات کو کم سویا کرتے تھے،

۱۸۔ اور سحر کے اوقات میں استغفار کرتے تھے

۱۹۔ اور ان کے اموال میں سائل اور محروم کے لیے حق ہوتا تھا۔

تفسیر آیات

۱۔ کَانُوۡا قَلِیۡلًا مِّنَ الَّیۡلِ: ان متقین کے اوصاف کا بیان ہے جو جنت اور چشموں میں ہوں

گے۔ پہلی صفت یہ تھی کہ وہ رات کو کم سوتے تھے۔ وہ دوسروں کی بہ نسبت کم سوتے تھے، نہ یہ کہ رات کا بیشتر حصہ عبادت میں گزارتے اور کم حصہ سوتے ہیں۔

اس کی دلیل یہ آیت ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو حکم ملتا ہے۔ بیشتر حصہ عبادت میں گزارنے اور کم حصہ سونے کا حکم نہیں ملتا بلکہ یہ فرمایا:

قُمِ الَّیۡلَ اِلَّا قَلِیۡلًا ۙ﴿۲﴾ نِّصۡفَہٗۤ اَوِ انۡقُصۡ مِنۡہُ قَلِیۡلًا ۙ﴿۳﴾ اَوۡ زِدۡ عَلَیۡہِ ...[1] رات کو اٹھا کیجیے مگر کم، آدھی رات یا اس سے کچھ کم کر لیجیے، یا اس پر کچھ بڑھا دیجیے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبادت کے وقت کا سونے کے وقت سے زیادہ ہونا ضروری نہیں ہے۔

دوسری صفت تھی وَ بِالۡاَسۡحَارِ ہُمۡ یَسۡتَغۡفِرُوۡنَ: اور سحر کے وقت اللہ سے معافی مانگتے ہیں کہ بندگی کا حق ادا نہیں ہو رہا۔ حقیقی بندگی یہی ہے کہ عبادت کرنے کے بعد اسے ناچیز سمجھے، اللہ کی بارگاہ میں اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرے اور بندگی کا حق ادا نہ ہونے پر معافی مانگے۔

چنانچہ اللہ کے سچے بندے دن رات عبادت کرنے کے بعد رات کی تاریکی میں محراب میں مارگزیدہ انسان کی طرح کراہتے اور فریاد کرتے ہیں:

آهِ مِنْ قِلَّةِ الزَّادِ وَ طُولِ الطَّرِيقِ...[2] افسوس! زاد راہ تھوڑا، راستہ طویل۔

تیسری صفت تھی وَ فِیۡۤ اَمۡوَالِہِمۡ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَ الۡمَحۡرُوۡمِ: وہ شب زندہ داری کے ساتھ ساتھ سائل نواز اور محروم نواز بھی ہوتے ہیں کہ ان کے مال میں سوال کرنے والے اور محروم کا ایک حق اور حصہ ہوتا ہے۔ یہ حق خمس اور زکوٰۃ کے علاوہ ہے۔

مروی ہے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال ہوا: حق معلوم کیا ہے جو ہمارے ذمے ہے؟ فرمایا:

هُوَ الشَّيْءُ يَعْمَلُهُ الرَّجُلُ فِي مَالِهِ يُعْطِيهِ فِي الْيَوْمِ أَوْ فِي الْجُمْعَةِ أَوْ فِي الشَّهْرِ قَلَّ أَوْ كَثُرَ غَيْرَ أَنَّهُ يَدُومُ عَلَيْهِ....[3] یہ وہ چیز ہے جو انسان اپنے مال کے سلسلے میں انجام دیتا ہے روزانہ یا ہر جمعہ یا ہر ماہ اپنے مال میں سے غریبوں کو دیتا ہے کم ہو یا زیادہ مگر یہ ہے ہمیشہ رہے۔

فضائل: سعید بن جبیر، ابن عباس سے روایت کرتے ہیں:

کَانُوۡا قَلِیۡلًا مِّنَ الَّیۡلِ مَا یَہۡجَعُوۡنَ علی بن ابی طالب، حسن و حسین و فاطمہ علیہم السلام کی شان میں ہے کہ علی رات کا ایک تہائی سوتے، دو تہائی عبادت کرتے تھے۔ سحر کے وقت دعا و استغفار کے لیے بیٹھتے تھے اور ہر رات کو ستر رکعت نماز پڑھتے تھے جس میں قرآن ختم کرتے تھے....[4]

---

[1] ۷۳ مزمل: ۲ تا ۴ [2] فرمان امیر المومنین علیہ السلام نہج البلاغۃ نصیحت: ۷۷ [3] الکافی ۳: ۴۹۹
[4] تفسیر شواھد التنزیل ذیل آیت

اہم نکات

۱۔ جنت آرزوؤں سے نہیں ملتی بلکہ تقویٰ، رات کی عبادت، استغفار اور غریب پروری سے ملتی ہے۔

وَ فِی الۡاَرۡضِ اٰیٰتٌ لِّلۡمُوۡقِنِیۡنَ ﴿ۙ۲۰﴾ ۲۰۔ اور زمین میں اہل یقین کے لیے نشانیاں ہیں۔

تفسیر آیات

حیات اور اعادہ حیات کے ممکن اور واقع ہونے پر اس زمین میں بہت سی نشانیاں اور دلائل موجود ہیں۔

قابل توجہ یہ ہے کہ یہ کرۂ ارض ایسی فضا میں مصروف گردش ہے جو حیات اور زندگی کے لیے نہایت نامساعد ہے۔ اس نامساعد فضا میں زمین کو زندگی کے قابل بنانے میں سینکڑوں عوامل کے باہمی ربط کا بڑا دخل ہے۔ ان میں سے ایک بھی عامل مفقود ہو تو یہ کرہ اپنے دامن میں زندگی پالنے کے قابل نہیں رہ سکتا۔ مثلاً زمین کی گردش کی سرعت، حجم، سورج سے فاصلہ، زمین کے گرد موجود حفاظتی ڈھال، زمین میں موجود عناصر، ان میں روئیدگی کی خاصیت اور دیگر لاکھوں باتوں کا زمین پر حیات کے وجود و بقا میں بڑا دخل ہے۔

وَ فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۲۱﴾ ۲۱۔ اور خود تمہاری ذات میں بھی، تو کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟

تفسیر آیات

اور خود تمہارے وجود میں بھی حیات و اعادہ حیات کی نشانیاں اور دلائل موجود ہیں۔ انسان کی اپنی تخلیق کے بارے میں قدرت کی واضح نشانیاں موجود ہیں۔

اربوں خلیات کا ایک منظم لشکر انسان کو احسن تقویم کی صورت میں بنانے پر مامور ہوتا ہے اور یہ لشکر اس ایک خلیہ سے وجود میں آیا جو ماں اور باپ کے اشتراک سے وجود میں آیا تھا۔ اس ابتدائی ایک خلیہ کو جو درس پڑھایا گیا ہے کہ اس انسان کو کس قسم کا بنانا ہے، وہ درس وارثتی طور پر تمام خلیات کو یاد ہے۔ چنانچہ ان میں تقسیم کار ہو جاتی ہے تو ہر گروپ کو علم ہوتا ہے کہ اس نے اللہ کی اس امانت کبریٰ کو کس شکل میں بنانا ہے۔ چنانچہ اس لشکر کا کچھ حصہ آنکھ، کچھ ناک، کچھ اعصاب، کچھ دماغ وغیرہ بنانے میں مشغول ہو جاتا ہے۔ ان سب خلیات کو علم ہے کہ اگر ان کو بتایا گیا ہے کہ اس بچے کو اس کے ماموں کی شکل میں بنانا ہے تو ماموں کی آنکھ، ناک اور منہ وغیرہ کس شکل کے ہیں۔ پھر کائنات کا عجیب ترین، پراسرار وجود، روح اس میں داخل کی جاتی ہے اور اللہ کا معجزہ انسان ایک عالم اکبر اپنے اندر سمائے وجود میں آتا ہے۔ اپنی بقا کی ضرورت کے تمام وسائل سے لیس ہے اور ساتھ اس تخلیقی کامل نظام کے ماورا ایک ہدایت اور سوجھ بوجھ بھی

اس میں ودیعت فرمائی جس سے یہ اپنے خالق کی معرفت، اپنے نفع و ضرر کی پہچان سے بھی بہرہ ور ہے اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ؟

اہم نکات

۱۔ انسان کی خلقت اور اس میں ودیعت شدہ باتیں اللہ کا عظیم معجزہ ہیں۔

وَ فِی السَّمَآءِ رِزۡقُکُمۡ وَ مَا تُوۡعَدُوۡنَ ﴿۲۲﴾

۲۲۔ اور تمہاری روزی آسمان میں ہے اور وہ بھی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ آسمان میں تمہارا رزق ہے۔ اس سے نفی نہیں ہوتی کہ زمین میں بھی رزق ہے:

هَلۡ مِنۡ خَالِقٍ غَیۡرُ اللّٰہِ یَرۡزُقُکُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ ...[1]

کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق ہے جو آسمان اور زمین سے تمہیں رزق دے؟

زمین سے رزق دینے کا عمل آسمان کے رزق پر موقوف ہے۔ اس لیے فرمایا: تمہارا رزق آسمان میں ہے۔ آسمان سے آنے والی بارش کو قرآن نے ایک آیت میں رزق کہا ہے:

وَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ رِّزۡقٍ فَاَحۡیَا بِہِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا ...[2]

نیز اس رزق میں جسے اللہ آسمان سے نازل فرماتا ہے پھر زمین کو اس سے زندہ کر دیتا ہے اس کے مردہ ہونے کے بعد۔

آسمان سے آنے والی بارش، سورج کی شعاعوں، بجلی کی چمک کے ساتھ گرنے والی نائٹروجن جو زراعت کے لیے کھاد کا کام دیتی ہے اور ہوا کی وجہ سے زمین میں روئیدگی آ جاتی ہے۔

فَاِذَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡہَا الۡمَآءَ اہۡتَزَّتۡ ...[3]

جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو یہ جنبش میں آ جاتی ہے۔

سورہ غافر آیت ۱۳ میں بھی فرمایا:

ہُوَ الَّذِیۡ یُرِیۡکُمۡ اٰیٰتِہٖ وَ یُنَزِّلُ لَکُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ رِزۡقًا ...

وہ وہی ہے جو تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے اور آسمان سے تمہارے لیے رزق نازل فرماتا ہے۔

بعض ماہرین کا کہنا ہے کہ رزق کا ستر فیصد آسمان سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر آسمان اور زمین کا رابطہ منقطع ہو جائے تو اہل ارض زندہ نہیں رہ سکتے۔

---

[1] ۳۵ فاطر: ۳ [2] ۴۵ جاثیۃ: ۵ [3] ۲۲ حج: ۵

۲۔ وَمَا تُوۡعَدُوۡنَ: من الوعد او من الوعید جس ثواب و جنت کا وعدہ ہے یا جس ثواب و عقاب کا وعدہ و وعید ہے وہ بھی آسمان میں ہے۔

اہم نکات

۱۔ مادی و معنوی روزی و برکات کا سرچشمہ آسمان میں ہے۔

فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ اِنَّہٗ لَحَقٌّ مِّثۡلَ مَاۤ اَنَّکُمۡ تَنۡطِقُوۡنَ ﴿۲۳﴾ ع

۲۳۔ پس آسمان اور زمین کے پروردگار کی قسم! یقیناً وہ اسی طرح برحق ہے جس طرح تم باتیں کر رہے ہو۔

تفسیر آیات

اگرچہ اس آیت سے پہلی آیت میں رزق کا ذکر ہے کہ اللہ ہی تمہیں رزق دیتا ہے تاہم اس سورۃ المبارکۃ کا بنیادی موضوع دوسری زندگی یعنی عالم آخرت کا اثبات ہے۔ لہٰذا زیادہ قرین سیاق یہ ہے کہ ہم اِنَّہٗ لَحَقٌّ کی ضمیر یوم الدین کی طرف قرار دیں۔ اس صورت میں آیت کا مطلب یہ بنے گا کہ قیامت کا آنا اس طرح حق اور حقیقت ہے جیسے تمہارا بات کرنا۔ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کی قسم کھاتا ہے اور اپنی ذات کے مقام ربوبیت کی قسم کھا کر فرماتا ہے: قیامت کا وجود اس طرح حق اور واقعیت رکھتا ہے جیسا کہ تمہارا بولنا، بات کرنا واقعیت رکھتا ہے۔ مشہور فلسفی نے کہا تھا: میں سوچتا ہوں پس میں موجود ہوں۔ جب کہ سوچنے سے زیادہ بولنا ایک واضح حقیقت ہے کہ یوں کہنا چاہیے: میں بولتا ہوں پس میں موجود ہوں۔ اگرچہ درحقیقت انسان کے لیے سب سے واضح چیز خود اپنی ذات ہے اس لیے پہلے ”میں“ آتا ہے پھر ”سوچتا ہوں“ یا ”بولتا ہوں“ آتا ہے۔ البتہ اپنے وجود کے بعد سب سے زیادہ واضح چیز انسان کا بولنا، بات کرنا ہے۔

منکرین جب قیامت پر اعتراض کرتے ہوئے بولتے تو اپنی نطق پر ان کا ایمان ہوتا تھا۔ وہ اس لیے بول رہے تھے کہ وہ جو جملے بنا رہے ہیں ان کا کوئی مفہوم ہے اور اس مفہوم کو مخاطب سمجھ لیتا ہے۔ آواز اس کے کانوں سے ٹکراتی ہے اور وہ اسے سمجھ لیتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ قیامت کی آمد، سب سے زیادہ واضح ہے۔

هَلۡ اَتٰىکَ حَدِیۡثُ ضَیۡفِ اِبۡرٰهِیۡمَ الۡمُکۡرَمِیۡنَ ﴿۲۴﴾ وقف لازم

۲۴۔ کیا آپ کے پاس ابراہیم کے معزز مہمانوں کی حکایت پہنچی ہے؟

اِذۡ دَخَلُوۡا عَلَیۡہِ فَقَالُوۡا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوۡمٌ مُّنۡکَرُوۡنَ ﴿۲۵﴾

۲۵۔ جب وہ ان کے ہاں آئے تو کہنے لگے: سلام ہو! ابراہیم نے کہا: سلام ہو! ناآشنا لوگ (معلوم ہوتے ہو)۔

فرشتوں کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں مہمان کی شکل میں آنے کا ذکر سورہ حجر آیت ۵ میں گزر چکا ہے۔

فَرَاغَ اِلٰۤی اَہۡلِہٖ فَجَآءَ بِعِجۡلٍ سَمِیۡنٍ ﴿۲۶﴾

۲۶۔ پھر وہ خاموشی سے اپنے گھر والوں کے پاس گئے اور ایک موٹا بچھڑا لے آئے۔

تشریح کلمات

فَرَاغَ: (ر و غ) راغ حیلہ بہانہ اختیار کرنا۔

تفسیر آیات

۱۔ فَرَاغَ: مہمانوں کو دیکھ کر چپکے سے، کسی حیلہ بہانہ سے اپنے گھر والوں کے پاس پہنچ جاتے ہیں کہ مہمانوں کے لیے پذیرائی کا اہتمام کریں۔

۲۔ اِلٰۤی اَہۡلِہٖ: سے معلوم ہو گیا مہمانوں کی پذیرائی کا کام اپنے گھر والوں سے لینا قدیم سے انبیاء علیہم السلام میں رائج تھا۔ کوئی خادم وغیرہ نہیں، گھر کے افراد یہ کام کرتے ہیں۔

۳۔ فَجَآءَ بِعِجۡلٍ سَمِیۡنٍ: حضرت ابراہیم علیہ السلام مہمانوں کے لیے ایک موٹا بچھڑا لے آئے۔ کسی کمزور لاغر بچھڑے پر اکتفا نہ کیا۔ اس سے مہمان نوازی کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک بچھڑا چند افراد کے لیے کافی ہوتا ہے۔ مہمانوں کی تعداد کا ذکر نہیں ملتا تاہم ایک گوسالہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ چند افراد تھے۔ سورہ ہود میں فرمایا بھنا ہوا بچھڑا۔ اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ آپؑ کی مالی حالت بہتر تھی۔

فَقَرَّبَہٗۤ اِلَیۡہِمۡ قَالَ اَلَا تَاۡکُلُوۡنَ ﴿۲۷﴾

۲۷۔ پھر اسے ان کے سامنے رکھا، کہا: آپ کھاتے کیوں نہیں؟

فَاَوۡجَسَ مِنۡہُمۡ خِیۡفَۃً ؕ قَالُوۡا

۲۸۔ پھر ابراہیم نے ان سے خوف محسوس کیا، کہنے لگے: خوف نہ کیجیے اور انہیں ایک دانا لڑکے کی

لَا تَخَفْ ۭ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ۝۲۸ | بشارت دی

فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ ۝۲۹

۲۹۔ تو ان کی زوجہ چلاتی ہوئی آئیں اور اپنا منہ پیٹنے لگیں اور بولیں: (میں تو) ایک بڑھیا (اور ساتھ) بانجھ (بھی ہوں)۔

قَالُوْا كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ۝۳۰

۳۰۔ انہوں نے کہا: تمہارے پروردگار نے اسی طرح فرمایا ہے، وہ یقیناً حکمت والا، خوب جاننے والا ہے۔

تشریح کلمات

صَرَّةٍ: (ص ر ر) چلانا، صَرَّةٍ گروہ کو بھی کہتے ہیں۔ روایت میں بھی یہی معنی کیا گیا ہے۔

صکت: (ص ك ك) منہ پیٹنا۔

تفسیر آیات

مقام خلّت پر فائز ہونے کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ثواب دارین عنایت فرمایا۔ بروایت بائبل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ۱۰۰ سال اور حضرت سارہ کی عمر ۹۰ سال تھی جب بیٹے کی بشارت دی گئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس واقعہ کی تفصیل سورۃ ھود آیت ۶۹ میں ذکر ہو گئی ہے۔

الجزء ۲۷

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ۝۳۱

۳۱۔ ابراہیم نے کہا: اے اللہ کے بھیجے ہوئے (فرشتو) آپ کی (اصل) مہم کیا ہے؟

قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ۝۳۲

۳۲۔ انہوں نے کہا: ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں،

لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ۝۳۳

۳۳۔ تاکہ ہم ان پر مٹی کے کنکر برسائیں،

مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ۝۳۴

۳۴۔ جو حد سے تجاوز کرنے والوں کے لیے آپ کے رب کی طرف سے نشان زدہ ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام فرشتوں سے پوچھا کہ آپ لوگ کس مہم کے لیے بھیجے گئے ہیں؟ حضرت

ابراہیم علیہ السلام گئے تھے ان فرشتوں کی مہم صرف اولاد کی خوشخبری دینا نہیں ہے ورنہ خوشخبری کے بعد یہ تصور ممکن تھا کہ ان کی مہم یہی ہے۔

۲۔ فرشتوں نے جواب میں کہا: ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ مجرم قوم سے مراد قوم لوط ہے جس نے جرم کے ارتکاب میں رسوخ پیدا کیا تھا۔

۳۔ فرشتوں نے کہا: ہم اس قوم پر پختہ مٹی کے پتھر برسائیں گے۔ اس پتھر کو سجیل بھی کہتے ہیں۔

۴۔ مُّسَوَّمَةً: یہ پتھر نشان زدہ ہیں کون سا پتھر کس مجرم کو ہلاک کرے گا چونکہ یہ عذاب کے پتھر ہیں۔ یہ نشانی کس قسم کی تھی، تفصیل معلوم نہیں ہے۔

۵۔ عِنۡدَ رَبِّكَ: یہ نشانی من عند االلّٰہ اپنی قدرت قاہرہ کی نشانی تھی؟ والعلم عند اللّٰہ۔

۶۔ لِلۡمُسۡرِفِيۡنَ: ان لوگوں کے خلاف جو فسق و فجور اور جرم کے ارتکاب میں تمام حدود پھلانگ چکے تھے۔

فَاَخۡرَجۡنَا مَنۡ كَانَ فِيۡهَا مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ﴿۳۵﴾	۳۵۔ پس وہاں موجود مومنین کو ہم نے نکال لیا۔
فَمَا وَجَدۡنَا فِيۡهَا غَيۡرَ بَيۡتٍ مِّنَ الۡمُسۡلِمِيۡنَ﴿۳۶﴾	۳۶۔ وہاں ہم نے ایک گھر کے علاوہ مسلمانوں کا کوئی گھر نہ پایا۔

تفسیر آیات

پوری قوم میں صرف ایک گھر مسلمان تھا اور وہ حضرت لوط علیہ السلام کا گھر تھا اس ایک گھر میں بھی ان کی اہلیہ مسلمان نہ تھی۔ سورہ ہود آیت ۸۱ میں فرمایا:

اِلَّا امۡرَاَتَكَ ؕ اِنَّهٗ مُصِيۡبُهَا مَاۤ اَصَابَهُمۡ ... سوائے آپ کی بیوی کے بے شک جو عذاب دوسروں پر پڑنے والا ہے وہی اس (بیوی) پر بھی پڑے گا،

ان دو آیات میں سے پہلی آیت میں فرمایا: ان میں سے مومنوں کو ہم نے نکالا ۔ دوسری آیت میں فرمایا: یہاں مسلمانوں کا صرف ایک گھر تھا۔ ان مومنوں کو مسلمان کہا ہے۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مومن اور مسلم ایک ہیں چونکہ اس مومن کو مسلم کہا ہے جو درست ہے۔ ہر مومن مسلم ہو گا لیکن ہر مسلم کا مومن ہونا ضروری نہیں ہے۔

وَ تَرَکۡنَا فِیۡہَاۤ اٰیَۃً لِّلَّذِیۡنَ یَخَافُوۡنَ الۡعَذَابَ الۡاَلِیۡمَ ﴿۳۷﴾	۳۷۔ اور دردناک عذاب سے ڈرنے والوں کے لیے ہم نے وہاں ایک نشانی چھوڑ دی۔

تفسیر آیات

ممکن ہے اس نشانی سے مراد بحیرہ مردار (dead Sea) ہو یعنی قوم لوط اس جگہ آباد رہی ہو اور اس جگہ کے زمین میں دھنس جانے سے بحیرۂ مردار کا پانی اس میں جمع ہو گیا ہو۔ سنہ ۲۰۰۱ء میں بحیرہ مردار دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ پورا علاقہ دھنسا ہوا ہے اور اس علاقے سے جیسے جیسے نزدیک ہوتے جاتے ہیں زندگی کے آثار ناپید ہونے لگتے ہیں۔ چنانچہ خود بحیرہ مردار کو اس لیے مردار کہتے ہیں کہ اس میں آبی حیات ناپید ہے۔

حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہما السلام کا واقعہ اس سے پہلے سورہ ہود آیت ۶۹۔۷۴ میں ذکر ہو چکا ہے۔

وَ فِیۡ مُوۡسٰۤی اِذۡ اَرۡسَلۡنٰہُ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ بِسُلۡطٰنٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۳۸﴾	۳۸۔ اور موسیٰ (کے قصے) میں بھی (نشانی ہے) جب ہم نے انہیں واضح دلیل کے ساتھ فرعون کی طرف بھیجا۔
فَتَوَلّٰی بِرُکۡنِہٖ وَ قَالَ سٰحِرٌ اَوۡ مَجۡنُوۡنٌ ﴿۳۹﴾	۳۹۔ تو اس نے اپنی طاقت کے بھروسے پر منہ موڑ لیا اور بولا: جادوگر یا دیوانہ ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تجلیات میں بھی نشانیاں ہیں کہ ہم نے انہیں واضح دلیل اور معجزات دے کر بھیجا تھا۔

۲۔ فَتَوَلّٰی بِرُکۡنِہٖ: الرکن ستون کو کہتے ہیں۔ طاقت وقوت کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خاطر میں نہیں لایا۔ بِرُکۡنِہٖ اپنی طاقت کے بل بوتے پر فرعون اس زمانے کی بڑی طاقت کا مالک تھا۔ جب کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک کمزور قوم کے فرد تھے۔ وہ موسیٰ علیہ السلام پر ساحر ہونے کا الزام عائد کرتا تھا لیکن ساتھ مجنون بھی کہتا تھا کہ یہ جادوگر ہونے کے ساتھ دیوانہ بھی ہے جو نامعقول باتیں کرتا ہے ورنہ عام طور ساحر ہوشیار ہوتا ہے، دیوانہ نہیں ہوتا۔

فَاَخَذۡنٰہُ وَ جُنُوۡدَہٗ فَنَبَذۡنٰہُمۡ فِی الۡیَمِّ وَ ہُوَ مُلِیۡمٌ ﴿۴۰﴾

۴۰۔ چنانچہ ہم نے اسے اور اس کے لشکر کو گرفت میں لے لیا اور انہیں دریا میں پھینک دیا اور وہ لائق ملامت تھا۔

تفسیر آیات

چنانچہ فرعون اور اس کے لشکر کو غرق آب کر دیا۔ وَ ہُوَ مُلِیۡمٌ وہ قابل ملامت عمل انجام دینے والا تھا۔

وَ فِیۡ عَادٍ اِذۡ اَرۡسَلۡنَا عَلَیۡہِمُ الرِّیۡحَ الۡعَقِیۡمَ ﴿۴۱﴾

۴۱۔ اور عاد میں بھی (نشانی ہے) جب ہم نے ان پر نامبارک آندھی بھیجی۔

مَا تَذَرُ مِنۡ شَیۡءٍ اَتَتۡ عَلَیۡہِ اِلَّا جَعَلَتۡہُ کَالرَّمِیۡمِ ﴿۴۲﴾

۴۲۔ وہ جس چیز پر گرتی تھی اسے بوسیدہ کر کے چھوڑ دیتی تھی۔

تفسیر آیات

۱۔ عاد کی قوم میں بھی ایک نشانی ہے کہ جس پر اللہ نے ایک ایسی ہوا چلا دی جو عقیم، نامبارک یعنی بانجھ تھی۔ ہوا سے بارداری ہوتی ہے لیکن یہ ہوا بانجھ، بے سود تھی۔ نہ صرف یہ کہ باردار نہیں تھی بلکہ تباہ کن تھی۔

۲۔ مَا تَذَرُ مِنۡ شَیۡءٍ: جس پر یہ ہوا گرتی اسے رمیم کی طرح کر دیتی۔ رمیم بوسیدہ ہڈی کو کہتے ہیں۔ سورہ حاقہ میں فرمایا کہ اس آندھی کو اللہ نے مسلسل سات راتوں اور آٹھ دنوں تک ان پر مسلط کیے رکھا۔

وَ فِیۡ ثَمُوۡدَ اِذۡ قِیۡلَ لَہُمۡ تَمَتَّعُوۡا حَتّٰی حِیۡنٍ ﴿۴۳﴾

۴۳۔ اور ثمود میں بھی (نشانی ہے) جب ان سے کہا گیا: ایک وقت معین تک زندگی کا لطف اٹھالو.

فَعَتَوۡا عَنۡ اَمۡرِ رَبِّہِمۡ فَاَخَذَتۡہُمُ الصّٰعِقَۃُ وَ ہُمۡ یَنۡظُرُوۡنَ ﴿۴۴﴾

۴۴۔ مگر انہوں نے اپنے رب کے حکم سے سرتابی کی تو انہیں کڑک نے گرفت میں لے لیا اور وہ دیکھتے رہ گئے۔

فَمَا اسۡتَطَاعُوۡا مِنۡ قِیَامٍ وَّ مَا کَانُوۡا مُنۡتَصِرِیۡنَ ﴿۴۵﴾

۴۵۔ پھر وہ اٹھ بھی نہ سکے اور نہ ہی وہ بدلہ لے سکے۔

تفسیر آیات

۱۔ قوم ثمود کو ایک معین وقت تک مہلت دے دی گئی تھی۔ اس مہلت کا ذکر سورہ ہود آیت ۶۵ میں آیا ہے وہ مہلت تین دن کی تھی۔

فَقَالَ تَمَتَّعُوۡا فِیۡ دَارِکُمۡ ثَلٰثَۃَ اَیَّامٍ ؕ ذٰلِکَ وَعۡدٌ غَیۡرُ مَکۡذُوۡبٍ ○	تو صالح نے کہا: تم لوگ تین دن اپنے گھروں میں بسر کرو یہ ناقابل تکذیب وعدہ ہے۔

توبہ و انابت کے لیے تین دنوں کی مہلت دے دی گئی تھی

۲۔ فَعَتَوۡا عَنۡ اَمۡرِ رَبِّہِمۡ: لیکن ان لوگوں نے اپنی سرتابی جاری رکھی تو انہیں کڑک (صاعہ) نے گرفت میں لے لیا۔

۳۔ فَمَا اسۡتَطَاعُوۡا مِنۡ قِیَامٍ: ان پر کڑک کے گرنے کے بعد نہ تو یہ لوگ اپنی جگہ سے اٹھ سکے، نہ مقابلہ کر سکتے تھے۔

وَقَوۡمَ نُوۡحٍ مِّنۡ قَبۡلُ ؕ اِنَّہُمۡ کَانُوۡا قَوۡمًا فٰسِقِیۡنَ ﴿۴۶﴾ ع	۴۶۔ اور اس سے پہلے نوح کی قوم (بھی ایک نشان عبرت) ہے، یقیناً وہ فاسق لوگ تھے۔

قوم نوح کے بارے میں متعدد سورہ ہائے قرآن میں ذکر ہو چکا ہے۔

وَ السَّمَآءَ بَنَیۡنٰہَا بِاَیۡىدٍ وَّ اِنَّا لَمُوۡسِعُوۡنَ ﴿۴۷﴾	۴۷۔ اور آسمان کو ہم نے قوت سے بنایا اور ہم ہی وسعت دینے والے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ بِاَیۡىدٍ: اس آیت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم نے آسمان کو اید سے بنایا۔ اید طاقت اور قوت کو کہتے ہیں۔ جیسے فرمایا:

وَاذۡکُرۡ عَبۡدَنَا دَاوٗدَ ذَا الۡاَیۡدِ ...[1]	اور (ان سے) ہمارے بندے داؤد کا قصہ بیان کیجیے جو طاقت کے مالک تھے۔

اسی سے اید تائید، قوت اور مدد دینے کے معنوں میں ہے۔

پس آیت کے معنی یہ ہوئے: اور آسمان کو ہم نے قوت سے بنایا۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ

---

[1] ۳۸ ص: ۱۷

نے (اپنی) لایزال اور لامتناہی قوت و طاقت سے آسمان بنایا جیسا کہ اکثر مفسرین نے سمجھا ہے۔ اس تفسیر کے مطابق اید کے ساتھ لفظ ''اپنی'' کا اضافہ کرنا پڑے گا۔ کہہ سکتے ہیں سیاق آیت سے ''اپنی'' سمجھا جاتا ہے چونکہ کسی غیر کی طاقت سے تو نہیں بنایا۔

اس جگہ ایک اور تفسیر ہے جسے بعض جدید مفسرین نے اختیار کیا ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ یہ فرمانا چاہتا ہے: ہم نے آسمان طاقت (انرجی) سے بنایا ہے یعنی آسمان بنانے کا ابتدائی میٹریل انرجی تھا۔ چنانچہ انرجی کے سمٹنے سے مادہ وجود میں آتا ہے اور مادہ کے بکھرنے سے انرجی بن جاتی ہے۔ اس طرح یہ دونوں آپس میں رشتہ دار ہیں۔ اسی تفسیر میں اِنَّا لَمُوۡسِعُوۡنَ کی یہ تفسیر کی ہے: ہم اس طاقت میں وسعت دینے والے ہیں۔ والعلم عند اللّٰہ وان الزمان سوف یفسر مثل ھذہ الآیۃ۔ اصولاً ہمیں قرآن کی تفسیر سائنسی مفروضوں کے مطابق نہیں کرنی چاہیے۔ سائنسی مفروضے بدلتے رہتے ہیں اور قرآن ثابت حقائق بیان کرتا ہے۔

۲۔ وَ اِنَّا لَمُوۡسِعُوۡنَ: اور ہم وسعت دینے والے ہیں یعنی آسمان کو وسعت دینے والے ہیں۔ کائنات کو پیدا کر کے اللہ نے آرام نہیں کیا جیسا کہ بائبل کہتی ہے بلکہ کُلَّ یَوۡمٍ ہُوَ فِیۡ شَاۡنٍ [۱] کے مطابق اس سرچشمہ فیض سے فیض ہمیشہ جاری رہتا ہے: لا انقطاع فی الفیض۔ اللہ تعالیٰ اس کائنات کو بنا کر فارغ نہیں ہوا بلکہ یہ کائنات بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے۔

کہتے ہیں: ستارے اپنے مرکز سے ۶۶ ہزار کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے دور ہو رہے ہیں۔

وَ الۡاَرۡضَ فَرَشۡنٰہَا فَنِعۡمَ الۡمٰہِدُوۡنَ ﴿۴۸﴾

۴۸۔ اور زمین کو ہم نے فرش بنایا اور ہم کیا خوب بچھانے والے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ الۡاَرۡضَ فَرَشۡنٰہَا: ہم نے ایک آتشین کرہ کو انسان کے لیے اس طرح بچھایا کہ ایک مہربان کی طرح اپنے دامن میں جگہ دیتی ہے۔ چنانچہ اس فرش میں ایسے عناصر ودیعت ہیں کہ جن میں انسان کی زندگی کے رنگ برنگ کے سامان موجود ہیں یہاں تک کہ بعض اہل قلم نے زمین کو ''مہربان ماں'' کا نام دیا ہے جس کی ممتا کی وجہ سے ہمیں زندگی کی تمام تر سہولیات میسر ہیں۔

۲۔ فَنِعۡمَ الۡمٰہِدُوۡنَ: ہم بہترین گہوارہ فراہم کرنے والے ہیں۔ وہ خدائے مہربان ہے:

الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ مَہۡدًا ... [۲] — جس نے تمہارے لیے زمین کو گہوارہ بنایا۔

کہ ہر طرف سے خطرات میں محصور نامساعد ترین فضا میں محفوظ ترین گہوارہ بنا دیا۔

---

[۱] ۵۵ رحمٰن: ۲۹ [۲] ۲۰ طٰہ: ۵۳

اہم نکات

۱۔ جس نے زمین جیسی نامساعد جگہ پر فرش حیات بچھایا کیا اس کے لیے اعادہ حیات ممکن نہیں؟

وَ مِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ خَلَقۡنَا زَوۡجَیۡنِ لَعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ ﴿۴۹﴾

۴۹۔ اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں، شاید کہ تم نصیحت حاصل کرو۔

تفسیر آیات

۱۔ پہلے بھی ذکر ہوا کہ ہر چیز زوجیت کے ایک جامع نظام میں موجود ہے۔ قدیم فلاسفر کہتے تھے:

کل شیء موجود مزدوج له مهية و وجود۔

ہر چیز ازدواجی وجود کے مرہون منت ہے: ماہیت اور وجود۔

آج کا انسان ہر چیز کو عناصر کے ازدواجی نظام کے مرہون سمجھتا ہے یعنی ہر شے عناصر کی ترکیب و ازدواج کے مرہون ہے۔ یہاں تک کہ ایٹم جو تعمیر کائنات کی بنیادی اینٹ ہے، یہ بھی الیکٹرون مثبت اور منفی کے ازدواج کا نتیجہ ہے۔

اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ کائنات کی تعمیر کی اساس ایک ہے اور وہ زوجیت ہے۔ اللہ نے اپنی کتاب میں اس نظام کا عنوان بیان فرمایا ہے۔ انسان اپنی کاوش سے اس کی تفصیل معلوم کر لے نیز نظام کی وحدت نظام دہندہ کی وحدت پر دلالت کرتی ہے۔

۲۔ لَعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ: شاید یہ غافل اس کائنات کا نظام دیکھ کر اللہ کی وحدانیت، مدبریت اور قدرت کی طرف متوجہ ہو کہ وہ ذات ایک ہی ہے، وہی اس کائنات کو چلا رہی ہے اور وہ اعادہ حیات پر قادر ہے۔

اہم نکات

۱۔ کائنات میں کوئی شے ایسی نہیں جو نظام زوجیت سے خارج ہو: وَ مِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ ....

فَفِرُّوۡۤا اِلَی اللّٰہِ ؕ اِنِّیۡ لَکُمۡ مِّنۡہُ نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۵۰﴾

۵۰۔ پس تم اللہ کی طرف بھاگو، بتحقیق میں اللہ کی طرف سے تمہیں صریح تنبیہ کرنے والا ہوں۔

تفسیر آیات

۱۔ فَفِرُّوۡۤا اِلَی اللّٰہِ: ہر جانب سے خطرات میں گھرا ہوا انسان ایک پناہ گاہ کا محتاج ہے۔ خواہشات، مفادات اور گمراہی کی طرف لے جانے والے بے شمار عوامل سے جان چھڑا کر مہربان رب کی امن و سکون

والی پناہ گاہ کی طرف بھاگو۔ اس کی وسیع ترین رحمت کے دامن میں جگہ تلاش کرو۔ نفس پرستی، گناہوں اور شرک و کفر سے دوری اختیار کرو اور اللہ کی پناہ میں جاؤ۔

۲۔ اِنِّیۡ لَکُمۡ مِّنۡہُ نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ: اے رسول ﷺ! لوگوں سے کہدیں کہ میں قبل از وقت تمہیں تنبیہ کرنے والا ہوں کہ اللہ کی پناہ میں نہ جانے کی صورت میں تم کس دائمی عذاب اور ابدی خسارے سے دوچار ہو جاؤ گے۔

دعاؤں میں ہے:

لَا مَفَرَّ مِنْكَ اِلَّا اِلَيْكَ...[1]	تجھ سے فرار کی کوئی جگہ نہیں سوائے اس کے تیری طرف فرار ہوا جائے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی حکومت سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اسی کی طرف بھاگنا ہوگا۔

وَلَا تَجۡعَلُوۡا مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ ؕ اِنِّیۡ لَکُمۡ مِّنۡہُ نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۵۱﴾	۵۱۔ اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو معبود نہ بناؤ، میں اللہ کی طرف سے تمہیں صریح تنبیہ کرنے والا ہوں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَا تَجۡعَلُوۡا مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا: اللہ کی پناہ میں جانے کی واحد صورت یہ ہے کہ غیر اللہ کو اپنا معبود نہ بناؤ خواہ وہ غیر اللہ بتوں کی شکل میں ہو، خواہ نفس پرستی کی شکل میں۔

۲۔ نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ: غیر اللہ کو معبود بنانے کی صورت میں انجام سے واشگاف الفاظ میں باخبر کرنے والا ہوں۔

اہم نکات

۱۔ غیر اللہ کی پرستش کرنے والوں کی کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔

کَذٰلِکَ مَاۤ اَتَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ مِّنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا قَالُوۡا سَاحِرٌ اَوۡ مَجۡنُوۡنٌ ﴿۵۲﴾	۵۲۔ اسی طرح جو لوگ ان سے پہلے گزرے ہیں ان کے پاس کوئی رسول نہیں آیا مگر اس سے انہوں نے کہا: جادوگر ہے یا دیوانہ۔

---

[1] الفقیۃ ۱: ۳۰۳

اَتَوَاصَوۡا بِہٖ ۚ بَلۡ ہُمۡ قَوۡمٌ طَاغُوۡنَ ﴿۵۳﴾

۵۳۔کیاان سب نے ایک دوسرے کو اسی بات کی نصیحت کی ہے؟ (نہیں) بلکہ وہ سرکش قوم ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ کَذٰلِکَ مَاۤ اَتَی: تمام انبیاء علیہم السلام کی تکذیب ایک لہجے میں ہوتی رہی۔ سب مشرکوں نے یک زبان ہو کر ایک قسم کا الزام عائد کیا۔ چنانچہ سب نے اپنے اپنے نبی کو جادوگر کہا یا مجنون۔

۲۔ اَتَوَاصَوۡا بِہٖ: ایسا لگتا ہے سب نے ایک جگہ جمع ہو کر ایک قرار داد پاس کی ہے کہ ہم نے جو بھی نبی آئے اس کے خلاف یہی الزام عائد کرنا ہے۔

۳۔ بَلۡ ہُمۡ قَوۡمٌ طَاغُوۡنَ: فرمایا: ایسا نہیں ہے بلکہ یہ سب سرکش لوگ ہیں اور سرکشی ایک مزاج، ایک طبیعت ہے اس لیے اس مزاج کا اظہار بھی ایک ہی طریقہ سے ہوتا ہے: تَشَابَہَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ ....[1] ان کے دل ایک جیسے ہو گئے۔

اہم نکات

۱۔ کفر اور سرکشی ایک مزاج ہے، اس کی علامت بھی ایک ہے۔

فَتَوَلَّ عَنۡہُمۡ فَمَاۤ اَنۡتَ بِمَلُوۡمٍ ﴿۵۴﴾

وَّ ذَکِّرۡ فَاِنَّ الذِّکۡرٰی تَنۡفَعُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۵۵﴾

۵۴۔ پس آپ ان سے رخ پھیر لیں تو آپ پر کوئی ملامت نہ ہو گی۔

۵۵۔ اور نصیحت کرتے رہیں کیونکہ نصیحت تو مومنین کے لیے یقیناً فائدہ مند ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَتَوَلَّ عَنۡہُمۡ: یہ ایمان نہیں لاتے اور آپ نے بھی اپنی تبلیغ پوری کی ہے تو آپ پر مزید ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیجیے۔ حجت پوری کرنے کے بعد انہیں ان کی حالت پر چھوڑنے پر کوئی ملامت نہ ہو گی۔

۲۔ وَّ ذَکِّرۡ: ان کافروں کو ان کے حال پر چھوڑ کر آپ اہل ایمان کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ آپ کی نصیحتوں سے فائدہ اٹھانے والے صرف اہل ایمان ہوں گے کیونکہ کفر و ایمان میں سے ہر ایک کے لیے اہل ہوتے ہیں۔ کافر اگر آپ کی بات نہیں سنتے تو یہاں پاکیزہ دل والے بھی موجود ہیں جو آپ کی

---

[1] ۲ بقرۃ: ۱۱۸

حیات آفریں باتوں کے لیے تڑپ رہے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ نصیحتوں سے فائدہ اُٹھانے والے مومن اور اسے ناپسند کرنے والے سرکش ہوتے ہیں۔

وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَالۡاِنۡسَ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنِ ﴿۵۶﴾

۵۶۔ اور میں نے جن و انس کو خلق نہیں کیا مگر یہ کہ وہ میری عبادت کریں۔

تفسیر آیات

حدیث میں آیا ہے لِیَعۡبُدُوۡنِ سے مراد لیعرفون ہے۔ حدیث کے مطابق آیت کا مطلب یہ بنتا ہے: اور میں نے جن و انس کو پیدا نہیں کیا مگر یہ کہ وہ میری معرفت حاصل کریں۔

عبادت، معرفت کے بعد ممکن ہے۔ اللہ کے کمال و جمال کی معرفت کے بعد کمال کے سامنے جھکنا کمال ہے۔ لہٰذا عبد کا کمال و ارتقا یہ ہے کہ وہ کمال کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کرے۔ لہٰذا خلقت انسانی کی غرض اسی صاحب کمال کی بندگی کرنے سے پوری ہوتی ہے، نہ کسی اور کی بندگی کرنے سے۔ اللہ نے انسان کو چونکہ بندگی کے لیے خلق کیا ہے اس لیے اس نے انسان کی خلقت میں بندگی کا شعور ودیعت فرمایا ہے:

فَاَقِمۡ وَجۡہَکَ لِلدِّیۡنِ حَنِیۡفًا ؕ فِطۡرَتَ اللّٰہِ الَّتِیۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیۡہَا ؕ لَا تَبۡدِیۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰہِ ؕ ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ ...[1]

پس (اے نبی) یکسو ہو کر اپنا رخ دین (خدا) کی طرف مرکوز رکھیں (یعنی) اللہ کی اس فطرت کی طرف جس پر اس نے سب انسانوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی تخلیق میں تبدیلی نہیں ہے، یہی محکم دین ہے۔

دین قیم جس میں کسی قسم کا انحراف نہیں ہے عین فطرت ہے۔ اگر اللہ کی بندگی فطری نہ ہوتی تو اس بندگی سے انسان کو سکون حاصل نہ ہوتا جیسا کہ مچھلی اگر پانی میں زندگی بسر کرنے کے لیے پیدا نہ ہوتی تو اسے پانی میں سکون نہ ملتا۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اللہ کی بندگی فطری ہے تو سب لوگوں کو اس پر چلنا چاہیے کیونکہ فطرت سب کے لیے یکساں ہیں؟

جواب یہ ہے کہ کسی بات کے فطری ہونے سے فطرت کے مطابق چلنے میں سب لوگوں کا یکساں ہونا ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ دوسروں پر احسان کرنے کا احساس سب کے نزدیک فطری ہے۔ اس کے باوجود بہت سے لوگ کمزور لوگوں پر احسان کرنے کی جگہ ان کا خون چوستے ہیں۔

---

[1] ۳۰ روم: ۳۰

اہم نکات

۱۔ انسان کا کمال، کمال کی بندگی میں ہے۔

۲۔ وہ انسان نہیں، جو کمال کے سامنے اکڑ جاتا ہے۔

مَاۤ اُرِیۡدُ مِنۡہُمۡ مِّنۡ رِّزۡقٍ وَّ مَاۤ اُرِیۡدُ اَنۡ یُّطۡعِمُوۡنِ ﴿۵۷﴾

۵۷۔ میں نہ ان سے کوئی روزی چاہتا ہوں اور نہ ہی میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں۔

اِنَّ اللّٰہَ ہُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الۡقُوَّۃِ الۡمَتِیۡنُ ﴿۵۸﴾

۵۸۔ یقیناً اللہ ہی بڑا رزق دینے والا، بڑی پائیدار طاقت والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔عبادت سے اللہ تعالیٰ کا کوئی مفاد وابستہ نہیں ہے۔ وہ کسی کی طرف سے رزق و روزی کا محتاج ہے نہ اسے کسی قسم کی تلافی کی ضرورت ہے۔

۲۔تمام مخلوقات کا رزق اسی کے ہاتھ میں ہے۔کائنات کی طاقت وقوت کا سرچشمہ بھی اسی کی ذات ہے بلکہ عبادت خود تمہاری ضرورت ہے۔تم عبادت کے محتاج ہو اور معبود کے بھی۔

فَاِنَّ لِلَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا ذَنُوۡبًا مِّثۡلَ ذَنُوۡبِ اَصۡحٰبِہِمۡ فَلَا یَسۡتَعۡجِلُوۡنِ ﴿۵۹﴾

۵۹۔پس جن لوگوں نے ظلم کیا ہے ان کے حصے میں وہی سزائیں ہیں جو ان کے ہم مشربوں کے حصے میں تھیں، لہٰذا وہ مجھ سے عجلت نہ مچائیں۔

تفسیر آیات

۱۔ فَاِنَّ لِلَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا: جن لوگوں نے شرک جیسے ظلم عظیم کا ارتکاب کیا ہے ان کے حصے میں تباہی اور ہلاکت کا وہی حصہ آنے والا ہے جو ان کی ہم مشرب قوموں پر اس سے پہلے آ چکی ہے۔

۲۔ فَلَا یَسۡتَعۡجِلُوۡنِ: لہٰذا یہ نہ کہو اگر ہم پر عذاب یا تباہی آنے والی ہے تو آئی کیوں نہیں ہے؟

فَوَیۡلٌ لِّلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ یَّوۡمِہِمُ الَّذِیۡ یُوۡعَدُوۡنَ ﴿۶۰﴾ ع

۶۰۔ پس کفار کے لیے تباہی ہے اس روز جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَوَیۡلٌ لِّلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا: ہلاکت ہو ان کافروں کے لیے جو عذاب کے لیے عجلت مچا رہے ہیں۔ اس دن تباہی آئے گی جس دن کا وعدہ ہے۔ وعدے کے دن سے پہلے عذاب نہیں آئے گا، نہ تاخیر ہو گی۔ بعض کے نزدیک اس عذاب سے مراد دنیوی عذاب ہے لیکن اکثر کے نزدیک قیامت کا عذاب ہے۔

سُورَةُ الطُّور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس سورۃ المبارکۃ کا نام الطور ہے جو شروع میں مذکور آیت سے ماخوذ ہے۔

یہ سورۃ مکی ہے۔ آیات کی تعداد کوفہ و شام کے قاریان کے مطابق ۴۹ ہے۔ بصرہ کے قاریان کے مطابق ۴۸ آیات ہیں اور حجاز کے قاریان کے مطابق ۴۷ آیات ہیں۔

اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ کوفی و شامی قرائت کے مطابق آیت ۱۳ یَوۡمَ یُدَعُّوۡنَ اِلٰی نَارِ جَہَنَّمَ دَعًّا ایک مستقل آیت ہے۔

حضرت امام جعفر صادق اور حضرت امام محمد باقر علیہما السلام سے روایت ہے:

مَنْ قَرَاَ سُوْرَۃَ الطُّوْرِ جَمَعَ اللّٰہُ لَہٗ خَیْرَ الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَۃِ۔[1] جو شخص سورۃ الطور کی تلاوت کرے اسے اللہ دنیا اور آخرت کی بھلائی ایک ساتھ دے گا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	بنام خدائے رحمن رحیم
وَ الطُّوۡرِ ۙ﴿۱﴾	۱۔ قسم ہے طور کی،
وَ کِتٰبٍ مَّسۡطُوۡرٍ ۙ﴿۲﴾	۲۔ اور لکھی ہوئی کتاب کی،
فِیۡ رَقٍّ مَّنۡشُوۡرٍ ۙ﴿۳﴾	۳۔ ایک کشادہ ورق میں،
وَّ الۡبَیۡتِ الۡمَعۡمُوۡرِ ۙ﴿۴﴾	۴۔ اور بیت معمور (آباد گھر) کی،
وَ السَّقۡفِ الۡمَرۡفُوۡعِ ۙ﴿۵﴾	۵۔ اور بلند چھت کی،
وَ الۡبَحۡرِ الۡمَسۡجُوۡرِ ۙ﴿۶﴾	۶۔ اور موجزن سمندر کی،

[1] وسائل الشیعۃ ۶: ۲۵۶

تشریح کلمات

الْمَسْجُوْرِ: (س ج ر) السجر کے معنی زور سے آگ بھڑکانے کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَالطُّوْرِ: قسم ہے طور کی۔ طور پہاڑ کو کہتے ہیں لیکن خاص ہو گیا سینا میں موجود طور کے ساتھ جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی تھی۔

۲۔ قسم ہے اس کتاب کی جو کشادہ ورق میں تحریر ہے۔ قدیم زمانے میں کسی تحریر کو محفوظ رکھنا ہو تو اس کو نازک چمڑے پر لکھ لیتے تھے۔ چنانچہ آسمانی کتب صحف انبیاء کو اسی چمڑے پر لکھ لیا کرتے تھے۔

۳۔ قسم ہے آباد گھر کی جو حج، عمرہ، طواف و زیارت اور عبادت کرنے والوں سے آباد رہتا ہے۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد کعبہ ہے اور دیگر بعض کے نزدیک اس سے مراد بیت معمور ہے جو آسمانوں میں کعبہ کے برابر میں موجود ہے۔ جہاں فرشتے اس کے گرد طواف کرتے ہیں جیسے زمین پر اہل ارض کعبہ کے گرد۔ اس پر متعدد روایات بھی موجود ہیں اور اسلامی اصطلاح میں اسی کو بیت معمور کہتے ہیں۔

۴۔ اور قسم ہے بلند چھت کی یعنی آسمان کی کہ اس نے ان چیزوں کو عبث خلق نہیں فرمایا۔ اس نے جس مقصد کے لے انہیں خلق کیا ہے اس کے تحت قیامت کا برپا ہونا لازمی ہے اور سرکشوں کے لیے عذاب بھی لازمی ہے۔

سورہ انبیاء آیت ۳۲ میں فرمایا:

وَ جَعَلۡنَا السَّمَآءَ سَقۡفًا مَّحۡفُوۡظًا ... اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنا دیا۔

آسمان کو سقف ایک تو بلندی کی وجہ سے کہا ہے، دوسرے آسمان سے اگر مراد اس ڈھال کو لیا جائے تو ممکن ہے سقف اس لیے کہا ہو کہ اوپر سے آنے والی آفتوں سے یہی ڈھال بچا لیتی ہے۔

۵۔ وَالۡبَحۡرِ الۡمَسۡجُوۡرِ: قسم ہے سمندر کی جو موجزن ہے۔ الۡمَسۡجُوۡرِ کے دوسرے معنی آگ کے ہیں یعنی آگ اور بھاپ میں تبدیل ہونے والے سمندر کی قسم۔

چنانچہ آیت وَ اِذَا الۡبِحَارُ سُجِّرَتۡ[1] کی تفسیر یہی بیان کی جاتی ہے کہ سمندر بھڑکتی آگ میں بدل جائے گا۔ شاید یہی معنی قرین سیاق ہیں۔

چنانچہ روایت میں آیا ہے:

حضرت علی علیہ السلام ایک یہودی سے پوچھا تمہاری کتاب میں آگ کی جگہ کون سی ہے؟ اس نے کہا: سمندر۔ آپؑ نے فرمایا: یہ شخص صحیح کہتا ہے۔ ہماری کتاب میں بھی ہے:

[1] ۸۱ تکویر: ۶

وَالۡبَحۡرِ الۡمَسۡجُوۡرِ۔
اس صورت میں آیت کا ترجمہ یہ ہوگا: قسم ہے: آتشین سمندر کی۔

اِنَّ عَذَابَ رَبِّکَ لَوَاقِعٌ ۙ﴿۷﴾
۷۔ آپ کے رب کا عذاب ضرور واقع ہونے والا ہے۔

مَّا لَہٗ مِنۡ دَافِعٍ ۙ﴿۸﴾
۸۔ اسے ٹالنے والا کوئی نہیں ہے۔

تفسیر آیات

کائنات میں مظاہر قدرت اور مظاہر شریعت کی قسم کھانے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ آگے ایک عظیم خبر اور نہایت اہمیت کا حامل واقعہ بیان ہونے والا ہے۔ وہ خبر مشرکین کے لیے ہے کہ اللہ کا عذاب آنے ہی والا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا اٹل فیصلہ ہے۔ یہ عدل الٰہی کی بنیاد پر ہے۔

۲۔ مَّا لَہٗ مِنۡ دَافِعٍ: اس لیے اس عذاب کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ اللہ کی قوت کے سامنے کسی کا بس چلتا ہے نہ عدل الٰہی کے خلاف کوئی فیصلہ دے گا۔

یَّوۡمَ تَمُوۡرُ السَّمَآءُ مَوۡرًا ۙ﴿۹﴾
۹۔ اس روز آسمان بری طرح تھرتھرائے گا،

وَّ تَسِیۡرُ الۡجِبَالُ سَیۡرًا ﴿ؕ۱۰﴾
۱۰۔ اور پہاڑ پوری طرح چلنے لگیں گے۔

فَوَیۡلٌ یَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُکَذِّبِیۡنَ ﴿ۙ۱۱﴾
۱۱۔ پس اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے تباہی ہے،

الَّذِیۡنَ ہُمۡ فِیۡ خَوۡضٍ یَّلۡعَبُوۡنَ ﴿۱۲﴾ وقف لازم
۱۲۔ جو بیہودگیوں میں کھیل رہے ہیں۔

تشریح کلمات

مَوۡرًا: (م و ر) المور کے معنی تیز رفتاری کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ قیامت ایک کائناتی انقلاب کا نام ہے۔ موجودہ آسمان و زمین اور نظام کائنات درہم برہم ہو جائے گا۔ اس کی جگہ اللہ ایک جدید کائنات اور نظام ترتیب دے گا:

یَوۡمَ نَطۡوِی السَّمَآءَ کَطَیِّ السِّجِلِّ لِلۡکُتُبِ ...۱؎	اس دن ہم آسمان کو اس طرح لپیٹ لیں گے جس طرح طومار میں اوراق لپیٹے ہیں۔

یا پھر فرمایا:

کَمَا بَدَاۡنَاۤ اَوَّلَ خَلۡقٍ نُّعِیۡدُہٗ ...۲؎	جس طرح ہم نے خلقت کی ابتدا کی تھی اسے ہم پھر دہرائیں گے

یعنی جدید کائنات بنائیں گے۔

۲۔ وَّتَسِیۡرُ الۡجِبَالُ سَیۡرًا: پہاڑ ریزہ ہو کر بادل کی طرح چلنے لگیں گے۔ دیگر قرآنی آیات میں بھی فرمایا:

وَتَکُوۡنُ الۡجِبَالُ کَالۡعِہۡنِ الۡمَنۡفُوۡشِ ؁۳؎ اور پہاڑ دھنی ہوئی اون کی طرح ہو جائیں گے۔

۳۔ فَوَیۡلٌ یَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُکَذِّبِیۡنَ: اس دن تکذیبی عناصر کی ہلاکت کا دن ہو گا جو اس دن کی تکذیب کرتے اور اسے ناممکن خیال کرتے تھے۔

۴۔ الَّذِیۡنَ ہُمۡ فِیۡ خَوۡضٍ: خَوۡضٍ قابل مذمت کام میں لگ جانے کے معنوں میں ہے یعنی وہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کے مضمرات پر غور کرنے کی بجائے بیہودہ باتوں میں لگے رہتے تھے: وہ بیہودہ باتیں یہ تھیں: یہ نبی ساحر ہے، مجنون ہے، کاہن ہے، پھر ان انبیاء علیہم السلام کا مذاق بھی اڑاتے تھے۔

یَوۡمَ یُدَعُّوۡنَ اِلٰی نَارِ جَہَنَّمَ دَعًّا ﴿۱۳﴾	۱۳۔ اس دن وہ شدت سے جہنم کی آگ کی طرف دھکیلے جائیں گے۔
ہٰذِہِ النَّارُ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ بِہَا تُکَذِّبُوۡنَ ﴿۱۴﴾	۱۴۔ یہ وہی آگ ہے جس کی تم لوگ تکذیب کرتے تھے۔
اَفَسِحۡرٌ ہٰذَاۤ اَمۡ اَنۡتُمۡ لَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۱۵﴾	۱۵۔ (بتاؤ) کیا یہ جادو ہے یا تم دیکھتے نہیں ہو؟

تشریح کلمات

یُدَعُّوۡنَ: (د ع ع) الدع سختی کے ساتھ دھکا دینے کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ یَوۡمَ یُدَعُّوۡنَ: اس دن تکذیبی عناصر کے لیے ہلاکت ہو گی جب انہیں جہنم کی طرف دھکیل دیا جائے گا۔ سورہ حاقہ آیت ۳۰ میں فرمایا:

۱؎ ۲؎ ۲۱ انبیاء: ۱۰۴ ۳؎ ۱۰۱ قارعۃ: ۵

خُذُوۡہُ فَغُلُّوۡہُ ۝ (حکم آئے گا کہ) اسے پکڑ لو اور طوق پہناؤ۔

اس مشرک کی حالت یہ ہوگی کہ طوق میں جکڑا ہوگا۔ داروغہ جہنم اسے دھکے دے کر جہنم کی طرف لے جا رہا ہوگا۔

۲۔ ہٰذِہِ النَّارُ الَّتِیۡ: داروغے اس سے کہیں گے: یہ وہی آتش ہے جس کی تو تکذیب اور اس کا مذاق اڑایا کرتا اور کہتا تھا یہ جادوگر ہے۔

۳۔ اَفَسِحۡرٌ ہٰذَاۤ: دیکھ! کیا یہ آتش جادو ہے؟ بے حقیقت ہے؟ کیا تمہیں یہ آگ نظر نہیں آتی۔ یہ باتیں از راہ تمسخر ہیں ورنہ جہنم کی آگ مشرکین کے لیے غیض و غضب میں ہوگی:

اِذَا رَاَتۡہُمۡ مِّنۡ مَّکَانٍۭ بَعِیۡدٍ سَمِعُوۡا لَہَا تَغَیُّظًا وَّ زَفِیۡرًا ۝۱۲ [1] جب وہ (جہنم) دور سے انہیں دیکھے گی تو یہ لوگ غضب سے اس کا بپھرنا اور دھاڑنا سنیں گے۔

اِصۡلَوۡہَا فَاصۡبِرُوۡۤا اَوۡ لَا تَصۡبِرُوۡا ۚ سَوَآءٌ عَلَیۡکُمۡ ؕ اِنَّمَا تُجۡزَوۡنَ مَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ۝۱۶ ۱۶۔ اب اس میں جھلس جاؤ پھر صبر کرو یا صبر نہ کرو تمہارے لیے یکساں ہے، تمہیں تو بہرحال تمہارے اعمال کی جزائیں دی جائیں گی۔

تشریح کلمات

اِصۡلَوۡہَا: (ص ل ی) صلی سے ہے جو جھلسنے کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِصۡلَوۡہَا: اب اس آتش میں جھلس جاؤ۔ چیخو چلاؤ یا صبر کرو، عذاب میں فرق نہیں آئے گا۔

۲۔ اِنَّمَا تُجۡزَوۡنَ: یہ خود تمہارے اپنے اعمال ہیں جو تمہیں عذاب میں مبتلا کر رہے ہیں ورنہ:

مَا یَفۡعَلُ اللّٰہُ بِعَذَابِکُمۡ اِنۡ شَکَرۡتُمۡ وَ اٰمَنۡتُمۡ ... [2] اگر تم شکر ادا کرو اور ایمان لے آؤ تو اللہ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا؟

اِنَّ الۡمُتَّقِیۡنَ فِیۡ جَنّٰتٍ وَّ نَعِیۡمٍ ۝۱۷ ۱۷۔ اہل تقویٰ تو یقیناً جنتوں اور نعمتوں میں ہوں گے۔

فٰکِہِیۡنَ بِمَاۤ اٰتٰہُمۡ رَبُّہُمۡ ۚ وَ وَقٰہُمۡ رَبُّہُمۡ عَذَابَ ۱۸۔ ان کے رب نے جو کچھ انہیں عطا کیا ہے اس پر وہ خوش ہوں گے اور ان کا پروردگار انہیں

---

[1] ۲۵ فرقان۔ ۱۲ [2] ۴ نساء۔ ۱۴۷

الۡجَحِیۡمِ ﴿۱۸﴾ انہیں عذاب جہنم سے بچا لے گا۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ الۡمُتَّقِیۡنَ فِیۡ جَنّٰتٍ: قرآن مجید ہمیشہ کافرین کے عذاب اور جہنم کے ذکر کے بعد مومنین کا حال بھی بیان فرمایا کرتا ہے کہ وہ جنت میں نعمتوں میں ہوں گے۔

۲۔ فٰکِہِیۡنَ بِمَاۤ اٰتٰہُمۡ: فٰکِہِیۡنَ کے معنی نعمتوں میں مسرت اور خوشحالی ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

وَّ نَعۡمَۃٍ کَانُوۡا فِیۡہَا فٰکِہِیۡنَ ۞[1] اور نعمتیں جن میں وہ مزہ لیتے تھے۔

وَ اِذَا انۡقَلَبُوۡۤا اِلٰۤی اَہۡلِہِمُ انۡقَلَبُوۡا فَکِہِیۡنَ ۞[2] اور جب وہ اپنے گھر والوں کی طرف لوٹتے تو اتراتے ہوئے لوٹتے تھے۔

ان دونوں آیتوں میں فٰکِہِیۡنَ مسرت کے معنوں میں آیا ہے۔

یہاں دو نعمتوں کا ذکر ہے: ایک حصول جنت دوسری جہنم سے نجات۔ عالم آخرت میں اہل جنت جب جہنم والوں کی حالت کا معائنہ کریں گے تو انہیں جنت کی نعمتوں کی قدر زیادہ ہو جائے گی اور اس جہنم سے نجات کو جنت سے کم درجہ کی نعمت تصور نہیں کریں گے۔

فضائل: مجاھد، عبد اللّٰہ بن عباس سے روایت کرتے ہیں:

ان المتقین فی جنٰت و نعیم خاص کر علی حمزہ، جعفر اور فاطمہ کی شان میں ہے۔

''خاص کر'' کی تعبیر اس لیے ہے کہ آیت کا اطلاق ہر متقی پر ہوتا ہے لیکن ان ہستیوں کو اس کے مصداق اول قرار دیا گیا ہے۔

ملاحظہ حسکانی تفسیر شواھد التنزیل ذیل آیت۔ ابن شہر آشوب نے تفسیر ابو یوسف یعقوب سے یہ روایت بیان کی ہے۔ غایۃ المرام صفحہ ۴۲۲ میں بھی مذکور ہے۔

کُلُوۡا وَ اشۡرَبُوۡا ہَنِیۡٓـًٔا بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۹﴾ ۱۹۔ خوشگواری سے کھاؤ اور پیو ان اعمال کے عوض جو تم کرتے رہے ہو۔

تفسیر آیات

جنت کے کھانے اور پینے کی چیزوں میں خوشگواری کے علاوہ کسی قسم کے ضرر کا احتمال نہیں ہے۔

جنت کی جس قدر نعمتیں انسان کو میسر آئیں گے وہ ان کے اعمال کا تجسم ہو گا۔

---

[1] ۴۴ دخان: ۲۷ [2] ۸۳ مطففین: ۳۱

مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ۚ وَ زَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ۝۲۰

۲۰۔ وہ صف میں بچھی ہوئی مسندوں پر تکیے لگائے ہوئے ہوں گے اور بڑی آنکھوں والی حوروں سے ہم ان کا عقد کر دیں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ محفلوں میں صف میں بچھی ہوئی مسندوں پر بیٹھے ہوں گے:

اِخۡوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیۡنَ ...[۱] وہ برادرانہ طور پر تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔

۲۔ وَ زَوَّجۡنٰہُمۡ بِحُوۡرٍ عِیۡنٍ: بڑی آنکھوں والی حوروں سے ہم ان کا عقد کریں گے۔

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ اتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ مَاۤ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ كُلُّ امْرِئٍۭ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ۝۲۱

۲۱۔ اور جو لوگ ایمان لے آئے اور ان کی اولاد نے بھی ایمان میں ان کی پیروی کی ان کی اولاد کو (جنت میں) ہم ان سے ملا دیں گے اور ان کے عمل میں سے ہم کچھ بھی کم نہیں کریں گے، ہر شخص اپنے عمل کا گروی ہے۔

تشریح کلمات

التنا: (ا ل ت) الت یا لت کم کر دینے کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ والدین کے احسانات صرف دنیا تک محدود نہیں ہیں۔ قیامت کے دن بھی وہ اپنی اس نیک اولاد کی شفاعت کریں گے جو والدین کے درجہ کے نہیں ہے۔ جب والدین کو جنت جانے کی اجازت مل جائے گی اور اولاد کو جنت جانے کی اجازت نہیں ملے گی چونکہ اولاد والدین کے درجے کے نہ ہو گی بلکہ والدین سے کم درجے کی مومن ہو گی، جس کی طرف بِاِیۡمَانٍ کسی حد تک ایمان رکھتی ہو کی تعبیر سے اشارہ فرمایا ہے لیکن والدین کی خواہش پر اس اولاد کو بھی والدین کے درجے پر فائز کیا جائے گا۔

۲۔ وَ مَاۤ اَلَتۡنٰہُمۡ مِّنۡ عَمَلِہِمۡ: اولاد کا درجہ بڑھائے جانے پر والدین کے درجات میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ اس صورت میں کوئی احسان نہ ہو گا اگر والدین سے اٹھا کر اولاد کو دے دیا۔ احسان

---

[۱] ۱۵ حجر: ۴۷

یہ ہے کہ اللہ اپنی طرف سے درجات عنایت فرمائے۔

سورہ مومن کی آیت ۸ اور سورہ رعد کی آیت ۲۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر والدین کم درجات کے ہیں اور اولاد بلند درجات کی ہو تو اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے والدین کو اولاد کے درجات پر لائے گا۔ فرمایا:

جَنّٰتُ عَدۡنٍ یَّدۡخُلُوۡنَہَا وَ مَنۡ صَلَحَ مِنۡ اٰبَآئِہِمۡ وَ اَزۡوَاجِہِمۡ وَ ذُرِّیّٰتِہِمۡ ...۔[1] ایسی دائمی جنتیں ہیں جن میں وہ خود بھی داخل ہوں گے اور ان کے آبا اور ان کی بیویوں اور اولاد میں سے جو نیک ہوں گے وہ بھی۔

والدین اگرچہ نیک ہوں گے لیکن اولاد کے درجات پر نہ ہوں گے تو والدین کو بھی اولاد کے درجات پر فائز کر کے جنت میں داخل کیا جائے گا۔

یہ وہ مقام ہے جہاں والدین کو نیک اولاد آخرت میں بھی فائدہ دے گی۔

۳۔ کُلُّ امۡرِیٴٍۭ بِمَا کَسَبَ رَہِیۡنٌ: ہر شخص اپنے عمل کا گروی اور گرفت میں ہے۔ اگر والدین کے کچھ اعمال اولاد کو دیے جائیں تو انسان اپنے عمل کا گروی نہ ہوا بلکہ بعض عمل کا گروی ہوا۔ گویا اس آیت میں فرمایا: عمل قرض ہے اور نفس گروی ہے۔ اگر عمل صالح ہوا تو قرض ادا ہو گیا، نفس چھوٹ جائے گا اور اگر عمل صالح نہ ہوا، جرم کا ارتکاب ہوا تو نفس گروی رہے گا اسے عذاب سے نجات نہیں ملے گی۔

اس تفسیر سے اس آیت میں اور آیہ کُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا کَسَبَتۡ رَہِیۡنَۃٌ ۙ اِلَّاۤ اَصۡحٰبَ الۡیَمِیۡنِ ۔[2] میں کوئی تضاد نہیں رہتا۔ اس آیت میں فرمایا: ہر شخص اپنے عمل کا گروی ہے۔ سورہ مدثر میں عمل صالح والے اصحاب کا استثنا ہو گیا۔

فضائل: ابو مالک، ابن عباس سے روایت کرتے ہیں:

یہ آیت پنجتن پاک کی شان میں ہے۔ حضرت عمر کے غلام نافع، عبداللّٰہ بن عمر سے روایت کرتے ہیں: جب ہم اصحاب کو شمار کرتے ہیں تو اس طرح کرتے ہیں۔ ابوبکر، عمر اور عثمان۔ کسی نے کہا: علی کا کیا مسئلہ ہے؟ کہا: تیرا بھلا ہو علی کا شمار اہل بیت میں ہوتا ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے درجہ پر ہیں۔ اللہ کا ارشاد ہے: وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ اتَّبَعَتۡہُمۡ ذُرِّیَّتُہُمۡ ....۔ پس فاطمہ، رسول کے درجہ میں ہیں اور علی بھی ان دونوں کے ساتھ ہیں۔

دوسری روایت میں نافع ابن عمر سے روایت کرتے ہیں:

میں نے عبد اللّٰہ بن عمر سے پوچھا: رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے بعد خیر الناس کون ہے؟ کہا: تجھے اس بات سے کیا سروکار۔ پھر کہا: اللہ سے معافی طلب کرو۔ خیر الناس وہ ہے جس کے لیے وہ حلال ہو جو رسول اللہؐ کے لیے حلال ہو اور وہ حرام ہو جو رسول

[1] ۱۳ رعد: ۲۳ [2] ۷۴ مدثر: ۳۸۔ ۳۹

اللہؐ کے لیے حرام ہے۔ میں نے کہا: وہ کون ہے۔ کہا: وہ علی (علیہ السلام) ہیں۔ (اصحاب کے گھروں کے) مسجد کی طرف جانے والے سارے راستے بند کیے سوائے علی (علیہ السلام) کے۔ پھر علی (علیہ السلام) سے فرمایا:

لك فی هذا المسجد ما لی و علیك فیه ما علی و انت وارثی و وصیی تقضی دینی و تنجز وعدی و تقتل علی سنتی کذب من زعم انه یبغضك و یحبنی۔

(اے علی) تیرے لیے اس مسجد میں وہ سہولت میسر ہے جو مجھے حاصل ہے اور وہی پابندی ہے جو میرے لیے ہے اور تو میرا وارث اور وصی ہے۔ تو میرا قرض ادا کرے گا۔ میرے معاہدوں پر عمل کرے گا اور میری سنت کے مطابق جنگ کرے گا۔ وہ شخص جھوٹ بولتا ہے جو تجھ سے بغض رکھ کر مجھ سے محبت رکھنے کا دعویٰ کرتا ہے۔

اس حدیث کو ابن بطریق نے کتاب العمدۃ فصل ۲۰ میں، بحرانی نے غایة المرام میں ذکر کیا ہے۔ عبداللہ بن عمر کا قول: ''علی (علیہ السلام) کا موازنہ رسول اللہؐ سے ہے اصحاب سے نہیں اور علی کا کسی اور سے موازنہ نہیں ہوسکتا'' اور دیگر اصحاب کا تفضیل علی علیہ السلام کے بارے میں موقف جاننے کے لیے ملاحظہ ہو: محاسن، بیهقی، مجمع الزوائد، فتح الباری شرح صحیح بخاری۔

اہم نکات

۱۔ قیامت کے دن مومن ہونے کی صورت اولاد اور والدین ایک دوسرے کے کام آئیں گے۔

۲۔ ہر شخص کی قسمت اس کے عمل سے وابستہ ہے۔ نیک عمل انسان کا ساتھ نہیں چھوڑتا اور بدعمل جان نہیں چھوڑتا۔

وَاَمۡدَدۡنٰهُمۡ بِفَاكِهَةٍ وَّلَحۡمٍ مِّمَّا يَشۡتَهُوۡنَ ﴿۲۲﴾

۲۲۔ اور ہم انہیں پھل اور گوشت جو ان کا جی چاہے فراہم کریں گے۔

يَتَنَازَعُوۡنَ فِيۡهَا كَاۡسًا لَّا لَغۡوٌ فِيۡهَا وَلَا تَاۡثِيۡمٌ ﴿۲۳﴾

۲۳۔ وہاں وہ آپس میں جام پھراتے ہوں گے جس میں نہ بیہودگی ہوگی اور نہ گناہ۔

وَيَطُوۡفُ عَلَيۡهِمۡ غِلۡمَانٌ لَّهُمۡ كَاَنَّهُمۡ لُؤۡلُؤٌ مَّكۡنُوۡنٌ ﴿۲۴﴾

۲۴۔ اور ان کے گرد نوعمر خدمت گزار لڑکے ان کے لیے چل پھر رہے ہوں گے گویا وہ چھپائے ہوئے موتی ہوں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَاَمۡدَدۡنٰہُمۡ: انہیں جنت میں وقتاً فوقتاً مختلف نعمتیں فراہم کی جائیں گی۔ مثلاً میوے، گوشت وہ پھل اور گوشت جن کی یہ مومن خواہش کرے۔ چونکہ جنت میں مومن کا ارادہ اور خواہش نافذ ہوتی ہے۔

۲۔ یَتَنَازَعُوۡنَ: تنازع کا لفظ جب کاس (جام) کے ساتھ ہو تو ایک دوسرے سے لینے یعنی جام پھرانے کے معنوں میں ہوگا۔

۳۔ وَ یَطُوۡفُ عَلَیۡہِمۡ غِلۡمَانٌ: غِلۡمَانٌ وہ نوعمر خادم ہوں گے جنہیں اللہ تعالیٰ نے صرف اہل جنت کی خدمت گزاری کے لیے خلق فرمایا ہے۔ یہ بھی جنت میں ہمیشہ رہیں گے۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا:

وَیَطُوۡفُ عَلَیۡہِمۡ وِلۡدَانٌ مُّخَلَّدُوۡنَ...[1] اور (خدمت کے لیے) ان کے گرد ایسے لڑکے پھر رہے ہوں گے جو ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

انہیں قرآن نے غِلۡمَانٌ اور وِلۡدَانٌ کے نام سے یاد کیا ہے۔

وَ اَقۡبَلَ بَعۡضُہُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ یَّتَسَآءَلُوۡنَ ﴿۲۵﴾ — ۲۵۔ اور یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر سوال کریں گے۔

قَالُوۡۤا اِنَّا کُنَّا قَبۡلُ فِیۡۤ اَہۡلِنَا مُشۡفِقِیۡنَ ﴿۲۶﴾ — ۲۶۔ کہیں گے: پہلے ہم اپنے گھر والوں کے درمیان ڈرتے رہتے تھے۔

فَمَنَّ اللّٰہُ عَلَیۡنَا وَ وَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوۡمِ ﴿۲۷﴾ — ۲۷۔ پس اللہ نے ہم پر احسان کیا اور ہمیں جھلسا دینے والی ہواؤں کے عذاب سے بچا لیا۔

اِنَّا کُنَّا مِنۡ قَبۡلُ نَدۡعُوۡہُ ؕ اِنَّہٗ ہُوَ الۡبَرُّ الرَّحِیۡمُ ﴿۲۸﴾ ع — ۲۸۔ اس سے پہلے ہم اسی کو پکارتے تھے وہ یقیناً احسان فرمانے والا، مہربان ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَقۡبَلَ بَعۡضُہُمۡ: احباب کی محفل میں بیٹھ کر اپنے گزرے ہوئے دنوں کے حالات ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہوں گے کہ دنیا میں کیسی زندگی گزاری اور ان مشکل مراحل کو طے کر کے جنت کی ان نعمتوں تک کیوں کر رسائی حاصل ہوئی۔

---

[1] ۷۶ دھر: ۱۹

قَالُوۡۤا اِنَّا کُنَّا قَبۡلُ فِیۡۤ اَہۡلِنَا: جواب ہوگا: ہم مال و اولاد کی وجہ سے خوف خدا سے غافل نہیں ہوتے تھے۔ اس ڈرنے ہمیں آج امن دیا ہے۔

۲۔ فَمَنَّ اللّٰہُ عَلَیۡنَا: اللہ نے ہم پر احسان کیا ورنہ ہمارے اعمال ان نعمتوں کے مقابلے میں کچھ نہ تھے۔ نعمتوں کا کیا ذکر، جہنم کے عذاب سے اللہ نے ہمیں بچایا ہے، یہ بڑا احسان ہے۔ اہل جنت عذاب جہنم کا مشاہدہ کریں گے تو جہنم سے نجات کی قدر ہوگی۔

السَّمُوۡمِ: جھلسا دینے والی ہوا کو کہتے ہیں۔

۳۔ اِنَّا کُنَّا مِنۡ قَبۡلُ نَدۡعُوۡہُ: جنت کی زندگی سے پہلے ہم اللہ کو پکارتے تھے۔ آج ہماری پکار سنی گئی۔

۴۔ اِنَّہٗ ہُوَ الۡبَرُّ الرَّحِیۡمُ: اسے ہم نے پکارا تھا یہ جان کر کہ وہ دو اہم اوصاف کا مالک ہے: وہ الۡبَرُّ احسان کرنے والا ہے اور اس کا احسان وسیع ہے جیسا کہ اس کی رحمت وسیع ہے۔ وہ الرَّحِیۡمُ ہے۔ ایک ادنیٰ عمل کا بڑا ثواب دیتا ہے۔ وہ کثیر الرحمۃ ہے۔

فَذَکِّرۡ فَمَاۤ اَنۡتَ بِنِعۡمَتِ رَبِّکَ بِکَاہِنٍ وَّ لَا مَجۡنُوۡنٍ ﴿۲۹﴾

۲۹۔ لہٰذا آپ نصیحت کرتے جائیں کہ آپ اپنے رب کے فضل سے نہ کاہن ہیں اور نہ مجنون۔

تشریح کلمات

کاھن: (ک ھ ن) غیبی باتیں بیان کرنے والے کو کہتے تھے۔ جاہلیت میں یہ ایک معروف پیشہ تھا۔ لوگ یہ خیال کرتے تھے کاہنوں کا ارواح کے ساتھ یا شیاطین اور جنوں کے ساتھ رابطہ ہوتا ہے جن سے وہ غیب کی باتیں حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کا حلیہ اور لہجۂ کلام بھی مختلف ہوتا تھا۔

تفسیر آیات

۱۔ فَذَکِّرۡ: مشرکین آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کاہن ہونے کا الزام لگاتے اور اس کے لیے آپ کے اس دعویٰ کو سند قرار دیتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر فرشتہ، وحی نازل کرتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غیب گوئی کرتے ہیں۔

یہ الزام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر چسپاں نہیں ہوتا تھا چونکہ کاہنوں اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان عمل میں کوئی قدر مشترک نہ تھی۔

اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں صرف اس بات پر اکتفا فرمایا کہ آپ کاہن نہیں ہیں، اس پر دلیل قائم نہیں فرمائی چونکہ سب جانتے تھے کاہن کیا ہوتا ہے۔ کاہن ایک پیشہ تھا، نہ پیغام، نہ دستور، نہ حق و

ناحق کی بات۔ اسی طرح رسول ﷺ کے مجنون نہ ہونے پر دلیل قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِہٖ رَیۡبَ الۡمَنُوۡنِ ﴿۳۰﴾

۳۰۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں: یہ شاعر ہے، ہم اس کے بارے میں گردش زمانہ (موت) کے منتظر ہیں؟

قُلۡ تَرَبَّصُوۡا فَاِنِّیۡ مَعَکُمۡ مِّنَ الۡمُتَرَبِّصِیۡنَ ﴿۳۱﴾

۳۱۔ کہدیجیے: انتظار کرو کہ میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔

تشریح کلمات

رَیۡبَ الۡمَنُوۡنِ: حادثہ، گردش کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ شَاعِرٌ: روایت ہے:

قریش کے لوگ دار الندوۃ میں جمع ہو گئے اور رسول اللہ ﷺ کے بارے میں متعدد آراء سامنے آئیں۔ ان میں سے کسی نے کہا: گردش زمانہ کا انتظار کرو، یہ شاعر ہی تو ہے۔ جس طرح دیگر شعراء زھیر، نابغہ اور اعشی کے مرنے کے بعد ان کی بھی بات ختم ہوئی ہے۔ اس بات پر اتفاق کر کے وہ منتشر ہو گئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[1]

۲۔ قُلۡ تَرَبَّصُوۡا: کہدیجیے: تم اپنے گمان کے مطابق ہمارے خاتمے کا انتظار کرو اور ہم اپنے ایمان کے مطابق تمہارے خاتمے کا انتظار کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں: انتظار کرو تمہاری سازشوں نے دم توڑنا ہے یا ہماری تحریک نے؟ یہ آنے والا وقت بتائے گا۔

اَمۡ تَاۡمُرُہُمۡ اَحۡلَامُہُمۡ بِہٰذَاۤ اَمۡ ہُمۡ قَوۡمٌ طَاغُوۡنَ ﴿۳۲﴾

۳۲۔ کیا ان کی عقلیں انہیں ایسا کرنے کو کہتی ہیں یا یہ سرکش لوگ ہیں؟

تفسیر آیات

۱۔ اَمۡ تَاۡمُرُہُمۡ اَحۡلَامُہُمۡ: کفار کی بے عقلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: کیا تمہاری عقلوں نے یہ فیصلہ دیا ہے کہ محمد (ﷺ) شاعر یا مجنون ہیں؟ اگر عقل کا شائبہ ہوتا تو عقلِ کل کو مجنون نہ

---

[1] روح المعانی

کہتے۔ عاقل اور مجنون میں امتیاز کی صلاحیت کا فقدان بے عقلی کی دلیل ہے۔

۲۔ هُمۡ قَوۡمٌ طَاغُوۡنَ: یہ لوگ دو حال سے خالی نہیں ہیں: یا تو یہ لوگ بے عقل ہیں یا سرکش قوم ہیں کیونکہ سرکش قوم کسی حدود و قیود میں نہیں رہتی۔ نہ اسے حق و باطل کی تمیز ہوتی ہے۔

اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلۡ لَّا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۳۳﴾

۳۳۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں اس (قرآن) کو اس نے خود گھڑ لیا ہے؟ (نہیں) بلکہ یہ ایمان نہیں لاتے۔

فَلۡیَاۡتُوۡا بِحَدِیۡثٍ مِّثۡلِهٖۤ اِنۡ کَانُوۡا صٰدِقِیۡنَ ﴿۳۴﴾

۳۴۔ پس اگر یہ سچے ہیں تو اس جیسا کلام بنا لائیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ تَقَوَّلَهٗ: یہ لوگ جو کہتے ہیں اس قرآن کو خود اس (محمد ﷺ) نے گڑھ لیا ہے اس لیے کہتے ہیں کہ عدم ایمان کے لیے بہانہ بنائیں۔ دراصل انہیں اندازہ ہے کہ یہ کلام گھڑا نہیں جا سکتا بلکہ وہ ایمان نہ لانے کے لیے ایک جواز کے طور پر کہتے ہیں۔

۲۔ فَلۡیَاۡتُوۡا بِحَدِیۡثٍ مِّثۡلِهٖۤ: جواب میں فرمایا: یہ کلام اگر زمین میں بن سکتا ہے تو تم بھی اسی زمین میں بستے ہو۔ اگر عرب قوم کا ایک فرد ایسا کلام بنا سکتا ہے تو تم ایک قوم ہو، سب مل کر ایسا کلام بنا لاؤ۔ قرآن کا یہ چیلنج عصر رسول ﷺ سے لے کر آج تک فضائے عالم میں گونج رہا ہے۔

اَمۡ خُلِقُوۡا مِنۡ غَیۡرِ شَیۡءٍ اَمۡ هُمُ الۡخٰلِقُوۡنَ ﴿۳۵﴾

۳۵۔ کیا یہ لوگ بغیر کسی خالق کے پیدا ہوئے ہیں یا خود (اپنے) خالق ہیں؟

تفسیر آیات

کیا یہ لوگ جو اللہ کی بندگی نہیں کرتے، کسی چیز کے بغیر از خود پیدا ہوئے ہیں یعنی یہ لوگ مِنۡ غَیۡرِ شَیۡءٍ پیدا ہوئے ہیں۔ جیسا کہ فرمایا: غَیۡرِ سُوۡٓءٍ[1] کسی عیب کے بغیر۔ یہاں ظاہر جملہ سے واضح طور پر جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ دو صورتیں سامنے رکھی گئی ہیں: ایک یہ کہ لوگ مِنۡ غَیۡرِ شَیۡءٍ کسی خالق کے بغیر پیدا ہوئے ہیں یا یہ لوگ خود اپنے خالق ہیں لیکن اگر یہ دونوں صورتیں ممکن نہیں ہیں تو لازماً ان کا کوئی خالق ہے جس کی بندگی کرنا لازمی ہے۔

---

[1] ۲۰ طہ: ۲۲

اَمۡ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ ۚ بَلۡ لَّا یُوۡقِنُوۡنَ ﴿ؕ۳۶﴾

۳۶۔ یا انہوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے؟ (نہیں) بلکہ یہ یقین نہیں رکھتے۔

تفسیر آیات

۱۔ تیسری صورت یہ ہے کہ کیا ان لوگوں نے کائنات کو بنایا ہے کہ خود خالق ہونے کی وجہ سے کسی غیر کی بندگی نہ کرتے ہوں؟ یہ لوگ ان مذکورہ صورتوں میں کسی ایک صورت کے قائل نہیں ہیں۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر یہ لوگ کیوں اللہ کی بندگی نہیں کرتے؟ جواب میں فرمایا:

بَلۡ لَّا یُوۡقِنُوۡنَ: یہ اپنے عقیدے پر یقین نہیں رکھتے۔ یہ لوگ خالق اللہ ہی کو کہتے ہیں پھر بھی اللہ کے خالق ہونے پر یقین نہ ہونے کی وجہ سے اللہ کی بندگی نہیں کرتے۔

اَمۡ عِنۡدَہُمۡ خَزَآئِنُ رَبِّکَ اَمۡ ہُمُ الۡمُصَۜیۡطِرُوۡنَ ﴿ؕ۳۷﴾

۳۷۔ کیا ان کے پاس آپ کے رب کے خزانے ہیں یا ان پر ان لوگوں کا تسلط قائم ہے؟

تفسیر آیات

چوتھی صورت یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ کے خزانوں کے مالک ہیں، اللہ کے پاس کچھ نہیں ہے۔ رزق، دولت، عزت دینے کا خود انہیں اختیار ہے لہٰذا وہ اللہ کی بندگی نہ کرتے ہوں۔ یہ لوگ اس بات کے بھی قائل نہیں ہیں کہ اپنی روزی اور قسمت خود ان کے ہاتھوں میں ہے۔

اَمۡ ہُمُ الۡمُصَۜیۡطِرُوۡنَ: پانچویں صورت یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ پر غالب آنے والے ہوں۔ اسی صورت میں غالب آنے والے مغلوب کی بندگی نہیں کرتے۔ اس نظریے کا بھی کوئی قائل نہیں ہے۔

اَمۡ لَہُمۡ سُلَّمٌ یَّسۡتَمِعُوۡنَ فِیۡہِ ۚ فَلۡیَاۡتِ مُسۡتَمِعُہُمۡ بِسُلۡطٰنٍ مُّبِیۡنٍ ﴿ؕ۳۸﴾

۳۸۔ یا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے جس (کے ذریعے) سے یہ وہاں (عالم ملکوت) کی باتیں سنتے ہیں؟ (اگر ایسا ہے) تو ان کا سننے والا واضح دلیل پیش کرے۔

تفسیر آیات

چھٹی صورت یہ ہے کہ ان کے پاس کوئی ایسی سیڑھی ہے جس پر چڑھ کر یہ عالم بالا کی باتیں سنتے

ہیں جہاں سے انہیں یہ معلومات حاصل ہوگئی ہوں کہ اللہ کی بندگی نہیں کی جاتی۔ اگر اس قسم کا کوئی مدعی ہے تو اسے اپنا مدعا پر دلیل کے ساتھ سامنے آنا چاہیے۔

اَمْ لَهُ الْبَنٰتُ وَلَكُمُ الْبَنُوْنَ ﴿٣٩﴾

۳۹۔ کیا اللہ کے لیے بیٹیاں اور تمہارے لیے بیٹے ہیں؟

تفسیر آیات

ساتویں صورت یہ ہے کہ تمہیں خود اللہ پر فضیلت ہے اس لیے اس کی بندگی نہیں کرتے ہو۔ دلیل یہ بناتے ہو کہ اللہ کی تو بیٹیاں ہیں اور ہمارے لیے بیٹے ہیں۔

اللہ کی اولاد ہونے کی بات بھی نہایت ہی غیر معقول منطق ہے۔

اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ﴿٤٠﴾

۴۰۔ کیا آپ ان سے اجر مانگتے ہیں کہ ان پر تاوان کا بوجھ پڑ رہا ہے؟

تفسیر آیات

آٹھویں صورت یہ ہے کہ ہمارے رسول چونکہ تم سے اجرت رسالت طلب کرتے ہیں اگر ان کی رسالت کو قبول کر کے اللہ کی بندگی اختیار کیا جائے تو تم پر تاوان کا بوجھ پڑے گا۔

اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿٤١﴾

۴۱۔ یا ان کے پاس غیب کا علم ہے جسے وہ لکھتے ہوں؟

تفسیر آیات

نویں صورت یہ ہے کہ ان کے پاس علم غیب ہے۔ اس سے یہ نسخہ برداری کرتے ہیں۔ اس علم غیب کی وجہ سے وہ اللہ کی بندگی کی طرف نہیں آتے چونکہ اس علم غیب میں ایسا کوئی حکم نہیں ہے۔

اَمْ يُرِيْدُوْنَ كَيْدًا ۭ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ ﴿٤٢﴾

۴۲۔ کیا یہ لوگ فریب دینا چاہتے ہیں؟ کفار تو خود فریب کا شکار ہو جائیں گے۔

تفسیر آیات

یہ ساری صورتیں درست نہیں ہیں پھر بھی وہ اس لیے اللہ کی بندگی کی طرف نہیں آتے ہیں چونکہ یہ لوگ اسلامی دعوت کے خلاف سازشوں میں مشغول ہیں اور ان کا خیال یہ ہے کہ یہ دعوت، ہماری سازشوں کا شکار ہو جائے گی اور ہمیں اس مسئلہ سے راحت ہو جائے گی۔

حالانکہ هُمُ الۡمَكِيۡدُوۡنَ یہ لوگ خود اپنی سازش کا شکار ہونے والے ہیں۔

یہ ابتدائے دعوت کے دنوں کی بات ہے جب مسلمان نہایت ہی نامساعد حالات سے دوچار ایک چھوٹی سی بے سروسامان جماعت پر مشتمل تھے۔ اس وقت کی پیشگوئی ہے کہ مخالفین اس دعوت کو ناکام بنانے کے لے جو بھی سازش اور تدبیر کریں اس کا الٹا اثر انہی کافروں کے خلاف ظاہر ہوگا۔

اَمۡ لَهُمۡ اِلٰهٌ غَيۡرُ اللّٰهِ ؕ سُبۡحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ ﴿۴۳﴾	۴۳۔ یا ان کا اللہ کے سوا کوئی معبود ہے؟ اللہ اس شرک سے پاک ہے جو یہ کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

ان تمام مفروضوں کے باطل ہونے کے باوجود کیا تمہارے لیے غیر خدا کے معبود ہونے کا امکان باقی رہتا ہے؟ یعنی آخری صورت جس کے خود مشرکین قائل ہیں، یہ ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود موجود ہے اس لیے ہم اللہ کی بندگی نہیں کرتے لیکن غیر اللہ کی بندگی کا باطل ہونا گزشتہ آیات سے ثابت ہوا ہے۔ اگر مذکورہ تمام صورتیں ناممکن ہیں تو تمہارے لیے اللہ کی بندگی سے فرار اختیار کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

سُبۡحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ: اللہ تعالیٰ کی ذات پاکیزہ ہے اس شرک سے جو تم نے اپنے ذہنوں میں گھڑ رکھا ہے۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ایمان کے سارے راستے بیان فرمائے اور کفر کے سارے راستے بند کیے اور جامع ترین انداز میں غیر اللہ کی بندگی کے جواز کے لیے کوئی راستہ نہیں چھوڑا۔

وَ اِنۡ يَّرَوۡا كِسۡفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا يَّقُوۡلُوۡا سَحَابٌ مَّرۡكُوۡمٌ ﴿۴۴﴾	۴۴۔ اور اگر یہ لوگ آسمان سے (عذاب کا) کوئی ٹکڑا گرتا ہوا دیکھ لیں تو کہیں گے: یہ تو سنگین بادل ہے۔
فَذَرۡهُمۡ حَتّٰى يُلٰقُوۡا يَوۡمَهُمُ	۴۵۔ پس آپ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیجیے

الَّذِیۡ فِیۡہِ یُصۡعَقُوۡنَ ﴿۴۵﴾ یہاں تک کہ یہ اپنا وہ دن دیکھ لیں جس میں ان کے ہوش اڑ جائیں گے۔

یَوۡمَ لَا یُغۡنِیۡ عَنۡہُمۡ کَیۡدُہُمۡ شَیۡئًا وَّ لَا ہُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ ﴿۴۶﴾ ۴۶۔ اس دن نہ ان کی تدبیر ان کے کسی کام آئے گی اور نہ ہی ان کی مدد کی جائے گی۔

تشریح کلمات

کِسۡفًا: (ك س ف) الکسفة کے معنی بادل، روئی یا اس قسم کے دوسرے سوراخ دار اجسام کے ٹکڑوں کے ہیں۔ اہل لغت نے کہا ہے: صَاعِقَۃٌ کی تین قسمیں ہیں: اول بمعنی موت ۔دوم بمعنی عذاب۔سوم بمعنی آگ اور بجلی کی کڑک لیکن تینوں قسمیں صَاعِقَۃٌ کے آثار ہیں۔

یُصۡعَقُوۡنَ: (ص ع ق) الصاعقة یعنی ہولناک دھماکہ۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِنۡ یَّرَوۡا کِسۡفًا: ان کی ہٹ دھرمی اور عناد کا یہ عالم ہے کہ وہ محسوسات تک کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ اگر بالفرض یہ لوگ آسمان سے عذاب کا ٹکڑا گرتے ہوئے دیکھ بھی لیں تو وہ اسے عذاب تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے بلکہ کہیں گے: یہ تو سنگین بادل ہے۔ اس طرح یہ لوگ کسی بھی معجزے کو تسلیم کرنے کے لیے حاضر نہیں ہیں۔

۲۔ فَذَرۡہُمۡ: آپ ان مشرکوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیجیے۔ ناقابل ہدایت، ہٹ دھرم منکرین کی سب سے بڑی سزا یہ ہے کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ وہ ذات ان سے ہاتھ اٹھا لے جس کے پاس سب کچھ ہے تو وہ سب کچھ سے محروم رہ جائیں گے۔

۲۔ حَتّٰی یُلٰقُوۡا یَوۡمَہُمُ: اس دن کے آنے تک جس میں وہ عذاب کا سامنا کریں گے۔ وہ دن ان کی موت کا دن ہوگا۔ موت ہی کے دن ان کی ابدی قسمت کا فیصلہ سنا دیا جائے گا اور جس عذاب کے یہ منکر تھے اسے چکھنا شروع کر دیں گے۔

۳۔ یَوۡمَ لَا یُغۡنِیۡ عَنۡہُمۡ کَیۡدُہُمۡ: وہ ان کی نہایت بے بسی کا دن ہوگا۔ اس دن اگر کوئی مدد کرنے والا ہے تو وہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس سے یہ لوگ مربوط نہیں رہے۔ اس کی بندگی سے دور رہے لہٰذا آج ان کی مدد کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔

وَ اِنَّ لِلَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا عَذَابًا دُوۡنَ ۴۷۔ اور ظالموں کے لیے اس (عذاب) کے علاوہ

ذٰلِكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۷﴾ بھی یقیناً عذاب ہے لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔

تفسیر آیات

۱۔ جن لوگوں نے شرک اختیار کیا ہے ان کے لیے آخرت کے عذاب کے علاوہ بھی عذاب ہے۔ یہ عذاب دنیا کا ہوسکتا ہے۔ جیسے بدر میں قتل و ہزیمت اور قبر کا بھی عذاب ہوسکتا ہے۔

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿۴۸﴾ ۴۸۔ اور آپ اپنے رب کے حکم تک صبر کریں، یقیناً آپ ہماری نگاہوں میں ہیں اور جب آپ اٹھیں تو اپنے رب کی ثنا کے ساتھ تسبیح کریں۔

وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ ﴿۴۹﴾ ع ۲ ۴۹۔ اور رات کے بعض حصوں میں اور ستاروں کے غروب ہونے کے بعد بھی اپنے رب کی تسبیح کریں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ: رب کا حکم یہ ہے کہ ان مشرکین کو کچھ دن مہلت ملنی ہے۔ مہلت کے دنوں میں صبر سے کام لینے کا حکم ہے۔

۲۔ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا: آپ ہماری نگاہوں میں ہیں۔ آپ کی ہر جنبش اور حرکت ہماری حفاظت میں ہے۔ جس طرح کسی کو اپنے حال پر چھوڑنا بہت بڑی سزا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کا رسول کریم ﷺ سے یہ فرمانا: فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا آپ ہماری حفاظت میں ہیں سب سے بڑی عنایت ہے۔

۳۔ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ: صبر، عزم و ارادے میں استحکام اور پشتیبانی کے لیے تسبیح و تحمید کا سہارا لیجیے۔

۴۔ حِيْنَ تَقُوْمُ: جب آپ اٹھیں تو اپنے رب کی ثنا کے ساتھ تسبیح کریں۔

جب اٹھیں سے مراد کیا ہے؟ چند اقوال ہیں: جب اپنی مجلس سے اٹھیں۔ جب دعوت الی اللہ کے لیے اٹھیں۔ جب خواب سے اٹھیں۔ بظاہر ان اقوال میں سب سے زیادہ مناسب قول یہ ہے کہ حین تقوم لصلوۃ الیل۔ جب رات کو تہجد کے لیے اٹھو تو تسبیح کی قوت کا سہارا لو۔ اس کی تائید سورہ مزمل کی آیات ۱ تا ۳ سے ہوتی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝ اے کپڑوں میں لپٹنے والے! رات کو اٹھا کیجیے مگر کم، آدھی رات یا اس سے کچھ کم کر لیجیے۔

ان آیات میں آیندہ آنے والے سنگین حالات کے مقابلہ کے لیے رات کو اٹھ کر عبادت کرنے کا حکم ہے:

اِنَّا سَنُلۡقِیۡ عَلَیۡکَ قَوۡلًا ثَقِیۡلًا ۝ [1]　ہم عنقریب آپ پر ایک بھاری حکم (کا بوجھ) ڈالنے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کو تسبیح کے ذریعے باطنی اور روحانی قوت سے لیس کرنا چاہتا ہے تا کہ حکم رب کی تعمیل میں صبر سے کام لینا آسان ہو جائے۔

۵۔ وَ مِنَ الَّیۡلِ فَسَبِّحۡہُ: اس جملے سے مراد تہجد کے علاوہ تسبیح ہو سکتی ہے۔ چنانچہ مجمع البیان میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام و حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم کان یقوم من اللیل ثلاث مرات فینظر فی افاق السماء ویقرأ الخمس من آل عمران التی آخرھا اِنَّکَ لَا تُخۡلِفُ الۡمِیۡعَادَ ثم یفتتح صلاۃ اللیل۔ [2]	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رات کو تین بار اٹھتے تھے۔ پھر آسمان کے اطراف کی طرف نگاہ فرماتے۔ پھر سورہ آل عمران کی پانچ آیات کی تلاوت اِنَّکَ لَا تُخۡلِفُ الۡمِیۡعَادَ تک فرماتے تھے۔ پھر نماز تہجد شروع کرتے تھے۔

۶۔ وَ اِدۡبَارَ النُّجُوۡمِ: ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی روایات کے مطابق اِدۡبَارَ النُّجُوۡمِ سے مراد صبح کی نماز سے پہلے کی دو رکعت نماز نافلہ ہے۔ [3]

یعنی جب صبح کی روشنی نمودار ہونے سے ستارے ناپید ہونے لگتے ہیں۔

---

[1] ۷۳ مزمل: ۵　[2] مجمع البیان۔ عوالی اللئالی ابن ابی جمہور ۲: ۲۶ ح ۶۲　[3] الکافی ۳: ۴۴۴

سُورَۃُ النَّجۡمِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اس سورۃ المبارکۃ کا نام النجم ہے جو شروع میں مذکور آیت وَالنَّجۡمِ اِذَا ہَوٰی سے ماخوذ ہے۔ کوفی قرائت کے مطابق یہ سورۃ مکی ہے اور آیات کی تعداد ۶۲ ہے۔ المیزان میں آیا ہے کہ یہ پہلی سورۃ ہے جس کی تلاوت رسول اللہ ﷺ نے علی الاعلان مؤمنین اور مشرکین کے سامنے فرمائی۔

اس سورۃ المبارکۃ میں مذکور آیات اَفَرَءَیۡتُمُ اللّٰتَ وَالۡعُزّٰی ۙ وَمَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الۡاُخۡرٰی ۝ کے ذیل میں ایک داستان بنام داستان غرانیق غیر شیعہ مصادر میں موجود ہے۔ ہم نے مقدمہ میں اس داستان کے مضمون سے اس کے جعلی ہونے پر دلیل قائم کی ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ — بنام خدائے رحمن رحیم

وَالنَّجۡمِ اِذَا ہَوٰی ۙ﴿۱﴾ — ۱۔ قسم ہے ستارے کی جب وہ غروب کرے۔

تفسیر آیات

۱۔ قسم ہے ستارے کی جب غروب ہو جائے اور صبح کی روشنی نمودار ہو جائے۔ تاریکی چھٹ جائے دنیا روشن ہو جائے۔ ہر چیز کی شناخت ممکن ہو جائے۔ کسی قسم کی دھند باقی نہ رہے۔

مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمۡ وَمَا غَوٰی ۚ﴿۲﴾ — ۲۔ تمہارا رفیق نہ گمراہ ہوا ہے اور نہ بہکا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ صَاحِبُکُمۡ: صاحب یعنی ساتھی، رفیق۔ ایک محاورہ ہے جہاں کوئی اور رشتہ بتانا منظور نہ ہو تو وہاں صَاحِبُکُمۡ کہتے ہیں۔ جیسے ہم ”یار“ کہتے ہیں۔

۲۔ساتھ یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ خود تمہارے رفیق ہیں۔ تمہارے درمیان زندگی کرنے والے ہیں ان کے خلق وخو، عادات مزاج اور سیرت و کردار سے تم بخوبی باخبر ہو۔

۳۔ مَاضَلَّ: نہ تمہارے ساتھی محمد (ﷺ) راہ حق سے بھٹکے ہیں نہ ہی بہکے ہیں۔ ضَلَّ گمراہی، ھُدٰی کے مقابلے میں ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

فَرِیۡقًا ہَدٰی وَ فَرِیۡقًا حَقَّ عَلَیۡہِمُ الضَّلٰلَۃُ ... [1] (اللہ نے) ایک گروہ کو ہدایت دے دی ہے اور دوسرے گروہ پر گمراہی پیوست ہو چکی ہے۔

جب کہ غَوٰی، رشد کے مقابلے میں ہے۔ قَدۡ تَّبَیَّنَ الرُّشۡدُ مِنَ الۡغَیِّ ... [2] رشید، صائب الرائے کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ محمد ﷺ نہ تو غلط راستے پر ہیں، نہ غلط عقیدے پر۔ ان کا راستہ وہ ہے جو انسان کو صحیح منزل تک پہنچا دیتا ہے اور ان کا عقیدہ بھی وہ ہے جو انسان کو حق اور حقیقت سے ہمکنار کرتا ہے۔

فضیلت: انس بن مالک راوی ہیں:

> ایک رات ایک ستارہ علی بن ابی طالب (علیہ السلام) کے گھر نازل ہوا تو لوگوں نے اس بارے میں کہا: محمد (ﷺ)، علی بن ابی طالب (علیہ السلام) کی محبت میں گمراہ ہو گئے ہیں۔ جس پر یہ آیات نازل ہوئیں: وَ النَّجۡمِ اِذَا ہَوٰی ۙ﴿۱﴾ مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمۡ وَ مَا غَوٰی ۚ﴿۲﴾

ملاحظہ ہو المناقب مغازلی صفحہ ۲۶۶۔ لسان المیزان ۲: ۴۴۹۔ العمدۃ لابن بطریق صفحہ ۴۴۔ تفصیل مصادر کے لیے ملاحظہ ہو: حاشیہ شواھد التنزیل ذیل آیت۔

وَ مَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡہَوٰی ؕ﴿۳﴾	۳۔ وہ خواہش سے نہیں بولتا۔
اِنۡ ہُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی ۙ﴿۴﴾	۴۔ یہ تو صرف وحی ہوتی ہے جو (اس پر) نازل کی جاتی ہے۔

تفسیر آیات

تمہارا رفیق جو باتیں کرتا ہے وہ صرف وحی ہے اس کی اپنی خواہش کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ بھٹکتا بہکتا وہ ہے جس پر ذاتی خواہش حاکم ہو۔

آیت کے اطلاق میں وہ تمام فرامین شامل ہیں جو حضور ﷺ نے اپنی امت سے بیان فرمائے ہیں اور وحی، اسلوب کلام و معانی میں بطور معجزہ نازل ہوئی ہے تو وہ قرآن ہے، ورنہ سنت رسول ﷺ ہے۔

اس آیت اور آیہ:

---

[1] ۷ اعراف: ۳۰ [2] ۲ بقرۃ: ۲۵۶

وَمَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوۡلُ فَخُذُوۡهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمۡ عَنۡهُ فَانۡتَهُوۡا ۔۔۔۔ [1] اور رسول جو تمہیں دے دیں وہ لے لو اور جس سے روک دیں اس سے رک جاؤ۔

اور آیہ:

مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰهَ ۔۔۔۔ [2] جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

میں علی الاطلاق حکم ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی کسی حالت کے ساتھ مقید نہیں ہے۔ لہٰذا یہ جسارت کرنا کہ رسول ﷺ کو مرض میں معاذ اللہ ہذیان ہوتا تھا، قرآنی صراحت کے خلاف ہے۔

عَلَّمَهٗ شَدِیۡدُ الۡقُوٰی ۙ﴿۵﴾ ۵۔ شدید قوت والے نے انہیں تعلیم دی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ عَلَّمَهٗ شَدِیۡدُ الۡقُوٰی: شدید القوۃ نے انہیں تعلیم دی ہے۔

شَدِیۡدُ الۡقُوٰی اللہ کی طرف اشارہ ہے یا جبرائیل کی طرف، اس نظریے پر ایک سوال وارد ہوتا ہے: یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جبرئیل معلم رسول ﷺ ہوں؟

جواب یہ ہے کہ معلم رسول ﷺ تو صرف اللہ ہے۔ جبرائیل صرف واسطہ ہیں آواز کی طرح۔ یہ اپنی جگہ واضح ہے کہ عمل کبھی فاعل حقیقی کی طرف منسوب ہوتا ہے اور کبھی مجازاً واسطہ کی طرف۔ جیسے روحوں کے قبض کو خود اللہ کی طرف منسوب کیا اور فرمایا:

اَللّٰهُ یَتَوَفَّی الۡاَنۡفُسَ حِیۡنَ مَوۡتِهَا ۔۔۔ [3] موت کے وقت اللہ روحوں کو قبض کرتا ہے۔

اور کبھی واسطے، ملک الموت کی طرف:

قُلۡ یَتَوَفّٰىكُمۡ مَّلَكُ الۡمَوۡتِ الَّذِیۡ وُكِّلَ بِكُمۡ ۔۔۔ [4] کہدیجیے: موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے تمہاری روحیں قبض کرتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ فرشتوں کا اپنا ارادہ نہیں ہوتا کہ کہا جائے فرشتوں نے کیا، اللہ نے نہیں کیا۔ فرشتے صرف ذریعہ اور آلہ ہیں۔ جیسے پانی اور دھوپ ذریعہ ہیں رزق دینے کا۔

اور سورہ تکویر آیت ۲۰ میں جبرئیل کو صاحب قوت کہا ہے:

ذِیۡ قُوَّۃٍ عِنۡدَ ذِی الۡعَرۡشِ مَكِیۡنٍ ۙ﴿﴾ جو قوت کا مالک ہے، صاحب عرش کے ہاں بلند مقام رکھتا ہے۔

---

[1] ۵۹ حشر: ۷ [2] ۴ نساء: ۸۰ [3] ۳۹ زمر: ۴۲ [4] ۳۲ سجدہ: ۱۱

ذُوۡ مِرَّۃٍ ؕ فَاسۡتَوٰی ۙ﴿۶﴾ — ۶۔ جو صاحب قوت پھر (اپنی شکل میں) سیدھا کھڑا ہوا۔

تشریح کلمات

مِرَّۃٍ: (م ر ر) کے چار معنی کیے گئے ہیں: ا۔ صاحب قوت، ۲۔ عقل و حکمت میں کمال والا، ۳۔ خوبصورت منظر والا، ۴۔ خلق حسن والا۔ اہل لغت کہتے ہیں دراصل یہ لفظ مضبوطی کے ساتھ رسّہ کاتنے کے معنوں میں ہے۔ حدیث میں بھی یہ لفظ تندرست اور قوی آدمی کے لیے استعمال کیا گیا ہے:

لا تحل الصدقة لمحترف ولا لذی مرة سوی۔[1] — صدقہ حلال نہیں ہے ہنر والے تندرست سالم شخص کے لیے۔

تفسیر آیات

ا۔ یہ صاحب قوت یا خوش منظر اور حسن و جمال کا مالک سیدھا کھڑا ہوا استوی اپنی شکل و صورت میں۔ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے مقام تخلیق و تدبیر میں استعمال ہوا ہے: ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ اس جگہ اللہ کے لیے اسۡتَوٰی استعمال نہیں ہو سکتا چونکہ اللہ کے اسۡتَوٰی کے بعد اس چیز کا ذکر آتا ہے جس پر استوار ہوا ہے جیسے عرش۔ یہاں اسۡتَوٰی کا لفظ اس آیت میں مذکور اسۡتَوٰی کی طرح ہے:

وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّہٗ وَ اسۡتَوٰۤی اٰتَیۡنٰہُ حُکۡمًا وَّ عِلۡمًا ...[2] — اور جب موسیٰ رشد کو پہنچ کر تنومند ہو گئے تو ہم نے انہیں حکمت اور علم عطا کیا۔

لہٰذا یہاں یہ لفظ جبرئیل کے لیے ہے۔

وَ ہُوَ بِالۡاُفُقِ الۡاَعۡلٰی ؕ﴿۷﴾ — ۷۔ اور جب وہ بلند ترین افق پر تھے۔

تفسیر آیات

جملہ حالیہ ہے یعنی جب جبرئیل بلند ترین افق پر تھے۔ اپنی شکل و صورت میں نمودار ہوئے (سیدھے کھڑے ہوئے)

ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی ۙ﴿۸﴾ — ۸۔ پھر وہ قریب آئے پھر مزید قریب آئے۔

---

[1] المقنعة: ۲۴۱ [2] ۲۸ قصص: ۱۴

تشریح کلمات

دَنَا: الدنو (د ن و) نزدیک کے معنوں میں ہے۔ بظاہر دنو قرب حسی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے قُطُوۡفُہَا دَانِیَۃٌ ۔[1] جس کے میوے قریب (دسترس میں) ہوں گے۔ جب کہ القرب، معنوی حسی دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

فَتَدَلّٰی: (د ل د) آویزاں ہونے کے معنوں میں ہے۔ جیسے ادلی دلوہ اپنا ڈول کنویں میں آویزاں کیا۔ یہ زیادہ قرب کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ ثُمَّ دَنَا: جبرئیل اپنی شکل وصورت میں آنے اور بلند ترین افق پر نمودار ہونے کے بعد نزدیک ہو گئے یعنی رسول کریم ﷺ کے نزدیک ہو گئے۔

۲۔ فَتَدَلّٰی: پھر ہوا میں معلق ہو گئے۔ بنا بقولے رسول کریم ﷺ کو معراج پر اٹھانے کے لیے اور مزید قریب آ گئے۔

فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ ⑨ ۹۔ یہاں تک کہ دو کمانوں کے برابر یا اس سے کم (فاصلہ) رہ گیا۔

تشریح کلمات

قَابَ: (ق و ب) مقدار کے معنوں میں ہے۔ القاب کے معنی کمان کے درمیانی حصہ سے لے کر ایک گوشہ کمان تک کے فاصلہ کے ہیں اور قوس کی طرف اضافہ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اور فاصلہ ناپنے کے لیے قوس، رمح، الذراع، الباع، الخطوۃ، الشبر وغیرہ کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔

تفسیر آیات

جبرئیل اپنی واقعی شکل میں اس حد تک نزدیک آ گئے کہ دو کمانوں کے برابر یا اس سے کم فاصلہ رہ گیا۔ انس بن مالک کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قَوۡسَیۡنِ دو ہاتھ کے برابر یا تھوڑا کم ہے۔ (مجمع البیان)

[1] ۶۹ حاقۃ: ۲۳

دوسرے نظریے کے مطابق رسول ﷺ اللہ کے اس قدر نزدیک ہو گئے یعنی عبد اور معبود میں موجود حجاب ہٹتے گئے اور قرب معنوی میں اس حد تک نزدیک ہو گئے کہ محسوس تشبیہ کے مطابق دو کمانوں کا فاصلہ رہ گیا۔

فَاَوۡحٰۤی اِلٰی عَبۡدِہٖ مَاۤ اَوۡحٰی ﴿۱۰﴾	۱۰۔ پھر اللہ نے اپنے بندے پر جو وحی بھیجنا تھی وہ وحی بھیجی۔

تفسیر آیات

۱۔فَاَوۡحٰۤی: اس آیت کی تشریح تو یہ ہے کہ فَاَوۡحٰۤی اللہ نے اپنے بندے پر وحی کی۔ دوسری تشریح یہ ہے کہ جبرئیل نے اللہ کے عبد پر وحی کی۔ چونکہ سابقہ تمام ضمائر کو جبرئیل کی طرف سمجھا ہے لہٰذا یہ تشریح بھی درست ہے اور پہلی تشریح بھی درست سمجھی جا سکتی ہے۔ چونکہ عَبۡدِہٖ قرینہ بن سکتا ہے کہ اَوۡحٰی کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔

۲۔مَاۤ اَوۡحٰی: جو وحی بھیجنا تھی۔ وہ کیا وحی بھیجنا تھی؟ ایک راز ہے اس کا اظہار نہیں ہوا۔ جو احتمالات مفسرین نے بیان کیے ہیں وہ ثابت نہیں ہیں۔

مَا کَذَبَ الۡفُؤَادُ مَا رَاٰی ﴿۱۱﴾	۱۱۔ جو کچھ (نظروں نے) دیکھا اسے دل نے نہیں جھٹلایا۔

تفسیر آیات

رسول اللہ ﷺ نے جو دیکھا وہ نظروں کا دھوکہ نہیں تھا بلکہ قلب نے بھی اس کی تصدیق کی۔ کبھی عام لوگوں کے لیے ایسا ہوتا ہے کہ نظروں سے کچھ نظر آتا ہے لیکن قلب اس کی تصدیق نہیں کرتا چونکہ عام لوگوں کی نگاہیں سو فیصد واقع نمائی نہیں کرتیں۔ ایک عظیم الجثہ ہوائی جہاز دور سے چھوٹا نظر آتا ہے۔ قلب اس کی تصدیق نہیں کرتا۔

لیکن رسول کریم ﷺ کی نگاہوں نے جن حقائق کا مشاہدہ کیا ہے وہ قلب و نظر دونوں کا مشاہدہ تھا۔ جس طرح رسول ﷺ وحی کو اپنے پورے وجود کے ساتھ درک فرماتے تھے ان حقائق کو بھی اپنے پورے وجود کے ساتھ درک فرمایا۔ اللہ تعالیٰ پورے وجود کو فؤاد اور کبھی قلب کے ساتھ تعبیر فرماتا ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ ما کذب فؤاد محمد مَا رَاٰی ببصرہ۔ جو کچھ رسول اللہ ﷺ کی

نظروں نے دیکھا اسے ان کے دل نے نہیں جھٹلایا۔ لہٰذا مَارَاٰی کے فاعل رسول کریم ﷺ ہیں۔

اہم نکات

۱۔ رسول ﷺ کو رویت اپنے پورے وجود سے ہوتی ہے۔

اَفَتُمٰرُوۡنَہٗ عَلٰی مَایَرٰی ﴿۱۲﴾

۱۲۔ تو کیا جسے انہوں نے (اپنی آنکھوں سے) دیکھا ہے تو تم لوگ (اس کے بارے میں) ان سے جھگڑتے ہو؟

تفسیر آیات

کیا تم ایسی روایت کے بارے میں بحث وجدال کرتے ہو جو قابل شک و تردید نہیں ہے۔ اس آیت میں بھی مَایَرٰی کے فاعل رسول کریم ﷺ ہیں۔

وَلَقَدۡ رَاٰہُ نَزۡلَۃً اُخۡرٰی ﴿۱۳﴾

۱۳۔ اور بتحقیق انہوں نے پھر ایک مرتبہ اسے دیکھ لیا،

عِنۡدَ سِدۡرَۃِ الۡمُنۡتَہٰی ﴿۱۴﴾

۱۴۔ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس،

عِنۡدَہَا جَنَّۃُ الۡمَاۡوٰی ﴿۱۵﴾

۱۵۔ جس کے پاس ہی جنت الماویٰ ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَقَدۡ رَاٰہُ نَزۡلَۃً اُخۡرٰی: رسول اللہ ﷺ نے جبرئیل کو دیکھ لیا۔ نَزۡلَۃً اُخۡرٰی دوسری مرتبہ کو کہتے ہیں۔ نَزۡلَۃً یہاں مرۃ کی جگہ ہے یعنی مرۃ اخری۔ پہلی مرتبہ اس وقت دیکھا تھا جب جبرئیل قوسین کے فاصلے پر تھے یا یہ ہے کہ نَزۡلَۃً اُخۡرٰی اور ایک مرتبہ نازل ہونے کی حالت میں دیکھا۔

۲۔ عِنۡدَ سِدۡرَۃِ الۡمُنۡتَہٰی: اس مرتبہ سِدۡرَۃِ الۡمُنۡتَہٰی کے پاس یہ رویت وجود میں آئی یعنی: جب رسول اللہ ﷺ معراج پر تھے تو آپؐ اس جگہ پہنچے جہاں سات آسمانوں کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس جگہ کو سِدۡرَۃِ الۡمُنۡتَہٰی کہتے ہیں۔ اس جگہ بنا بر روایات جبرئیل امین نے رک جانا تھا۔ وہاں ایک مرتبہ پھر اپنی حقیقی شکل وصورت میں نمودار ہوئے۔ وہ جگہ جو اہل جنت کے بیٹھنے کی جگہ الۡمَاۡوٰی ہے۔ وہ سِدۡرَۃِ الۡمُنۡتَہٰی کے پاس ہے۔ یعنی جَنَّۃُ الۡمَاۡوٰی سات آسمانوں کے ختم ہونے کے بعد موجود ہے۔

اِذۡ یَغۡشَی السِّدۡرَۃَ مَا یَغۡشٰی ﴿۱۶﴾

۱۶۔ اس وقت سدرہ پر چھا رہا تھا جو چھا رہا تھا۔

تفسیر آیات

سدرہ نام کے اس درخت پر کیا چیز چھائی ہوئی ہے اسے مَا یَغۡشٰی کہہ کر ابہام میں رکھا ہے۔
اگرچہ ایک روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

رایت علی کل ورقۃ من اوراقھا ملکا قائما یسبح اللّٰہ تعالی۔[1]

میں نے اس درخت کے ہر پتے پر ایک فرشتے کو دیکھا جو اللہ کی تسبیح کر رہا تھا۔

مَا زَاغَ الۡبَصَرُ وَ مَا طَغٰی ﴿۱۷﴾

۱۷۔ نگاہ نے نہ انحراف کیا اور نہ تجاوز۔

تفسیر آیات

رسول اللہ ﷺ کی نگاہ نے اس حقیقت کبریٰ کو دیکھنے میں کسی قسم کی غلطی نہیں کی۔ زَاغَ، زیغ کجی کو کہتے ہیں اور طَغٰی حد سے تجاوز کرنے کو۔ رسولؐ کی نگاہ نے نہ تو اس حقیقت کو واقعیت کے ساتھ دیکھنے میں کسی قسم کا انحراف کیا کہ حقیقت کو ادراک کرنے میں کوئی سقم رہ جائے، نہ ہی جس چیز کو اپنی نگاہ میں لانا تھا اس کی جگہ کسی اور چیز کو نگاہ میں لائے یعنی نگاہ نے تجاوز کر کے کسی اور چیز کی طرف توجہ نہ دی۔

بتانا یہ مقصود ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے اس حقیقت کا ادراک کرنے میں کسی قسم کی خامی نہ آنے دی جسے اللہ تعالیٰ ان کے ادراک میں لانا چاہتا تھا۔

لَقَدۡ رَاٰی مِنۡ اٰیٰتِ رَبِّہِ الۡکُبۡرٰی ﴿۱۸﴾

۱۸۔ بتحقیق انہوں نے اپنے رب کی بڑی نشانیوں کا مشاہدہ کیا۔

تفسیر آیات

اس آیت میں پچھلی تمام آیتوں کی تشریح فرما دی کہ رسول اللہ ﷺ نے کیا دیکھا اور کس چیز کے دیکھنے میں ان کے قلب مبارک نے ساتھ دیا اور کسی چیز کے دیکھنے میں نہ کجی آئی، نہ حد سے تجاوز کی نوبت آئی۔ آپؐ نے اللہ کی بڑی نشانیاں دیکھیں۔ ان میں سے ایک جبرئیل کو اپنی شکل و صورت میں دیکھنا شامل ہے۔

مروی ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے وَ لَقَدۡ رَاٰہُ نَزۡلَۃً اُخۡرٰی کے بارے میں سوال ہوا تو آپ علیہ السلام نے فرمایا:

اِنَّ بَعۡدَ ھٰذِہِ الۡاٰیَۃِ مَا یَدُلُّ عَلٰی مَا

اس آیت کے بعد اس چیز کا ذکر ہے جس کو دیکھ لیا،

---

[1] مجمع البیان۔ بحار ۱۸: ۲۸۹

رَاٰی حَیۡثُ قَالَ: مَاکَذَبَ الۡفُؤَادُ مَا رَاٰی یَقُوۡلُ: مَا کَذَبَ فُؤَادُ مُحَمَّدٍ مَارَاَتۡ عَیۡنَاہُ ثُمَّ اَخۡبَرَ بِمَا رَاٰی فَقَالَ: لَقَدۡ رَاٰی مِنۡ اٰیٰتِ رَبِّہِ الۡکُبۡرٰی فَآیَاتُ اللّٰہِ غَیۡرُ اللّٰہِ...۔[1]

جہاں فرمایا: جو کچھ دیکھا اسے دل نے نہیں جھٹلایا۔ فرماتا ہے: محمدؐ کے دل نے اس چیز کو نہیں جھٹلایا جو ان کی نظروں نے دیکھا ہے۔ پھر اللہ نے بتایا ان کی نظروں نے کیا دیکھا: اللہ کی بڑی نشانیاں دیکھیں۔ اللہ کی نشانیاں اور ہیں، خود اللہ اور ہے۔

دوسری تفسیر میں یہ موقف اختیار کیا گیا ہے کہ ان آیات میں رویئت سے مراد جبرئیل کی نہیں، اللہ کی رویئت ہے اور پھر یہ موقف اختیار کرتے ہیں: رویئت سے مراد رویئت قلبی ہے۔ جب کہ قلبی رویئت کو معرفت کہتے ہیں۔ معرفت کو رویئت سے تعبیر کرنے کی نظیر قرآن میں نہیں ملتی۔ رہی روایات کی بات۔ روایات متعدد مختلف تعبیروں پر مشتمل ہیں جو دونوں موقف کے حق میں اور خلاف ہیں۔ لہٰذا قرآنی تعبیر پر توجہ مرکوز کرنا ہوگی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو اپنی بڑی نشانیاں دکھائیں وَلِیَکُوۡنَ مِنَ الۡمُوۡقِنِیۡنَ ....[2] تاکہ یقین کی آخری منزل پر فائز ہو جائیں۔قلب ونظر دونوں کے اتفاق کے ساتھ اللہ کی بڑی نشانیوں کا مشاہدہ کیا۔ اللہ کے ملکوتی نظام کی عظمت کا ایسا مشاہدہ کسی اور نبی کے لیے بھی قابل تصور نہیں ہے چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

وَکَذٰلِکَ نُرِیۡۤ اِبۡرٰہِیۡمَ مَلَکُوۡتَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَلِیَکُوۡنَ مِنَ الۡمُوۡقِنِیۡنَ ﴿۷۵﴾[3]

اور اس طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کا (نظام) حکومت دکھاتے تھے تاکہ وہ اہل یقین میں سے ہو جائیں۔

اَفَرَءَیۡتُمُ اللّٰتَ وَالۡعُزّٰی ﴿۱۹﴾
وَمَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الۡاُخۡرٰی ﴿۲۰﴾
اَلَکُمُ الذَّکَرُ وَلَہُ الۡاُنۡثٰی ﴿۲۱﴾
تِلۡکَ اِذًا قِسۡمَۃٌ ضِیۡزٰی ﴿۲۲﴾

۱۹۔ بھلا تم لوگوں نے لات اور عزیٰ کو دیکھا ہے؟
۲۰۔ اور پھر تیسرے منات کو بھی؟
۲۱۔ کیا تمہارے لیے تو بیٹے اور اللہ کے لیے بیٹیاں ہیں؟
۲۲۔ یہ تو پھر غیر منصفانہ تقسیم ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَفَرَءَیۡتُمُ اللّٰتَ وَالۡعُزّٰی: اللہ تعالیٰ کے اس عظیم ملکوتی نظام کے مقابلے میں کیا تم نے ان

---

[1] الکافی ۱: ۹۵ باب فی ابطال الرویة [2] و [3] انعام: ۷۵

بے حس، بے جان پتھروں کے بارے میں سوچا ہے جنہیں یہ لوگ لات، عزی اور مناۃ کے نام سے یاد کرتے ہیں اور انہیں اپنا رب تسلیم کر کے تدبیر عالم کا اختیار سونپ دیتے ہیں۔

لات: اس بت کی بنی ثقیف کے لوگ پوجا کرتے تھے۔ یہ بت طائف میں نصب تھا۔ اہل تحقیق کہتے ہیں لات، اللہ کی تانیث یعنی ان کا مونث معبود ہے۔

عزی: یہ قریش کا بت تھا۔ اس کے معنی عزت والی ہے۔ یہ بت مکہ اور طائف کے درمیان وادی نخلۃ میں نصب تھا۔ جنگ احد میں ابو سفیان نے یہ نعرہ لگایا:

نحن لنا العزی و لا عزی لکم۔ ہمارے لیے عزی ہے تمہارا کوئی عزی نہیں

تو رسول ﷺ نے مسلمانوں سے فرمایا کہو:

اللّٰہ مولانا و لا مولی لکم۔[1] اللہ ہمارا مولا ہے تمہارا کوئی مولا نہیں۔

مناۃ: یہ بت مکہ اور مدینہ کے درمیان قُدید کے مقام پر نصب تھا۔ اس بت کی پوجا کرنے والے خزاعہ، اوس اور خزرج کے لوگ تھے۔

۲۔ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الۡاُخۡرٰی: کہتے ہیں: اس بت کو تیسرے اور اُخری کی تعبیر کے ساتھ اس لیے یاد فرمایا کہ یہ مشرکین کے نزدیک کم اہمیت کا بت تھا۔

۳۔ اَلَکُمُ الذَّکَرُ وَلَهُ الۡاُنۡثٰی: تم بیٹی کی پیدائش اپنے لیے ذلت اور عار سمجھتے ہو۔ اسے اللہ کے حصے میں رکھ دیا اور کہہ دیا یہ بت فرشتوں کی شبیہ ہیں اور فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔

۴۔ تِلۡكَ اِذًا قِسۡمَةٌ ضِيۡزٰی: یہ خود تمہاری ذہنوں کے مطابق غیر منصفانہ تقسیم ہے کہ جو باعث ذلت و عار ہے وہ اللہ کے حصے میں اور جو باعث فخر و مباہات ہے وہ خود تمہارے اپنے حصے میں۔

اس آیت کے ذیل میں داستان غرانیق کی رد کے بارے میں مقدمہ تفسیر کا مطالعہ فرمائیں۔

اِنۡ هِیَ اِلَّاۤ اَسۡمَآءٌ سَمَّيۡتُمُوۡهَاۤ اَنۡتُمۡ وَاٰبَآؤُكُمۡ مَّاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنۡ سُلۡطٰنٍ ؕ اِنۡ يَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهۡوَى الۡاَنۡفُسُ ۚ وَلَقَدۡ جَآءَهُمۡ مِّنۡ رَّبِّهِمُ الۡهُدٰی ﴿۲۳﴾

۲۳۔ دراصل یہ تو صرف چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آبا و اجداد نے گھڑ لیے ہیں، اللہ نے تو اس کی کوئی دلیل نازل نہیں کی ہے، یہ لوگ صرف گمان اور خواہشات نفس کی پیروی کرتے ہیں حالانکہ ان کے پاس ان کے پروردگار کی طرف سے ہدایت آ چکی ہے۔

---

[1] بحار ۲۰: ۲۳

تفسیر آیات

۱۔ یہ لات، عزی اور مناۃ صرف نام ہیں۔ ان کا کوئی مصداق اور حقیقت نہیں ہے۔ تم نے انہیں معبود بنا لیا، انہیں ملائکہ فرض کیا، ملائکہ کو مونث کہا، پھر انہیں اللہ کی بیٹیاں کہدیا۔ یہ سب تمہارے اپنے ذہنوں کی تخلیق ہے۔ ان ناموں کو خود تم نے اور تمہارے باپ داداؤں نے گھڑ لیا ہے۔

۲۔ مَّاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ بِہَا مِنۡ سُلۡطٰنٍ: اللہ نے تو اس قسم کی کوئی سند نازل نہیں کی۔ یہ اللہ سے متعلق نظریہ ہے۔ اگر اس نظریہ کی کوئی حقیقت ہوتی تو اللہ کی طرف سے اس کی کوئی سند ہوتی۔ کتب وحی میں ان کا کہیں ذکر ہوتا۔

۳۔ اِنۡ یَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ: دراصل یہ لوگ ایک گمان اور واہمہ کے پیچھے ہیں۔ ظن، حق تک رسائی نہیں دیتا۔ کسی موقف کے لیے ظن و گمان کو بطور سند پیش نہیں کیا جا سکتا۔

۴۔ وَمَا تَہۡوَی الۡاَنۡفُسُ: دوسری بات یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں۔ ان کی خواہشات یہ ہیں کہ بتوں کے سامنے نذرانہ پیش کر کے تمام ذمہ داریوں سے فارغ ہو جائیں۔ نہ احکام، نہ شریعت، نہ حلال و حرام، نہ تقویٰ، نہ حقوق ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد ہوں۔ اگر رسول، شریعت، آخرت جنت و جہنم کو تسلیم کیا جائے تو بہت سی پابندیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو ان کی خواہشات کے خلاف ہیں۔

۵۔ وَلَقَدۡ جَآءَہُمۡ مِّنۡ رَّبِّہِمُ الۡہُدٰی: ان اوہام کے مقابلے میں وہ ہدایت آ گئی ہے جو تمہیں ابدی سعادت کی طرف لے جاتی ہے اور وہ ہادی بھی آ گیا ہے جو تمہیں ان خرافات سے نجات دلا کر حقیقی معبود کی طرف لے جاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ دین میں ظن و تخمین پر اعتماد، خواہش پرست اور احکام و شریعت سے چھٹکارا چاہنے والے لوگ کرتے ہیں۔ ۴۳۳

اَمۡ لِلۡاِنۡسَانِ مَا تَمَنّٰی ﴿۲۴﴾	۲۴۔ انسان جو آرزو کرتا ہے کیا وہ اسے مل جاتی ہے؟
فَلِلّٰہِ الۡاٰخِرَۃُ وَ الۡاُوۡلٰی ﴿۲۵﴾ ع	۲۵۔ اور دنیا اور آخرت کا مالک تو صرف اللہ ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَمۡ لِلۡاِنۡسَانِ: کیا انسان اپنے ذہن میں جس کی خواہش کرتا ہے وہ اسے مل جائے گی خواہ عدل و انصاف اور اصول وضوابط کی خلاف ورزی ہی کیوں نہ ہو؟ صرف اور صرف خواہش اور تمنا کی بنیاد پر مل

جائے گی خواہ وہ اس کا مستحق نہ بھی ہو؟

ان مشرکین نے پتھر کے بتوں سے امیدیں وابستہ کیں کہ ہماری زندگی کی ضروریات کے لیے یہ پتھر سفارش کریں گے اور یہ پتھر ہماری زندگی بہتر بنائیں گے۔

۲۔ فَلِلّٰہِ الۡاٰخِرَۃُ وَ الۡاُوۡلٰی: جب کہ آخرت اور دنیا کی مالک اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ مشرکین اپنی دنیا کے لیے بتوں سے امیدیں وابستہ کرتے ہیں۔ آخرت کا تصور ان کے ہاں نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: یہ مشرکین اس ذات سے امیدیں وابستہ نہیں کرتے جس کے قبضۂ قدرت میں دنیا کے علاوہ آخرت بھی ہے۔

اہم نکات

۱۔ نافہم انسان اس ذات سے امیدیں وابستہ نہیں کرتے جس کے قبضۂ قدرت میں دنیا و آخرت دونوں ہیں اور ایسی چیزوں سے امیدیں وابستہ کرتے ہیں جن کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔

وَ کَمۡ مِّنۡ مَّلَکٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغۡنِیۡ شَفَاعَتُہُمۡ شَیۡئًا اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ اَنۡ یَّاۡذَنَ اللّٰہُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یَرۡضٰی ﴿۲۶﴾

۲۶۔ اور آسمانوں میں کتنے ہی ایسے فرشتے ہیں جن کی شفاعت کچھ بھی فائدہ نہیں دیتی مگر اللہ کی اجازت کے بعد جس کے لیے وہ چاہے اور پسند کرے۔

تفسیر آیات

۱۔ جامد، بے شعور پتھروں کے بتوں کی تو کوئی حیثیت نہیں کہ انہیں شفاعت کا حق مل جائے۔ اللہ کے مقرب فرشتوں کو بھی شفاعت کا حق حاصل نہیں ہے جب تک اللہ تعالیٰ کا اذن اور اس کی رضا نہ ہو۔

اذن اور رضا میں فرق یہ ہے کہ اذن رکاوٹ پیدا نہ کرنے کو کہتے ہیں کہ ایک کام کو ہونے دیا جاتا ہے خواہ رکاوٹ پیدا نہ کرنے والا راضی ہو یا نہ ہو۔

وَ مَاۤ اَصَابَکُمۡ یَوۡمَ الۡتَقَی الۡجَمۡعٰنِ فَبِاِذۡنِ اللّٰہِ ...[1]

اور دونوں فریقوں کے درمیان مقابلے کے روز تمہیں جو مصیبت پہنچی وہ اللہ کے اذن سے تھی۔

ایک کام ہے جس پر اللہ راضی نہیں ہے لیکن از راہ امتحان اس کام میں رکاوٹ نہیں ڈالتا، اسے ہونے دیتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کسی کام پر راضی ہے تو اذن کا ہونا ضروری ہے۔

اذن اور رضا ہونے کی صورت میں فرشتوں کی شفاعت ثابت ہے۔

---

[1] ۳ آل عمران: ۱۶۶

اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ لَیُسَمُّوۡنَ الۡمَلٰٓئِکَۃَ تَسۡمِیَۃَ الۡاُنۡثٰی ﴿۲۷﴾

۲۷۔ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ فرشتوں کے نام لڑکیوں جیسے رکھتے ہیں۔

تفسیر آیات

ان دونوں عقیدوں میں ارتباط ہے: مشرکین آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، صرف اپنی دنیا کے لیے فرشتوں کو رب بناتے ہیں اور فرشتوں کو مونث نام دیتے ہیں۔

وَ مَا لَہُمۡ بِہٖ مِنۡ عِلۡمٍ ؕ اِنۡ یَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَ اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغۡنِیۡ مِنَ الۡحَقِّ شَیۡئًا ﴿۲۸﴾

۲۸۔ حالانکہ انہیں اس کا کچھ بھی علم نہیں ہے وہ تو صرف گمان کی پیروی کرتے ہیں اور گمان تو حق (تک) پہنچنے کے لیے کچھ کام نہیں دیتا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ مَا لَہُمۡ بِہٖ مِنۡ عِلۡمٍ: ان مشرکوں کو اس نام گزاری کا کوئی علم نہیں ہے کہ یہ فرشتے مونث اور اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ یہ بغیر سند کے بات کر رہے ہیں۔

۲۔ اِنۡ یَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ: یہ صرف ظن و گمان کی پیروی کرتے ہیں بلکہ در واقع یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر ظن کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

ظن کی یہ تعریف کی جاتی ہے:

الظن هو الترجیح الراجح والمرجوح یسمی وهماً۔

ظن ایک طرف کو ترجیح دینے کو کہتے ہیں۔ جس طرف کو ترجیح نہیں ملتی اسے وہم کہتے ہیں۔

ظن کی یہ تعریف جدید اصطلاح کے مطابق ہے۔ ممکن ہے قرآن جسے ظن کہتا ہے اس سے مراد ”وہم“ ہو۔

۳۔ وَ اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغۡنِیۡ مِنَ الۡحَقِّ: حق واقع کو کہتے ہیں۔ ظن واقع نمائی نہیں کر سکتا۔ ایک واہمہ، سراب کا حقیقت کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ انسان کی اپنی ذہنی تخلیق، واہمہ ہے۔ اس کا حق کے ساتھ کوئی ربط نہیں ہے۔

فَاَعۡرِضۡ عَنۡ مَّنۡ تَوَلّٰی ۬ۙ عَنۡ ذِکۡرِنَا وَ لَمۡ یُرِدۡ اِلَّا الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا ﴿ؕ۲۹﴾

۲۹۔ پس آپ اس سے منہ پھیر لیں جو ہمارے ذکر سے منہ پھیرتا ہے اور صرف دنیاوی زندگی کا خواہاں ہے۔

ذٰلِکَ مَبۡلَغُہُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ ؕ اِنَّ رَبَّکَ ہُوَ اَعۡلَمُ بِمَنۡ ضَلَّ عَنۡ سَبِیۡلِہٖ ۙ وَ ہُوَ اَعۡلَمُ بِمَنِ اہۡتَدٰی ﴿۳۰﴾

۳۰۔ یہی ان کے علم کی انتہا ہے آپ کا پروردگار یقیناً بہتر جانتا ہے کہ اس کے راستے سے کون بھٹک گیا ہے اور اسے بھی خوب جانتا ہے جو ہدایت پر ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ رسول اللہ ﷺ کو یہ حکم ملتا ہے کہ آپ ان واہمہ پرستوں، ہماری عبادت اور ذکر کو چھوڑ کر پتھروں کی پوجا کرنے والوں اور صرف دنیوی زندگی تک محدود رہنے والوں کو اعتنا میں نہ لائیں۔

۲۔ ذٰلِکَ مَبۡلَغُہُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ: ان کی علمی سطح بھی دنیا کی زندگی تک محدود ہے۔ ان کی فکری سطح انہی اوہام تک محدود ہے۔ اس زندگی کے ماوراء ایک اور زندگی ہے جس کے بغیر یہ کائنات عبث اور لغو ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ ان کے لیے قابل ہضم نہیں ہے۔

اسی لیے دعاؤں میں آیا ہے:

وَ لَا تَجۡعَلِ الدُّنۡیَا اَکۡبَرَ ھَمِّنَا وَ لَا مَبۡلَغَ عِلۡمِنَا .... [1]

اے اللہ! ہمیں ایسا نہ بنا دے کہ دنیا ہی ہمارا سب سے بڑا مقصد ہو اور ہمارے علم و آگہی کی انتہا یہی دنیا قرار پائے۔

۳۔ اِنَّ رَبَّکَ ہُوَ اَعۡلَمُ: آپ کے رب کے علم میں ہے گمراہ کون ہے اور ہدایت یافتہ کون ہے لہٰذا گمراہ کو عذاب ملنے اور ہدایت یافتہ کو ثواب ملنے میں کوئی دشواری نہ ہو گی۔

اہم نکات

۱۔ دنیا پرست محدود ذہنیت کے ہوتے ہیں۔

وَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ۙ لِیَجۡزِیَ الَّذِیۡنَ اَسَآءُوۡا

۳۱۔ اور جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ ہی کا ہے تاکہ اللہ برائی کرنے والوں کو ان

[1] مستدرک الوسائل ۶: ۲۸۵

بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ﴿۳۱﴾

کے عمل کا بدلہ دے اور نیکی کرنے والوں کو بہترین جزا دے۔

تفسیر آیات

ا۔ کائنات میں جو کچھ ہے وہ اللہ کی ملکیت اور تصرف میں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس کائنات کا کوئی والی وارث اور مالک نہیں ہے۔ کوئی کچھ کرے، پوچھنے والا نہیں ہے بلکہ اس کا مالک اللہ ہے۔ اپنی مملوک اور ملکیت میں کیا ہوتا ہے اس پر نظر رکھتا ہے۔

۲۔ لِیَجْزِیَ: تاکہ اس ملکیت کے نتیجے میں جزا سزا اور مؤاخذہ کا قانون جاری ہو سکے۔ یہ قانون اس صورت میں نافذ ہو سکتا ہے جب ملکیت اور تصرف قائم ہو۔

اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ﴿۳۲﴾ ع

۳۲۔ جو لوگ گناہان کبیرہ اور بے حیائیوں سے اجتناب برتتے ہیں سوائے گناہان صغیرہ کے تو آپ کے پروردگار کی مغفرت کا دائرہ یقیناً بہت وسیع ہے، وہ تم سے خوب آگاہ ہے جب اس نے تمہیں مٹی سے بنایا اور جب تم اپنی ماؤں کے شکم میں ابھی جنین تھے، پس اپنے نفس کی پاکیزگی نہ جتاؤ، اللہ پرہیزگار کو خوب جانتا ہے۔

تفسیر آیات

ا۔ اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ: آیت کا تسلسل اَلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰی کے ساتھ ہے۔ جو لوگ نیکی کرنے والے ہیں اور ساتھ گناہان کبیرہ اور بے حیائیوں سے اجتناب کرتے ہوں انہیں جزائے خیر ملے گی۔

۲۔ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ گناہان کبیرہ کے بارے میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے:

كُلُّ مَا اَوْعَدَ اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ عَلَيْهِ النَّارَ۔[1]

گناہ کبیرہ وہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے جہنم کی سزا رکھی ہے۔

---

[1] الفقیہ ۳: ۵۶۹

دیگر روایات میں بطور مثال شراب نوشی، زنا، ربا، عاق والدین اور جنگ سے فرار کا ذکر ہے۔

۳۔ وَالۡفَوَاحِشَ: بے حیائی یعنی وہ گناہ جو انسان کے شرم و حیا کی نفی سے متعلق ہیں جیسے زنا اور چوری۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی مروی روایت میں الفواحش کی تشریح زنا اور چوری سے کی ہے۔[1]

قرآن کی دیگر آیات میں زنا اور لواط کو فواحش میں شمار کیا ہے:

وَلَا تَقۡرَبُوا الزِّنٰۤی اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً ...[2] اور زنا کے قریب بھی نہ جاؤ یقیناً یہ بڑی بے حیائی ہے۔

قوم لوط کے بارے میں فرمایا:

اَتَاۡتُوۡنَ الۡفَاحِشَۃَ ...[3] کیا تم بدکاری کا ارتکاب کرتے ہو؟

ان آیات و روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض گناہ ایسے ہیں جو گناہ کبیرہ اور فواحش دونوں میں شامل ہیں۔

۴۔ اِلَّا اللَّمَمَ ۔ لمم: العین میں آیا ہے: اللمم الالمام بالذنب الفینۃ بعد الفینۃ یعنی لمم کے معنی ہیں وقتاً فوقتاً گناہ کرنا۔

لمم کی تعریف گناہان صغیرہ سے بھی کی جاتی ہے لیکن ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی احادیث میں لمم کی تعریف ان گناہوں سے کی گئی ہے جو وقتاً فوقتاً سرزد ہوتے ہیں، ہمیشہ نہیں۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

قال: اللَّمَّامُ الْعَبْدُ الَّذِی یُلِمُّ الذَّنْبَ بَعْدَ الذَّنْبِ، لَیْسَ مِنْ سَلِیقَتِهِ اَیْ مِنْ طَبِیعَتِهِ۔[4] لمام وہ بندہ ہے جو گناہ کے بعد کبھی گناہ کرتا ہے یعنی گناہ کرنا اس کا مزاج اور طبیعت نہیں ہے۔

دوسری روایت میں فرمایا:

اللَّمَمُ الرَّجُلُ یُلِمُّ بِالذَّنْبِ فَیَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ مِنْهُ...[5] لمم کے معنی ہیں بندہ گناہ کرتا ہے پھر اس گناہ سے استغفار کرتا ہے۔

یہ حدیث قرآن مجید کی اس آیت کے مطابق ہے:

وَالَّذِیۡنَ اِذَا فَعَلُوۡا فَاحِشَۃً اَوۡ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ ذَکَرُوا اللّٰہَ فَاسۡتَغۡفَرُوۡا لِذُنُوۡبِہِمۡ ...[6] اور جن سے کبھی نازیبا حرکت سرزد ہو جائے یا وہ اپنے آپ پر ظلم کر بیٹھیں تو اسی وقت اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں۔

اس آیت اور روایت کی روشنی میں گناہ کبیرہ وہ گناہ ہے جس کا انسان خوگر ہو جاتا ہے اور گناہ اپنے

---

[1] الکافی ۲: ۲۷۸ [2] ۱۷ اسراء: ۳۲ [3] ۲۷ نمل: ۵۴
[4] الکافی ۲: ۴۴۲ باب اللمم [5] الکافی ۲: ۲۷۸ [6] ۳ آل عمران: ۱۳۵

سلیقہ کار میں شامل رکھتا ہے۔ صغیرہ وہ گناہ ہے جس کے بعد انسان احساس گناہ اور استغفار کرتا ہے۔ یہی مطلب حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ایک روایت میں ہے:

لَا صَغِيرَةَ مَعَ الْإِصْرَارِ وَ لَا كَبِيرَةَ مَعَ الْاِسْتِغْفَارِ۔[1] ہمیشہ ارتکاب سے گناہ، صغیرہ نہیں رہتا اور استغفار سے گناہ، کبیرہ نہیں رہتا۔

۵۔ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ: استغفار اور توبہ کی صورت میں اللہ کی مغفرت کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ اس میں ہر گناہ آ سکتا ہے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

اَللّٰهُمَّ اِنَّ مَغْفِرَتَكَ اَوْسَعُ مِنْ ذُنُوبِي۔[2] اے اللہ! تیری مغفرت میرے گناہوں سے زیادہ وسیع ہے۔

۶۔ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ: اللہ تمہارے بارے میں بہتر علم رکھتا ہے جب تمہیں اللہ مٹی سے بنا رہا تھا (انسان کی تخلیق ارضی عناصر سے ہوئی ہے اور انسان میں موجود تمام عناصر ارضی ہیں) اور جب تم اپنی ماؤں کے شکم میں جنین کی حالت میں تھے، اس وقت اللہ کو علم تھا کہ تم گناہوں کے مرتکب ہونے والے ہو۔ تم میں موجود کمزوریوں کا اللہ کو علم ہے۔ اس لیے اللہ نے توبہ اور وسیع مغفرت کا سہارا عنایت فرمایا ہے۔

۷۔ فَلَا تُزَكُّوْۤا اَنْفُسَكُمْ: جب اللہ تمہاری حالت پر خود تمہارے وجود میں آنے سے پہلے باخبر ہے تو تم اپنے نفس کی پاکیزگی کے دعوے نہ کرو۔ اللہ بہتر جانتا ہے تمہارے دعوے کہاں تک درست ہیں۔ اگر اس کا مقصد لوگوں کے سامنے اپنی پاکیزگی کا اظہار کرنا ہے تو یہ خود ستائی اور خود بینی ہے جو بندگی کے سراسر خلاف ہے۔ امیر المومنین علیہ السلام سے روایت ہے:

سَيِّئَةٌ تَسُوْءُكَ خَيْرٌ عِنْدَ اللّٰهِ مِنْ حَسَنَةٍ تُعْجِبُكَ۔[3] وہ گناہ جو خود تجھے برا لگے اللہ کے نزدیک اس نیکی سے بہتر ہے جو تجھے خود پسندی میں مبتلا کر دے۔

بلکہ انسان کا لوگوں کے سامنے اپنے اعمال کا ذکر بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔

راوی کہتا ہے میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے فَلَا تُزَكُّوْۤا اَنْفُسَكُمْ کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا:

قَوْلُ الْاِنْسَانِ صَلَّيْتُ الْبَارِحَةَ وَ صُمْتُ اَمْسِ وَ نَحْوَ هٰذَا۔...[4] انسان کا یہ کہنا خود ستائی ہے کہ میں نے رات نماز پڑھی کل روزہ رکھا اور اس طرح کی باتیں۔

اہم نکات

۱۔ گناہ کا ارتکاب شیوہ نہ ہو تو کبھی سرزد ہونے والا گناہ معاف ہو جاتا ہے۔

۲۔ لوگوں کے سامنے اپنے اعمال اور دینی خدمات کے ذکر سے عمل کی قیمت ختم ہو جاتی ہے۔

---

[1] الکافی ۲: ۲۸۸ [2] مستدرك الوسائل ۵: ۱۴۳ [3] نہج البلاغۃ حکمت: ۴۶ [4] الوسائل ۱: ۷۴

اَفَرَءَيۡتَ الَّذِىۡ تَوَلّٰىۙ ۝۳۳ | ۳۳۔ کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جس نے منہ پھیر لیا،

وَاَعۡطٰى قَلِيۡلًا وَّاَكۡدٰى ۝۳۴ | ۳۴۔ اور تھوڑا سا دیا اور پھر رک گیا؟

اَعِنۡدَهٗ عِلۡمُ الۡغَيۡبِ فَهُوَ يَرٰى ۝۳۵ | ۳۵۔ کیا اس کے پاس غیب کا علم ہے وہ دیکھ رہا ہے؟

تشریح کلمات

الکدی: (ك د ى) الکدیۃ کے معنی سخت زمین کے ہیں۔ محاورہ ہے حفر فاکدی وہ گڑھا کھودتا ہوا سخت زمین تک جا پہنچا اور مزید کھدائی سے رک گیا۔ استعارہ کے طور پر اکدی کا لفظ تھوڑا سا دے کر ہاتھ روک لینے اور ناکام ہونے پر بولا جاتا ہے۔

شان نزول

اَفَرَءَيۡتَ الَّذِىۡ تَوَلّٰى: مفسرین کی ایک جماعت نے لکھا ہے کہ یہ آیت ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے دین کی پیروی کرنے لگا تو دیگر مشرکوں نے اسے گمراہ کیا یہ کہہ کر کہ تم نے اپنے بزرگوں کا دین ترک کر کے یہ نظریہ اپنا لیا کہ ہمارے بزرگ جہنم میں ہیں؟ ولید نے کہا: میں اللہ کے عذاب سے ڈر گیا تھا۔ اس پر اس مشرک نے کہا: اگر تو مجھے کچھ مال دے دے اور شرک کی طرف واپس آ جائے تو تیرا عذاب میں خود اٹھاؤں گا۔ اس نے ایسا ہی کیا، شرک کی طرف واپس چلا گیا۔ کچھ دیر مال دینے کے بعد اس نے مال دینا بند کر دیا۔ اس شخص کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

شان نزول میں دیگر مختلف اور متعدد روایات بھی ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اَفَرَءَيۡتَ الَّذِىۡ تَوَلّٰى: اس شخص کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے جس نے دین اسلام سے منہ موڑا۔ پھر تھوڑا مال دینے کے بعد رک گیا۔

۲۔ کیا اس کے پاس علم غیب تھا جس کے ذریعے اسے معلوم ہوا کہ آخرت کے عذاب سے اس طرح بچ سکتا ہے یعنی مال دے کر کسی اور کے ذمے ڈالا جا سکتا ہے۔

اَمۡ لَمۡ يُنَبَّاۡ بِمَا فِىۡ صُحُفِ مُوۡسٰىۙ ۝۳۶ | ۳۶۔ کیا اسے ان باتوں کی خبر نہیں پہنچی جو موسیٰ کے صحیفوں میں تھیں؟

وَ اِبۡرٰہِیۡمَ الَّذِیۡ وَفّٰۤی ﴿ۙ۳۷﴾

۳۷۔ اور ابراہیم کے (صحیفوں میں) جس نے (حق اطاعت) پورا کیا؟

تفسیر آیات

ا۔ کیا مشرکین کو یہ بتایا نہیں گیا کہ جو کتابیں موسیٰ و ابراہیم پر نازل ہوئی ہیں ان میں کیا تحریر ہے؟ صحیفہ موسیٰ توریت تو معلوم ہے لیکن صحیفہ ابراہیم علیہ السلام کا ذکر قرآن مجید میں صرف دو جگہ آیا ہے: ایک اس سورہ میں، دوسرے سورہ اعلیٰ میں۔

۲۔ الَّذِیۡ وَفّٰۤی: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تمام عہد و پیمان جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیے تھے اپنے بیٹے کے ذبح تک پورے کر دیے۔

اس کے بعد اگلی چار آیات میں اس مضمون کا ذکر ہے جو حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے صحیفوں میں ہے۔

اَلَّا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی ﴿ۙ۳۸﴾

وَ اَنۡ لَّیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ﴿ۙ۳۹﴾

وَ اَنَّ سَعۡیَہٗ سَوۡفَ یُرٰی ﴿۪۴۰﴾

ثُمَّ یُجۡزٰىہُ الۡجَزَآءَ الۡاَوۡفٰی ﴿ۙ۴۱﴾

۳۸۔ یہ کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

۳۹۔ اور یہ کہ انسان کو صرف وہی ملتا ہے جس کی وہ سعی کرتا ہے۔

۴۰۔ اور یہ کہ اس کی کوشش عنقریب دیکھی جائے گی۔

۴۱۔ پھر اسے پورا بدلہ دیا جائے گا،

تفسیر آیات

ا۔ وہ اصول و قوانین جو انبیاء علیہم السلام کے صحیفوں میں درج ہیں اور جو تمام اسلامی شریعتوں میں ہر زمانے کے لیے لازم العمل ہیں یہ ہیں:

الف: انسان اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہے۔ وہ اسے نہ کسی اور کے ذمے ڈال سکتا ہے، نہ ہی دوسرے کے جرم کی ذمہ داری اپنے اوپر لے سکتا ہے۔

ب: انسان کو اس کے اپنے عمل کا صلہ ملے گا۔ دوسروں کے عمل کا صلہ اسے نہیں ملے گا۔

ج: انسان کا کوئی عمل ضائع نہیں جائے ۔ قیامت کے دن وہ اپنے عمل کا خود معائنہ کر سکے گا۔

آیت ۳۸ کے تحت دوسرے کے عمل کا وبال اپنے سر نہیں لے سکتا کہ گناہ کوئی کرے اور اس کی

سزا دوسرا تحمل کرے مگر یہ کہ دوسرے کے جرم میں اس کا کوئی عمل دخل ہو۔ جیسے حدیث ہے:

اَيُّمَا عَبْدٍ مِنْ عِبَادِ اللّٰهِ سَنَّ سُنَّةَ ضَلَالٍ كَانَ عَلَيهِ مِثْلُ وِزْرِ مَنْ فَعَلَ ذٰلِكَ مِنْ غَيْرِ اَنْ يُنْقَصَ مِنْ اَوْزَارِهِمْ شَیْءٌ۔[1]

اللہ کے بندوں میں سے کوئی بندہ کسی گمراہی کی رسم کو رواج دے تو اس پر عمل کرنے والے پر آنے والے وبال (گناہ) کے برابر اس پر بھی وبال آئے گا، بغیر اس کے کہ اس کا ارتکاب کرنے والے کے وبال میں کوئی کمی ہو۔

آیت ۳۹ کے تحت انسان کو اپنے عمل کا صلہ ملے گا۔ نہ اس کے عمل کا صلہ کسی دوسرے کو ملے گا، نہ ہی کسی دوسرے کے عمل کا صلہ اسے ملے گا۔

کچھ لوگوں نے اس آیت کو دنیاوی معاملات پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن کی تعلیمات کی روشنی میں انسان اپنی محنت کی کمائی کے سوا کسی چیز کا مالک نہیں بن سکتا۔ یہ ایک غلط نتیجہ اخذ کرنا ہے۔ قرآنی تعلیمات میں ارث کا حکم ایک مسلمہ اصول ہے کہ ایک شیر خوار بچہ وارث بننے کی صورت میں مالک بن جاتا ہے۔ اس کی کوئی محنت نہیں ہے۔ ہبہ، صدقات، زکوۃ و خمس کے شرعی میزان سے بھی استحقاق کی بنیاد پر محنت کے بغیر مالک بن جاتے ہیں:

الناس مسلطون علی اموالھم۔[2] لوگ اپنے اموال پر اختیار رکھتے ہیں۔

اس آیت کا تعلق ثواب و عقاب آخرت سے ہے کہ ایک شخص کا عمل دوسرے شخص کے کام نہیں آئے گا۔ اس صورت میں یہ سوالات اٹھاتے ہیں کہ اگر ایک شخص کا عمل دوسرے کو فائدہ نہیں دے سکتا تو پھر ایصال ثواب کے اعمال، شفاعت، دعائے استغفار، حج بدل، تلاوت قرآن کا ثواب ہدیہ کرنا، میت کی نماز، روزے کی قضا وغیرہ کا کیا حکم ہے؟

جواب یہ ہے کہ شفاعت، دوسرے کی دعا سے فائدہ ملنا وغیرہ، چند شرائط کے ساتھ مشروط ہے۔ بلا عمل وہ دیگر لوگوں کے عمل سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ بدعمل کی شفاعت نہیں ہوتی۔ اس کے حق میں دعا قبول نہیں ہوتی۔ تلاوت قرآن کا ثواب اسے نہیں ملتا جو قرآن کو پس پشت ڈالتا رہا ہو۔ ان مذکورہ تمام امور میں دوسرے شخص کے عمل سے فائدہ ملنے کے لیے بھی عمل شرط ہے۔ البتہ اللہ کا یہ فضل و احسان ہے اس کے تھوڑے عمل کی وجہ سے اللہ دوسروں کی دعا، شفاعت، ایصال ثواب اور نیابت میں انجام دینے والے اعمال کا ثواب اس مومن کی خواہش پوری کرتے ہوئے مرحمت فرماتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

لِيَجۡزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحۡسَنَ مَا عَمِلُوۡا وَيَزِيۡدَهُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ ....[3]
تاکہ اللہ انہیں ان کے بہترین اعمال کی جزا دے اور اپنے فضل سے انہیں مزید بھی عطا کرے۔

لِلَّذِيۡنَ اَحۡسَنُوا الۡحُسۡنٰى وَزِيَادَةٌ ....[4]
جنہوں نے نیکی کی ہے ان کے لیے نیکی ہے اور مزید بھی۔

---

[1] وسائل الشیعۃ ۱۶: ۱۷۳ [2] عوالی اللآلی ۱: ۲۲۲ [3] ۲۴ نور: ۳۸ [4] ۱۰ یونس: ۲۶

وَ زِيَادَةٌ سے مراد اصل ثواب اور اس کے دس گنا سے بھی زیادہ ہے۔ الْحُسْنٰى دس گنا ہے۔ وَ زِيَادَةٌ میں کوئی حد بندی نہیں۔ لہٰذا یہ انسان کی اپنی سعی اور عمل کا نتیجہ ہے کہ دوسرے مومنین کی اس کے بارے میں خواہش کو اللہ قبول فرماتا ہے اور اس کے بارے میں دوسرے مومنین کا ہدیہ قبول کرنا يَزِيۡدُهُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ سے ہے۔

درحقیقت ایصال ثواب وغیرہ میں دو اشخاص کے عمل کو دخل ہے۔ ایصال کرنے والا عمل کے اعتبار سے اس قابل ہو کہ اللہ اس کی خواہش پوری کرے اور جسے ایصال کرنا ہے وہ بھی عمل کے اعتبار سے اس قابل ہو کہ ایصال ثواب اسے مل سکے۔ اگر یہ دونوں عمل کے لحاظ سے قابل اعتنا نہ ہوں تو مذکورہ تمام اعمال کا اسے فائدہ نہیں ملے گا۔

ایصال ثواب میں فقہ جعفری کے مطابق بدنی اور مالی عبادات میں فرق نہیں ہے۔ ہر نیک عمل کا ثواب دوسرے کو ہدیہ کر سکتا ہے۔

فقہ مالکی و شافعی میں خالص بدنی عبادت جیسے نماز، روزہ، تلاوت کا ثواب دوسرے کو نہیں پہنچ سکتا۔ صرف مالی عبادات جیسے صدقہ اور مالی و بدنی مرکب جیسے حج کا ثواب دوسرے کو پہنچ سکتا ہے۔ حنفی کا موقف اس مسئلے میں فقہ جعفری کی طرح ہے۔

۲۔ وَ اَنَّ سَعۡیَهٗ سَوۡفَ یُرٰی: قیامت کے دن اس نے دنیا میں جو سعی اور محنت کی ہے اس کا ثواب اور اجر تو ملے گا ہی، ساتھ خود اپنے عمل کا مشاہدہ بھی کرے گا۔ چنانچہ یہ آیت اور دیگر متعدد آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود عمل دیکھا جائے گا۔

۳۔ ثُمَّ یُجۡزٰىهُ: عمل کے مشاہدے کے بعد جزائے عمل کی نوبت آئے گی۔ اس سے یہ بات اور واضح ہو گئی کہ سَوۡفَ یُرٰی سے "جزائے عمل دیکھے گا" مراد نہیں ہو سکتا چونکہ جزائے عمل کا ثُمَّ کے بعد جدا ذکر ہوا ہے۔

۴۔ الۡجَزَآءَ الۡاَوۡفٰی: اگر ایک نیکی کا ایک ثواب دیا جائے تو یہ وفا ہے لیکن اللہ ایک نیکی کا دس گنا ثواب مرحمت فرماتا ہے تو یہ اوفی زیادہ وفا ہے۔

راوی کہتا ہے میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کو پوچھا: کوئی اپنے والد یا کسی رشتہ دار یا غیر رشتہ دار کی قبر پر کھڑا ہو جائے تو اس سے اس قبر والے کو فائدہ ملے گا؟ فرمایا:

نَعَمْ اِنَّ ذٰلِكَ يَدْخُلُ عَلَيْهِ كَمَا يَدْخُلُ عَلٰى اَحَدِكُمُ الْهَدِيَّةُ يَفْرَحُ بِهَا۔[1]

ہاں! اسے فائدہ ملے گا جیسے تم میں سے کسی کو ہدیہ ملتا ہے تو خوش ہوتا ہے۔

وَ اَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الۡمُنۡتَہٰی ﴿۴۲﴾

۴۲۔ اور یہ کہ (منتہائے مقصود) آپ کے رب کے پاس پہنچنا ہے۔

---

[1] مستدرك الوسائل ۔ ۲: ۳۶۳

وَ اَنَّہٗ ھُوَ اَضۡحَکَ وَ اَبۡکٰی ﴿۴۳﴾ ۴۳۔ اور یہ کہ وہ ہنساتا اور وہی رلاتا ہے۔

وَ اَنَّہٗ ھُوَ اَمَاتَ وَ اَحۡیَا ﴿۴۴﴾ ۴۴۔ اور یہ کہ وہی مارتا اور وہی جلاتا ہے۔

وَ اَنَّہٗ خَلَقَ الزَّوۡجَیۡنِ الذَّکَرَ وَ الۡاُنۡثٰی ﴿۴۵﴾ ۴۵۔ اور یہ کہ وہی نر اور مادہ کا جوڑا پیدا کرتا ہے،

مِنۡ نُّطۡفَۃٍ اِذَا تُمۡنٰی ﴿۴۶﴾ ۴۶۔ ایک نطفے سے جب وہ ٹپکایا جاتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الۡمُنۡتَہٰی: موسیٰ و ابراہیم علیہا السلام کے صحیفوں کے مندرجات کا ذکر جاری ہے۔ اللہ کی ذات تک ہے۔ تمام کائنات کا وجود اور اس کی بقا اور بقا سے متعلق تدبیر، سب کا انتہائے مقصود اللہ کی ذات ہے۔ اسی طرح تمام انسانی اعمال کا آخری نتیجہ اللہ کے پاس قبول و رد کے لیے پہنچنا ہے۔

۲۔ وَ اَنَّہٗ ھُوَ اَضۡحَکَ وَ اَبۡکٰی: تمام امور کی بازگشت اللہ کی طرف ہونے کی ایک صورت کا ذکر ہے کہ خوشی اور غمی کے عوامل کا سلسلہ بالآخر اللہ کی ذات پر منتہی ہوتا ہے۔

المیزان میں اس آیت کی بہتر وضاحت آئی ہے۔ فرماتے ہیں:

> انسان کے ہنسنے پر اللہ کے ارادے سے انسان کے ارادے کی نفی نہیں ہوتی کیونکہ اللہ کا ارادہ مطلق ہنسنے پر نہیں ہوتا بلکہ انسان کے اپنے ارادے اور اختیار سے ہنسنے پر ہوتا ہے۔ ہنسنے پر انسان کا ارادہ اللہ کے ارادے کے ذیل میں ہوتا ہے، نہ یہ کہ اللہ کے ارادے کے ساتھ متصادم ہوتا ہے تاکہ جبر لازم آئے، نہ یہ کہ ہنسنے کا عمل انسان کی سو فیصد اپنی تخلیق ہے کہ تفویض لازم آئے۔

۳۔ وَ اَنَّہٗ ھُوَ اَمَاتَ وَ اَحۡیَا: اَمَاتَ یعنی موت کو پیدا کیا۔ وَ اَحۡیَا زندگی کو بھی خلق فرمایا۔ الَّذِیۡ خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَ الۡحَیٰوۃَ ....[1] وہی ذات ہے جس نے موت اور حیات کو خلق فرمایا۔ اسی کے ہاتھ میں زندگی اور موت ہے لہٰذا وہی لائق عبادت ہے۔

۴۔ وَ اَنَّہٗ خَلَقَ الزَّوۡجَیۡنِ: وہی ذات لائق عبادت ہے جس نے اس کرہ ارض پر حیات برقرار رکھنے کے لیے مرد و زن کا جفت پیدا کیا۔

۵۔ مِنۡ نُّطۡفَۃٍ: ایک حقیر نطفے کے ذریعے زمین کو انسانوں سے آباد کیا لہٰذا لائق عبادت وہی ذات ہے جس کے قبضہ قدرت میں کل کائنات اور دیگر تمام موجودات کی تدبیر ہے۔

---

[1] ۶۷ ملک:۲

وَاَنَّ عَلَیۡهِ النَّشۡاَۃَ الۡاُخۡرٰی ﴿۴۷﴾ ۴۷۔ اور یہ کہ دوسری زندگی کا پیدا کرنا اس کے ذمے ہے۔

تفسیر آیات

وَاَنَّ عَلَیۡهِ: یہ بھی موسیٰ و ابراہیم کے صحیفوں میں درج ہے کہ اس کے ذمے ہے۔ اپنے وعدے پر عمل کرنا ضروری ہے۔ انسان کو مکلّف بنانے کے اعتبار سے بھی روز حساب کا ہونا لازمی ہے ورنہ وعدہ خلافی لازم آتی ہے جو اللہ تعالیٰ سے صادر ہونا ممکن نہیں ہے۔ روز جزا و سزا نہ ہو تو خلق و ایجاد عبث ہو کر رہ جاتی ہے اور نتیجہ نہ ہونے کی صورت میں مکلّف بنانے سے ظلم لازم آتا ہے۔

یہ خود ارادۂ الٰہی کے تحت اللہ پر واجب ہے، کسی برتر قانون کے تحت پابند ہونے کی وجہ سے نہیں جیسے:

کَتَبَ رَبُّکُمۡ عَلٰی نَفۡسِهِ الرَّحۡمَۃَ ...[1] تمہارے رب نے رحمت کو اپنے اوپر لازم قرار دیا ہے۔

اس آیت میں لفظ کَتَبَ اور عَلٰی دونوں وجوب اور لازم ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا کہ حق تعالیٰ پر کوئی بھی چیز واجب نہیں ہے[2] صریح قرآن، خود ارادۂ الٰہی کے خلاف ہے اور ساتھ محشی اور دیگر مفسرین کی تصریحات کے بھی خلاف ہے جو انہوں نے آیہ کَتَبَ رَبُّکُمۡ عَلٰی نَفۡسِهِ الرَّحۡمَۃَ کے ذیل میں کی ہیں۔

وَاَنَّهٗ هُوَ اَغۡنٰی وَاَقۡنٰی ﴿۴۸﴾ ۴۸۔ اور یہ کہ وہی دولت مند بناتا ہے اور ثابت سرمایہ دیتا ہے۔

تشریح کلمات

اَقۡنٰی: (ق ن ی) القنیة ثابت سرمائے جیسے باغات، جائداد وغیرہ کو کہتے ہیں۔ اقناه الله مالاً۔ بعض نے قنی کے افقر بھی کیا ہے۔ یہ اس صورت میں ہے کہ یہاں باب افعال کو بمعنی سلب لیا جائے اَقۡنٰی، سرمائے کو سلب کیا۔ جیسے اعجم ابہام کو دور کیا۔ اس صورت میں آیت کا ترجمہ یہ ہوگا: اور یہ کہ وہی دولت مند بناتا ہے اور فقیر بھی۔

تفسیر آیات

اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے فقیری اور امیری۔ دولت اور سرمایہ حیات عنایت کرنا اللہ کے ہاتھ میں ہے، ان بے شعور بتوں کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ لہٰذ اگر کوئی اس دنیا کی خاطر کسی ذات کی عبادت کرتا ہے تو

---

[1] ۶ انعام: ۵۴ [2] دریابادی

اسے بھی اللہ ہی کی عبادت کرنی چاہیے۔

وَاَنَّہٗ ہُوَ رَبُّ الشِّعۡرٰی ﴿۴۹﴾　　۴۹۔ اور یہ کہ وہی (ستارہ) شعرا کا مالک ہے۔

تفسیر آیات

شعریٰ نامی ستارہ سورج کے بعد سب سے زیادہ چمکدار ستارہ ہے۔ یہ ستارہ سورج سے بیس گناہ زیادہ روشن اور زمین سے دس نوری سال کے فاصلے پر ہے۔ اہل مصر اور عربوں میں قبیلہ خزاعہ اس ستارے کی پرستش کرتا تھا۔ اس آیت میں فرمایا: تمہارا رب شعریٰ نہیں بلکہ اللہ ہے جو شعریٰ کا بھی رب ہے۔

وَاَنَّہٗۤ اَہۡلَکَ عَادَۨا الۡاُوۡلٰی ﴿۵۰﴾　　۵۰۔ اور یہ کہ اسی نے عاد اولیٰ کو ہلاک کیا۔

تفسیر آیات

طبری کے مطابق اس قوم کو عاد اولیٰ اس لیے کہا ہے چونکہ عاد ثانیہ ایک قبیلہ تھا جو عمالیق کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا۔ وہ بنی لقیم بن ہزال کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

لیکن صحیح موقف یہ ہے کہ عاد اولی قوم ہود کو کہتے ہیں اسی قوم کے ایک قبیلہ کو ارم کہتے ہیں۔ اس قوم پر تباہی آنے کے بعد جو اہل ایمان بچ گئے تھے ان کی نسل کو عاد ثانیہ کہتے ہیں۔

وَثَمُوۡدَاۡ فَمَاۤ اَبۡقٰی ﴿۵۱﴾　　۵۱۔ اور ثمود کو بھی، پھر کچھ نہ چھوڑا۔

تفسیر آیات

اور قوم ثمود کو بھی اللہ نے شرک و کفر کی وجہ سے ایسا تباہ کیا کہ کسی کو نہیں چھوڑا۔

وَقَوۡمَ نُوۡحٍ مِّنۡ قَبۡلُ ؕ اِنَّہُمۡ کَانُوۡا ہُمۡ اَظۡلَمَ وَاَطۡغٰی ﴿۵۲﴾　　۵۲۔ اور اس سے پہلے قوم نوح کو (تباہ کیا) کیونکہ وہ یقیناً سب سے زیادہ ظالم اور سرکش تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ ان قوموں سے پہلے قوم نوح کو بھی طوفان کے ذریعے تباہ کیا۔

۲۔ اِنَّہُمۡ کَانُوۡا ہُمۡ اَظۡلَمَ وَاَطۡغٰی: نوح علیہ السلام کی قوم زیادہ ظالم اور زیادہ سرکش تھی کہ حضرت

نوح علیہ السلام کی سینکڑوں سال کی تبلیغ و ہدایت کے باوجود وہ لوگ راہ راست پر نہیں آئے۔ تفصیل سورہ نوح میں آئے گی۔

وَالۡمُؤۡتَفِکَۃَ اَہۡوٰی ﴿۵۳﴾ ۵۳۔ اور الٹی ہوئی بستیوں کو گرا دیا۔

تفسیر آیات

قوم لوط کی طرف اشارہ ہے کہ قوم لوط کی بستی کو الٹ دیا گیا تھا۔ دوسری جگہ فرمایا:

فَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا جَعَلۡنَا عَالِیَہَا سَافِلَہَا ۔[1] پس جب ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے اس (بستی) کو تہ و بالا کر دیا۔

فَغَشّٰىہَا مَا غَشّٰی ﴿۵۴﴾ ۵۴۔ پھر ان پر چھایا جو چھایا۔

تفسیر آیات

آسمان سے برسنے والے پتھروں کے ان پر چھا جانے کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

وَ اَمۡطَرۡنَا عَلَیۡہَا حِجَارَۃً مِّنۡ سِجِّیۡلٍ مَّنۡضُوۡدٍ ۙ[2] اور اس پر پختہ مٹی کے پتھروں کی لگاتار بارش برسائی۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکَ تَتَمَارٰی ﴿۵۵﴾ ۵۵۔ پھر تو اپنے رب کی کون سی نعمت پر شک کرتا ہے؟

تفسیر آیات

اے انسان! ان تمام واقعات و حالات اور تاریخ انسان کے عبرتناک حادثات سامنے آنے کے بعد تو اللہ کی کس نعمت پر شک کرتا ہے جب کہ اس قسم کے عذاب سے ابھی تک محفوظ ہے۔ اس آیت میں مخاطب ہر وہ شخص ہے جو ان آیات کا مطالعہ کرتا ہے۔

ہٰذَا نَذِیۡرٌ مِّنَ النُّذُرِ الۡاُوۡلٰی ﴿۵۶﴾ ۵۶۔ یہ (پیامبر) بھی گزشتہ تنبیہ کرنے والوں کی طرح ایک تنبیہ کرنے والا ہے۔

---

[1]، [2] ۱۱ ہود: ۸۲

تفسیر آیات

۱۔ ھٰذَا نَذِیۡرٌ: ھٰذَا کا اشارہ قرآن کی طرف یا رسول اللہ ﷺ کی طرف ہے کہ یہ رسول، اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے رسولوں میں سے ایک رسول ہیں۔ اس پر تعجب کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

اَزِفَتِ الۡاٰزِفَۃُ ﴿۵۷﴾ ۵۷۔ آنے والی (قیامت) قریب آ ہی گئی ہے،

تفسیر آیات

قیامت نزدیک ہو گئی جو قیامت ہر صورت میں آنے والی ہے۔ درحقیقت قیامت کی ابتدا موت سے ہو جاتی ہے کہ اگلی زندگی کی قسمت کا فیصلہ موت کے وقت سنا دیا جاتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے:

من مات فقد قامت قیامته۔[1] جو مر گیا اس کی قیامت برپا ہو گئی۔

لَیۡسَ لَہَا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ کَاشِفَۃٌ ﴿۵۸﴾ ۵۸۔ اللہ کے سوا اسے دور کرنے والا کوئی نہیں۔

تفسیر آیات

اللہ کے علاوہ قیامت کی ہولناکیوں کو دور کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ کسی متنفس کے بس میں نہیں ہے کہ قیامت کی سختیوں میں سے کسی ایک سختی کو دور کر سکے۔

کَاشِفَۃٌ مونث ہے نفس کی صفت کی وجہ سے جو محذوف ہے۔ یہ خیال بھی ظاہر کیا جاتا ہے کہ کَاشِفَۃٌ کی تاء مبالغہ کے لیے ہے جیسے علامۃ اور یہ خیال بھی ہے کہ یہ مصدر ہے جیسے عافیۃ۔

اَفَمِنۡ ہٰذَا الۡحَدِیۡثِ تَعۡجَبُوۡنَ ﴿۵۹﴾ ۵۹۔ کیا تم اس کلام سے تعجب کرتے ہو؟

وَ تَضۡحَکُوۡنَ وَ لَا تَبۡکُوۡنَ ﴿۶۰﴾ ۶۰۔ اور ہنستے ہو اور روتے نہیں ہو؟

تفسیر آیات

۱۔ کیا تم اس قرآن کے بارے میں تعجب کرتے ہو کہ ایک انسان پر اللہ کی طرف سے وحی نازل ہو، کیسے ممکن ہے؟ تعجب سے مراد یہ ہے کہ کسی ناممکن چیز کو ممکن دکھانے سے ہوتا ہے اور انکاری لہجے میں تعجب کا اظہار کیا جاتا ہے۔

---

[1] بحار الانوار ۵۸: ۷

۲۔ تمہیں اپنی جہالت اور تاریک عاقبت کے تصور سے رونا چاہیے تھا کہ کس ابدی بدبختی میں مبتلا ہو گیا۔ الٹا اس حیات آفرین کتاب کا مذاق اڑاتے ہو۔ اس سے ہدایت حاصل کرنے کی جگہ اس کا تمسخر اڑاتے ہو۔

وَاَنۡتُمۡ سٰمِدُوۡنَ ﴿۶۱﴾ ۶۱۔ اور تم لغویات میں مگن ہو؟

تشریح کلمات

سٰمِدُوۡنَ: (س م د) کے متعدد معانی ہیں۔ ایک معنی لغویات سے کیا ہے۔ تکبر سے سر اٹھانے کو بھی کہتے ہیں اور گانا گانے کے معنوں میں بھی لیا گیا ہے۔

تفسیر آیات

جب قرآن پیش کیا جاتا ہے تو تم قرآن سے توجہ ہٹانے کے لیے لغویات میں مگن ہو جاتے ہو یا اس کلام کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی جگہ تکبر اور نخوت سے اپنے سروں کو اوپر کی طرف الٹا دیتے ہو۔

فَاسۡجُدُوۡا لِلّٰہِ وَ اعۡبُدُوۡا ﴿۶۲﴾ ۶۲۔ پس اللہ کے آگے سجدہ کرو اور اسی کی عبادت کرو۔

تفسیر آیات

پس جب صورت حال یہ ہے کہ قیامت نزدیک ہے۔ اللہ کے علاوہ قیامت کی ہولناکیوں کو دور کرنے والا بھی کوئی نہیں ہے اور منکرین اس قرآن کا انکار کرتے لغویات میں مگن ہوتے ہیں تو اے مومنو! تم اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہو جاؤ اور اللہ کی بندگی کرو۔

واضح رہے: اس آیت پر سجدہ واجب ہے۔

سُورَةُ القَمَر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس سورۃ المبارکہ کا نام شروع میں مذکور وَانۡشَقَّ الۡقَمَرُ سے ماخوذ ہے۔ یہ سورۃ مکی ہے اور آیات کی تعداد ۵۵ ہے۔

مضامین سورۃ انذار و تنبیہ پر مشتمل ہے اور اس بات کو تاکید اور تکرار کے ساتھ کئی بار دہرایا کہ ”ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان بنا دیا ہے تو کیا کوئی نصیحت قبول کرنے والا ہے؟“

اس سورۃ میں یہ پیشگوئی بھی ہے کہ مشرکین فاتح جماعت نہیں ہیں بلکہ ”یہ جماعت عنقریب شکست کھائے گی اور پیٹھ پھیر کر بھاگے گی۔“ (آیت ۴۵)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	بنام خدائے رحمن رحیم
اِقۡتَرَبَتِ السَّاعَۃُ وَ انۡشَقَّ الۡقَمَرُ ①	۱۔ قیامت قریب آ گئی اور چاند شق ہو گیا۔

تفسیر آیات

شق قمر اور قیامت کے نزدیک ہونے میں کوئی ربط معلوم ہوتا ہے۔ وہ ربط یہ ہے کہ چاند کے ٹکڑے ہونے سے اس بات کا امکان سامنے آ گیا کہ موجودہ نظام درہم برہم ہو سکتا ہے اور قیامت موجودہ نظام کائنات کے درہم برہم ہونے سے عبارت ہے۔

شق القمر کا معجزہ ایک ممکن الوقوع معجزہ ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے واقع شدہ معجزات میں سے ایک معجزہ ہے آتش نمرود، عمر نوح، عصائے موسیٰ، ولادت عیسیٰ، مردوں کا زندہ کرنا، وغیرہ کی طرح۔ لہٰذا اس کے وقوع کو طبیعاتی قوانین کی دفعات میں تلاش نہیں کرنا چاہیے بلکہ انبیاء علیہم السلام کے معجزات میں تلاش کرنا چاہیے۔

ہم نے اس سے پہلے متعدد مقامات پر اس بات کی وضاحت کی ہے کہ: **معجزات**، طبیعیاتی قوانین کے دائرے میں نہیں ہوتے اور بلا علت بھی نہیں ہوتے۔ ہر حادثے کی طرح معجزات کے پیچھے علل و اسباب ہوتے ہیں۔ البتہ یہ علل و اسباب عام لوگوں کے لیے قابل تسخیر نہیں ہیں۔ اسی قابل تسخیر نہ ہونے کی وجہ سے معجزہ، معجزہ ہوتا ہے۔ لہٰذا معجزے کی طبیعیاتی توجیہ کرنا درست نہیں ہے جب کہ بعض مفسرین نے اس کی توجیہ کرنے کے لیے بہت زحمت و تکلف سے کام لیا ہے۔

شق القمر کا واقعہ ہجرت سے پانچ سال قبل کا ہے۔ مشرکین نے ایک دن رسول اللہ ﷺ سے کہا: اگر آپ سچے ہیں تو چاند کو دو ٹکڑے کر دیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **ان فعلت تومنون؟** اگر میں نے ایسا کر دیا تو کیا تم ایمان لاؤ گے؟ لوگوں نے کہا: ہاں۔ چنانچہ چودھویں کا چاند تھا رسول کریم ﷺ نے دعا کی:

فانشق القمر فلقتين و رسول الله ص **ينادی يا فلان يا فلان اشهدوا۔**[1]

چنانچہ چاند دو ٹکڑے ہو گیا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اے فلاں اے فلاں گواہ رہنا۔

شق القمر کے واقع کے راویان حضرت علی علیہ السلام، **عبد الله بن مسعود، انس بن مالك، حذيفه بن يمان، عبد الله بن عمر، عبد الله بن عباس** اور **جبير بن مطعم** ہیں۔ اگرچہ اس واقع کے عینی شاہد تو حضرت علی علیہ السلام، ابن عباس اور ابن عمر ہو سکتے ہیں۔ باقی اصحاب ہجرت کے بعد داخل اسلام ہوئے ہیں لیکن رسول اللہ ﷺ کے معاصر اور صحبت حاصل ہونے کی وجہ سے عین ممکن ہے کہ اس واقع کو ان اصحاب نے خود رسول اللہ ﷺ سے ہی سنا ہو۔

اس معجزے پر سوالات اٹھائے جاتے ہیں جن کا مختصر ذکر ضروری ہے:

پہلا سوال: معجزات کی دو قسمیں ہیں: ابتدائی معجزہ جو ہر رسول اپنی رسالت کے ثبوت کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اس قسم کے معجزات کے انکار پر فوری عذاب نہیں آتا۔ دوسرا معجزہ، تجویزی معجزہ ہے ہیں جو لوگوں کے مطالبے پر دکھایا جاتا ہے۔ اس قسم کے معجزات کے انکار پر فوری عذاب نازل ہو جاتا ہے۔

وَلَوۡ اَنۡزَلۡنَا مَلَکًا لَّقُضِیَ الۡاَمۡرُ ثُمَّ لَا یُنۡظَرُوۡنَ ۝[2]

اور اگر ہم نے فرشتہ نازل کر دیا ہوتا تو (اب تک) فیصلہ بھی ہو چکا ہوتا پھر انہیں (ذرا) مہلت نہ دی جاتی۔

اگر شق القمر کا معجزہ لوگوں کے مطالبے پر دکھایا گیا ہے اور لوگوں نے اسے جادو کہہ کر قبول نہیں کیا تو فوری عذاب آنا چاہیے تھا، جو نہیں آیا؟

جواب یہ ہے کہ یہ اس امت مرحومہ کا خاصہ ہے کہ اسے فوری عذاب سے دو امان عنایت ہوئی ہیں: ایک رسول رحمت ﷺ کا وجود، دوسری استغفار۔ فرمایا:

---

[1] بحار الانوار ۱۷: ۳۶۷
[2] ۶ انعام: ۸

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمۡ وَاَنۡتَ فِيۡهِمۡ ؕ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمۡ وَهُمۡ يَسۡتَغۡفِرُوۡنَ ۝[1] اور اللہ ان پر عذاب نازل نہیں کرے گا جب تک آپ ان کے درمیان موجود ہیں اور نہ ہی اللہ انہیں عذاب دینے والا ہے جب وہ استغفار کر رہے ہوں۔

لہٰذا جب تک رسول اللہ ﷺ ان کے درمیان موجود رہے ان پر عذاب نہیں آیا۔ البتہ رسول اللہ ﷺ کے مکہ سے خارج ہونے کے بعد ان پر بدر وغیرہ میں عذاب آنا شروع ہو گیا۔ اس جواب کو صاحب تفسیر المیزان نے اختیار کیا ہے۔

دوسرا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ یہ موقف اختیار کیا جائے کہ یہ معجزہ لوگوں کے مطالبے پر نہیں دکھایا گیا بلکہ رسول اللہ ﷺ از خود دکھایا ہے۔

چنانچہ جو روایت حضرت علی علیہ السلام سے مروی ہے۔ اس میں لوگوں کے مطالبے کا ذکر نہیں ہے۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں:

انشق القمر بمکة فلقتین فقال رسول اللّٰہؐ اشھدوا اشھدوا۔[2] مکہ میں چاند دو ٹکڑے ہو گیا تو رسول اللہؐ نے فرمایا: گواہ رہو گواہ رہو۔

دوسرا سوال یہ کیا جاتا ہے کہ: اگر شق القمر ہو گیا ہوتا تو اس وقت کی رصدگاہوں میں بہت سے لوگوں کو دکھائی دیتا۔

جواب یہ ہے کہ چاند دو ٹکڑے ہونے کے بعد مختصر وقفے کے بعد دوبارہ جڑ گیا۔ ایک مختصر وقفے میں دوسرے لوگ متوجہ نہیں ہوتے۔ دوسری بات یہ ہے روایت کے مطابق چودھویں کا چاند تھا جو شق ہو گیا۔ اس وقت دوسرے علاقوں میں دیکھا نہیں جاتا جیسا کہ چاند گرہن بعض علاقوں میں دیکھا جاتا ہے اور بعض علاقوں میں نہیں دیکھا جاتا۔

بعض یہ خیال کرتے ہیں: انشق القمر سے مراد یہ ہے کہ ابتدائی تخلیق کائنات میں قمر، سورج سے منشق ہو گیا تھا۔ دوسرے بعض کہتے ہیں انشق سے مراد یہ ہے کہ قیامت کے دن منشق ہو گا۔ ماضی کا صیغہ اس واقعہ کے یقینی ہونے کی وجہ سے استعمال ہوا ہے۔

یہ دونوں نظریے قابل توجہ نہیں ہیں۔ چونکہ اگلی آیت میں فرمایا ہے: یہ کافر لوگ جو بھی معجزہ دیکھ لیں منہ پھیر لیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ شق القمر معجزہ تھا جو رونما ہوا۔ سورج سے الگ ہونا، اول تو ایک تھیوری سے زیادہ اس کی حقیقت نہیں ہے۔ ثانیاً یہ کوئی معجزہ نہیں، اسی طرح قیامت کے دن ہونے والے واقعات معجزہ نہیں ہیں۔

شاعر نے ایک اچھا تخیل پیش کیا ہے:

---

[1] ۸ انفال: ۳۳ [2] الامالی للطوسی ۱: ۳۴۱

معجزہ شق القمر کا ہے مدینہ سے عیاں
مہ نے شق ہو کر لیا ہے دین کو آغوش میں

وَاِنۡ یَّرَوۡا اٰیَۃً یُّعۡرِضُوۡا وَ یَقُوۡلُوۡا سِحۡرٌ مُّسۡتَمِرٌّ ﴿۲﴾

۲۔اور (کفار) اگر کوئی نشانی دیکھ لیتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں: یہ تو وہی ہمیشہ کا جادو ہے۔

تفسیر آیات

اس آیت میں دو باتوں کی صراحت ہے کہ اول یہ کہ شق القمر کا واقعہ ایک معجزے کے طور پر وقوع پذیر ہوا تھا۔ دوسری یہ ہے کہ اس معجزے کو سِحۡرٌ مُّسۡتَمِرٌّ کہنے کے بعد دیگرے واقع ہونے والا جادو کہنے سے معلوم ہوا کہ یہ معجزات کے تسلسل میں ایک معجزہ تھا۔ اس سے دیگر معجزات کے وقوع پذیر ہونے کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

وَکَذَّبُوۡا وَاتَّبَعُوۡۤا اَهۡوَآءَهُمۡ وَکُلُّ اَمۡرٍ مُّسۡتَقِرٌّ ﴿۳﴾

۳۔انہوں نے تکذیب کی اور اپنی خواہشات کی پیروی کی اور ہر امر استقرار پانے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ ان کافروں نے اپنی خواہش پرستی کی بنیاد پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تکذیب کی ہے کہ رسول کی رسالت قبول کر کے ان کی بالادستی کو قبول کرنا ان کی انا پرستی کے خلاف تھا۔

۲۔ وَکُلُّ اَمۡرٍ مُّسۡتَقِرٌّ: ہر معاملے کا ایک انجام ہوتا ہے جس پر پہنچ کر اس کی اصلی حالت سامنے آ جاتی ہے۔ اگر یہ دین برحق نہیں ہے تو کل اپنے انجام کو پہنچ کر فاش ہو جائے گا ورنہ تم اے مشرکو! اپنے انجام کو پہنچ کر رسوا ہو جاؤ گے۔

اس آیت میں دین اسلام کے استحکام اور دشمنان اسلام کی نابودی کی نوید ہے۔

اس آیت میں ان لوگوں کے لیے ایک نوید ہے جو حق کی راہ میں مخلصانہ طریقے سے کام کرتے ہوئے ایک طویل منصوبہ بندی کرتے ہیں اور اپنے اس عمل کو اخلاص کے منافی باتوں سے پاک رکھتے ہیں۔ انہیں آخر میں کامیابی ملے گی۔ وَکُلُّ اَمۡرٍ مُّسۡتَقِرٌّ کے تحت انجام کار سرخ روئی ہو گی جب کہ غیر مخلص لوگوں کی وقتی اچھل کود ختم اور انجام کار رسوائی ہو گی۔

اہم نکات

۱۔ دین کے نام پر کام کرنے والوں کو کامیابی کا راز اپنے ضمیر میں تلاش کرنا چاہیے۔

۲۔ نظر انجام پر ہونی چاہیے، وقتی اچھل کود پر نہیں۔

وَلَقَدۡ جَآءَهُمۡ مِّنَ الۡاَنۡۢبَآءِ مَا فِيۡهِ مُزۡدَجَرٌ ۙ﴿۴﴾
۴۔ اور بتحقیق ان کے پاس وہ خبریں آ چکی ہیں جو (کفر سے) باز رہنے کے لیے کافی ہیں،

حِكۡمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغۡنِ النُّذُرُ ۙ﴿۵﴾
۵۔ (جن میں) حکیمانہ اور مؤثر (باتیں) ہیں لیکن تنبیہیں فائدہ مند نہیں رہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَقَدۡ جَآءَهُمۡ: ان منکرین کے پاس گزشتہ اقوام کے انجام کے بارے میں سبق آموز اور عبرتناک خبریں آ چکی اور ساتھ آنے والی زندگی، آخرت کے حالات سے بھی باخبر کیا گیا ہے۔

۲۔ مَا فِيۡهِ مُزۡدَجَرٌ: ان خبروں میں قابل تنبیہ لوگوں کے لیے کافی تنبیہ ہے۔

۳۔ حِكۡمَةٌۢ بَالِغَةٌ: ان خبروں میں موثر حکیمانہ تنبیہ ہے۔ ان تنبیہوں میں کسی قسم کی خامی نہیں ہے۔

۴۔ فَمَا تُغۡنِ النُّذُرُ: ان تنبیہوں سے فائدہ نہیں ہوا ہے تو ظرفیت نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ زمین میں استعداد نہ ہونے کی صورت میں بہترین بیج بھی سڑ جاتا ہے۔

فَتَوَلَّ عَنۡهُمۡ ۘ يَوۡمَ يَدۡعُ الدَّاعِ اِلٰی شَیۡءٍ نُّكُرٍ ۙ﴿۶﴾ وقف لازم
۶۔ پس آپ بھی ان سے رخ پھیر لیں، جس دن بلانے والا ایک ناپسندیدہ چیز کی طرف بلائے گا۔

خُشَّعًا اَبۡصَارُهُمۡ يَخۡرُجُوۡنَ مِنَ الۡاَجۡدَاثِ كَاَنَّهُمۡ جَرَادٌ مُّنۡتَشِرٌ ۙ﴿۷﴾
۷۔ تو وہ آنکھیں نیچی کر کے قبروں سے نکل پڑیں گے گویا وہ بکھری ہوئی ٹڈیاں ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ فَتَوَلَّ عَنۡهُمۡ: انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ ان کی ہدایت پر توجہ دینا بند کر دیں اور ضلالت کی تاریکیوں میں پڑا رہنے دیں۔ ماں سے بھی زیادہ مہرباں رب کا یہ اعلان سب سے بڑی سزا ہے۔

۲۔ يَوۡمَ يَدۡعُ الدَّاعِ: جب پکارنے والا ایسی چیز کی طرف پکارے گا جو ان کے وہم و گمان میں بھی

نہ تھی۔ انہیں قیامت کے بارے میں بتایا گیا تھا لیکن وہ اس کے منکر تھے۔ اس کی نوعیت اور ہولنا کی کا وہ قصور نہیں کر سکتے تھے۔

۳۔ خُشَّعًا اَبۡصَارُهُمۡ: سہمی ہوئی نگاہوں کے ساتھ قیامت کی ہولناکیاں ان سے دیکھی نہیں جائیں گی جب کہ وہ اس ہولناک حالت کے لیے تیار بھی نہ تھے۔

۴۔ یَخۡرُجُوۡنَ مِنَ الۡاَجۡدَاثِ: قبروں سے نکلیں گے یعنی جس خاک میں وہ اس وقت ملے ہوئے ہوں گے اس کے ذروں سے نکلیں گے۔

۵۔ کَاَنَّهُمۡ جَرَادٌ مُّنۡتَشِرٌ: ٹڈیاں جب پھیلتی ہیں غیر منظم طریقے سے ایک دوسرے پر گرتی ہیں۔ اسی طرح کافر جب خاک سے اٹھیں گے حواس باختہ ہو کر ہر طرف بکھر جائیں گے:

وَ تَرَی النَّاسَ سُکٰرٰی وَ مَا هُمۡ بِسُکٰرٰی ...[1]	اور تم لوگوں کو نشے کی حالت میں دیکھو گے، حالانکہ وہ نشے میں نہ ہوں گے۔

مُّهۡطِعِیۡنَ اِلَی الدَّاعِ ؕ یَقُوۡلُ الۡکٰفِرُوۡنَ هٰذَا یَوۡمٌ عَسِرٌ ﴿۸﴾	۸۔ پکارنے والے کی طرف دوڑتے ہوئے جا رہے ہوں گے، اس وقت کفار کہیں گے: یہ بڑا کٹھن دن ہے۔

تشریح کلمات

مُّهۡطِعِیۡنَ: (ھ ط ع) گردن اُٹھا کر چلنے والے اونٹ کو بعیر مهطع کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ مُّهۡطِعِیۡنَ اِلَی الدَّاعِ: جب پکارنے والا پکارتا ہے تو بے ساختہ اس آواز کی طرف لپک کر جانا پڑتا ہے یا سر اٹھا کر اس پکار کی طرف نظر اُٹھانے لگتے ہیں کہ کیسی پکار ہے جس کی طرف دوڑنا پڑ رہا ہے۔

۲۔ یَقُوۡلُ الۡکٰفِرُوۡنَ: کافر کے لیے قیامت کا دن بڑا مشکل دن ہو گا۔ اس مشکل سے نکلنے کے لیے وہ ہر قیمت ادا کرنے پر آمادہ ہو گا:

وَ لَوۡ اَنَّ لِلَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا مَا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا وَّ مِثۡلَهٗ مَعَهٗ لَافۡتَدَوۡا بِهٖ مِنۡ سُوۡٓءِ الۡعَذَابِ ...[2]	اور اگر ظالموں کے پاس وہ سب (دولت) موجود ہو جو زمین میں ہے اور اتنی مزید بھی ہو تو قیامت کے دن برے عذاب سے بچنے کے لیے وہ اسے فدیہ میں دینے کے لیے آمادہ ہو جائیں گے۔

---

[1] ۲۲ حج: ۲　[2] ۳۹ زمر: ۴۷

کَذَّبَتۡ قَبۡلَہُمۡ قَوۡمُ نُوۡحٍ فَکَذَّبُوۡا عَبۡدَنَا وَ قَالُوۡا مَجۡنُوۡنٌ وَّ ازۡدُجِرَ ﴿۹﴾	۹۔ ان سے پہلے نوح کی قوم نے بھی تکذیب کی تھی، پس انہوں نے ہمارے بندے کی تکذیب کی اور کہنے لگے: دیوانہ ہے اور (جنات کی) جھڑکی کا شکار ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قَبۡلَہُمۡ: ان سے پہلے، سے مراد کفار مکہ سے پہلے نوح علیہ السلام کی قوم نے تکذیب کی۔ یہاں تکذیب کا دوبار ذکر ہے۔ پہلی بار انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کا ذکر ہے:

کَذَّبَتۡ قَوۡمُ نُوۡحِۣ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۱۰۵﴾ [1] — نوح کی قوم نے بھی پیغمبروں کی تکذیب کی۔

دوسری بار حضرت نوح علیہ السلام کی تکذیب کا ذکر ہے۔

۲۔ وَ قَالُوۡا مَجۡنُوۡنٌ وَّ ازۡدُجِرَ: صرف تکذیب پر اکتفا نہیں کیا بلکہ دیوانہ جن زدہ بھی کہا۔ ازۡدُجِرَ سے بظاہر جن زدہ مراد ہے۔ بعض کہتے ہیں وَّ ازۡدُجِرَ کا مطلب یہ ہے کہ انہیں تبلیغ سے زجر (منع) کر دیا گیا یعنی وہ ممنوع التبلیغ تھے۔

فَدَعَا رَبَّہٗۤ اَنِّیۡ مَغۡلُوۡبٌ فَانۡتَصِرۡ ﴿۱۰﴾	۱۰۔ پس نوح نے اپنے رب کو پکارا: میں مغلوب ہو گیا ہوں پس تو انتقام لے۔

تفسیر آیات

جب حضرت نوح علیہ السلام صدیوں کی تبلیغ کے بعد اپنی قوم کے ایمان سے ناامید ہو گئے اور اللہ نے بھی خبر دی کہ یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں:

وَ اُوۡحِیَ اِلٰی نُوۡحٍ اَنَّہٗ لَنۡ یُّؤۡمِنَ مِنۡ قَوۡمِکَ اِلَّا مَنۡ قَدۡ اٰمَنَ ... [2]	اور نوح کی طرف یہ وحی کی گئی کہ جو لوگ ایمان لا چکے ہیں ان کے علاوہ آپ کی قوم میں سے ہرگز کوئی اور ایمان نہیں لائے گا۔

اس وقت حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے خلاف بددعا کی اور ان سے انتقام کی دعا کی۔ جب کسی قوم یا اس کی آنے والی نسلوں سے ایمان کی امید نہیں رہتی تو بددعا کی نوبت آتی ہے۔

---

[1] ۲۶ شعراء۔ ۱۰۵ [2] ۱۱ ھود۔ ۳۶

فَفَتَحۡنَاۤ اَبۡوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنۡهَمِرٍ ﴿۱۱﴾ ۱۱۔ پھر ہم نے زوردار بارش سے آسمان کے دھانے کھول دیے۔

وَّ فَجَّرۡنَا الۡاَرۡضَ عُیُوۡنًا فَالۡتَقَی الۡمَآءُ عَلٰۤی اَمۡرٍ قَدۡ قُدِرَ ﴿۱۲﴾ ۱۲۔ اور زمین کو شگافتہ کر کے ہم نے چشمے جاری کر دیے تو (دونوں) پانی اس امر پر مل گئے جو مقدر ہو چکا تھا۔

تشریح کلمات

مُّنۡهَمِرٍ: (ھ م ر) الھمر کے معنی آنسو یا پانی بہا دینے کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ فَفَتَحۡنَاۤ اَبۡوَابَ السَّمَآءِ: آسمان کے دھانے کھولنے کی تعبیر سے یہ بتانا مقصود ہے کہ غیر معمولی بارش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اس قسم کی بارش کا ہم نے سنہ ۲۰۱۰ کے برساتی موسم میں مشاہدہ کیا جس سے پاکستان کی پوری سرزمین کا پانچواں حصہ زیر آب آ گیا اور یہ تاریخ کا سنگین ترین سیلاب تھا۔

۲۔ وَّ فَجَّرۡنَا الۡاَرۡضَ: ساتھ زمین سے بھی چشمے پھوٹے۔ زمین سے پھوٹنے والے پانی سے مراد سمندر کا پانی ہو سکتا ہے جو طوفان کے ذریعے خشکی پر آ گیا ہو۔ حضرت شیخ محمد الحسین کاشف الغطاء احتمال دیتے ہیں کہ آسمان سے کوئی دمدار سیارہ سمندر میں گرا ہو گا جس سے یہ طوفان آ گیا۔

۳۔ فَالۡتَقَی الۡمَآءُ: دونوں پانیوں کے ملنے سے وہ عظیم طوفان آ گیا جس نے اونچے پہاڑوں تک کو ڈبو دیا تھا۔

۴۔ عَلٰۤی اَمۡرٍ قَدۡ قُدِرَ: آسمان اور زمین کے پانی نے مل کر اس مقدار کو پورا کر دیا جسے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا تھا یعنی جس حد تک تقدیر الٰہی میں پانی نے اونچا جانا تھا اس حد تک آنے کے لیے دونوں پانی جمع ہو گئے۔ وہ امر مقدر یہ تھا کہ اہل ایمان کے علاوہ تمام کافروں کے زندہ بچنے کا امکان ختم ہو جائے۔

وَ حَمَلۡنٰهُ عَلٰی ذَاتِ اَلۡوَاحٍ وَّ دُسُرٍ ﴿۱۳﴾ ۱۳۔ اور تختوں اور کیلوں والی (کشتی) پر ہم نے نوح کو سوار کیا۔

تشریح کلمات

دُسُرٍ: (د س ر) میخ کے معنوں میں ہے۔ ایک طرف دھکیل دینے کے معنوں میں بھی آیا ہے۔ ابن

عباس نے کہا ہے: اس سے مراد کشتی کا سینہ ہے جو پانی کو دھکیل دیتا ہے۔

تفسیر آیات

وَحَمَلْنٰهُ: ایسی کشتی پر اٹھایا جو تختوں اور کیلوں سے بنی ہوئی تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں ابھی آہن سازی کی صنعت وجود میں نہیں آئی تھی۔ لہٰذا دُسُرٍ سے مراد رسی یا لکڑی کی کیلیں ہو سکتی ہیں۔

تَجۡرِیۡ بِاَعۡیُنِنَا ۚ جَزَآءً لِّمَنۡ کَانَ کُفِرَ ﴿۱۴﴾

۱۴۔ جو ہماری نگرانی میں چل رہی تھی، یہ بدلہ اس شخص کی وجہ سے تھا جس کی قدر شناسی نہیں کی گئی تھی۔

تفسیر آیات

ا۔ یہ کشتی ہماری نگرانی اور حفاظت میں چل رہی تھی۔ یہ ایک محاورہ ہے کہ اگر کسی کو یہ کہنا ہو تو اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں رہے تو کہتے ہیں انت عین اللّٰہ۔

۲۔ جَزَآءً لِّمَنۡ کَانَ کُفِرَ: اس کشتی کے ذریعے نجات ہم نے اس بات کے صلے میں دی کہ ان کی تکذیب کی گئی یعنی حضرت نوح علیہ السلام کو ہم نے نجات دی اس بات کی جزا میں کہ ان کی طویل تبلیغ کو مسترد کیا گیا۔

وَ لَقَدۡ تَّرَکۡنٰهَاۤ اٰیَۃً فَہَلۡ مِنۡ مُّدَّکِرٍ ﴿۱۵﴾

۱۵۔ اور تحقیق اس (کشتی) کو ہم نے ایک نشانی بنا چھوڑا تو کیا کوئی نصیحت قبول کرنے والا ہے؟

تفسیر آیات

ا۔ تَّرَکۡنٰهَاۤ: ضمیر اگر سفینہ کی طرف ہے جس کا سیاق سے مفہوم ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ ہم نے اس سفینہ کو عبرت کی نشانی کے طور پر ایک مدت تک باقی رکھا۔ چنانچہ کہتے ہیں کوہ ارارات (جودی) پر اس کشتی کے آثار پائے گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو سورہ ہود: ۴۴۔

اور اگر تَّرَکۡنٰهَاۤ کی ضمیر طوفان کے واقعہ کی طرف ہے تو اس صورت میں اس کے معنی واضح ہیں۔

۲۔ فَہَلۡ مِنۡ مُّدَّکِرٍ: ہے کوئی اس طوفان اور اس کی تباہی سے نصیحت حاصل کرنے والا۔ اس سوالیہ جملے کا اشارہ مکہ کے مشرکین کی طرف ہے۔

فَكَيۡفَ كَانَ عَذَابِىۡ وَنُذُرِ ﴿۱۶﴾ ۱۶۔ پس بتاؤ میرا عذاب اور میری تنبیہیں کیسی رہیں؟

تفسیر آیات

نزول قرآن کے معاصر منکرین کی تنبیہ کے لیے فرمایا: میرے عذاب اور تنبیہات کا اندازہ نہیں ہوا کہ کس حد تک شدید ہیں؟

وَلَقَدۡ يَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّكۡرِ فَهَلۡ مِنۡ مُّدَّكِرٍ ﴿۱۷﴾ ۱۷۔ اور بتحقیق ہم نے اس قرآن کو نصیحت کے لیے آسان بنا دیا ہے تو کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا؟

تفسیر آیات

نصیحت حاصل کرنے اور عبرت کی دعوت کا ایک طریقہ تو یہ ہے لوگوں کو عذاب میں مبتلا کیا جائے اور ان پر بلا نازل کر کے نصیحت حاصل کرنے پر آمادہ کیا جائے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس امت پر رحم فرمایا اور نصیحت کے لیے عذاب اور بلا نازل کرنے کی بجائے قرآن کو بطور حجت و نصیحت نازل کیا جو نصیحت کا آسان طریقہ ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ اقوام گزشتہ میں سے ہر قوم پر نازل ہونے والے عذاب کا ذکر فرمانے کے بعد فرماتا ہے: ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان طریقہ بنایا ہے۔ چنانچہ قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم صالح اور قوم لوط پر نازل ہونے والے عذابوں کے ذکر کے بعد اس بات کا ذکر بار بار آ رہا ہے کہ ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان طریقہ بنایا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے جن باتوں سے انسان نے نصیحت حاصل کرنی ہے انہیں نہایت سلیس اور واضح الفاظ میں مختلف اسلوب اور انداز میں تکرار کے ساتھ بیان کیا جائے تا کہ اسلوب مختلف ہونے اور تکرار کی وجہ سے نصیحتیں ذہن نشین ہو جائیں۔

كَذَّبَتۡ عَادٌ فَكَيۡفَ كَانَ عَذَابِىۡ وَنُذُرِ ﴿۱۸﴾ ۱۸۔ عاد نے تکذیب کی تو بتاؤ میرا عذاب اور میری تنبیہیں کیسی تھیں؟

اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ رِيۡحًا صَرۡصَرًا فِىۡ يَوۡمِ نَحۡسٍ مُّسۡتَمِرٍّ ﴿۱۹﴾ ۱۹۔ ایک مسلسل نحوست کے دن ہم نے ان پر ایک طوفانی ہوا چلائی،

تفسیر آیات

۱۔ کَذَّبَتۡ عَادٌ: چنانچہ قوم عاد نے مشرکین مکہ کی طرح ہمارے رسول کی تکذیب کی تو ہماری طرف سے عذاب نے ان کو آ لیا۔

۲۔ اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا: قوم عاد پر ہم نے طوفانی ہوا چلا دی۔ صرصر طوفانی ہوا کو کہتے ہیں، بعض کے نزدیک سرد ہوا کو کہتے ہیں۔

۳۔ فِیۡ یَوۡمِ نَحۡسٍ مُّسۡتَمِرٍّ: ایسے منحوس دن میں یہ عذاب آیا جس کی نحوست چند دنوں تک مستمر یعنی جاری رہی۔ سورہ حاقۃ آیت ۷ میں ہے:

سَخَّرَهَا عَلَیۡهِمۡ سَبۡعَ لَیَالٍ وَّ ثَمٰنِیَۃَ اَیَّامٍ ۙ حُسُوۡمًا ... جسے اس نے مسلسل سات راتوں اور آٹھ دنوں تک ان پر مسلط رکھا۔

یہ قوم عاد کے لیے نحوست کا دن تھا۔ ایسا نہیں ہے کہ اس دن میں نحوست ہے۔ یہاں یوم سے مراد زمانے کا ایک حصہ ہے خواہ کئی دن ہوں کیونکہ دیگر آیات میں ایام نحسات کہا ہے۔ چنانچہ سورہ حاقۃ آیت ۷ میں ان ایام کی تعداد آٹھ بتائی ہے۔

تَنۡزِعُ النَّاسَ ۙ کَاَنَّهُمۡ اَعۡجَازُ نَخۡلٍ مُّنۡقَعِرٍ ﴿۲۰﴾ ۲۰۔ جو لوگوں کو جڑ سے اکھڑے ہوئے کھجور کے تنوں کی طرح اٹھا کر پھینک رہی تھی۔

فَکَیۡفَ کَانَ عَذَابِیۡ وَ نُذُرِ ﴿۲۱﴾ ۲۱۔ پس بتاؤ میرا عذاب اور میری تنبیہیں کیسی تھیں؟

تشریح کلمات

مُّنۡقَعِرٍ: (ق ع ر) قعر یعنی جڑ سے اکھڑا ہوا۔

تفسیر آیات

۱۔ اَعۡجَازُ: عجز الشیء مؤخرہ۔ یہاں اَعۡجَازُ سے مراد تنا ہو سکتا ہے۔ جڑ سے اکھڑے ہوئے درخت کے تنوں کی طرح۔

۲۔ تَنۡزِعُ النَّاسَ: یہ طوفانی ہوا لوگوں کو زمین سے اس طرح اٹھا کر پھینک دیتی تھی کہ ان کے جسم چور چور ہو جاتے۔ سورہ حاقۃ میں تشبیہ دی ہے کہ گویا وہ کھجور کے کھوکھلے تنے ہوں۔

وَ لَقَدۡ یَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّکۡرِ فَهَلۡ ۲۲۔ اور بتحقیق ہم نے اس قرآن کو نصیحت کے

مِنۡ مُّدَّکِرٍ ﴿۲۲﴾ ع ۸ — لیے آسان بنا دیا ہے تو کیا کوئی نصیحت قبول کرنے والا ہے؟

تفسیر آیات

۱۔ امت محمدی کو ایسے عذاب سے دوچار نہیں کیا۔ اس کی جگہ قرآن کی شکل میں ایسی کتاب پیش کی جس سے نصیحت حاصل کرنا نہایت آسان ہے۔

کَذَّبَتۡ ثَمُوۡدُ بِالنُّذُرِ ﴿۲۳﴾ — ۲۳۔ ثمود نے بھی تنبیہ کرنے والوں کی تکذیب کی،

فَقَالُوۡۤا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُہٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِذًا لَّفِیۡ ضَلٰلٍ وَّ سُعُرٍ ﴿۲۴﴾ — ۲۴۔ اور کہنے لگے: کیا ہم اپنوں میں سے ایک بشر کی پیروی کریں؟ تب تو ہم گمراہی اور دیوانگی میں ہوں گے۔

تشریح کلمات

سُعُرٍ: (س ع ر) دیوانگی کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ کَذَّبَتۡ ثَمُوۡدُ: قوم ثمود نے بھی تنبیہ کرنے والے رسولوں کی تکذیب کی۔ النذر مصدر ہے انذار کے معنوں میں اور نذیر کی جمع بھی نُذُرِ ہے۔ قرائن سے معلوم ہو سکتا ہے نُذُرِ مصدر ہے یا نذیر کی جمع ہے۔ چنانچہ عَذَابِیۡ کے ساتھ نُذُرِ کا ذکر آیا ہے تو انداز (تنبیہ) کے معنوں میں ہوگا اور جب کَذَّبَتۡ کے بعد نُذُرِ آیا ہے تو نذیر کی جمع ہو گی۔

۲۔ فَقَالُوۡۤا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُہٗۤ: مشرکین نے ہمیشہ یہ اعتراض کیا کہ بشر اللہ کی نمائندگی کرنے کا اہل نہیں ہے۔ اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ انسان کی پیروی کو کم عقلی سمجھتے تھے۔ یہ شرک کا مزاج ہے کہ وہ عقل و شعور کے مالک انسان کو رسالت کا مقام دینے کے لیے حاضر نہیں ہے، بے شعور جامد بتوں کو معبود کا مقام دیتا ہے۔

ءَاُلۡقِیَ الذِّکۡرُ عَلَیۡہِ مِنۡۢ بَیۡنِنَا بَلۡ ہُوَ کَذَّابٌ اَشِرٌ ﴿۲۵﴾ — ۲۵۔ کیا ہمارے درمیان یہی ایک رہ گیا تھا جس پر یہ ذکر نازل کیا گیا؟ (نہیں) بلکہ یہ بڑا جھوٹا خود پسند ہے۔

سَيَعۡلَمُوۡنَ غَدًا مَّنِ الۡكَذَّابُ الۡاَشِرُ ﴿۲۶﴾

۲۶۔ عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا کہ بڑا جھوٹا خود پسند کون ہے۔

تشریح کلمات

اشر: (ا ش ر) الاشر: بہت زیادہ اترانا۔

تفسیر آیات

۱۔ ءَاُلۡقِیَ الذِّکۡرُ عَلَیۡہِ: اس کتاب کے ہم زیادہ لائق تھے۔ جس پر نازل کی گئی وہ اس لائق کہاں ہے وہ تو ایک جھوٹا خودخواہ آدمی ہے۔

۲۔ سَیَعۡلَمُوۡنَ غَدًا: جواب میں فرمایا: جب کل محاسبے کا وقت آئے گا اس وقت معلوم ہو گا سچا کون ہے اور جھوٹا کون۔ ابدی نجات کی طرف رہنمائی کرنے والا کون ہے اور خود پسند کون۔

اِنَّا مُرۡسِلُوا النَّاقَۃِ فِتۡنَۃً لَّہُمۡ فَارۡتَقِبۡہُمۡ وَ اصۡطَبِرۡ ﴿۲۷﴾

۲۷۔ بے شک ہم اونٹنی کو ان کے لیے آزمائش بنا کر بھیجنے والے ہیں، پس ان کا انتظار کیجیے اور صبر کیجیے۔

وَ نَبِّئۡہُمۡ اَنَّ الۡمَآءَ قِسۡمَۃٌۢ بَیۡنَہُمۡ ۚ کُلُّ شِرۡبٍ مُّحۡتَضَرٌ ﴿۲۸﴾

۲۸۔ اور انہیں بتا دو کہ پانی ان کے درمیان تقسیم ہوگا اور ہر ایک اپنی باری پر حاضر ہوگا۔

تفسیر آیات

وہ فتنہ یعنی آزمائش یہ تھی کہ قوم سے کہدیا گیا ایک دن یہ اونٹنی پانی پیئے گی اور ایک دن تم اپنے اور اپنے جانوروں کے لیے پانی لو گے۔ اونٹنی کی باری کے دن کوئی اور وہاں سے پانی نہیں لے سکے گا۔ جب کہ پوری آبادی کے لیے ایک ہی کنواں ہے اور یہ فیصلہ بھی ایک شخص حضرت صالح علیہ السلام کی طرف سے بحکم خدا تھا۔ حضرت صالح علیہ السلام کے پاس نہ کوئی طاقت تھی، نہ کوئی لشکر۔ نہ کسی کی جرأت تھی کہ اس ایک اونٹنی کا مقابلہ کرے۔

فَنَادَوۡا صَاحِبَہُمۡ فَتَعَاطٰی فَعَقَرَ ﴿۲۹﴾

۲۹۔ پھر انہوں نے اپنے ساتھی کو بلایا اور اسے (ہتھیار) تھمایا پس اس نے (اونٹنی کی) کونچیں کاٹ دیں۔

فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِىْ وَنُذُرِ ۝۳۰

۳۰۔ پس بتاؤ میرا عذاب اور میری تنبیہیں کیسی تھیں؟

تفسیر آیات

چنانچہ اس اونٹنی کا خاتمہ کرنے کے لیے اپنی قوم کے ایک فرد کو بلایا جو شقی القلب، جھگڑالو، ہر بات پر طیش میں آنے والا تھا۔ اس سے کہا گیا اپنی بہادری اس اونٹنی کا خاتمہ کر کے دکھا دے۔ فَتَعَاطٰى کے ایک معنی التناول تھامنے کے ہیں اور دوسرے یہ معنی بھی کیے ہیں: والجراۃ علی الشيء، کسی کے خلاف جسارت کرنے کو بھی کہتے ہیں۔ اس صورت میں ترجمہ یہ ہو گا: پھر انہوں نے اپنے ساتھی کو بلایا اور اسے جرأت دلائی۔ پھر اس نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں۔ یعنی ان لوگوں نے اپنے شقی القلب جھگڑالو کو بلا کر اسے ورغلایا اور اس اونٹنی کو ختم کرنے پر آمادہ کیا۔

اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ ۝۳۱

۳۱۔ ہم نے ان پر ایک زور دار چنگھاڑ چھوڑ دی تو وہ سب باڑ والے کے بھوسے کی طرح ہو گئے۔

تشریح کلمات

كَهَشِيْمِ: (ھ ش م) خشک گھاس یا درخت کے خشک تنے جو ٹوٹ کر ریزہ ہو جاتے ہیں۔

الْمُحْتَظِرِ: (ح ظ ر) حظیرۃ کا مالک۔ حظیرۃ اس باڑ کو کہتے ہیں جس میں جانوروں کو سردیوں میں محفوظ رکھا جاتا اور خشک گھاس کھلائی جاتی ہے۔

تفسیر آیات

ناقہ صالح کی کونچیں کاٹنے کے بعد اللہ کی طرف سے فوری عذاب آ گیا چونکہ یہ اونٹنی اس قوم کے مطالبہ پر بطور معجزہ پیش کی گئی تھی۔ یہ عذاب ایک زور دار چنگھاڑ کے ذریعے نازل ہوا۔ اسے قرآن نے دوسری جگہ صاعقۃ کہا ہے: مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ ....[1]

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝۳۲

۳۲۔ اور بتحقیق ہم نے اس قرآن کو نصیحت کے لیے آسان بنا دیا ہے تو کیا کوئی نصیحت قبول کرنے والا ہے؟

---

[1] ۴۱ فصلت: ۱۳

تفسیر آیات

ہم نے قوم صالح کی طرح عذاب نازل نہیں کیا۔ اس کی جگہ ایک رحمت بھری کتاب نازل کی جس سے نصیحت لینا نہایت آسان ہے۔ ہے کوئی اسے غنیمت جاننے والا؟

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطٍۭ بِالنُّذُرِ ﴿۳۳﴾ ۳۳۔ لوط کی قوم نے بھی تنبیہ کرنے والوں کو جھٹلایا،

اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا اِلَّاۤ اٰلَ لُوْطٍ ؕ نَجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ ﴿۳۴﴾ ۳۴۔ تو ہم نے ان پر پتھر برسانے والی ہوا چلا دی سوائے آل لوط کے جنہیں ہم نے سحر کے وقت بچا لیا،

نِّعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ ﴿۳۵﴾ ۳۵۔ اپنی طرف سے فضل کے طور پر، شکرگزاروں کو ہم ایسے ہی جزا دیتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ قوم لوط نے نہ صرف حضرت لوط کو جھٹلایا بلکہ دیگر مشرکین کی طرح انبیاء علیہم السلام کی نبوت کا انکار کیا۔ وہ رسالت و نبوت کے منکر تھے۔

۲۔ ان پر پتھر برسا دینے والی ہوا چلا دی اور سب کو ہلاک کر دیا۔ اس کی تشریح سورہ شعراء آیت ۱۷۳ میں تشریح ہو گئی ہے۔

۳۔ اِلَّاۤ اٰلَ لُوْطٍ: آل لوط کو اس عذاب سے اللہ نے بچا لیا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نعمت تھی۔ اس نعمت کے وہ مستحق ہوئے چونکہ وہ شکرگزار تھے۔

۴۔ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ: شکرگزاری اور قدردانی ایسا قابل ستائش اخلاق ہے جسے اللہ بہت پسند فرماتا ہے اور خود اللہ تعالیٰ بھی قدر دان ہے:

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ۝ [1] اللہ یقیناً بڑا بخشنے والا، قدر دان ہے۔

شکرگزاری بہت بلند مرتبہ اخلاق ہے۔ اس لیے اس مرتبے پر بہت کم لوگ فائز ہوتے ہیں۔

وَ قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ۝ [2] اور میرے بندوں میں شکر کرنے والے کم ہیں۔

وَ لَقَدْ اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ ﴿۳۶﴾ ۳۶۔ اور بتحقیق لوط نے ہماری عقوبت سے انہیں ڈرایا مگر وہ ان تنبیہ کرنے والوں سے جھگڑتے رہے۔

---

[1] ۴۲ شوریٰ۔ ۲۳ [2] ۳۴ سباء۔ ۱۳

تفسیر آیات

حضرت لوط علیہ السلام نے عذاب کے آنے سے پہلے قوم کو اس سے آگاہ کیا تھا لیکن وہ حضرت لوط علیہ السلام کی نبوت کو تسلیم نہیں کرتے تھے، ان کی اس خبر کو بھی تسلیم نہیں کیا چونکہ اس خبر کی سچائی کا تعلق ان کی نبوت کے ساتھ تھا۔

اس آیت میں النذر، نذیر کی جمع تسلیم کی جائے گی چونکہ تماروا قرینہ ہے کہ ان لوگوں نے تنبیہ کرنے والوں کے ساتھ جھگڑا کیا۔ خود تنبیہوں کے ساتھ جھگڑا نہیں ہو سکتا۔ الا اینکہ تماروا شک کے معنوں میں لیا جائے۔ اس صورت میں النذر، الانذار کی جمع ہو سکتی ہے۔

وَ لَقَدۡ رَاوَدُوۡہُ عَنۡ ضَیۡفِہٖ فَطَمَسۡنَاۤ اَعۡیُنَہُمۡ فَذُوۡقُوۡا عَذَابِیۡ وَ نُذُرِ ﴿۳۷﴾

۳۷۔ اور تحقیق انہوں نے لوط کے مہمانوں کو قابو کرنا چاہا تو ہم نے ان کی آنکھیں مٹا دیں، لو اب میرے عذاب اور تنبیہوں کو چکھو۔

تفسیر آیات

فرشتے حضرت لوط علیہ السلام کے پاس نہایت حسین لڑکوں کی شکل میں آئے۔ قوم لوط نے ان کے گھر پر حلہ بول دیا اور مہمانوں کو بدکاری کے لیے ان کے حوالہ کرنے مطالبہ کیا۔ حضرت لوط علیہ السلام کے انکار پر وہ گھر میں گھسنے کی کوشش کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی بینائی سلب کر لی اور وہ اندھے ہو گئے۔

وَ لَقَدۡ صَبَّحَہُمۡ بُکۡرَۃً عَذَابٌ مُّسۡتَقِرٌّ ﴿۳۸﴾

۳۸۔ اور تحقیق صبح سویرے ایک دائمی عذاب ان پر نازل ہوا۔

فَذُوۡقُوۡا عَذَابِیۡ وَ نُذُرِ ﴿۳۹﴾

۳۹۔ اب چکھو میرے عذاب اور تنبیہوں کا ذائقہ۔

تفسیر آیات

۱۔ انہیں دن چڑھنے پر ایک ایسے عذاب نے لپیٹ میں لے لیا جس میں دوام، جاری رہنا ہے۔ عَذَابٌ مُّسۡتَقِرٌّ سے مراد دنیوی عذاب ہے جو اخروی عذاب سے متصل ہے کہ اس عذاب کے آنے کے بعد عذاب کا سلسلہ جاری رہے گا۔

۲۔ یہ ہے اللہ کا عذاب اور تنبیہوں کی تکذیب کا ذائقہ۔

وَلَقَدۡ يَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّكۡرِ فَهَلۡ مِنۡ مُّدَّكِرٍ ﴿۴۰﴾ ع

۴۰۔ اور بتحقیق ہم نے اس قرآن کو نصیحت کے لیے آسان بنا دیا ہے، تو کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا؟

تفسیر آیات

ہم نے قوم لوط کی طرح تمہیں عذاب مستقر میں نہیں دیا۔ اس سے پہلے قرآن کی شکل میں ایک نصیحت تمہارے سامنے رکھ دی۔ کیا اس عذاب کے آنے سے پہلے اس سے نصیحت حاصل کرنے والا کوئی ہے؟

وَلَقَدۡ جَآءَ اٰلَ فِرۡعَوۡنَ النُّذُرُ ﴿۴۱﴾ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا فَاَخَذۡنٰهُمۡ اَخۡذَ عَزِيۡزٍ مُّقۡتَدِرٍ ﴿۴۲﴾

۴۱۔ اور بتحقیق قوم فرعون کے پاس بھی تنبیہ کرنے والے آئے۔

۴۲۔ انہوں نے ہماری تمام نشانیوں کی تکذیب کی تو ہم نے انہیں اس طرح گرفت میں لیا جس طرح ایک غالب آنے والا طاقتور گرفت میں لیتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ باقی انبیاء علیہم السلام کی قوم کا ذکر ہوتا ہے لیکن فرعون کا جب ذکر ہوتا تو اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَمَلَا۠ئِهٖ [1] فرعون اور اس کے درباری یا اٰلَ فِرۡعَوۡنَ فرمایا۔ یہ اس لیے کہ فرعون کی قوم دیگر قوموں کی طرح آزاد نہیں تھی بلکہ اس قوم پر فرعون کی گرفت بہت مضبوط تھی اور اس قوم کی اپنی جدا حیثیت نہ تھی۔ دیگر قوموں میں چند ایک لوگ انبیاء علیہم السلام پر ایمان لے آتے تھے لیکن قوم فرعون میں ایسا ممکن نہ تھا۔ کوئی ایمان لے آتا تو اسے ایمان چھپانا پڑتا تھا: يَكۡتُمُ اِيۡمَانَهٗۤ .... [2] یا اگر علی الاعلان ایمان لے آتا ہے تو اسے سولی پر چڑھا دیا جاتا ہے۔ جیسے جادوگروں کے ایمان کے بعد ہوا۔ یہاں آل سے مراد فرعون کے قریبی لوگ ہیں جو رشتے میں ہوں یا نظریے میں۔

۲۔ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا: آل فرعون نے ہماری تمام آیات کی تکذیب کی۔ كُلِّهَا سے اشارہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات دوسرے انبیاء علیہم السلام کی نسبت زیادہ تھے اور قرآن نے ان میں سے نو معجزوں کا ذکر کیا ہے۔

۳۔ فَاَخَذۡنٰهُمۡ: اللہ نے آل فرعون کو ایسے عذاب میں لیا جیسے ایک غالب آنے والی طاقت اور

[1] ۷ اعراف: ۱۰۳ [2] ۴۰ غافر: ۲۸

طاقتور گرفت میں لیتا ہے۔ جہاں بچنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

اَكُفَّارُكُمۡ خَيۡرٌ مِّنۡ اُولٰٓئِكُمۡ اَمۡ لَكُمۡ بَرَآءَةٌ فِى الزُّبُرِ ﴿۴۳﴾

۴۳۔ کیا تمہارے (زمانے کے) کفار ان لوگوں سے بہتر ہیں یا (الہامی) کتب میں تمہارے لیے معافی کا پروانہ لکھا ہوا ہے؟

تفسیر آیات

ا۔ اَكُفَّارُكُمۡ خَيۡرٌ: اے کفار عرب! اے کفار قریش! جرم تمہارا بھی وہی ہے پس تمہیں بھی اسی قسم کی سزا ملے گی کیونکہ نہ تم آل فرعون سے بہتر کردار کے حامل ہو، نہ تمہارا جرم ان کے جرائم سے کم ہے۔

۲۔ اَمۡ لَكُمۡ بَرَآءَةٌ فِى الزُّبُرِ: نہ ہی اللہ کی طرف سے نازل شدہ آسمانی کتابوں میں سے کسی کتاب میں تمہیں امان حاصل ہونے کا کوئی پروانہ موجود ہے کہ تمہارے جرم کی کوئی سزا نہیں ہے۔

اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ نَحۡنُ جَمِيۡعٌ مُّنۡتَصِرٌ ﴿۴۴﴾

۴۴۔ یا یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایک فاتح جماعت ہیں؟

سَيُهۡزَمُ الۡجَمۡعُ وَ يُوَلُّوۡنَ الدُّبُرَ ﴿۴۵﴾

۴۵۔ (نہیں) یہ جماعت عنقریب شکست کھائے گی اور پیٹھ پھیر کر بھاگے گی۔

تفسیر آیات

ا۔ کیا تم دعویٰ کر سکتے ہو کہ ایک فاتح، ناقابل شکست جماعت ہو۔ گزشتہ اقوام سے تم کوئی مختلف اور طاقتور قوم ہو۔ ظاہر ہے اس کا جواب نفی میں ہے بلکہ گزشتہ اقوام کے مقابلے میں تمہاری کوئی حیثیت نہیں ہے۔ جیسا کہ مروی ہے کہ حضرت فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا نے فرمایا:

تشربون الطرق و تقتاتون القد اذلۃ خاسئین...[1]

تم کیچڑ والے بدبودار پانی سے پیاس بجھاتے اور گھاس پھوس سے بھوک مٹاتے تھے۔

۲۔ سَيُهۡزَمُ الۡجَمۡعُ: تم فاتح نہیں، شکست خوردہ جماعت ہو۔ نہایت قابل توجہ یہ ہے کہ یہ پیشینگوئی مکی زندگی کے اس زمانے کی بات ہے جب مسلمان نہایت کم تعداد میں ہر قسم کا ظلم سہ رہے تھے۔ بظاہر ان مظالم سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

---

[1] الاحتجاج ا: ۱۰۰

۳۔ وَ یُوَلُّوۡنَ الدُّبُرَ: مکہ میں مٹھی بھر بے بس جماعت کی طرف سے یہ اعلان کہ تم پیٹھ پھیر کر بھاگنے والے ہو، بظاہر مضحکہ لگتا تھا۔ چنانچہ جنگ بدر میں قریش نے ذلت آمیز شکست کھائی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی آیت کی تلاوت فرمائی۔

بَلِ السَّاعَۃُ مَوۡعِدُہُمۡ وَ السَّاعَۃُ اَدۡہٰی وَ اَمَرُّ ﴿۴۶﴾

۴۶۔ ان کے وعدے کا وقت قیامت ہے اور قیامت تو زیادہ ہولناک اور زیادہ تلخ ہے۔

تفسیر آیات

ان مشرکین کو دنیا میں جو ہر طرح کی پستی اور ذلت خواری اٹھانا پڑے گی وہ اس ذلت و رسوائی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں جو انہیں قیامت کے دن اٹھانا پڑے گی۔

اَدۡہٰی: دھو یا دھا سے جو مصیبت اور بڑے حادثے کے معنوں میں آتا ہے۔

وقف لازم

اِنَّ الۡمُجۡرِمِیۡنَ فِیۡ ضَلٰلٍ وَّ سُعُرٍ ﴿۴۷﴾

۴۷۔ مجرم لوگ یقیناً گمراہی اور عذاب میں ہیں۔

یَوۡمَ یُسۡحَبُوۡنَ فِی النَّارِ عَلٰی وُجُوۡہِہِمۡ ؕ ذُوۡقُوۡا مَسَّ سَقَرَ ﴿۴۸﴾

۴۸۔ جس دن وہ منہ کے بل آگ میں گھسیٹے جائیں گے (ان سے کہا جائے گا) چکھو آگ کا ذائقہ۔

تفسیر آیات

۱۔ مجرمین کو قیامت کے دن نجات کا کوئی راستہ نہیں ملے گا اور جہنم ہی ان کا راستہ ہوگا۔

۲۔ یَوۡمَ یُسۡحَبُوۡنَ فِی النَّارِ: یہ منظر نہایت رسوا کن ہوگا جب ان کافروں کو منہ کے بل جہنم کی طرف گھسیٹ کر لے جا رہے ہوں گے اور نہایت اہانت کے لہجے میں یہ آواز آ رہی ہوگی: چکھو آگ کا ذائقہ۔ یہ اس تمسخر کا عملی جواب ہے جو دنیا میں یہ مسلمانوں کے ساتھ کرتے تھے۔

اِنَّا کُلَّ شَیۡءٍ خَلَقۡنٰہُ بِقَدَرٍ ﴿۴۹﴾

۴۹۔ ہم نے ہر چیز کو ایک اندازے کے مطابق پیدا کیا ہے۔

تفسیر آیات

جزا و سزا کا قانون اندھا دھند نہیں ہے، ایک تقدیر، ایک نظام کے تحت ہے۔ چنانچہ تقدیر اور قدر سے مراد قانون اور نظام ہے۔ ہر شے کی تخلیق اسی نظام اور قانون کے تحت ہے۔ ہر شے کو اسی نظام اور

قانون کے دائرے میں وجود میں آنا، نشو و نما پانا اور پھلنا پھولنا ہے۔ اس نظام اور اس قانون میں علل و اسباب کو بڑا دخل ہے۔ بغیر علت و سبب کے نہ تو کوئی چیز از خود وجود میں آتی ہے، نہ ہی اس میں تبدیلی آ سکتی ہے۔ انسان کو بھی اللہ کی اس وضع کردہ تقدیر یعنی نظام کے تحت چل کر اس میں اپنی تقدیر خود اپنے ہاتھوں سے رقم کرنا ہے۔ لہٰذا تقدیر کا مطلب جبر نہیں بلکہ نظم ہے اور اس نظم میں انسان کو اپنی قسمت خود بنانی ہے۔ یعنی خودمختاری کے ساتھ۔ لہٰذا انسان اپنی دنیوی زندگی میں اپنے لیے جس تقدیر کو رقم کرے گا قانون تقدیر کے مطابق کل قیامت کے دن اسی کا سامنا کرنا ہوگا۔

وَمَاۤ اَمۡرُنَاۤ اِلَّا وَاحِدَۃٌ کَلَمۡحٍۭ بِالۡبَصَرِ ﴿۵۰﴾

۵۰۔ اور ہمارا حکم بس ایک ہی ہوتا ہے پلک جھپکنے کی طرح۔

تفسیر آیات

۱۔ فرمایا: ہم جب کسی چیز کا ارادہ کر لیتے ہیں تو اس کے متعلق ایک امر صادر کرنا ہوتا ہے۔ نہ متعدد اوامر کی ضرورت ہے، نہ وسائل کی ضرورت ہے اور نہ اسباب درکار ہیں۔ وہ امر کلمہ کُن ہے۔ یعنی الا کلمۃ واحدۃ۔ یہاں امر سے مراد امر تکوینی ہے جیسے:

اِنَّمَاۤ اَمۡرُہٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیۡئًا اَنۡ یَّقُوۡلَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ۝ [1]

جب وہ کسی چیز کا ارادہ کر لیتا ہے تو بس اس کا امر یہ ہوتا ہے کہ اسے یہ کہے: ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے۔

۲۔ کَلَمۡحٍۭ بِالۡبَصَرِ: پلک جھپکنا۔ ایک تعبیر ہے اس بات کی وضاحت کے لیے کہ ارادۂ الٰہی اور امر تکوینی، زمانی نہیں ہوتا یعنی امر خدا کے لیے زمانہ درکار نہیں ہوتا۔ اِدھر ارادہ کر لیا، اُدھر جس کا ارادہ کیا گیا ہے وہ وجود میں اسی طرح آ گیا جس طرح ارادہ کیا گیا ہے۔

روزنامہ جنگ راولپنڈی مورخہ ۱۸ مارچ ۲۰۱۴ء میں یہ خبر چھپی ہے: امریکہ کے ماہر طبیعیات ایلن گتھ کا کہنا ہے کہ کائنات کے ۱۴ ارب سال قبل عظیم دھماکے کے نتیجے میں ایک سیکنڈ کے دس کھرب ویں حصے میں وجود میں آنے کے بارے میں سائنسدانوں میں بحث چھوٹ پڑی ہے۔

وَمَاۤ اَمۡرُ السَّاعَۃِ اِلَّا کَلَمۡحِ الۡبَصَرِ [2]　اور قیامت کا معاملہ تو ایسا ہے جیسے آنکھ کا جھپکنا۔

وَلَقَدۡ اَہۡلَکۡنَاۤ اَشۡیَاعَکُمۡ فَہَلۡ مِنۡ مُّدَّکِرٍ ﴿۵۱﴾

۵۱۔ اور تحقیق ہم نے تم جیسے بہتیروں کو ہلاک کیا ہے، تو کیا کوئی نصیحت لینے والا ہے؟

تفسیر آیات

اے کفار! تمہاری ہلاکت اور نابودی صرف ایک دھمکی نہیں، ہم نے تم جیسے بہت سے سرکشوں کو نابود

---

[1] ۳۶ یس: ۸۲　[2] ۱۶ نحل: ۷۷

کیا ہے۔ گزشتہ اقوام کی تاریخ کے صفحات پر ان کی ہلاکت اور تباہی کی داستانیں ثبت ہیں۔
فَهَلۡ مِنۡ مُّدَّكِرٍ : کوئی ہے ان عبرتناک داستانوں سے نصیحت حاصل کرنے والا؟

وَكُلُّ شَىۡءٍ فَعَلُوۡهُ فِى الزُّبُرِ ﴿۵۲﴾ — ۵۲۔ اور جو کچھ انہوں نے کیا ہے سب نامہ اعمال میں درج ہے۔

وَكُلُّ صَغِيۡرٍ وَّكَبِيۡرٍ مُّسۡتَطَرٌ ﴿۵۳﴾ — ۵۳۔ اور ہر چھوٹی اور بڑی بات (اس میں) لکھی ہوئی ہے۔

تفسیر آیات

قیامت کے دن ان مشرکین کے مواخذے میں دشواری پیش نہیں آئے گی چونکہ ان کے نامہ اعمال میں ان کی ہر حرکت اور ہر جنبش ثبت ہے۔ کل قیامت کے دن یہ لوگ جب اپنے نامۂ اعمال کا مشاہدہ کریں گے تو کہہ اٹھیں گے:

مَالِ هٰذَا الۡكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيۡرَةً وَّلَا كَبِيۡرَةً اِلَّاۤ اَحۡصٰهَا ....[1] — یہ کیسا نامۂ اعمال ہے؟ اس نے کسی چھوٹی اور بڑی بات کو نہیں چھوڑا (بلکہ) سب کو درج کر لیا ہے۔

اِنَّ الۡمُتَّقِيۡنَ فِىۡ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ ﴿۵۴﴾ — ۵۴۔ اہل تقویٰ یقیناً جنتوں اور نہروں میں ہوں گے۔

فِىۡ مَقۡعَدِ صِدۡقٍ عِنۡدَ مَلِيۡكٍ مُّقۡتَدِرٍ ﴿۵۵﴾ ع — ۵۵۔ سچی عزت کے مقام پر صاحب اقتدار بادشاہ کی بارگاہ میں۔

تفسیر آیات

۱۔ اہل تقویٰ کے لیے جنت میں مختلف نہریں ہوں گی۔ سورہ محمد میں ان نہروں کا ذکر آیا ہے:

مَثَلُ الۡجَنَّةِ الَّتِىۡ وُعِدَ الۡمُتَّقُوۡنَ ؕ فِيۡهَاۤ اَنۡهٰرٌ مِّنۡ مَّآءٍ غَيۡرِ اٰسِنٍ ۚ وَاَنۡهٰرٌ مِّنۡ لَّبَنٍ لَّمۡ يَتَغَيَّرۡ طَعۡمُهٗ ۚ وَاَنۡهٰرٌ مِّنۡ خَمۡرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيۡنَ ۚ وَاَنۡهٰرٌ مِّنۡ عَسَلٍ مُّصَفًّى ....[2] — جس جنت کا پرہیزگاروں سے وعدہ کیا گیا ہے اس کی مثال یوں ہے کہ اس میں ایسے پانی کی نہریں ہیں جو (کبھی) بدبودار نہ ہو گا اور ایسے دودھ کی نہریں ہیں جس کا ذائقہ نہیں بدلے گا اور ایسی شراب کی نہریں ہیں جو پینے والوں کے لیے لذت بخش ہو گی اور خالص شہد کی نہریں (بھی) ہیں۔

---

[1] ۱۸ کہف: ۴۹ [2] ۴۷ محمد: ۱۵

۲۔ فِیۡ مَقۡعَدِ صِدۡقٍ: مقام ایسا ہوگا جس میں کسی قسم کے غیر حقیقی ہونے کا شائبہ نہ ہوگا۔ یعنی اہل تقویٰ جنت میں جس مقام پر فائز ہوں گے، جو عزت و اکرام انہیں حاصل ہوگا، وہ سچا ہوگا۔ دھوکہ نہیں ہوگا، زائل ہونے والا وقتی نہ ہوگا، دائمی ہوگا، عارضی نہ ہوگا اور سچا مقام ہوگا۔ جب کہ دنیا میں جو مقام حاصل ہوتا ہے وہ عارضی، واہمے سے زیادہ نہیں ہوتا۔

۳۔ عِنۡدَ مَلِیۡکٍ مُّقۡتَدِرٍ: معنوی اور روحانی اعتبار سے اس کے جوار میں ہوگا جو صاحب اقتدار بادشاہ ہے۔ اس ذات کی قربت میں عِنۡدَ مَلِیۡکٍ ہونا تمام نعمتوں سے بالاتر نعمت ہے۔ یہ نعمت ناقابل وصف و بیان ہے۔ چنانچہ فرمایا:

وَ رِضۡوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکۡبَرُ ...[1]	اور اللہ کی طرف سے خوشنودی تو ان سب سے بڑھ کر ہے.

اللہ کی خوشنودی ناقابل وصف و بیان ہے اور اس خوشنودی کے نتیجے میں ملنے والی قربت بھی ناقابل وصف و بیان نعمت ہوگی۔

حضرت امام صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

مدح المکان بالصدق فلا یقعد فیہ الا اھل الصدق۔[2]	اللہ نے اس مکان کو سچائی کے ساتھ متصف کیا ہے، پس اس میں صرف اہل صدق ہی رہ سکیں گے۔

اسئل اللّٰہ سبحانہ ان یرزقنا قربہ و ان یجعلنا من الذین یسکنون فِیۡ مَقۡعَدِ صِدۡقٍ عِنۡدَ مَلِیۡکٍ مُّقۡتَدِرٍ۔

[1] ۹ توبۃ: ۷۲
[2] معالم التنزیل فی تفسیر القرآن ۴: ۳۳۰

سُوْرَةُ الرَّحْمٰن

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اس سورۃ مبارکہ کا نام اَلرَّحْمٰن ہے جو ابتدائی آیت سے ماخوذ ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ یہ سورۃ مکی ہے یا مدنی۔ بیشتر ترجیح مکی ہونے کو دی جاتی ہے۔

یہ دوسری سورۃ ہے اور اس سے پہلے سورہ انعام میں بھی جن و انس کو یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ کہہ کر خطاب کیا گیا ہے۔

جابر بن عبد اللّٰہ انصاری راوی ہیں:

لوگوں کے سامنے جب رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وآلہ نے سورۃ الرحمٰن تلاوت فرمائی تو لوگ خاموش سنتے رہے، جس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ نے فرمایا: جنوں نے تم سے بہتر جواب دیا ہے جب یہ آیت پڑھی گئی: فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے تو جنات نے جواب دیا: لا و لا بشیء من آلائك ربنا نكذب۔ ہم اپنے رب کی کسی نعمت کو نہیں جھٹلاتے۔[1]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

جو سورۃ الرحمٰن کی تلاوت کرے وہ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ کے بعد یہ جملہ کہا کرے:

لَا بِشَیْءٍ مِنْ آلَائِكَ رَبِّ اُكَذِّبُ۔[2] میرے مالک! میں تیری کسی نعمت کو نہیں جھٹلاتا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	بنام خدائے رحمٰن رحیم
اَلرَّحۡمٰنُ ۙ﴿۱﴾	۱۔ رحمٰن نے،
عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ ؕ﴿۲﴾	۲۔ قرآن سکھایا۔

[1] بحار ۱۸: ۷۸ [2] الکافی ۳: ۴۲۹

خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ ۙ﴿۳﴾　　۳۔ اسی نے انسان کو پیدا کیا۔

عَلَّمَہُ الۡبَیَانَ ﴿۴﴾　　۴۔ اسی نے انسان کو بولنا سکھایا۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلرَّحۡمٰنُ: اس جگہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنی میں سے اَلرَّحۡمٰنُ کا ذکر بتاتا ہے کہ آگے اللہ کی رحمانیت کے تقاضوں کا ذکر ہے۔ سب رحمتوں کا ذکر نہ ہوگا، جن رحمتوں کا ذکر ہوگا وہ سب سے بڑی رحمتیں ہوں گی۔

۲۔ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ: سب سے بڑی رحمت قرآن کی تعلیم ہے۔ قرآن کی تعلیم نعمت تخلیق سے بھی زیادہ عظیم نعمت ہے کیونکہ قرآن انسان کی غرض تخلیق پوری کرتا ہے۔ اگر قرآن جیسی کتاب ہدایت نہ ہوتی تو تخلیق عبث ہو جاتی۔ اسی لیے تخلیق کی نعمت سے پہلے قرآنی رحمت کا ذکر فرمایا ورنہ ترتیب تو یہ بنتی تھی کہ پہلے انسان کی پیدائش کا ذکر ہوتا بعد میں تعلیم کا۔ البتہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ قرآنی تعلیم کا انتظام انسان کی تخلیق سے پہلے کیا گیا تھا۔ جیسا کہ فرمایا:

اِنَّہٗ لَقُرۡاٰنٌ کَرِیۡمٌ ﴿ۙ﴾ فِیۡ کِتٰبٍ مَّکۡنُوۡنٍ ﴿ۙ﴾[۱]　　یہ قرآن یقیناً بڑی تکریم والا ہے جو ایک محفوظ کتاب میں ہے۔

۳۔ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ: دوسری نعمت انسان کو وجود دینا ہے۔ وہ انسان جو اس کائنات میں اللہ کا معجزہ ہے۔ انسان کی تخلیق میں اللہ کی رحمتوں کی تجلیاں ہیں جو وصف و بیان سے بھی بالاتر ہیں۔

۴۔ عَلَّمَہُ الۡبَیَانَ: انسان کو بولنا سکھایا۔ اگر مافی ضمیر کے اظہار کے لیے بیان یعنی الفاظ و آواز کی نعمت نہ ہوتی تو افہام و تفہیم کے لیے خود معانی کو مخاطب کے سامنے پیش کرنا پڑتا۔ مثلاً اگر پانی بتانا مقصود ہو تو ہم لفظ پانی کے ذریعے معنی آسانی سے پیش کرتے ہیں ورنہ خود پانی سامنے رکھ کر سمجھانا پڑتا جو یا تو ناممکن ہوتا یا مشکل۔

اَلشَّمۡسُ وَ الۡقَمَرُ بِحُسۡبَانٍ ۪﴿۵﴾　　۵۔ سورج اور چاند (مقررہ) حساب کے تحت ہیں۔

تفسیر آیات

سورج اور قمر دونوں ایک کائناتی حساب اور نظام کے تحت ہیں۔ اگر اس حساب سے مختلف ہوتے تو یہ دونوں اہل ارض کے لیے نعمت کا سرچشمہ نہ ہوتے۔ سورج اگر موجودہ حساب سے ہٹ کر زمین کے زیادہ

---

[۱] ۵۶ واقعۃ: ۷۷۔ ۷۸

قریب ہوتا تو کرۂ ارض کی ہر چیز جل کر بھسم ہو جاتی اور اگر موجودہ حساب سے زیادہ دور ہوتا تو زمین پر موت کا جمود طاری ہو جاتا۔ اس وقت سورج کی حرارت کا دو لاکھ واں حصہ زمین تک پہنچتا ہے جو زمین کے لیے مناسب ہے۔

اسی طرح چاند کا حجم، موجودہ حجم سے بڑا ہوتا تو چاند کی کشش کی وجہ سے سمندر کی ’’مد‘‘ سے روئے زمین غرق آب ہو جاتی اور فضائے وسیع میں سورج اور چاند کی گردش میں اربوں سال سے بال برابر بھی فرق نہیں آ رہا۔ سچ فرمایا خالق نے: اَلشَّمۡسُ وَ الۡقَمَرُ بِحُسۡبَانٍ سورج اور چاند ایک حساب کے تحت چل رہے ہیں۔

وَّ النَّجۡمُ وَ الشَّجَرُ یَسۡجُدٰنِ ۞ ۶۔ اور ستارے اور درخت سجدہ کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

اَلنَّجۡمُ: ستارے کو کہتے ہیں۔ لفظ سے یہی معنی ذہن میں آتا ہے۔ اگرچہ لغت میں اَلنَّجۡمُ بغیر تنے والے بیل بوٹوں کے لیے بھی بولا جاتا ہے اور بعض قابل توجہ مفسرین نے یہی معنی اختیار کیا ہے۔ وہ اس کے لیے الشَّجَرُ کا ذکر قرینہ گردانتے ہیں تاہم اس لفظ سے ستارے مراد لینا زیادہ مناسب ہے۔ اول تو اَلنَّجۡمُ سے ستارے کی طرف ذہن جاتا ہے۔ ثانیاً اَلشَّمۡسُ وَ الۡقَمَرُ کے ساتھ اَلنَّجۡمُ کا ذکر آیا ہے تو ستارہ مراد لینا زیادہ مناسب ہے۔ ثالثاً قرآن میں دوسری جگہ اَلنُّجُوۡمُ کا لفظ الشَّجَرُ کے ساتھ مذکور ہے وہاں اَلنُّجُوۡمُ سے ستارے ہی مراد لیے جا سکتے ہیں:

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَسۡجُدُ لَہٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ وَ الشَّمۡسُ وَ الۡقَمَرُ وَ النُّجُوۡمُ وَ الۡجِبَالُ وَ الشَّجَرُ وَ الدَّوَآبُّ وَ کَثِیۡرٌ مِّنَ النَّاسِ ....[1]	کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے نیز سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت، جانور اور بہت سے انسان اللہ کے لیے سجدہ کرتے ہیں۔

اس آیت میں بھی اَلنُّجُوۡمُ کا ذکر اَلشَّمۡسُ وَ الۡقَمَرُ کے ساتھ ہے یہاں اَلنُّجُوۡمُ سے مراد یقیناً ستارے ہیں۔

بتانا یہ مقصود ہو سکتا ہے کہ آسمانوں میں عظیم ستاروں سے لے کر زمین میں موجود چھوٹے سے درخت تک سب خدائے عظیم کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ یَسۡجُدٰ فعل مستقبل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے یہ سجدے قصد و ارادے سے وقتاً فوقتاً بار بار وجود میں آتے رہتے ہیں۔

---

[1] ۲۲ حج: ۱۸

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ﴿٧﴾	۷۔ اور اسی نے اس آسمان کو بلند کیا اور ترازو قائم کی۔
أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ ﴿٨﴾	۸۔ تاکہ تم ترازو (کے ساتھ تولنے) میں تجاوز نہ کرو۔
وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ ﴿٩﴾	۹۔ اور انصاف کے ساتھ وزن کو درست رکھو اور تول میں کمی نہ کرو۔

تفسیر آیات

۱۔ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا: آسمان کو بلند اور میزان قائم کرنے میں ایک ربط اس طرح ہو سکتا ہے کہ اللہ نے اس بلند و بالا آسمان میں توازن قائم رکھا ہے۔ اسی توازن پر آسمان یعنی اجرام سماوی قائم ہیں۔ چنانچہ حدیث نبوی ہے:

بالعدل قامت السمٰوات و الارض۔[1] آسمان و زمین عدل سے قائم ہیں۔

دوسری تفسیر یہ ہو سکتی ہے: جہاں اللہ نے آسمان کو بلند کیا ہے وہاں حق و باطل میں تمیز کرنے والی قوت عقل کو ترازو بنایا یا یہ ہو سکتا ہے: جہاں اللہ نے آسمان کو بلند کیا ہے وہاں اپنے انبیاء علیہم السلام کے ذریعے شریعت و احکام کا میزان قائم کر کے حق و باطل، صدق و کذب اور عدل و ظلم میں تمیز قائم کی۔ جیسے فرمایا:

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ...[2]	تحقیق ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا ہے اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کیا ہے تاکہ لوگ عدل قائم کریں۔

بہرحال پوری کائنات اعتدال و توازن پر قائم ہے۔ اس اعتدال میں بال برابر بھی انحراف آ جائے تو یہ اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتی۔ یہ ہے تکوینی میزان۔ اس کے ساتھ ایک تشریعی میزان بھی ہے۔ انسان کو چاہیے کہ اس میزان سے انحراف نہ کرے ورنہ عدل اجتماعی اور انصاف ناپید ہو جائے گا۔ اس میزان کے مصادیق میں وہ ترازو بھی شامل ہے جس سے اوزان معلوم کیے جاتے ہیں۔

۲۔ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ: میزان، وضع اس لیے کیا کہ تم اس میزان و معیار سے تجاوز نہ کرو اور اپنے معاملات میں ترازو کے ساتھ تولنے میں تجاوز نہ کرو۔

---

[1] عوالی اللآلی ۴: ۱۰۲ [2] ۵۷ حدید: ۲۵

۳۔ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ: لہٰذا جب تمہارے سامنے میزان آ گیا تو اپنے معاملات میں اوزان اور تول میں کمی نہ کرو۔ انسانی زندگی کا دار و مدار اجتماعی زندگی پر ہے، اجتماعی زندگی باہمی معاملات پر قائم ہے اور باہمی معاملات انصاف کے ساتھ ناپ تول پر موقوف ہیں۔

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ۝۱۰ ۱۰۔ اور اسی نے مخلوقات کے لیے اس زمین کو بنایا ہے۔

فِيْهَا فَاكِهَةٌ ۙ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ ۝۱۱ ۱۱۔ اس میں میوے اور خوشے والے کھجور کے درخت ہیں۔

وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ ۝۱۲ ۱۲۔ اور بھوسے والا اناج خوشبو والے پھول ہیں۔

تشریح کلمات

الْاَكْمَامِ: (ك م م) الکِمّ خوشوں کے غلاف کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع اکمام ہے۔

الْعَصْفِ: (ع ص ف) العصف۔ کھیتی کے جو پتے کاٹ لیے جاتے ہیں نیز خشک نباتات جو ٹوٹ کر چور ہو جائے۔

تفسیر آیات

۱۔ زمین اور زمین میں موجود تمام نعمتیں جن کا ذکر ان آیات میں آیا ہے انسان کے لیے ہیں اور پھلوں اور دانوں کی سینکڑوں قسمیں فراہم فرما کر یہ ظاہر فرمایا: اللہ کا مقصد صرف انسان کو زندہ رکھنا نہیں ہے، اس کے لیے تو صرف ایک قسم کا غلہ کافی تھا بلکہ انسان کو نعمتوں سے مالا مال کرنا بھی مقصود ہے۔

ان نعمتوں کا تعلق انسان کے علاوہ جنات سے بھی ہونا چاہیے چونکہ آگے خطاب دونوں سے ہے:

فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝۱۳ ۱۳۔ پس (اے جن و انس!) تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر آیات

ان نعمتوں میں سے کسی ایک نعمت کو بھی تم نہیں جھٹلا سکتے۔

اس آیت میں خطاب جن و انس سے ہے۔ اس پر اگلی آیات شاہد ہیں۔ جیسے خَلَقَ الْاِنْسَانَ،

وَ خَلَقَ الۡجَآنَّ اور سَنَفۡرُغُ لَکُمۡ اَیُّہَ الثَّقَلٰنِ۔

اَلْآءِ: جمع ہے اِلۡیٌ کی۔ اس کے اصل معنی نعمت کے ہیں۔ دوسرے معانی میں اگر استعمال ہوا ہے تو بالعنایہ یعنی کسی مناسبت سے استعمال ہوا ہے۔ جیسے خوبیوں، کمالات وغیرہ میں استعمال ہوتا ہے تو اصل معنی، ''نعمت'' ملحوظ رہتا ہے کہ خوبیاں اور کمالات بھی نعمت ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ ایک لفظ مختلف اسلوب اور ترکیبوں میں استعمال ہوتا ہے تو ممکن ہے مختلف معانی کا فائدہ دے لیکن اگر ایک لفظ کو ایک ہی ترکیب اور ایک ہی اسلوب میں مکرر استعمال کیا گیا ہو تو صرف تکرار کی بنا پر معانی مختلف نہیں ہو سکتے جیسے وَ لَقَدۡ یَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّکۡرِ فَہَلۡ مِنۡ مُّدَّکِرٍ ۔ میں لِلذِّکۡرِ، مُّدَّکِرٍ اور یَسَّرۡنَا کے معانی صرف تکرار کی بنا پر مختلف نہیں ہو سکتے۔ جیسا کہ بعض اہل قلم نے اٰلَآءِ کے ہر دفعہ مختلف معنی نکالنے کی کوشش کی ہے۔

تکذیب نعمت کی متعدد صورتیں ہو سکتی ہیں:

i۔ بعض لوگ ان نعمتوں کو سرے سے اللہ کی طرف سے نہیں سمجھتے بلکہ اپنی مہارت اور محنت و ہوشیاری کا مرہون منت سمجھتے ہیں۔

ii۔ بعض لوگ ان نعمتوں کو اللہ کی جگہ غیر اللہ کی عنایت سمجھتے ہیں۔ جیسے مشرکین جو غیر اللہ کو رازق سمجھتے تھے۔

iii۔ بعض لوگ اگرچہ ان نعمتوں کو اللہ کی طرف سے سمجھتے ہیں لیکن مقام شکر میں ان کا رویہ منکروں سے مختلف نہیں ہے اور ان کے عمل اور کردار سے اس بات کا اظہار نہیں ہوتا کہ یہ نعمتیں اللہ کی طرف سے ہیں۔

یہ سب لوگ تکذیب نعمت کرنے والوں کے زمرے میں آتے ہیں۔

خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ صَلۡصَالٍ کَالۡفَخَّارِ ﴿۱۴﴾	۱۴۔ اس نے انسان کو ٹھیکری کی طرح کے خشک گارے سے بنایا۔
وَ خَلَقَ الۡجَآنَّ مِنۡ مَّارِجٍ مِّنۡ نَّارٍ ﴿۱۵﴾	۱۵۔ اور جنات کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا۔

تشریح کلمات

صَلۡصَالٍ: (ص ل ل) صلصال کے معنی کسی خشک چیز سے آنا کے ہیں۔ خشک مٹی کو بھی صلصال کہتے ہیں۔

فخار: (ف خ ر) الفخار مٹکوں کو کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ٹھوکا لگانے سے اس طرح زور سے بولتے ہیں جیسے کوئی بہت زیادہ فخر کر رہا ہو۔

مَّارِجٍ: (م ر ج) آگ کا شعلہ یا مخلوط آتش۔

تفسیر آیات

۱۔ یہ انسان کی ابتدائی تخلیق کا ذکر ہے کہ ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے خاکی عناصر سے خلق فرمایا۔ چنانچہ انسان کے جسم میں موجود تمام عناصر خاکی ہیں۔ قرآن مجید میں انسان کو خاک سے پیدا کرنے کا متعدد مقامات پر جب ذکر ہوتا ہے تو تخلیق کے مختلف مراحل و مراتب کی طرف اشارہ بھی ہوتا ہے۔ مثلاً مِنۡ تُرَابٍ،[1] مِّنۡ طِیۡنٍ،[2] مِّنۡ طِیۡنٍ لَّازِبٍ،[3] مِنۡ صَلۡصَالٍ مِّنۡ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ۔[4] پھر فرمایا: وَنَفَخۡتُ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ۔[5] پھر فرمایا: ثُمَّ جَعَلَ نَسۡلَہٗ مِنۡ سُلٰلَۃٍ مِّنۡ مَّآءٍ مَّہِیۡنٍ۔[6]

۲۔ وَخَلَقَ الۡجَآنَّ: جنات کو اللہ تعالیٰ نے شعلہ آتش سے خلق فرمایا اس لیے جنات نظر نہیں آتے۔ جس طرح انسان مٹی سے پیدا ہوا ہے مگر اس چلتے پھرتے انسان اور مٹی میں بہت فرق ہے۔ اس طرح جنات آتش سے پیدا ہوئے ہیں لیکن وہ بالکل اس آتش کی طرح نہیں ہیں جو ہم جلاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں انسان باشعور مادہ ہے اور جنات باشعور انرجی۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۱۶﴾ ۱۶۔ پس تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر آیات

نعمت وجود، ملنے کے بعد ملنے والی کس نعمت کو جھٹلاؤ گے کہ اس کائنات میں تمہیں بہترین پیرائے میں خلق کیا ہے۔

رَبُّ الۡمَشۡرِقَیۡنِ وَرَبُّ الۡمَغۡرِبَیۡنِ ﴿۱۷﴾ ۱۷۔ وہ دونوں مشرقوں اور دونوں مغربوں کا پروردگار ہے۔

تفسیر آیات

ایک رائے یہ ہے کہ دو مشرق اور دو مغرب سے مراد سورج اور چاند کے مشرق و مغرب ہیں چونکہ

[1] ۳ آل عمران: ۵۹ [2] ۶ انعام: ۲ [3] ۳۷ صافات ۱۱ [4] ۱۵ حجر: ۲۶ [5] ۱۵ حجر: ۲۹
[6] ۳۲ سجدہ: ۸ (ترجمہ) پھر اس کی نسل کو حقیر پانی کے نچوڑ سے پیدا کیا۔

اس سے پہلے شمس و قمر کا ذکر آیا ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ دو مشرق اور دو مغرب سے مراد دو مختلف موسموں کے مشرق و مغرب ہیں کہ جاڑے کے چھوٹے دنوں کا مغرب گرمی کے بڑے دنوں کے مغرب سے مختلف ہوتا ہے۔ یہی نظریہ روایت میں بھی آیا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

فان مشرق الشتاء علی حدۃ و مشرق الصیف علی حدۃ اما تعرف ذلك من قرب الشمس و بعدها...[1]

جاڑوں کا مشرق جدا اور گرمیوں کا مشرق جدا ہے۔ کیا تو اس بات کو سورج کے قریب اور دور ہونے سے نہیں پہچانتا؟

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۱۸﴾

۱۸۔ پس تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر آیات

اس شروق و غروب کے ذریعے فراہم کردہ نعمتوں میں سے کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ اگر یہ شروق و غروب نہ ہوتے تو تم سے نعمت وجود تک چھن جاتی۔

مَرَجَ الۡبَحۡرَیۡنِ یَلۡتَقِیٰنِ ﴿۱۹﴾

۱۹۔ اسی نے دو سمندروں کو جاری کیا کہ آپس میں مل جائیں،

بَیۡنَہُمَا بَرۡزَخٌ لَّا یَبۡغِیٰنِ ﴿۲۰﴾

۲۰۔ تاہم ان دونوں کے درمیان ایک آڑ ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے۔

تفسیر آیات

مَرَجَ الۡبَحۡرَیۡنِ: مَرَجَ روانہ کیا۔ دو سمندروں کو جاری کیا۔ سورہ فرقان آیت ۵۳ میں فرمایا کہ ان دو سمندروں سے مراد میٹھا اور کھارا پانی ہے:

وَ ہُوَ الَّذِیۡ مَرَجَ الۡبَحۡرَیۡنِ ہٰذَا عَذۡبٌ فُرَاتٌ وَّ ہٰذَا مِلۡحٌ اُجَاجٌ ۚ وَ جَعَلَ بَیۡنَہُمَا بَرۡزَخًا وَّ حِجۡرًا مَّحۡجُوۡرًا ﴿﴾

اور اسی نے دو دریاؤں کو مخلوط کیا ہے، ایک شیریں مزیدار اور دوسرا کھارا کڑوا ہے اور اس نے دونوں کے درمیان ایک حد فاصل اور مضبوط رکاوٹ بنا دی ہے۔

---

[1] نور الثقلین ۵: ۱۹۰

ان دونوں پانیوں کو اللہ تعالیٰ نے جاری فرمایا ہے۔

۲۔ یَلۡتَقِیٰنِ: یہ دونوں پانی آپس میں مل جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ آپس میں ملنے والے دوسمندروں کا ذکر ہے۔

واضح رہے بحر، سمندر اور بڑے پیانے پر موجود پانی والے دریا کو بھی کہتے ہیں۔ کیا اس سے سمندر کا کھارا پانی اور زیر زمین موجود میٹھا پانی مراد ہے؟ جیسا کہ صاحب المیزان نے اختیار کیا ہے یا دریاؤں سے سمندر میں بہنے والا میٹھا پانی مراد ہے؟ تحقیق طلب امر ہے۔

بَیۡنَہُمَا بَرۡزَخٌ لَّا یَبۡغِیٰنِ: ان دو پانیوں کے آپس ملنے کے باوجود ان کے درمیان ایک آڑ ہے۔ دونوں پانی اس آڑ کو پھلانگتے نہیں ہیں۔ سمندر کا پانی، زیر زمین پانی سے مخلوط ہو جاتا تو روئے زمین پر زندگی باقی نہ رہتی۔ اس سے لَّا یَبۡغِیٰنِ کی حکمت و مصلحت معلوم ہو جاتی ہے لیکن اگر دریاؤں اور سمندر کا پانی مراد لیا جائے تو بھی درست ہے۔ دونوں پانی ایک حد تک آپس میں نہیں ملتے لیکن اس میں کیا حکمت و مصلحت اور نعمتیں ہیں کہ جن و انس سے پوچھا جائے کہ تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ ممکن ہے تحقیق سے ان نعمتوں کا علم ہو جائے۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۲۱﴾ ۲۱۔ پس تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر آیات

زندگی میں تم شیرین اور نمکین پانی کے اثرات کو کیسے جھٹلاؤ گے؟

یَخۡرُجُ مِنۡہُمَا اللُّؤۡلُؤُ وَ الۡمَرۡجَانُ ﴿۲۲﴾ ۲۲۔ان دونوں سمندروں سے موتی اور مونگا نکلتے ہیں.

تفسیر آیات

ان دونوں پانیوں سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں۔ یہاں یہ سوال ہو گا کہ میٹھے پانی سے موتی اور مونگا نہیں نکلتے؟ خصوصاً زیر زمین پانی سے۔

بعض کہتے ہیں موتی اور مونگے صرف اسی جگہ پیدا ہوتے ہیں جہاں میٹھا اور کھارا پانی آپس میں ملتے ہیں۔ والعلم عند اللّٰہ۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۲۳﴾ ۲۳۔پس تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر آیات

تم پانی سے حاصل ہونے والی دولت پر مشتمل نعمتوں میں سے کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

ذیل میں ہم ان روایات کا ذکر کرتے ہیں جن میں ان دو آیات کی تطبیق محمد ﷺ علی، فاطمہ اور حسنین علیہم السلام پر کی گئی ہے:

i۔ ابن عباس سے روایت ہے:

مَرَجَ الۡبَحۡرَیۡنِ علی اور فاطمہ (علیہا السلام) ہیں۔ بَیۡنَہُمَا بَرۡزَخٌ حضرت محمد ﷺ ہیں۔ اللُّؤۡلُؤُ وَ الۡمَرۡجَانُ سے حسنین (علیہما السلام) مراد ہیں۔[1]

الدرالمنثور ذیل آیت اسی مضمون کی روایت حضرت ابن عباس کے علاوہ دیگر اجلہ اصحاب نے روایت کی ہے۔

ii۔ ابو سعید خدری۔ ملاحظہ ہو مناقب مغازلی صفحہ ۳۳۹۔ حدیث ۳۹۳

iii۔ انس بن مالک۔ ملاحظہ ہو مناقب علی تالیف: حافظ ابن مردویہ۔ الدر المنثور ۶: ۱۴۳۔ نور الابصار ص ۱۰۱۔

iv۔ ابوذر۔ ملاحظہ ہو البرہان ۵: ۳۳۴

v۔ عبد اللہ بن مسعود۔ ملاحظہ ہو تفسیر فرات ۱: ۴۶۱

وَ لَہُ الۡجَوَارِ الۡمُنۡشَـٰٔتُ فِی الۡبَحۡرِ کَالۡاَعۡلَامِ ﴿ۚ۲۴﴾ ۲۴۔ اور سمندر میں چلنے والے پہاڑوں کی طرح بلند جہاز اسی کے ہیں۔

تفسیر آیات

جہاز سازی و جہاز رانی جیسی انسان کی زمانہ قدیم کی ایجادات ہوں یا آج کل کی جدید ٹیکنالوجی اور کمپیوٹر کی دنیا، ان تخلیقی صلاحیتوں کے ماہر پر تو تعجب کیا جاتا ہے لیکن اس کے عظیم خالق کی صنعت پر تعجب و حیرانگی کا اظہار نہیں کیا جاتا جس نے انسان کو صلاحیت عطا کی کہ سمندر کی موجوں کو تسخیر کرتے ہوئے اپنی سواری کے لیے جہاز بنائے اور پانی کو اس طرح خلق کیا کہ اس کی پشت پر جہاز بآسانی اپنی منزل کی طرف گامزن ہو سکیں۔

---

[1] شواھد التنزیل ۲: ۲۸۹

ع ۲۵ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۲۵﴾
۲۵۔ پس تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر آیات

جہاز رانی اور سمندری سفر میں موجود فوائد، منافع پر مشتمل نعمتوں کو کیسے جھٹلاؤ گے۔

کُلُّ مَنۡ عَلَیۡہَا فَانٍ ﴿۲۶﴾
۲۶۔ روئے زمین پر موجود ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔

وَّ یَبۡقٰی وَجۡہُ رَبِّکَ ذُو الۡجَلٰلِ وَ الۡاِکۡرَامِ ﴿۲۷﴾
۲۷۔ اور صرف آپ کے صاحب عزت و جلال رب کی ذات باقی رہنے والی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ کُلُّ مَنۡ عَلَیۡہَا فَانٍ: اس روئے زمین کی تمام زندہ موجودات، خواہ ان کا تعلق انس سے ہو یا جن سے، سب کو راہ فنا اختیار کرنا ہے۔ یہاں سے کوچ کر کے دوسرے عالم کی طرف منتقل ہونا اور وہاں جا کر اپنے اعمال کا سامنا کرنا ہے۔

۲۔ وَّ یَبۡقٰی وَجۡہُ رَبِّکَ: سب فانی ہیں سوائے وجہ رب کے۔ وجہ یعنی ذات۔ چونکہ کسی ذات کی پہچان وجہ چہرے سے ہوتی ہے لہٰذا چہرہ کہہ کر ذات مراد لینا محاورہ ہے۔ چنانچہ مکہ کے مساکین کہا کرتے تھے: این وجہ عربی کریم ینقذنی من الھوان۔ کہاں ہے وہ عربی چہرہ جو مجھے ذلت سے بچائے۔ اسی سے وجہ النہار کہہ کر خود دن مراد لیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے وجہ کا استعمال جا بجا ہوا ہے:

یُرِیۡدُوۡنَ وَجۡہَ اللّٰہِ ... [۱] — جو اللہ کی رضا مندی چاہتے ہیں۔

ابۡتِغَآءَ وَجۡہِ رَبِّہِمۡ ... [۲] — اپنے رب کی خوشنودی کے خاطر صبر کرتے ہیں۔

کُلُّ شَیۡءٍ ہَالِکٌ اِلَّا وَجۡہَہٗ ... [۳] — ہر چیز فنا ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۲۸﴾
۲۸۔ پس تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

---

۱ ۳۰ روم: ۳۸ ۲ ۱۳ رعد: ۲۲ ۳ ۲۸ قصص: ۸۸

تفسیر آیات

اس دنیا کی صرف چند روز کی آسان تکلیف دے کر ابدی زندگی اور دائمی بقا کی طرف لے جانا ایسی نعمت ہے جس کی قدر تمہیں قیامت کے دن ہو گی۔

یَسۡـَٔلُہٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ کُلَّ یَوۡمٍ ہُوَ فِیۡ شَاۡنٍ ﴿ۚ۲۹﴾	۲۹۔ جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے (سب) اسی سے مانگتے ہیں، وہ ہر روز ایک (نئی) کرشمہ سازی میں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ یَسۡـَٔلُہٗ: کل کائنات نیاز مندی اور احتیاج سے عبارت اور مجسم سوال ہے۔ حتیٰ اپنے وجود و بقا میں بھی محتاج۔

آیت میں فرمایا: کل کائنات اللہ سے سوال کرتی ہے۔ کس چیز کا سوال کرتی ہے؟ اس کا ذکر نہیں ہے۔ اس سے سوال کی عمومیت واضح ہو جاتی ہے کہ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اللہ سے سوال کیے بغیر حاصل کی جائے۔ لہٰذا ممکنات اپنے وجود و بقا کے بارے میں تمام چیزوں کا بزبان حال سوال کرتے ہیں۔

۲۔ کُلَّ یَوۡمٍ ہُوَ فِیۡ شَاۡنٍ: وہ (اللہ) ہر وقت، ہر زمانے میں فِیۡ شَاۡنٍ ایجاد و ابداع میں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ہر عمل ایجاد ہے۔ لا تکرار فی الوجود۔ کُلَّ یَوۡمٍ میں یَوۡمٍ سے زمانہ مراد نہیں ہے۔ کُلَّ یَوۡمٍ تسلسل کے بیان کے لیے ہے۔ لا انقطاع فی الفیض۔ اللہ سے فیض ایک لمحے کے لیے بھی منقطع نہیں ہو سکتا۔ اس طرح اللہ کی طرف سے تخلیق و ایجاد کا عمل جاری ہے:

یَزِیۡدُ فِی الۡخَلۡقِ مَا یَشَآءُ ...[1]	وہ جیسے چاہتا ہے مخلوقات میں اضافہ فرماتا ہے۔

اور ہر حاجت مند کی حاجت روائی بھی جاری ہے۔ اسی لیے ہم نے شَاۡنٍ کا ترجمہ کرشمہ سازی سے کیا ہے۔ ہر وقت، ہر چیز اس کی بارگاہ سے انسان مانگ سکتا ہے۔ حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپ نے ایک خطبے میں فرمایا:

الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِی لَا یَمُوتُ وَلَا تَنْقَضِی عَجَائِبُہُ لِاَنَّہُ کُلَّ یَوْمٍ فِی شَاْنٍ مِنْ اِحْدَاثِ بَدِیعٍ لَمْ یَکُنْ...[2]	حمد ہے اس ذات کے لیے جسے فنا نہیں ہے اور اس کی ایجادات کے عجائب ختم ہونے والے نہیں ہیں۔ وہ ہر روز ایک کرشمہ سازی میں ہے یعنی جو موجود نہیں ہے اس کی نئی ایجاد میں۔

---

[1] ۳۵ فاطر: ۱

[2] الکافی ۱: ۱۴۱۔ باب جامع التوحید

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۳۰﴾

۳۰۔ پس تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر آیات

ہر لحہ فیاضی کرنے والے رب کی فیاضی کی کون کون سی نعمت جھٹلاؤ گے۔

سَنَفۡرُغُ لَکُمۡ اَیُّہَ الثَّقَلٰنِ ﴿۳۱﴾

۳۱۔ اے (جن و انس کی) دو باوزن جماعتو! ہم عنقریب تمہاری (جزا و سزا کی) طرف پوری توجہ دینے والے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ الثَّقَلٰنِ: یعنی جن و انس اس روئے زمین کی دو گراں قدر، قابل ذکر مخلوق ہیں۔

سَنَفۡرُغُ: ہم پوری توجہ دینے والے ہیں۔ یعنی ہم قیامت کے دن اے جن و انس! تمہاری سزا و جزا اور تمہارے چھوٹے بڑے اعمال کے حساب پر پوری توجہ دینے والے ہیں۔ پوری توجہ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کسی اور کام میں مشغول ہے، پوری توجہ نہیں ہے، آخرت میں پوری توجہ ہو گی۔ اس کی ذات اس بات سے برتر و بالاتر ہے:

یَا مَنۡ لَا یَشۡغَلُہٗ شَاۡنٌ عَنۡ شَاۡنٍ ...[1]

اے وہ ذات جسے کوئی مشغولیت کسی اور مشغولیت سے نہیں روکتی۔

بلکہ بتانا یہ مقصود ہے کہ دنیا میں ہم نے تمہیں ڈھیل دے رکھی تھی۔ تمہارے اعمال کا محاسبہ نہیں ہوتا تھا لیکن قیامت کے دن تمہارے تمام اعمال کی چھان بین ہو گی۔ تمہارے تمام چھوٹے بڑے اعمال پر پوری توجہ مرکوز ہو گی جیسا کہ کوئی شخص ہر کام سے فارغ ہو کر صرف ایک کام پر توجہ مرکوز کرتا ہے۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۳۲﴾

۳۲۔ پس تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر آیات

آج تو تم ہماری نعمتوں کی ناقدری کرتے ہو۔ کل قیامت کے دن جب ہم تمہارا حساب لینے لگیں

---

[1] مستدرک الوسائل ۲: ۲۴۱

گے تو اس وقت تمہیں اندازہ ہو جائے گا ہم نے تمہیں کس کس نعمت سے مالا مال ہونے کا موقع فراہم کیا تھا۔ دنیا میں تو تم تکذیب کرتے رہے لیکن آج تم کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ؕ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ﴿۳۳﴾

۳۳۔ اے گروہ جن و انس! اگر تم آسمانوں اور زمین کی سرحدوں سے نکلنے کی استطاعت رکھتے ہو تو نکل جاؤ، تم سلطنت و قہاریت کے بغیر نہیں نکل سکو گے۔

تفسیر آیات

قیامت کے دن جب تمہیں حساب دینے کے لیے اللہ کی بارگاہ میں بلایا جائے گا تو تم اللہ کو حساب دینے سے گریز کرنا اور اللہ کی مملکت اور خدا کی خدائی سے فرار ہونا چاہو تو ایسا نہیں کر سکو گے۔ چونکہ اگر فرار ہونا ہے تو کل کائنات اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ سے فرار ہونا ہے۔ لَا تَنْفُذُوْنَ: کل کائنات سے بھاگ نکلو ممکن نہیں ہے یعنی کل کائنات کی سرحدوں سے بھاگ نکلنا ممکن نہیں ہے۔ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ اس کے لیے سلطنت و قہاریت ایسی چاہیے جو کل کائنات پر غالب آئے۔ ایسا بھی ممکن نہیں ہے۔

اس جگہ اس بات کا خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ تسخیر طبیعت، سلطان کے ذریعے ممکن ہے۔ اس طرح خلائی سفر کے ذریعے دوسرے کرات کی تسخیر ممکن ہے لیکن یہ خیال قرین واقع نہیں ہے۔ چونکہ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ سے مراد سات آسمان لیے جائیں تو سات آسمانوں کی سرحدوں سے نکلنا ممکن نہیں ہے۔ سیاق آیات سے بھی یہ بات بعید معلوم ہوتی ہے چونکہ سیاق و سباق آیت قیامت کے بارے میں ہے۔

البتہ یہ خیال اس وقت قابل بحث ہو سکتا ہے جب سات آسمانوں کو اسی نظام شمسی میں تلاش کیا جائے۔ چنانچہ قاموس قرآن کے مؤلف نے اس کی کوشش کی ہے۔

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۴﴾

۳۴۔ پس تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر آیات

قبل از وقت آگاہ رہنا کہ قیامت کے دن اللہ کی مملکت سے فرار ممکن نہیں، ایک تنبیہ ہے جو ایک نعمت ہے۔ حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ علیہ السلام نے فرمایا:

مَنۡ حَذَّرَكَ كَمَنۡ بَشَّرَكَ۔[1] جو (برائیوں سے) خوف دلائے وہ تمہارے لیے مژدہ سنانے والے کے مانند ہے۔

یہ تنبیہ بھی ایک نعمت ہے جس کی وجہ سے انسان اطاعت کرتا، معصیت سے دور ہوتا اور اس دن کے لیے تیاری کرتا ہے جس سے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

یُرۡسَلُ عَلَیۡکُمَا شُوَاظٌ مِّنۡ نَّارٍ ۬ۙ وَّ نُحَاسٌ فَلَا تَنۡتَصِرٰنِ ﴿۳۵﴾

۳۵۔ تم دونوں پر آگ کے شعلے اور چنگاریاں چھوڑی جائیں گی، پھر تم کامیاب نہیں رہو گے۔

تشریح کلمات

شُوَاظٌ: (ش و ظ) آگ کا شعلہ جس میں دھواں نہ ہو۔

تفسیر آیات

اے جن و انس! اگر تم دونوں نے قیامت کے دن اللہ کی حکومت سے فرار ہونے کی کوشش کی بھی تو تم آگ کے شعلے اور چنگاریوں کی لپیٹ میں آ جاؤ گے۔

قیامت کے دن اس قسم کی کوشش اگرچہ ممکن نہیں ہے تاہم اگر کسی کے تصور میں آ جائے تو اس کے عدم امکان کا بیان ہے۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۳۶﴾

۳۶۔ پس تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر آیات

قیامت کے دن اس بات کی قدر ہو گی کہ اس حقیقت سے قبل از وقت آگاہی کتنی بڑی نعمت تھی۔

فَاِذَا انۡشَقَّتِ السَّمَآءُ فَکَانَتۡ وَرۡدَۃً کَالدِّہَانِ ﴿۳۷﴾

۳۷۔ پس جب آسمان پھٹ جائے گا تو سرخ ہو جائے گا جیسے سرخ چمڑا۔

تشریح کلمات

وَرۡدَۃً: (و ر د) سرخ گل کو کہتے ہیں۔

---

[1] نہج البلاغۃ حکمت: ۵۹

الدھان: (د ھ ن) سرخ چمڑے کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

جب قیامت کے روز کائناتی انقلاب آئے گا تو موجودہ نظام بدل جائے گا۔ آسمان پھٹ جائے گا، کرات آسمانی بکھر جائیں گے اور آسمان کا موجودہ نیلا رنگ بدل کر سرخ چمڑے کے رنگ کا ہو جائے گا۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۳۸﴾

۳۸۔ پس تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر آیات

اس روز معلوم ہو جائے گا اللہ نے ہدایت کے سامان فراہم کر کے جن و انس پر کتنا احسان فرمایا تھا۔ اب عینی مشاہدے کے بعد ان احسانات کو کوئی نہیں جھٹلا سکتا۔

فَیَوۡمَئِذٍ لَّا یُسۡـَٔلُ عَنۡ ذَنۡۢبِہٖۤ اِنۡسٌ وَّ لَا جَآنٌّ ﴿۳۹﴾

۳۹۔ پھر اس روز کسی انسان سے اور کسی جن سے اس کے گناہ کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا۔

تفسیر آیات

چونکہ وہ شکلوں سے پہچانے جائیں گے:

یَّوۡمَ تَبۡیَضُّ وُجُوۡہٌ وَّ تَسۡوَدُّ وُجُوۡہٌ [1]

قیامت کے دن کچھ لوگ سرخرو اور کچھ لوگ سیاہ رو ہوں گے۔

بلکہ قیامت کے دن اعراف (اونچی جگہ) پر کچھ مردانِ حق ہوں گے وہ بھی لوگوں کو ان کی شکلوں سے پہچان لیں گے:

وَ عَلَی الۡاَعۡرَافِ رِجَالٌ یَّعۡرِفُوۡنَ کُلًّۢا بِسِیۡمٰہُمۡ ۔۔۔ [2]

اور بلندیوں پر کچھ ایسے افراد ہوں گے جو ہر ایک کو ان کی شکلوں سے پہچان لیں گے۔

لہٰذا بعض مجرم ایسے ہوں گے جو حساب کے بغیر ہی جہنم کی طرف لے جائے جائیں گے کیونکہ وہ چہروں سے پہچانے جائیں گے۔ قیامت کے دن تین قسم کے لوگ ہوں گے: بلا حساب جنت جانے والے، بلا حساب جہنم جانے والے، حساب کے بعد جنت یا جہنم کا فیصلہ سننے والے۔ ذَنۡۢبِہٖۤ کی ضمیر انس کی طرف ہے۔ یہ

---

[1] ۳ آل عمران: ۱۰۶ [2] ۷ اعراف: ۴۶

نائب فاعل ہونے کی وجہ سے رتبۃً پہلے ہے۔ اصل کلام اس طرح ہے: لا یسأل انس عن ذنبه ولا جان عن ذنبه۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۴۰﴾ ۴۰۔ پس تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر آیات

تمہیں قیامت کے دن جن حالات کا سامنا کرنا ہے، ان خطرات سے آگاہ کرنا لطف پروردگار ہے۔

یُعۡرَفُ الۡمُجۡرِمُوۡنَ بِسِیۡمٰهُمۡ فَیُؤۡخَذُ بِالنَّوَاصِیۡ وَالۡاَقۡدَامِ ﴿۴۱﴾ ۴۱۔ مجرم اپنے چہروں سے پہچانے جائیں گے پھر وہ پیشانیوں اور پیروں سے پکڑے جائیں گے۔

تفسیر آیات

سابقہ آیت میں اٹھنے والے سوال کہ ان سے سوال کیوں نہیں ہو گا؟ کا جواب ہے۔ فرمایا: مجرم اپنی شکلوں سے پہچانے جائیں گے، سیاہ چہروں سے۔ ان کے نامہ اعمال میں کوئی نیکی نہ ہو گی بلکہ جرائم ہی جرائم ہوں گے۔ چنانچہ انہیں چہروں اور پیروں سے پکڑ کر جہنم کی طرف لے جایا جائے گا۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۴۲﴾ ۴۲۔ پس تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر آیات

اے جن و انس! اگر تم ہدایت یافتہ ہو تو تم پر اللہ کی نعمتوں کی کتنی ارزانی ہو گی کہ ان مجرموں کی صف میں تم شامل نہ ہوئے۔

ہٰذِہٖ جَہَنَّمُ الَّتِیۡ یُکَذِّبُ بِہَا الۡمُجۡرِمُوۡنَ ﴿۴۳﴾ ۴۳۔ یہ وہی جہنم ہے جسے مجرمین جھٹلاتے تھے۔

یَطُوۡفُوۡنَ بَیۡنَہَا وَبَیۡنَ حَمِیۡمٍ اٰنٍ ﴿۴۴﴾ ۴۴۔ وہ جہنم اور کھولتے ہوئے انتہائی گرم پانی کے درمیان گردش کرتے رہیں گے۔

وقف لازم

تشریح کلمات

اٰنٍ: (ا ن ی) انتہائی گرم۔ یہ انی یأنی کا اسم فاعل ہے اور قاضٍ کی طرح یاء محذوف ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ یہ مجرم جو شکلوں سے پہچانے جائیں گے وہی لوگ ہیں جو آخرت اور جنت و نار کو نہیں مانتے تھے۔
۲۔ وہ آتش اور کھولتے پانی کے درمیان گردش میں ہوں گے۔ یہ کھولتا ہوا پانی بھی جہنم ہی میں ہو گا۔ جیسے دوسری جگہ فرمایا:

فِیۡ سَمُوۡمٍ وَّ حَمِیۡمٍ ۝ [1] وہ جلتی ہوا اور کھولتے پانی میں ہوں گے۔

ع ۲ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۴۵﴾ ۴۵۔ پس تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر آیات

ان ہولناک مراحل سے نجات حاصل کرنے کا راستہ بتا دینا کتنی بڑی نعمت ہے۔

وَ لِمَنۡ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ جَنَّتٰنِ ﴿۴۶﴾ ۴۶۔ اور جو شخص اپنے رب کی بارگاہ میں پیش ہونے کا خوف رکھتا ہے اس کے لیے دو باغ ہیں۔

تفسیر آیات

ایک خوف، عذاب کا ہوتا ہے اور ایک اللہ کی ناراضگی کا ہوتا ہے۔ جو لوگ رضایت رب کے درپے ہوتے ہیں ان کے سامنے ثواب نہیں ہوتا اگرچہ انہیں علم ہے رضایت رب کا لازمہ ثواب ہے۔ اسی طرح جو لوگ اللہ کی ناراضگی سے خائف ہوتے ہیں ان کے ذہن میں عذاب کا خوف نہیں ہوتا۔ ان کے قلب و ضمیر پر یہ بات حاکم ہے کہ انہوں نے اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے۔ بندگی کا حق ادا نہ ہونے پر شرمندہ ہیں۔ اسی لیے وہ اس کی بارگاہ میں جانے کا خوف دل میں رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے خوف کو فضیلت حاصل ہے اور خصوصیت کے حامل دو باغوں کا ذکر ہے ورنہ دیگر آیات میں باغات (جنات عدن) کا ذکر ہے۔

امام صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

[1] ۵۶ واقعۃ: ۴۲

مَنْ عَلِمَ اَنَّ اللّٰهَ يَرَاهُ وَ يَسْمَعُ مَا يَقُولُ وَ يَعْلَمُ مَا يَعْمَلُهُ مَنْ خَيْرٍ اَوْ شَرٍّ فَيَحْجُزُهُ ذٰلِكَ عَنِ الْقَبِيحِ مِنَ الْاَعْمَالِ فَذٰلِكَ الَّذِى خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَى۔[1]	جو یہ جانتا ہے کہ وہ خیر و شر کی جو بات کرتا ہے اسے اللہ دیکھتا اور سنتا ہے اور وہ جو عمل انجام دیتا ہے اللہ کو اس کا علم ہوتا ہے اس لیے وہ قبیح اعمال سے رک جاتا ہے یہ شخص وہی ہے جو مقام رب سے خوف کرتا اور نفس کو خواہشات سے روکتا ہے۔

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۷﴾	۴۷۔ پس تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر آیات

کتنی بڑی نعمتیں جنت میں تمہارے انتظار میں ہیں۔

ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ﴿۴۸﴾	۴۸۔ (یہ دونوں باغ) گھنی شاخوں والے ہوں گے۔

تشریح کلمات

اَفْنَانٍ: گھنی شاخوں کو کہتے ہیں اور متنوع یعنی متعدد قسموں کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔

تفسیر آیات

یہ دو باغ گھنی شاخوں یا متنوع اور کئی اقسام کی چیزوں پر مشتمل ہوں گے؟ فہم بشر کے مطابق یہ ان دو باغوں کی خصوصیت اور وصف کا اجمالی بیان ہے تاہم اس مختصر جملے سے انسان بہت کچھ سمجھ سکتا ہے۔

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۹﴾	۴۹۔ پس تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر آیات

ان ناقابل وصف و بیان نعمتوں میں سے کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

---

[1] الکافی ۲: ۷۰

فِيْهِمَا عَيْنٰنِ تَجْرِيٰنِ ﴿۵۰﴾　　۵۰۔ ان دونوں (باغوں) میں دو بہتے ہوئے چشمے ہیں۔

تفسیر آیات

یہ دو چشمے خصوصیت کے حامل ہوں گے۔ ورنہ دیگر آیات میں جنت کے چشموں کا ذکر آتا ہے:

فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ [1]　　باغوں اور چشموں میں ہوں گے۔

تَجْرِيٰنِ: سے یہ معلوم ہوا کہ چشمے رواں ہوں گے۔ ان دو چشموں کی روانی میں کیا کیا نعمتیں پوشیدہ ہیں؟ ہم اس کا تصور نہیں کر سکتے۔

فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۱﴾　　۵۱۔ پس تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر آیات

اگر دنیا میں ان نعمتوں کو جھٹلا بھی دیا، آخرت میں پردہ اٹھنے کے بعد کیسے جھٹلاؤ گے۔

فِيْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ ﴿۵۲﴾　　۵۲۔ ان دونوں میں موجود ہر میوے کی دو دو قسمیں ہیں۔

تفسیر آیات

ان دو باغوں کی ایک خصوصیت یہ ہوگی کہ یہاں موجود تمام پھلوں کی دو دو قسمیں ہوں گی۔ یہ دو قسمیں کس لذت و ذائقہ کی ہوں گی؟ اجمال میں رکھا ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ ہمارے لیے قابل فہم و ادراک نہیں ہیں۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَاۗءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ [2]　　اور کوئی نہیں جانتا کہ ان کے اعمال کے صلے میں ان آنکھوں کی ٹھنڈک کا کیا کیا سامان پردہ غیب میں موجود ہے۔

ان قسموں کے بارے میں تفاسیر میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ صرف ظن و تخمین ہے۔ ہم ان باتوں میں نہیں جاتے۔

---

[1] ۱۵ حجر: ۴۵　　[2] ۳۲ سجدہ: ۱۷

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۳﴾

۵۳۔ پس تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر آیات

قیامت کے دن پردہ ہٹنے پر علم ہوگا کہ وہ دنیا میں اللہ کی کس کس نعمت کو جھٹلاتے رہے ہیں۔

مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى فُرُشٍۭ بَطَآىِٕنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ ؕ وَ جَنَا الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ ﴿۵۴﴾

۵۴۔ وہ ایسے فرشوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے جن کے استر ریشم کے ہوں گے اور ان دونوں باغوں کے میوے (ان کی دسترس میں) قریب ہوں گے۔

تشریح کلمات

اِسْتَبْرَقٍ: (ب ر ق) یہ لفظ فارسی سے عربی میں منتقل ہوا ہے۔ فارسی میں یہ لفظ استقر تھا۔

تفسیر آیات

۱۔ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى فُرُشٍ: یہاں فرش کا ذکر ہے اور ایک اس کے استر کا۔ پھر فرمایا ان کے استر ریشم کے ہوں گے۔ ہم عالم دنیا والے چیزوں کو اپنے مشاہدات کی روشنی میں سمجھ سکتے ہیں۔ ہمارے مشاہدات کے ''فرش'' اور ''استر'' ہمارے لیے قابل فہم ہیں، اسی طرح تکیہ بھی لیکن کیا یہ فرش، استر اور ریشم اسی طرح کے ہوں گے جس طرح ہم سمجھ رہے ہیں؟ کلا۔ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّاۤ اُخْفِیَ ....

۲۔ وَ جَنَا الْجَنَّتَيْنِ: ان دونوں باغوں کے پھل اہل جنت کے نزدیک، دست یابی میں ہوں گے۔ چونکہ جنت میں اہل جنت کا ارادہ نافذ ہوتا ہے، اسباب وسائل کا ذریعہ استعمال کرنا نہیں پڑتا۔ اس لیے جیسے جس پھل کا ارادہ کر لیا حاضر ہو گیا: دَانٍ۔

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۵﴾

۵۵۔ پس تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر آیات

کیا ان نعمتوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد بھی کوئی انہیں جھٹلا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

فِیۡهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرۡفِ ۙ لَمۡ یَطۡمِثۡهُنَّ اِنۡسٌ قَبۡلَهُمۡ وَ لَا جَآنٌّ ﴿۵۶﴾

۵۶۔ ان میں نگاہیں (اپنے شوہروں تک) محدود رکھنے والی حوریں ہیں جنہیں ان سے پہلے نہ کسی انسان نے چھوا ہوگا اور نہ کسی جن نے۔

تشریح کلمات

یَطۡمِثۡهُنَّ: (ط م ث) الطمث کے معنی کسی عورت کی بکارت زائل کرنا کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ فِیۡهِنَّ: ''ان جنتوں میں'' سے مراد مذکورہ دو جنتیں ہو سکتی ہیں یا وہ قصور و محلات مراد ہو سکتے ہیں جن کا جنت کے لفظ سے مفہوم ہوتا ہے یا مذکورہ نعمتوں میں ایسی حوریں ہیں۔

۲۔ قٰصِرٰتُ الطَّرۡفِ: الطرف بروزن حَرۡف، آنکھوں کی پلکوں کو حرکت دینا جو نگاہ کرنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ان باغوں میں ایسی حوریں ہوں گی جو اپنی نگاہیں اپنے شوہروں تک محدود رکھنے والی ہوں گی۔ ان کی نگاہوں میں شرم و حیا ہوگی۔ شرم و حیا ہی عورت کا حسن و جمال ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا وقار اور عزت ہے۔ شرم و حیا عورت کی عفت کی محافظ اور اس میں جذب و کشش کا باعث ہے۔ یہ کشش شرم و حیا کی فصیل سے پرے ہے۔ یہ جاذبیت احترام و عفت کے حصار میں ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کے حسن و جمال کا وصف بیان کرنے کی جگہ عفت و حیا کا ذکر فرمایا ہے چونکہ عورت کا حسن و جمال وہ نہیں ہے جس کا مظاہرہ حسن کے مقابلوں میں کیا جاتا ہے جہاں ہر بری نظر کو بدنظری کی دعوت دی جاتی ہے۔

۳۔ لَمۡ یَطۡمِثۡهُنَّ: ان عورتوں کو ان سے پہلے کسی نے نہ چھوا ہوگا۔ جنت میں انسان اور جنات دونوں کے لیے ان کی جنس کی عورتیں ہوں گی۔ نہ کسی جن عورت کو ان سے پہلے کسی جن نے چھوا ہوگا، نہ کسی انس عورت کو ان سے پہلے کسی انسان نے چھوا ہوگا۔

حضرت ابوذر فرماتے ہیں:

> جنت کی بیوی اپنے شوہر سے کہے گی: میرے رب کی عزت کی قسم! میں جنت میں تجھ سے بہتر کسی کو نہیں دیکھتی ہوں۔ حمد ہے اس اللہ کی جس نے مجھے تمہاری بیوی اور تجھے میرا شوہر بنایا۔[۱]

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۵۷﴾

۵۷۔ پس تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

---

۱ بحار الانوار۔۸:۱۰۴

تفسیر آیات

دنیا میں مختصر عمل کی جزا میں ان عظیم اور ابدی نعمتوں کو کیسے جھٹلاؤ گے؟

كَاَنَّهُنَّ الْيَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ ﴿٥٨﴾ ۵۸۔ گویا وہ یاقوت اور موتی ہیں۔

تشریح کلمات

اَلْمَرْجَانُ: (م ر ج) مونگا۔ چھوٹا موتی۔

تفسیر آیات

یہ عورتیں چہرے کی رنگت میں ہیرے کی مانند ہیں اور صفائی میں موتیوں کی طرح۔ اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کی حیا داری اور عفت شعاری کا ذکر پہلے فرمایا۔ اس کے بعد جسمانی حسن و جمال کا ذکر فرما کر اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ عورت کی اصل قیمت اس کی حیا اور عفت سے بنتی ہے۔

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٥٩﴾ ۵۹۔ پس تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر آیات

کیا تم اللہ کی ان نعمتوں کو جھٹلاؤ گے جو تمہارے تصورات سے بھی بالاتر ہیں؟

هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ﴿٦٠﴾ ۶۰۔ احسان کا بدلہ احسان کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟

تفسیر آیات

ایک اخلاقی ضابطہ جسے اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے اوپر لازم گردانا ہے اور انسان سے بھی چاہا ہے:

تخلقوا بالاخلاق اللّٰہ۔[1] اپنے میں اللہ کا اخلاق پیدا کرو۔

احسان کا بدلہ احسان ہو گا۔ احسان کا دائرہ عدل سے وسیع ہے۔ انسان کو جہاں عدل کی ضرورت ہے وہاں احسان کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

---

[1] بحار ۵۸: ۱۲۹

سورہ نحل آیت ۹۰ اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ وَالۡاِحۡسَانِ کے ذیل میں ہم نے بتایا ہے کہ عدل یہ ہے کہ مقروض سے قرض وصول کیا جائے اور احسان یہ ہے کہ مقروض کے نادار ہونے کی صورت میں قرض معاف کیا جائے۔ عدل سے معاشرے میں امن قائم ہوتا ہے تو احسان سے حلاوت اور شیرینی پیدا ہوتی ہے۔

ظلم کے مارے لوگوں کو جہاں عدل کی ضرورت ہوتی ہے وہاں حالات و گردش کے شکار لوگوں کو احسان کی ضرورت ہوتی ہے۔

راوی کہتا ہے میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام کو یہ کہتے سنا:

آیَةٌ فِی کِتَابِ اللّٰہِ مُسَجَّلَةٌ. قُلْتُ: مَا هِیَ؟ قَالَ: هَلۡ جَزَآءُ الۡاِحۡسَانِ اِلَّا الۡاِحۡسَانُ جَرَتْ فِی الْمُؤْمِنِ وَ الْکَافِرِ وَالْبَرِّ وَالْفَاجِرِ. مَنْ صُنِعَ اِلَیْهِ مَعْرُوفٌ فَعَلَیْهِ اَنْ یُکَافِیَٔ بِهٖ وَ لَیْسَتِ الْمُکَافَاۃُ اَنْ یَصْنَعَ کَمَا صُنِعَ حَتّٰی یُرْبِیَ عَلَیْهِ فَاِنْ صَنَعْتَ کَمَا صُنِعَ کَانَ لَهُ الْفَضْلُ بِالْاِبْتِدَاءِ۔[1]

کتاب خدا میں ایک آیت درج ہے۔ میں نے پوچھا وہ کون سی ہے؟ فرمایا: هَلۡ جَزَآءُ الۡاِحۡسَانِ اِلَّا الۡاِحۡسَانُ۔ یہ مومن، کافر، نیک اور برے سب کے لیے ہے۔ جس پر احسان کیا گیا ہے اس چاہیے کہ اسے چکا دے۔ چکانا یہ نہیں ہے کہ جیسا اس نے احسان کیا ہے ایسا ہی تو اس پر احسان کرے، جب تک بیشتر احسان نہ کرے۔ اگر تو نے اتنا ہی احسان کیا جتنا اس نے کیا تھا تو فضیلت اسے حاصل ہے جس نے ابتدا کی ہے۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۶۱﴾

۶۱۔ پس تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر آیات

اللہ بھی تمہاری تھوڑی نیکی کے بدلے میں بے پایاں احسان فرمائے گا۔ اللہ کے بے پایاں احسانات میں پوشیدہ کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

وَ مِنۡ دُوۡنِہِمَا جَنَّتٰنِ ﴿۶۲﴾

۶۲۔ اور ان دونوں باغوں کے علاوہ دو باغ اور ہیں۔

تفسیر آیات

دُوۡنِہِمَا: کا ایک ترجمہ تو وہی ہے جو ہم نے متن میں اختیار کیا ہے۔ دوسرا ترجمہ یہ کیا گیا ہے: اور ان دو باغوں سے کمتر دو باغ اور ہیں۔

---

[1] مجمع البیان ذیل آیت۔ وسائل الشیعۃ ۱۶: ۳۰۷

دون کے معنی ’’ قریب‘‘ کے بھی کیے جاتے ہیں۔ اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہو گا: مذکورہ دو باغوں سے قریب تر دو اور باغ ہیں۔

ہمارے نزدیک دون کے معنی ’’ علاوہ‘‘ کے ہیں چونکہ یہ لفظ ’’علاوہ‘‘ کے معنوں میں دیگر سب معنوں سے بہت بیشتر استعمال ہوتا ہے اور اس میں ان آیات کی تفصیل ہے جن میں فرمایا ہے بہت سے باغات (جَنّٰتٍ وَّعُیُوۡنٍ) ہوں گے۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۶۳﴾

۶۳۔ پس تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر آیات

یہ باغات اور ان میں موجود نعمتوں پر تمہارا ایمان ہوتا تو تم ان کو نہ جھٹلاتے۔

مُدۡهَآمَّتٰنِ ﴿۶۴﴾

۶۴۔ دونوں باغ گھنے سرسبز ہیں۔

تشریح کلمات

مدهامة: (د ه م) ادھام سرسبزی کو اچھی سیرابی میسر آ جائے تو سیاہ مائل ہو جاتی ہے۔ اس وقت کہتے ہیں: ادھام الزرع۔ جب کھیتی سیاہ مائل ہو جاتی ہے۔

تفسیر آیات

یہ دونوں باغ بہتر سرسبزی کی بنا پر سیاہ مائل گھنے درختوں پر مشتمل ہوں گے۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۶۵﴾

۶۵۔ پس تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر آیات

تم اللہ کی جن نعمتوں کا احاطہ نہیں کر سکتے انہیں کیسے جھٹلاؤ گے؟

فِیۡهِمَا عَیۡنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ ﴿۶۶﴾

۶۶۔ ان دونوں باغوں میں دو ابلتے ہوئے چشمے موجود ہیں۔

تشریح کلمات

نَضَّاخَتٰنِ: النضخ تیزی کے ساتھ فواروں کی طرح ابلنے کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

ان دو دیگر باغات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان دونوں میں دو ایسے چشمے ہیں جن کا پانی فوارے کی طرح ابلتا ہو گا۔ سابقہ دو باغوں میں بھی دو چشموں کا ذکر تھا۔ ان دو چشموں کو جاری چشمے فرمایا: فِیۡهِمَا عَیۡنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ۔ ہماری دنیا کے فہم کے مطابق چشمے کا فوارے کی طرح اچھلنا اور ابلنا زیادہ خوش منظر ہوتا ہے اور ابلنا جاری بھی ہے لیکن جاری ابلنا نہیں ہے۔ اس طرح ہمارے فہم کے مطابق یہ دو باغ سابقہ دو باغوں سے کمتر نہیں ہیں البتہ مختلف ہیں اور تنوع میں بھی ایک جاذبیت ہے۔

سورہ دھر آیت ۶ میں جنت کے ایک چشمے کے بارے میں فرمایا:

عَیۡنًا یَّشۡرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ یُفَجِّرُوۡنَهَا تَفۡجِیۡرًا ۝

یہ ایسا چشمہ ہے جس سے اللہ کے (خاص) بندے پئیں گے اور خود اسے (جیسے چاہیں) جاری کر دیں گے۔

چنانچہ نضخ اور تفجیر قریب المعنی ہیں۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۶۷﴾

۶۷۔ پس تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر آیات

بتاؤ اب بھی اپنے پروردگار کی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟

فِیۡهِمَا فَاکِهَةٌ وَّ نَخۡلٌ وَّ رُمَّانٌ ﴿۶۸﴾

۶۸۔ ان دونوں میں میوے اور کھجوریں اور انار ہیں۔

تفسیر آیات

ان دو باغوں کی خصوصیات کا ذکر ہے کہ ان میں میوے ہیں۔

میوؤں کے ذکر کے بعد انار اور کھجور کا خصوصی طور پر ذکر آیا جو اس بات کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ ان دو میوؤں میں ایک خصوصیت ہے۔ اس خصوصیت کو آج کل طبی ماہرین کسی حد تک سمجھنے لگے ہیں۔

انار کے بارے میں ایک حدیث ہے:

مَا عَلَی وَجْہِ الْاَرْضِ ثَمَرَۃٌ کَانَتْ اَحَبَّ اِلَی رَسُولِ اللّٰہِ مِنَ الرُّمَّانِ.... [1] روئے زمین پر رسول خدا ﷺ کے لیے انار سے زیادہ پسندیدہ میوہ نہیں تھا۔

ہمارے معاصر طبی ماہرین سیب کو میوں کی سرداری دیتے ہیں اور آج کل یہ سرداری کیلے کو دینے کی باتیں ہو رہی ہے۔ لیکن ایک حدیث میں یہ سرداری انار کو دی گئی ہے:

اَلْفَاکِہَۃُ مِائَۃٌ وَ عِشْرُونَ لَوْناً سَیِّدُھَا الرُّمَّانُ۔ [2] میووں کی ایک سو بیس قسمیں ہیں سب کا سردار انار ہے۔

کھجور کی خصوصیات بھی بہت زیادہ ہیں۔ حدیث میں آیا ہے:

کھجور سے روزہ افطار کرنا کیوں افضل ہے؟ اس لیے کہ اَسْرَعُ مَنْفَعَۃً اس سے جلدی فائدہ ملتا ہے۔ [3]

طبی حوالوں سے مسلم ہے کہ کھجور جلدی خون میں تحلیل ہوتی ہے۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۶۹﴾ ۶۹۔ پس تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر آیات

اس قسم کی نعمتوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد بھی تم انہیں جھٹلاؤ گے؟

فِیۡہِنَّ خَیۡرٰتٌ حِسَانٌ ﴿۷۰﴾ ۷۰۔ ان میں نیک سیرت اور خوبصورت بیویاں ہیں.

تفسیر آیات

۱۔ فِیۡہِنَّ: ان دو باغوں یا ان نعمتوں میں۔

۲۔ خَیۡرٰتٌ حِسَانٌ: مجمع البیان میں خَیۡرٰتٌ کا معنی ''اچھے اخلاق کی مالک'' اور حِسَانٌ کا ''حسن و جمال'' سے کیا ہے۔

مروی ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے خَیۡرٰتٌ حِسَانٌ کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا:

ھُنَّ صَوَالِحُ الْمُؤْمِنَاتِ الْعَارِفَاتِ۔ [4] یہ وہ مؤمنہ عورتیں ہیں جو نیک اور معرفت رکھنے والی ہیں.

---

۱ و ۲ الکافی ۶: ۳۵۲ ۳ علل الشرائع ۲: ۳۹۰ ۴ الکافی ۸: ۱۵۶

حضرت امام صادق علیہ السلام سے دوسری روایت میں آیا ہے:

اَلْخَیْرَاتُ الْحِسَانُ مِنْ نِسَاءِ اَهْلِ الدُّنْیَا وَ هُنَّ اَجْمَلُ مِنَ الْحُورِ الْعِینِ...۔[1]

الخیرات الحسان دنیا کی عورتیں ہیں اور یہ حور العین سے زیادہ خوبصورت ہوں گی۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۷۱﴾

۷۱۔ پس تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر آیات

نعمتیں تو وصف و بیان سے زیادہ ہیں لیکن نادان انسان ان کو جاننے کی کوشش کرنے کی جگہ ان کی تکذیب کرتے ہیں۔

حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِی الْخِیَامِ ﴿۷۲﴾

۷۲۔ خیموں میں مستور حوریں ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ مَّقْصُوْرٰتٌ: اپنی اپنی اقامت گاہوں میں مستور اور محفوظ ہوں گی۔ نہ ان پر کسی غیر کی نگاہ پڑے گی، نہ ان کی نگاہ کسی غیر پر پڑے گی۔

۲۔ فِی الْخِیَامِ: خیام سے مراد عمدہ اقامت گاہیں۔ محاورے میں خیمہ ان اقامت گاہوں کو کہتے ہیں جن میں ہر آسائش فراہم ہو۔ خیام سے مراد وہ چیز نہیں ہے جسے ہم مجبوری کی حالت میں استعمال کرتے ہیں۔

ابن عباس سے روایت ہے:

الخیمة درة مجوفة فرسخ فی فرسخ فیها اربعة الآف مصراع من ذهب۔[2]

یہ خیمہ ایک ایسا وسیع موتی ہے جس کا ایک فرسخ طول، ایک فرسخ عرض ہے۔ اس میں چار ہزار سونے کی چوکھٹ ہیں۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۷۳﴾

۷۳۔ پس تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

---

[1] الفقیہ ۳: ۴۶۹ باب النوادر　[2] بحار الانوار ۸: ۱۰۷

تفسیر آیات

اللہ کی نعمتوں کے اہل بننے کی کوشش کی جگہ تکذیب کرتے ہو۔

لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ ﴿٧٤﴾ ۷۴۔ جنہیں ان سے پہلے نہ کسی انسان نے چھوا ہوگا اور نہ کسی جن نے۔

تفسیر آیات

اس آیت کی تشریح اسی سورہ کی آیت نمبر ۵۶ میں ہو چکی ہے۔

فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٧٥﴾ ۷۵۔ پس تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر آیات

تمہارا رب وہ ہے جو اپنے بندوں پر نعمتوں کی فراوانی کرنا چاہتا ہے۔ تم ان کی تکذیب کرو گے؟

مُتَّكِئِينَ عَلَىٰ رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ﴿٧٦﴾ ۷۶۔ وہ سبز قالینوں اور نفیس فرشوں پر تکیے لگائے ہوئے ہوں گے۔

تشریح کلمات

رَفْرَفٍ: اصل میں رفرف درختوں کے گھنے پتوں کو کہتے ہیں۔ پھر اسے رنگین فرش کے لیے بھی استعمال کیا گیا۔ روح المعانی میں حضرت علی علیہ السلام کی طرف منسوب کیا ہے کہ رفرف بستر پر سونے کے لیے ڈالی جانے والے چادر (بیڈ شیٹ) کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

عَبْقَرِيٍّ: عبقر کی طرف منسوب ہے۔ عربوں میں عبقر جنات کی آبادی والے شہر کو کہتے ہیں اور ہر عجیب وغریب چیز کو اسی شہر کی طرف نسبت دیتے ہیں۔ اسی سے نفیس اعلیٰ چیز کو عبقر کہتے ہیں۔ بعض کے نزدیک اس کپڑے کو کہتے ہیں جس پر نقش و نگار ہوں۔ غیر معمولی خوبیوں کی مالک چیز کی صفت بیان کرنا

ہوتو اسے عبقری کہتے ہیں۔

فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۷﴾　　۷۷۔ پس تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر آیات

اللہ کی بے پایان نعمتوں میں سے کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

لا بشیء من الآء ربنا نکذب۔ اے اللہ! تیری نعمتوں میں سے کسی ایک نعمت کا شکر ادا نہیں ہوسکتا۔ تیری نعمتوں کا حق ادا نہ ہونے پر شرمندہ ہیں اور ہم ادائے شکر کی نعمت کا بھی تجھ سے سوال کرتے ہیں: رب اوزعنی ان اشکر نعمتك التی انعمت علی و علی والدیؒ۔

تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِی الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿۷۸﴾ ع　　۷۸۔ بابرکت ہے آپ کے پروردگار کا نام جو صاحب جلالت و اکرام ہے۔

تفسیر آیات

مبارک ہے اس ذات کا اسم جو تمام نعمتوں کی سرچشمہ ہے۔ وہ بابرکت اسم الرحمٰن ہے جو اس کی رحمت کی وسعت پر دلالت کرنے والا اسم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسم الرحمن، لفظ اللّٰہ کی طرح صرف اللہ تعالیٰ کی ذات سے مختص ہے۔

۲۔ ذِی الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ: اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے ذکر کے ساتھ اپنے اسمائے مبارکہ میں سے دو ایسے اسمائے مبارکہ کا ذکر فرمایا ہے جو اللہ کے اسم جلال یعنی جلیل القدر ذات ہونے پر دلالت کرتے ہیں اور ان اسماء کا ان نعمتوں کی فراوانی میں دخل ہے۔

وَالْاِكْرَامِ: یہی صاحب اکرام ذات انسان کو نعمات سے مالا مال کرنے کے لیے اس انتظار میں ہے کہ انسان اپنے آپ کو ان نعمات کا مستحق بنانے کے لیے کوئی معمولی سا اقدام کرے۔

ذِی الْجَلٰلِ صفات جلال و عظمت سے متعلق ہے اور وَالْاِكْرَامِ صفات جمال و انعام سے متعلق ہے۔ جلال سے قدرت اور اکرام سے عطا اور عنایت کا بیان ہے۔

فہرست مطالب

سورة حٰمٓ سجدة
عرض ناشر ____ ۵
تعارف سورة ____ ۹
قرآن ایک غیر مبہم کتاب ہے ____ ۱۰
کفار کی طرف سے دعوت
اسلام کے لیے عدم آمدگی ____ ۱۲
مؤمن اور عمل صالح بجالانے والوں کا اجر
دائمی ہوگا ____ ۱۳
زمین کی دو دنوں میں خلقت کا ذکر ____ ۱۴
زمین کو حیات کے لیے
سازگار بنانے کا ذکر ____ ۱۵
دھویں کی شکل سے آسمان کی تخلیق کا ذکر ____ ۱۶
سات آسمانوں، ہر آسمان کے لیے مختص حکم اور
آسمان دنیا کو ستاروں سے مزیّن کرنے کا ذکر ____ ۱۷
قوم عاد پر نزول عذاب کا ذکر ____ ۱۹
قوم ثمود پر نزول عذاب کا ذکر ____ ۲۰
قیامت کے دن انسان کے اعضاء اور کھال کی
گواہی کا ذکر ____ ۲۱
انسان کی اپنی کھال پر برہمی کہ میرے خلاف
کیوں گواہ دی اور کھال کا جواب ____ ۲۲
اللہ تعالیٰ سے حسن ظن رکھنا چاہیے ____ ۲۴
کافروں کی ایک سزا یہ ہے کہ ان کے ساتھ
ایسے ہم نشین لگا دیے جاتے ہیں جو برے
اعمال خوشنما بنا دیں ____ ۲۵
مشرکین قرآن سننے سے احتراز کرتے تھے
کہ مسلمان نہ ہو جائیں ____ ۲۶
اللہ کو رب تسلیم کرنے کے بعد اس پر
استقامت دکھانے والوں پر فرشتے نازل
ہوتے ہیں اور بشارت دیتے ہیں ____ ۲۷
اللہ کی طرف دعوت دینے والوں کا مقام ____ ۳۰
برائی کو نیکی سے ختم کرنے کا حکم ____ ۳۱
شب و روز، آفتاب و ماہتاب، اللہ کی تدبیری
نشانیاں ہیں ____ ۳۲
مٹی پر پانی پڑنے سے مردہ مٹی میں حیات
آجاتی ہے اس طرح اللہ انسان کو دوبارہ
زندگی دے سکتا ہے ____ ۳۵
جہنمی اور امن والے برابر نہیں ہو سکتے ____ ۳۶
کافر لوگ قرآن کی معجزاتی حیثیت ختم
نہیں کر سکتے ____ ۳۷
اللہ نے قرآن عربی میں کیوں نازل کیا؟ ____ ۳۸
اعمال کے نیک و بد کے اثرات خود عمل کرنے
والے پر مترتب ہوتے ہیں ____ ۳۹
اللہ تعالیٰ کی چند ایک تدبیری نشانیوں کا ذکر ____ ۴۱
انسان آسائش طلب، بے صبر ہوتا ہے ____ ۴۲
مراعات یافتہ لوگ مراعات کو اپنا حق سمجھتے ہیں
اور آخرت میں بھی مراعات کا
حقدار سمجھتے ہیں ____ ۴۳
انسان آسودگی میں اکڑ جاتا ہے اور گردش
کی صورت میں اکھڑ جاتا ہے ____ ۴۴
اللہ تعالیٰ آفاق و انفس میں اپنی تدبیری و ربوبی
نشانیاں دکھانے والا ہے ____ ۴۵

سورۃ الشوریٰ
تعارف سورۃ ___ ۵۱
وحی مالک ارض و سماء کی طرف سے ہوتی ہے ___ ۵۲
آسمان وحی کی سنگینی کا متحمل نہیں ہے ___ ۵۳
ام القریٰ کی تشریح اور مستشرقین کے
اعتراض کا جواب ___ ۵۵
اللہ نے نہیں چاہا سب انسانوں کو بالجبر
ایک امت میں رکھے ___ ۵۶
اللہ کائنات کا ایجاد کرنے والا ہے۔ اللہ
کے مثل کوئی نہیں ہے۔ اللہ کے لیے مثل کے
قائل لوگوں کا ذکر ___ ۵۸
کائنات کے خزانوں کی کنجی اللہ کے پاس ہے ___ ۶۰
اولوالعزم صاحبان شریعت انبیاء کا ذکر ___ ۶۱
ان شریعتوں میں سرکشوں نے تفرقہ ڈالا ___ ۶۴
رسولؐ کے لیے استقامت دکھانے کا حکم ___ ۶۵
بعض ضمائر کے قبول اسلام کے بعد جھگڑے
کا جواز نہیں ہے ___ ۶۷
قیامت کے منکر اسے جلدی چاہتے ہیں جب کہ
مؤمن قیامت سے خائف رہتا ہے ___ ۶۸
طالب آخرت کو دنیا مل سکتی ہے طالب دنیا
کو آخرت نہیں مل سکتی ___ ۶۹
کیا اللہ کے علاوہ کوئی اور نظام اور شریعت
دینے والا ہے؟ ___ ۷۰
ظالم اپنا عذاب دیکھ لے گا اور مؤمن جنت میں
اللہ کے فضل سے فیض یاب ہوگا ___ ۷۱
آیت مودت کی تین تفسیریں ہیں ___ ۷۲
آیت مؤدت کے کلمات کی تشریح ___ ۷۳
اختیار کردہ تفسیر پر احادیث کے شواہد ___ ۷۴
اختیار کردہ تفسیر پر اعتراضات اور ان کے
جوابات ___ ۷۸
تفہیم القرآن کے اعتراضات کے جوابات ___ ۸۰
آیت مؤدت کے اہل بیت کے بارے
میں نازل ہونے کے دیگر شواہد ___ ۸۲
کوئی رسول اللہ پر افترا نہیں باندھ سکتا ___ ۸۵
ایمان و عمل صالح کے حامل لوگوں
کی شفاعت قبول ہوگی ___ ۸۶
اللہ تقسیم رزق میں لوگوں کے مفاد کے
مطابق عمل کرتا ہے ___ ۸۸
آسمانی مخلوقات کی طرف واضح اشارہ ___ ۹۰
بہت سی بلائیں لوگوں کی بدکرداری کی
وجہ سے آتی ہیں ___ ۹۱
سمندر میں کشتیوں کی روانی اللہ کی
تدبیری نشانی ہے ___ ۹۲
دنیا کی دولت ناپائیدار اور جو اللہ کے
پاس ہے وہ بے پایان ہے ___ ۹۳
جنت میں دائمی نعمت حاصل کرنے والوں
کے اوصاف ___ ۹۵
برائی کا بدلہ اسی مقدار سے زیادہ نہیں لے سکتا۔
معاف کرنا بہتر ہے ___ ۹۷
ظلم کا بدلہ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے ___ ۹۷
ظالم اور باغی قانون کی گرفت میں آئیں گے ___ ۹۸
ظالموں کا عذاب کے سامنے آنے کا تذکرہ ___ ۱۰۰
لوگ اگر رسولؐ کی دعوت مسترد کریں تو ان
پر جبر نہیں ہوگا ___ ۱۰۲
اولاد اللہ کی مشیت کے مطابق عنایت
ہوتی ہے ___ ۱۰۳
وحی کے تین طریقوں کا ذکر ___ ۱۰۴
وحی، روح اور زندگی بن کر قلب رسولؐ پر
نازل ہوتی ہے ___ ۱۰۶

سورۃ الزخرف
تعارف سورۃ ___ ۱۱۱
قرآن کو عربی میں نازل کیا یہ قرآن
لوح محفوظ، بلند پایہ مقام رکھتا ہے ___ ۱۱۲
مشرکین اللہ کو خالق مانتے ہیں ___ ۱۱۵
زمین کو گہوارہ بنانا، آسمان سے پانی برسانا،

چیزوں کو جفت بنانا، نقل وحمل کے لیے
کشتی اور حیوانات کو مسخر کرنا اللہ کی
تدبیری آیات ہیں ۱۱۷

مشرکین نے اللہ کے حصے میں لڑکیاں
رکھی ہیں جو خود انہیں پسند نہیں ہیں ۱۱۹

مشرکین نظریۂ جبر سے اپنے مذہب کی
حقانیت پر استدلال کرتے ہیں ۱۲۲

مراعات یافتہ طبقہ ہمیشہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت
میں رکاوٹ بنا ہے ۱۲۴

مشرکین صرف آبائی اندھی تقلید کو مذہب
کی سند سمجھتے ہیں ۱۲۴

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف
سے برائت از مشرکین کا اعلان ۱۲۵

قیامت تک کے علمبردار آل ابراہیم ہیں ۱۲۶

مشرکین مادی سوچ کے مطابق رسالت کے
لیے اپنے انتخاب کا اظہار کرتے ہیں۔ اللہ
رسالت سے کمتر، رزق کی تقسیم کو لوگوں اختیار
میں نہیں رکھا ۱۲۹

دولت کی فراوانی سے سب کے کفر پر مجتمع
ہونے کا خطرہ نہ ہوتا تو اللہ کافروں کو
چاندی اور سونے کا گھر دے دیتا ۱۳۱

ذکر خدا سے منحرف ہونے والوں پر اللہ
شیطان مسلط فرماتا ہے ۱۳۲

اللہ، رسول کی زندگی کے بعد سرکشوں
سے انتقام لے گا ۱۳۴

احادیث کے مطابق یہ انتقام حضرت
علی علیہ السلام لیں گے ۱۳۴

توحید کے بارے میں استقامت
دکھانے اور سابقہ انبیاء سے پوچھنے کا حکم ۱۳۶

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے معجزات کا ذکر ۱۳۷

فرعون اپنے تکبر اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تحقیر
کا اظہار کرتا ہے ۱۳۹

طاغوت کی اطاعت کا انجام ۱۴۱

مشرکین کے معبودوں کا ذکر اور اعتراض
کا جواب ۱۴۳

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کی توحید کی
دعوت دیتے تھے ۱۴۶

متقین کی آپس میں دوستی قیامت کے دن بھی
باقی رہے گی ۱۴۸

اہل تقویٰ کے درجات کا ذکر ۱۴۹

مجرمین کے عذاب کا ذکر ۱۵۱

اللہ کا بیٹا ہوتا تو سب سے
پہلے رسول اس کی عبادت کرتے ۱۵۴

اللہ تعالیٰ کل کائنات کا معبود،
رب اور مالک ہے ۱۵۵

سورة الدخان

تعارف سورة ۱۶۱

قرآن، مبارک رات میں نازل ہوا ۱۶۲

اس مبارک رات میں مقدرات کا
تعین ہوتا ہے ۱۶۳

قوم فرعون اور بنی اسرائیل کا ذکر ۱۶۸

قوم تبع کا ذکر ۱۷۴

عذاب جہنم کا ذکر ۱۷۶

اہل جنت کے لیے نعمتوں کا ذکر ۱۷۸

سورة الجاثية

تعارف سورة ۱۸۳

آسمانوں، زمین، انسان کی تخلیق، جانداران،
شب وروز، بارش اور ہوا میں اللہ کی تدبیری آیات
موجود ہیں ۱۸۴

آیات الٰہی سن کر روگردانی کرنے والوں
کے انجام کا ذکر ۱۸۶

سمندر اور آسمانوں اور زمین میں موجود تمام
چیزوں کو انسان کے لیے مسخر کرنے کا ذکر ۱۸۸

مسلمانوں کو کافروں سے درگزر کرنے کا حکم ۱۸۹

بنی اسرائیل کا ذکر ____ ۱۹۰
رسول اللہؐ کو شریعت عنایت فرمانے کا ذکر ____ ۱۹۲
گناہ گار اور مؤمن برابر نہیں ہو سکتے ____ ۱۹۴
خواہش پرست قابل ہدایت نہیں ہوتا ہے ____ ۱۹۵
منکرین معاد کا عقیدہ یہ ہے کہ گردش زمانہ کے ہاتھوں ہم ختم ہوتے ہیں
دوسری زندگی نہیں ہے ____ ۱۹۷
منکرین معاد کا اعتراض اور جواب ____ ۱۹۸
قیامت کے دن ہر امت کو اپنا حساب دینا ہوگا ____ ۱۹۹
ہر امت کو اس کے نامۂ اعمال کی طرف بلایا جائے گا ____ ۲۰۱
اہل ایمان اور اہل کفر کی قسمت کا فیصلہ ہوگا ____ ۲۰۲
منکرین معاد کی منطق ____ ۲۰۳
قیامت کے دن منکرین معاد کا انجام ____ ۲۰۴

سورۃ الاحقاف
تعارف سورہ ____ ۲۰۹
مشرکین یہ بتائیں کہ ان کے معبودوں نے کیا خلق کیا ہے؟ یا کوئی دلیل پیش کرو کہ وہ معبود ہیں ____ ۲۱۱
مشرکین جن معبودوں کی عبادت کرتے ہیں وہ کل خود ان کے دشمن ہو جائیں گے ____ ۲۱۲
رسول اللہ ﷺ کوئی نرالے رسول نہیں، رسولوں کا تسلسل ہیں ____ ۲۱۴
مشرکین کہتے ہیں: اسلام میں کوئی خوبی ہوتی تو دوسرے لوگ ہم پر سبقت نہ لے جاتے ____ ۲۱۶
اللہ کو رب مان کر استقامت دیکھانے والوں کو امن وسکون حاصل ہوگا ____ ۲۱۷
والدین خصوصاً والدہ کے احسانات اور ان پر احسان کرنے کا ذکر ____ ۲۱۸
حق کی طرف بلانے والے والدین کی نافرمانی کرنے والے کا ذکر ____ ۲۲۳
کافروں کو جہنم کے سامنے پیش کرنے کا ذکر ____ ۲۲۶
قوم عاد اور وادی احقاف (برہوت) کا ذکر ____ ۲۲۷
جنات کا قرآن سننے اور ایمان لانے کا ذکر ____ ۲۳۳
کیا کائنات کے خلق پر قادر ذات اعادۂ حیات پر قادر نہیں ہے؟ ____ ۲۳۵
رسول اللہ ﷺ کو اولوالعزم انبیاء علیہم السلام کی طرح صبر کرنے کا حکم ____ ۲۳۷

سورہ محمد ﷺ
تعارف سورۃ ____ ۲۴۱
ایمان باللہ کے بعد جو کچھ محمد ﷺ پر نازل ہوا ہے اس پر ایمان سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے ____ ۲۴۲
لوگوں کے لیے اجمالی ایمان آسان، تفصیلی ایمان مشکل ____ ۲۴۳
دوران جنگ قیدی نہ بنانے کا حکم، جنگ تھم جانے کے بعد قیدی بنانے کے لیے ہدایات ____ ۲۴۵
غلامی اور اسلام۔ اعتراضات اور جوابات ____ ۲۴۷
اللہ کے دین کی مدد کرنے والوں کو اللہ کی مدد مل جاتی ہے ____ ۲۵۰
کافر کا ہر حربہ ناکام ہوگا ____ ۲۵۰
اللہ راہ خدا کے مجاہدین کا مولا ہے ____ ۲۵۲
ایمان وعمل صالح کو مقصد حیات بنانے اور جانوروں کی طرح صرف کھانے کو مقصد حیات بنانے والوں میں موازنہ ____ ۲۵۳
جنت کی نعمتوں کا ذکر ____ ۲۵۶
منافقین کلام رسول ﷺ نہیں سمجھتے تھے اہل علم سے رجوع کرتے تھے ____ ۲۵۷
معصوم کی طرف سے استغفار کی تشریح ____ ۲۶۰
قتال کا حکم آنے پر منافقین پر غشی کی سی کیفیت طاری ہوتی تھی ____ ۲۶۱
فساد فی الارض اور قطع رحمی کرنے والے حکمرانوں کا ذکر ____ ۲۶۳

ایسے حکمرانوں اور یزید بن معاویہ پر
لعنت کا حکم ____ ۲۶۵
منافقین کی مجرمانہ حرکتوں کا ذکر ____ ۲۶۸
اے رسولؐ آپ منافقین کو ان کے لب و لہجے
سے پہچان لیں گے ____ ۲۷۱
بغض علی نفاق کی علامت ہونے پر چند
احادیث کا ذکر ____ ۲۷۲
رسول ﷺ کی مخالفت کرنے کی صورت
میں عمل برباد ہو جاتا ہے ____ ۲۷۴
رسول اللہ ﷺ کسی کو خصوصی حکم دیں اور وہ
نہ مانے تو اس کے اعمال برباد ہو جائیں گے ____ ۲۷۵
جنگ میں صلح کے نام سے دشمن سے
دھوکہ نہ کھانے کا حکم ____ ۲۷۷
دین سے متصادم دنیا کھیل اور فضول ہے ____ ۲۷۸
تم نے اگر راہ خدا میں انفاق نہ کیا تو اللہ
تمہاری جگہ اور لوگوں کو پیدا کرے گا ____ ۲۸۰

سورة الفتح

تعارف سورۃ ____ ۲۸۳
فتح مبین سے مراد ____ ۲۸۷
"مغفرت" اور "ذنب" کی تشریح ____ ۲۸۸
صلح حدیبیہ کے بعد اللہ نے مؤمنین
کے دلوں میں سکون نازل کیا ____ ۲۹۱
سکون سے مؤمنین جنت کے حقدار اور
منافقین عذاب کے سزاوار بنتے ہیں ____ ۲۹۲
حدیبیہ میں لی گئی بیعت کا ذکر ____ ۲۹۵
رسول اللہؐ کے ساتھ عمرہ کے لیے نہ جانے
والوں کا جھوٹا عذر اور اس کی رد ____ ۲۹۶
حدیبیہ کے سفر میں رسولؐ کے ساتھ نہ جانے
والوں کو آئندہ جنگوں میں نہ لے جانے کا حکم ____ ۲۹۹
آئندہ ان لوگوں کو جنگجو قوم سے مقابلے
کے لیے بلایا جائے گا ____ ۳۰۰
ان لوگوں کا ذکر جن کا عذر قبول ہے ____ ۳۰۲
بیعت رضوان کا ذکر ____ ۳۰۳
آنے والی جنگوں میں فتح اور غنائم کی پیشگوئی ____ ۳۰۵
حدیبیہ میں جنگ کے بغیر صلح ہونا اللہ کا کرم تھا ____ ۳۰۷
مکہ میں بعض مسلمانوں کی جان
کو خطرہ نہ ہوتا تو جنگ ہو جاتی ____ ۳۰۹
کافروں کے جاہلانہ تعصب کے مقابلے
میں اللہ نے اپنے رسول اور مؤمنوں
کو سکون عنایت فرمایا ____ ۳۱۰
اللہ نے رسول اللہ ﷺ کا وہ خواب سچا کر دکھایا
جس میں آپ نے دیکھا کہ مکہ میں فاتحانہ
داخل ہو رہے ہیں ____ ۳۱۱
رسول اللہ ﷺ کی معیت میں رہنے والوں کے
اوصاف کا ذکر ____ ۳۱۳

سورة الحجرات

تعارف سورۃ ____ ۳۱۹
حکم خدا و رسول پر اپنی رائے کو
مقدم نہ کرنے کا حکم ____ ۳۲۰
نبیؐ کی آواز پر اپنی آواز بلند
کرنے والوں کا عمل برباد ہو جاتا ہے ____ ۳۲۱
آداب و تہذیب کا تعلق عقل سے ہے ____ ۳۲۳
فاسق کی خبر بلا تحقیق قبول نہ کرنے کا حکم ____ ۳۲۴
آیۂ اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌ اور روایت
الصحابة کلھم عدول میں تصادم ____ ۳۲۶
رسول ﷺ کی اطاعت ایمان اور رسول کو
اپنے زیر اثر لانے کی کوشش کفر، فسوق
اور عصیان ہے ____ ۳۲۸
مسلمانوں کی آپس میں لڑائی ہو جائے
تو صلح کی کوشش کرنی چاہیے صلح نہ ہو سکے
تو باغی کے خلاف لڑنا واجب ہے ____ ۳۲۹
مؤمنین آپس میں بھائی ہیں ان
میں صلح کرایا کرو ____ ۳۳۱
احترام مؤمن واجب ہے۔ لہٰذا ایک دوسرے

سے تمسخر کرنا، عیب لگانا، برے القاب سے
یاد کرنا ظلم ہے ______ ۳۳۲
احترام مؤمن کے تحت بدگمانی، تجسس اور
غیبت کرنا حرام ہے ______ ۳۳۵
اللہ نے لوگوں میں امتیاز رکھا ہے
بہتر امتیاز تقویٰ ہے ______ ۳۴۰
اسلام اور ایمان میں فرق ______ ۳۴۱
حقیقی مؤمن کی تعریف ______ ۳۴۲
اسلام قبول کرنا رسول پر نہیں بلکہ اللہ
کا تم پر احسان ہے ______ ۳۴۴

سورۃ ق
تعارف سورۃ ______ ۳۴۹
مشرکین انسان کو سفارت الٰہی کے قابل نہیں سمجھتے
اور قیام قیامت کو بھی غیر ممکن سمجھتے ہیں ______ ۳۵۰
انسان نابود نہیں ہوتا۔ اللہ کی کتاب تکوین میں
اس کے جسم کے ذرات محفوظ ہوتے ہیں ______ ۳۵۱
آسمان کو محفوظ ڈھال بنانے کا ذکر ______ ۳۵۲
زمین کو زندگی کے لیے سازگار بنانے کا ذکر ______ ۳۵۳
پانی کے ذریعہ زمین کو زندہ کرنے اور انسان
کو بھی اس طرح زندہ کرنے کا ذکر ______ ۲۵۵
قیامت کی تکذیب کرنے والی قوموں کا ذکر ______ ۳۵۶
جو اللہ پہلی تخلیق پر قادر ہے کیا وہ جدید تخلیق
پر قادر نہ ہوگا ______ ۳۵۶
اللہ ہمارے وجود سے زیادہ ہم
سے قریب ہے ______ ۳۵۷
انسان کے اعمال و اقوال محفوظ ہوتے ہیں ______ ۳۵۸
سکرات موت کے وقت ہی حق منکشف
ہو جائے گا ______ ۳۵۹
دوسرا صور پھونکنے پر ہر شخص ایک ہانکنے والے
اور گواہ کے ساتھ حساب کے لیے حاضر ہوگا ______ ۳۶۰
قیامت کے دن پردے اٹھ جانے پر تمام
حقائق سامنے آئیں گے ______ ۳۶۱

شیطان اور شیطان زدہ میں قیامت
کے دن جھگڑا ______ ۳۶۳
جہنم کو پر کیا جائے گا ______ ۳۶۴
جنت اور اہل جنت میں کوئی فاصلہ نہ ہوگا ______ ۳۶۵
اہل جنت کو جنت میں داخل ہونے کا
حکم ملے گا ______ ۳۶۷
قدیم قوموں کی ہلاکت میں قلب و سماعت
والوں کے لیے نشانی ہے ______ ۳۶۹
رسولؐ کو صبر اور مختلف اوقات میں تسبیح
کرنے کا حکم ______ ۳۷۰
قیام قیامت کے بارے میں چند حقائق ______ ۳۷۲

سورۃ الذاریات
تعارف سورۃ ______ ۳۷۷
مظاہر قدرت کی قسم قیامت برپا ہونے
والی ہے ______ ۳۷۸
ان متقین کے اوصاف جو جنت میں
داخل ہوں گے ______ ۳۸۱
زمین اور انسان میں اللہ کی نشانیاں
موجود ہیں ______ ۲۸۳
انسان کا رزق آسمان میں ہے ______ ۳۸۴
قیامت کا برپا ہونا واضح ترین ہے ______ ۳۸۵
حضرت ابراہیم ؑ کے ہاں فرشتے مہمان
بن کر آتے ہیں اور بیٹے کی بشارت
دیتے ہیں ______ ۳۸۶
قوم لوط کی تباہی کا ذکر ______ ۳۸۸
حضرت موسیٰ ؑ قوم عاد، قوم ثمود اور
قوم نوح کا ذکر ______ ۳۹۰
آسمان کو طاقت سے خلق کرنے اور وسعت
دینے کا ذکر ______ ۳۹۲
ہر چیز کی زوجیت کا ذکر ______ ۳۹۳
جن و انس کو اللہ نے عبادت کے لیے
خلق فرمایا ______ ۳۹۶

سورۃ الطور

بہت سی قسموں کے بعد قیامت کی آمد کا ذکر ۴۰۳
اہل جہنم کا ذکر ۴۰۴
اہل تقویٰ کی نعمتوں کا ذکر ۴۰۶
مؤمن کے لیے قیامت کے دن اولاد اور
والدین ایک دوسرے کے کام آئیں گے ۴۰۷
فضائل علی علیہ السلام ۴۰۸
اہل جنت کی ناز ونعمت اور آپس کی
گفتگو کا ذکر ۴۱۰
رسول اللہؐ نہ کاہن ہیں نہ مجنون، نہ شاعر،
تم اس رسالت کی ناکامی کا انتظار کرو،
ہم تمہاری نابودی کا انتظار کرتے ہیں ۴۱۲
اگر یہ قرآن خود محمدؐ نے گھڑ لیا ہے تو تم بھی اس
قسم کا کلام بنا لاؤ ۴۱۳
تم خود بغیر خالق کے پیدا ہوئے ہو یا تم خود اپنے
خالق ہو؟ چونکہ عبادت خالق کی ہوتی ہے ۴۱۳
کیا کائنات کے تم خالق ہو؟ یا کیا تمہارے پاس
رب کے خزائن ہیں؟ کیا تم پر کوئی تاوان کا
بوجھ ہے کیا تمہیں علم غیب حاصل ہے۔ یہ سب
نہیں تو کیا اللہ کے علاوہ کوئی اور معبود ہے؟ ۴۱۶
یہ لوگ عذاب کے مشاہدے پر بھی نہیں
مانیں گے ۴۱۷
اے رسول! (ﷺ) آپ صبر کریں آپ
ہماری نگاہ میں ہیں ۴۱۸

سورۃ النجم

تعارف سورۃ
رسول ﷺ صرف وحی کی باتیں کرتے ہیں ۴۲۴
جبرئیل کے چند اوصاف کا ذکر ۴۲۵
جبرئیل کو ان کی اپنی شکل میں دیکھنے کا ذکر ۴۲۷
رسولؐ نے اللہ کی بڑی نشانیوں کا مشاہدہ کیا ۴۳۰
بت پرستی انسان کی خودساختہ ہے ۴۳۲
اللہ کی اجازت کے بغیر فرشتے شفاعت
نہیں کر سکتے ۴۳۴
فرشتوں کو لڑکیاں قرار دینا جہالت پر مبنی ہے ۴۳۵
بڑے گناہوں سے اجتناب کرنے کی صورت
میں دوسرے گناہوں سے اللہ درگزر
فرماتا ہے ۴۳۷
اپنے آپ کو پاکیزہ نہ سمجھا کرو ۴۳۹
صحف انبیاء میں یہ بات درج ہے کہ کسی
کے جرم کی سزا دوسرے بے جرم کو
نہیں دی جائے گی ۴۴۱
انسان کو اپنے کیے کی سزا و جزا ملے گی ۴۴۲
ایصال ثواب کا مسئلہ ۴۴۳
تمام اُمور کی بازگشت اللہ کی طرف ہے ۴۴۴
عدل الٰہی کے تحت دوسری زندگی دینا
اللہ کے ذمہ ہے ۴۴۵
قوموں کی تباہی کا ذکر ۴۴۶

سورۃ القمر

تعارف سورۃ ۴۵۳
شق قمر کا ذکر ۴۵۳
قرآن کے منکرین کا ذکر ۴۵۶
حضرت نوح اور ان کی قوم کا ذکر ۴۵۹
طوفان اور کشتی نوح کا ذکر ۴۶۰
قرآن کو ایک آسان نصیحت بنایا ہے ۴۶۲
قوم عاد کا ذکر ۴۶۳
قوم ثمود کا ذکر ۴۶۴
قوم لوط کا ذکر ۴۶۷
آل فرعون کا ذکر ۴۶۹
مشرکین مکہ کی شکست و فرار کی پیشگوئی ۴۷۰
اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک
تقدیر و ضابطہ مقرر کیا ہے ۴۷۰
امر الٰہی کے نفاذ کے لیے وقت درکار
نہیں ہوتا ۴۷۲
نامہ اعمال میں ہر چھوٹی بڑی بات ثبت ہے ۴۷۳

متقین کے مقام کا ذکر ____ ۴۷۳

سورۃ الرحمن

تعارف سورۃ ____ ۴۷۷
انسان کے لیے قرآن کی تعلیم، قوت بیان
کی نعمت کا ذکر ____ ۴۷۸
ستارے اور درخت اللہ کے لیے
سجدہ ریز ہیں ____ ۴۷۹
اللہ تعالیٰ نے میزان عدل قائم کیا ہے ____ ۴۸۰
زمین کو لوگوں کی زندگی کے لیے سازگار بنایا ____ ۴۸۱
انسان کو خشک گارے اور جنات کو
آتش سے بنایا ____ ۴۸۲
دو سمندروں کے ملاپ اور موتی و مونگے
کا ذکر ____ ۴۸۳
سمندروں میں جہاز رانی اللہ
کی طرف سے ہے ____ ۴۸۶
روئے زمین پر موجود ہر چیز فنا پذیر ہے
سوائے اللہ کے ____ ۴۸۷
کائنات کی تمام موجودات اللہ
سے سوال کرتی ہیں ____ ۴۸۸
قیامت کے دن انسان اور جنات
سے پورا پورا حساب لیا جائے گا ____ ۴۸۹
قیامت کے دن اللہ کے حساب سے
فرار ممکن نہیں ____ ۴۹۰
قیامت اور مجرمین کا ذکر ____ ۴۹۳
خوف خدا رکھنے والوں اور ان کے لیے
نعمتوں کا ذک ____ ۴۹۶
احسان کا بدلہ احسان ہی ہو سکتا ہے ____ ۴۹۹
جنت کے باغات اور نعمتوں کا ذکر ____ ۵۰۰